خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

# سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

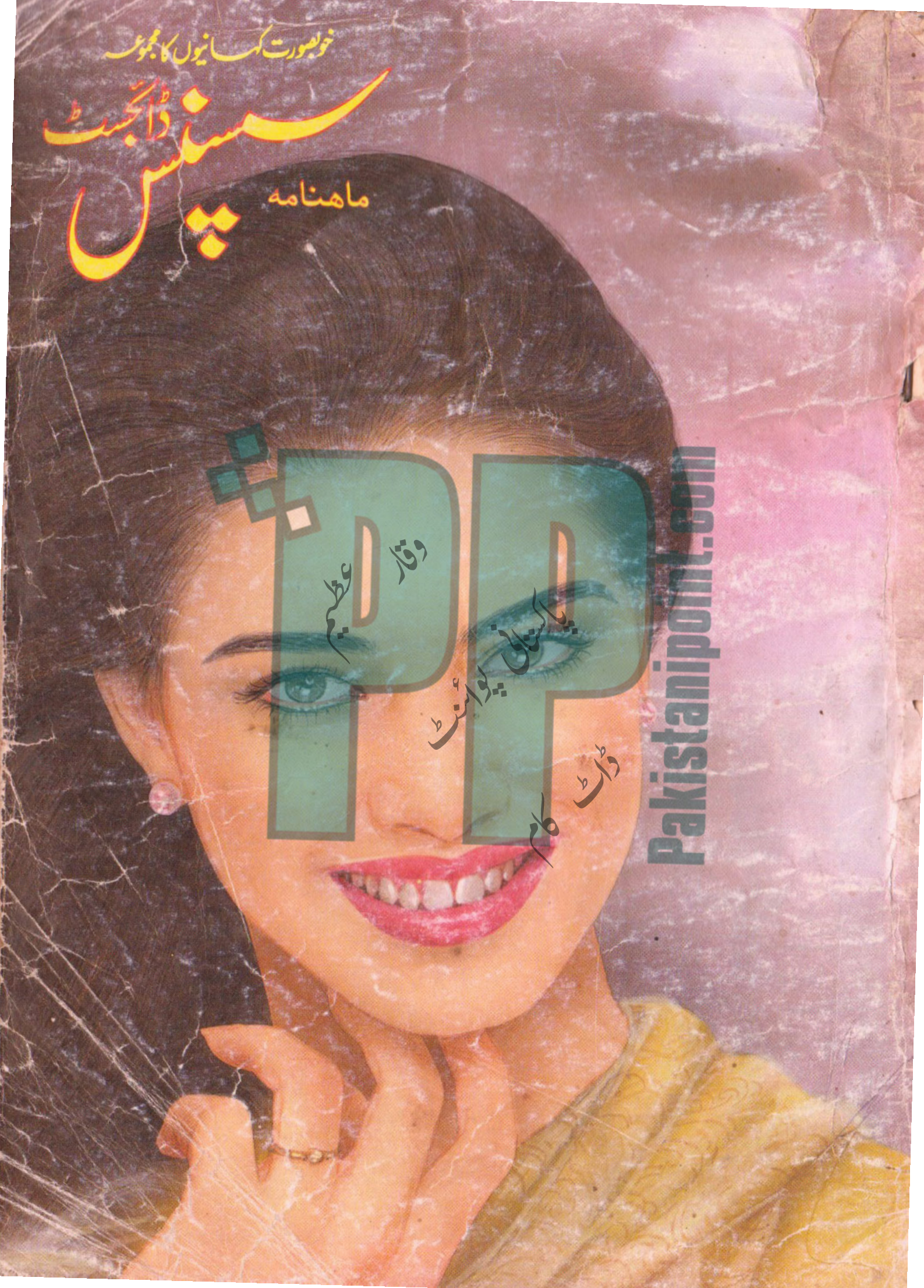

PP
وقار عظیم
پاکستان پوائنٹ
ڈاٹ کام
Pakistanipoint.com

انشائیہ — 11 — جون ایلیا
ثروت مندوں کو مشورہ اور منعموں کو نوید کہ ضرورت مند اب حاجتمند نہیں رہے ایک فقر کیش بنجارے کی خود کلامیاں

آپ کے خط — 12 — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور مشورے جو انجمن آرائی میں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں

آخری معرکہ ہمیت — 18 — الیاس سیتاپوری
ماضی کا آئینہ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے ایسے واقعات جو بینائوں کی بینائی کے لیے کتابوں محفوظ کر دیے گئے ہیں

حویلی کے راز — 71 — مانک رجام ساقی
فلک بوس دیواروں میں محبوس جاہ پرست کوتاہ بینوں کی داستان عبرت مندِ ادب سے انتخاب

دیوتا — 76 — فرہاد علی تیمور
ایک فسوں کار کی خود نوشت ایک عالم جس کے خون کا پیاسا تھا سسپنس کا مقبول عام سلسلہ جو ۲۸۶ صفحات پر جاری ہے

دستِ ہنر — 119 — کامل ظہیر
اُس باپ کی کہانی جسے اولاد کی صلاحیتوں پر شک تھا، کچھ کر دکھانے پر آمادہ بیٹے کی داستان

آواز نہ دو — 130 — نجمہ مودی
ایک گل بدن کے شعلہ بداماں بننے کا فسانہ۔ اُسے ایک نئے زخم کے لیے مدتوں انتظار کرنا پڑا

صید و صیاد — 144 — مرزا امجد بیگ
ہمارے اردگرد پھیلی داستانوں میں سے ایک سچی داستان، مرزا صاحب کی ڈائری سے انتخاب



پبلشر: عذرا رسول ◆ پرنٹر: جمیل حسن ◆ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ھاکی اسٹیڈیم، کراچی
یکے از مطبوعات: جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز ◆ مقام اشاعت: C-63 فیز ٹو، ایکس ٹینشن، کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی


مدیر اعلیٰ — معراج رسول


شکار — 175 — محمود احمد مودی
زمانۂ جدید کے ایک عجیب و غریب شکار کا ماجرا۔ اُسے کہیں اماں نہیں ملتی اور وقت بہت کم تھا

موت کے سوداگر — 180 — اقلیم علیم
منشیات استعمال کرکے خودکشی کرنے والوں کی نہیں ہونا چاہیے کہ زندگی ایک گھونٹ کے بعد دوبارہ نہیں ملتی، سسپنس کا ایک تعمیری سلسلہ

پیمانۂ صبر — 225 — ڈاکٹر عابد الرحمٰن
ایک شوہر کی داستان جو اپنی بیوی کی عادات سے نالاں تھا اور اسے سبق سکھانا چاہتا تھا

حضرت شعیبؑ — 233 — ضیا تسنیم بلگرامی
اہل مدین کا احوال۔ اُن پر خدائی عذاب بنی اسرائیلیوں کی صورت میں نازل ہوا تھا

اسیری اور رہائی — 243 — محمد زبیر سلیمانی
رشتوں ناتوں سے دور اپنی دنیا بسانے والے ایک پتھر دل شوہر کی کتھا، وہ سب جیتا مگر خود سے ہار گیا

محفل شعر و سخن — 247 — قارئین
مشہور و معروف شاعروں کے اشعار سے منتخب آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ، آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

یوپ کے سبز باغات — 250 — ش۔ صغیر ادیب
سرابوں کے اسیر ایک بے خانماں شخص کی بربادی کا افسانہ، اس کی آزادی اغلاماں میں مضمر تھی

کترنیں — ادارہ و قارئین
دُنیا بھر سے اِدھر اُدھر سے بٹورے چٹکلے، اقتباسات، گدگدیاں، ہنسگلیاں اور قہقہے۔ سب کچھ آپ کے لیے



رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی



خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی ◆ E-mail address: jasoosi@attglobal.net ◆ Phone: (021) 5802552 Fax: (021) 5802551



جلد 29 ◆ شمارہ 11 ◆ نومبر 2000 ◆ قیمت فی پرچہ 30 روپے ◆ زرِ سالانہ 400 روپے ◆ قیمت سعودی عرب و گلف ریاستیں 12 ریال یا ساوی



وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
PakistaniPoint.com

انشائیہ

# دماغ ماؤف ہیں

جون ایلیا

میں نے ایک آن اور ایک زمان میں شام کے ہنگام آیتہ الآیات سید السّادات نشان بلیغ البیان کے محضر میں ایک کلام کیا تھا اور اپنی ناتمامی کو تمام کیا تھا اور وہ کلام یہ ہے۔

یہ ان بستیوں کی بستی ہے جو یہ نہ جان سکے کہ ان کا ہرج مرج کیا ہے؟ ایک سرسامی کیفیت ہے جس میں بولنے والے صرف بڑبڑا رہے ہیں۔ یہ وہ گونگے ہیں جو اب بولنے پر آئے ہیں تو نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ بولیں تو کیا بولیں۔ سو انھوں نے زبان سے وہ سب کچھ اگلنا شروع کر دیا ہے جو حلق، حنجرے اور ہونٹوں کی سکت میں ہے۔ یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ لوگوں نے اپنے دکھوں کو لاعلاج بنا رکھا ہے۔ تمام عمر ٹیڑھے راستے پر چلتے رہے اور جب سیدھے راستے پر پڑنے لگے تو یہی بھول گئے کہ جانا کہاں تھا؟ بہت تمہاری کی، تم نے جب بھی کی، آزار شعاری اور بد نجاری کی۔

یہ کیسی افتاد ہے کہ اونچے اٹھے تو نیچے چھلانگ لگانے کے لیے۔ زمانے سے مہلت پائی تو اپنے ہی خلاف سازش اور آپس ہی میں دراندازی کرنے کے لیے۔ یہ کیسی کشاکش ہے جس سے دم گھٹا جا رہا ہے اور یہ کیسی کشود ہے جس نے گرہوں پر گرہیں ڈال دی ہیں۔

جو کچھ بھی سوچا گیا ہے، وہ بُری طرح سوچا گیا ہے۔ جو ہو رہا ہے، وہ بہت بُرا ہو رہا ہے۔ سرد ہروں نے اپنے چھوٹوں کی چارہ جوئی کے ٹالنے پر ایکا کر لیا ہے۔ اب تو شاید یہ بھی نہیں سوچا جا رہا کہ سوچنا کیا تھا۔

ثروت مندوں کو مژدہ ہو کہ حاجت مندوں نے جھنگ پی رکھی ہے اور اب انھیں کسی چیز کی حاجت نہیں رہی۔ محتاجی نے قابلِ رشک استغنا سیکھ لیا ہے۔ منعموں کو نوید دی جائے کہ فاقہ کشی نے روزہ رکھ لیا ہے۔ دراصل بھوکوں کو بہکا دیا گیا تھا۔ اب انھوں نے سر جھکا کر سوچ بچار کیا تو معلوم ہوا کہ بھوک لگ ہی نہیں رہی تھی۔ یہ روایت ہی غلط تھی کہ لوگ محرومی میں مبتلا ہیں کہ خود محروموں نے اس کی تردید کر دی ہے۔

کیا ان بستیوں نے اس لیے آسمان سر پر اٹھایا تھا، اوندھے منہ زمین پر آ رہیں۔ جس بندوبست کے خلاف بڑی چیخ پکار ہٹ تھی۔ اب اسے کس طرح سہارا جا رہا ہے۔ کیا اب یہ سوچنے کی فرصت باقی رہی کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے کس کا بھلا ہو گا؟ دیاروں کے مدبّروں اور شہروں کے شہرت مداروں پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ کون کس کے حق میں بول رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو کس سے شکایت کرنا چاہیے۔

یہ تمیز مشکل ہے کہ اس گھپ اندھیرے میں کس کا گریبان کس کے ہاتھ میں ہے۔ دماغ ماؤف ہیں اس لیے کہ اصل غایت کو بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ بھلا دیا گیا ہے۔ ان جھنجلاہٹوں کی سرنوشت کیا ہو گی جن میں رعایت دی گئی ہے تو غصب کرنے والوں کو۔ اس پرخاش اور پیکار کا انجام کیا ہو گا جس میں پناہ دی گئی ہے تو غبن کرنے والوں کو۔

▽▲▽



وقار زیدی
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
ROSE
Beauty Parlour (Pvt.) Ltd.
Nazimabad:6623233-6623234
Gulshan-e-Iqbal:
4977970-4977972-4979276
ایکسپرٹ دلہن میک اپ
LASERDOT

قلاؤن کی تجہیز و تکفین میں پورے شہر نے حصہ لیا۔ ہر طرف اداسی چھائی ہوئی تھی اور ایک عام مسلمان شک و شبے کے عالم میں خود سے یہ سوال کر رہا تھا کہ اب کیا ہوگا اور کیا بیبرس اور قلاؤن کے بعد اسلام کمزور نہیں ہو جائے گا۔ مسلمانوں کا عسکری سیلاب جو کبھی خمس میں نمودار ہوتا تو کبھی جارجیا اور آرمینیا میں۔ اب دونوں بڑے مسلمانوں کے بعد کیا ہوگا۔ کیا مسلمان اپنے متحدہ دشمن کو حسب سابق میدانِ جنگ میں سبق دیتے رہیں گے۔

خود مملوک امرا کو بھی امید نہیں تھی کہ نیا سلطان اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے عیسائیوں اور منگولوں کو

حصولِ مقصد کی لگن، عزم و حوصلہ اور استقلال کی داستان تاریخ اسلام کا ایک روشن باب

الیاس سیتاپوری

# آخری معرکہ یروشلم

دو برس سلطانوں نے شہر عکا اور اس کے قلعے کی تسخیر کی بہت منصوبہ بندیاں کیں۔ مگر اس واقعہ نے یہ ثابت کر دیا کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اور اللہ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے، لے لیتا ہے۔ دوانہ تاتی تجربہ کار سلطان بیبرس اور قلاؤن جو کام نہیں کر سکے وہ ایک نوجوان ناتجربہ کار سلطان کے سپرد کر دیا گیا۔ عکا اور مسیحی دنیا کو اس سے سلطان کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ حوصلہ مل گیا تھا کہ اب مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا ہے اور عیسائی دنیا عکا میں سے سلطان کو شکست دے کر قاہرہ کو بھی فتح کر لے گی۔

عیسائیوں کی اسلام دشمنی کے کئی مناظر اس کہانی میں بھی نظر آئیں گے اور یہ بھی کہ عیسائیوں کا کوئی ایسا ضابطہ یا اخلاق نہیں ہے جو ان کے کردار میں استقلال، جوش و خروش اور نصب العینی کی تڑپ پیدا کرے۔ جب تک عیسائیوں میں یہ خرابیاں موجود رہیں گی یہ مادی ترقیوں کے باوجود زوال اور اضمحلال کے گڑھوں میں گرتے رہیں گے۔ ان کا خاندانی نظام پہلے بھی برباد تھا اور آج بربادی کے بالکل کنارے پہنچ چکا ہے۔ اس کہانی کے سلسلے میں اپنا جو تاثر دیا گیا ہے وہ برقرار ہے کہ ہماری لڑائی یہودیوں سے نہیں عیسائیوں سے ہے یہودی دنیوان کے طفیلی اور آلۂ کار ہیں۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

خوف زدہ رکھ سکے گا بھی یا نہیں۔

خلیفہ نے جمعے کے خطبے میں اپنے نام کے بعد صلاح الدین خلیل ملک الاشرف کا نام لیا کیونکہ اب قلاؤن کا یہی بیٹا سلطان تھا۔

نمازیوں نے سن لیا کہ اب ان کا سلطان ملک الاشرف صلاح الدین خلیل ہے۔

خلیفہ پر ان دگرگوں حالات کی بے یقینی دیر تک طاری رہی۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ نیا سلطان عکا کی تسخیر کرلے گا لیکن خلیفہ کو قلاؤن کے اس فیصلے کا علم تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے عکا کی تسخیر کا کام لینا چاہتا ہے اس لیے اس نے اپنے بیٹے کو سلطان بنا دیا تھا۔

بہت سے شہریوں کو یہ تو معلوم تھا کہ سلطان قلاؤن کی بیماری کے دوران میں اس کے حصے کے سارے کام اس کا یہی بیٹا انجام دیتا رہا تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر پتھر نکالنے والے اور انہیں اونٹوں اور گدھوں پر بار کرنے والے جانتے تھے کہ یہ بہت بڑا کام قلاؤن کا بیٹا انجام دے رہا ہے۔

جنگلات میں بڑے بڑے درختوں کو کاٹ کر شہتیر تیار کرنے والے بھی جانتے تھے کہ قلاؤن کا کام اس کا بیٹا انجام دے رہا ہے۔

ملک الاشرف خلیل غزہ کے راستے جنگی ساز و سامان روانہ کرچکا تھا۔ اگر باپ موجود ہوتا تو شاید وہ باپ کی موجودگی ہی میں تسخیرِ عکا کے لیے روانہ ہو چکا ہوتا۔

مملوک افسران نے شروع شروع میں یہی محسوس کیا کہ آخر وہ کیا اسباب ہیں جو یہ نوجوان ان کو اپنے کسی معاملے میں شریک نہیں کرتا۔ کیا یہ نیا سلطان ان کی مدد کے بغیر ہی عکا کو فتح کرلے گا۔ وہاں کی اکثریت یہی سمجھ رہی تھی کہ مسلمان اپنی سابقہ فتوحات کو بھلا دیں گے اور کوئی نیا کارنامہ انجام نہیں دے سکیں گے۔

اچانک ملک الاشرف نے اپنے مملوک امرا کو طلب کیا اور ان سے پوچھا "تم لوگوں نے کس حد تک تیاریاں کر رکھی ہیں؟ میں نہیں جانتا لیکن میں عن قریب عکا کو فتح کرنے کی نیت سے چل پڑوں گا۔ اس سے پہلے تم لوگ فوج میں اس لیے موجود رہو کہ میں تم سب کو اپنا بزرگ، مشیر اور سردار سمجھتا ہوں۔ مجھے عکا کے معاملے میں تم لوگوں سے مشورے کرنا ہوں گے، میں تمہارے تجربوں سے فائدہ اٹھاؤں گا۔"

کئی امیروں کے منہ سوجے ہوئے تھے اور صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اس نئے نوجوان سلطان سے بالکل خوش نہیں ہیں۔

ملک الاشرف خلیل نے ان ناراض مملوک امرا کو بطورِ خاص مخاطب کیا "دیکھو، اس وقت دلوں میں کدورتیں رکھنے والوں کو بھی میرا نہیں، ملتِ اسلامیہ کا ساتھ دینا چاہیے۔ عیسائی اور مغول دو متضاد نسلوں سے تعلق اور واسطہ رکھنے والے تمہارے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔ وہ ایک دشمن کی طرح ایک ہو کے ہمیں نیست و نابود کردینا چاہتے ہیں لیکن ہم آپس ہی میں متحد نہیں ہیں۔ ہم سب کا ایک خدا ہے، ایک ہی آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم ایک ہی کتاب، ایک ہی مقصد۔"

ایک مملوک سردار آگے بڑھا اور ملک الاشرف کو مشورہ دیا "میں تجھے ایک بہت اچھا مشورہ دوں گا۔ اگر تو نے میرا وہ مشورہ مان لیا اور اس پر عمل کیا تو میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ ہم سب ایک بار پھر متحد ہو جائیں گے اور اپنے دشمن کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوں گے۔"

ملک الاشرف خلیل نے کہا "ٹھیک ہے، مشورہ دو۔ دیکھوں گا میں اس پر کس حد تک عمل کر سکتا ہوں۔"

مملوک سردار نے برجستہ مشورہ دیا "تم سلطانی چھوڑ دو۔ نیچے آجاؤ۔ ہم کسی عمر رسیدہ اور تجربے کار مملوک کو اپنا سلطان بنالیں گے۔"

ملک الاشرف نے کہا "تو نے عجیب، بے ہودہ مشورہ دیا ہے اس سے تو ہم سب میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔" اس نے خلیفہ کا خطبہ نہیں سنا۔ اس خطبے کے بعد جب تو کوئی نیا سلطان قوم کے سامنے لے جائے گا تو وہ اسے کس طرح قبول کریں گے اور قاہرہ کی سلطانی ایک مناقشہ اور تنازعہ بن جائے گی اور ہمارا اتحاد اور اتفاق قصۂ پارینہ میں پڑ جائے گا۔ تو تو مجھے نہایت بدبخت امیر لگتا ہے۔"

اس مملوک سردار نے غصّے سے منہ پھیر لیا اور کہا۔ "میں دل سے تجھ کو سلطان نہیں تسلیم کرتا۔ لے میں تیرے ساتھ کسی جہاد میں حصہ بھی نہیں لوں گا۔"

یہ مملوک سردار ملک الاشرف کو چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ خلیل ملک الاشرف کو اپنے حافظے پر زور دینا پڑ رہا تھا کہ یہ کون تھا؟ کہاں رہتا ہے؟ اور اس کی دوسرے بہت سے مملوک سرداروں میں آخر کیا حیثیت ہے؟

جب ان سوالوں کے جوابات نہیں ملے تو وہ اپنی الجھنوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے فوج میں چلا گیا۔ وہاں موجود مملوک سرداروں نے اپنے نئے اور نوجوان سلطان کا آگے بڑھ کر استقبال کیا اور سب ہی نے باری باری مصافحہ کیا۔

ملک الاشرف خلیل ان سب میں اس معترض اور منحرف مملوک امیر کو تلاش کرتا رہا جس نے اپنی باتوں سے



اس کے دل و دماغ میں ہیجان اور انتشار پیدا کر دیا تھا۔

کئی مملوک امرا نے سلطان میں یہ بے چینی اور اضطراب دیکھ کر پوچھا "اگر ہم غلطی نہیں کر رہے ہیں تو آپ ہمیں بتائیں کہ اس جمادی خوشی کے موقع پر آپ پریشان اور مضطرب کیوں ہیں؟"

ملک الاشرف نے پہلے تو اپنی تشویش کی وجہ سے سب کو آگاہ کرنا چاہا مگر اس خوف سے کہ کہیں ان امرا میں بھی اس ہائی اور فتنہ پرور جیسے خیالات کے کچھ اور امیر نہ ہوں کیونکہ سلطانی کے امیدوار کئی تھے اور ناکامی نے ان سب میں بھی نئے سلطان کے خلاف حسد اور عناد پیدا کر دیا تھا۔ ان سوئے ہوئے لوگوں کو چھیڑ کر بیدار کر دینا عقل مندی کی بات نہیں ہے۔

اس نے ان تمام امرا کو اپنے محل میں دعوت دے دی اور کہا "آپ سب شب کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔ اس میں آپ کے اور مستقبل کے بارے میں مشورے بھی ہو جائیں گے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ میرے مرحوم باپ نے اپنی زندگی کا جو آخری کارنامہ انجام نہیں دیا اور اس کی حسرت لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میں ان کی وہ حسرت پوری کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہو کہ میں یہ مشکل کارنامہ انجام نہیں دے سکوں گا تو وہ مجھ سے علیحدگی اختیار کرلے اور اس وقت میرے پاس آئے جب میں عکا کو فتح کرکے واپس آجاؤں۔ میں تمہیں قاہرہ میں ان علیحدہ ہو جانے والوں سے ملاقات کروں گا۔"

مملوک سرداروں کو ملک الاشرف کی یہ باتیں کچھ بہکی بہکی سی محسوس ہوئیں مگر انہیں شبہ تھا کہ یہ نیا سلطان جو یہ بڑی بڑی باتیں کر رہا ہے، ان پر وہ پورا بھی اترے گا یا نہیں۔

عام سپاہیوں نے نئے سلطان کو اپنے آس پاس بے تکلفی سے چلتے پھرتے اور باتیں کرتے دیکھا تو انہیں بڑی خوشی ہوئی۔

جب چھاؤنی سے نکلنے کے بعد وہ تنہا محل واپس پہنچا تو محل کے مملوک محافظین نے اسے احساس دلایا کہ اب اسے تنہا نہیں نکلنا چاہیے کیونکہ یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ چند نامعلوم مملوک امرا نئے سلطان کی مخالفت پر کمربستہ ہو چکے ہیں اور وہ لوگوں کو نئے سلطان کے خلاف برانگیختہ کرتے پھر رہے ہیں۔

ملک الاشرف خلیل کو اقتدار سنبھالتے ہی جن حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، اس سے اس کو بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ سلطانی کانٹوں کا بستر ہے جس پر وہ ایک لمحے کے لیے بھی سکون سے نہیں سو سکتا۔

وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہا تھا حالانکہ باپ کی موجودگی میں اس کے کئی دوست، بہت سے غم خوار اور آگے پیچھے پھرنے والے پائے جاتے تھے مگر اب وہ سب غائب ہو چکے تھے۔ گویا ملک الاشرف خلیل کو کوئی متعدی مرض ہو اور جس سے لوگ بچتے پھر رہے ہوں۔

محل میں جانے کے بعد اس نے محل کے نگراں مملوک بدرالدین کو بلوایا۔

یہ ادھیڑ عمر شخص قلاؤن سے بہت قریب تھا اور اس کی وفاداری اور معاملہ فہمی کے سب ہی معترف تھے۔

بدرالدین نے نئے سلطان سے تخلیے میں ملاقات کی تو اس پہلی ہی ملاقات میں بدرالدین کی حرکات و سکنات سے ایسا لگا، جیسے وہ خود بھی اس نوجوان سلطان سے ملنے کے لیے بے چین اور بے قرار تھا۔

خلیل نے اس سے محل کی نگرانی سے متعلق کئی سوالات کیے اور کہا "میں یہ سوالات اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ میرے کئی مخالفین میرے خلاف کسی قسم کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں کیونکہ وہ میری سلطانی سے خوش نہیں ہیں اور میری جگہ کسی عمر رسیدہ زیادہ تجربے کار مملوک امیر کو سلطان بنانا چاہتے ہیں۔"

بدرالدین نے کہا "آپ کا خیال اور آپ کی اطلاعات درست ہیں۔ میں خود بھی اپنی کوتاہی کی معافی مانگنے کے لیے آپ کے پاس آنا چاہتا تھا مگر آپ نے خود ہی مجھے بلوالیا۔"

ملک الاشرف خلیل نے حیرت سے پوچھا "کون سی کوتاہی! جس کے لیے تو مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔"

بدرالدین نے کہا "ابھی جو آپ سے چند مملوک سردار اور امرا محل میں ملے تھے، ان میں ایک مشتبہ امیر بھی تھا۔ اس نے آپ سے آپ کی سلطانی کے خلاف باتیں بھی کی تھیں۔ میں حیران ہوں کہ وہ اجنبی شاہی محل میں کس کے توسط سے پہنچا کہ ہم اسے نہیں پہچان سکے جو مملوک امرا اس کو لے کر آپ کے پاس گئے تھے، وہ بھی میری ہی طرح حیران و پریشان ہیں۔"

بدرالدین کے اس انکشاف سے ملک الاشرف خلیل خود بھی پریشان ہو گیا، پوچھا "وہ تھا کون؟"

بدرالدین نے جواب دیا "کچھ پتا نہیں۔ ہم تو اب یہ سوچ رہے ہیں کہ جب وہ محل میں آپ تک پہنچ ہی گیا تھا تو وہ انگلستان کے شہزادے ایڈورڈ کی طرح آپ پر حملہ آور بھی ہو سکتا تھا۔"

ملک الاشرف نے جب اس سلسلے میں زیادہ تفصیلی

باتیں کیں تو اسے معلوم ہوا کہ وہ مملوک امیر خود کو جبرس کے وقتوں کا امیر بتاتا تھا۔ کہتا تھا کہ میں بعض ضروری معاملات کو نمٹانے کے لیے بخارا اپنے خاندان والوں سے ملنے کے لیے چلا گیا تھا۔ اب کئی سال بعد واپس آیا ہوں۔"

حقیقتاً یہ مملوک امیر سب ہی کے لیے معمّا بن گیا تھا۔ وہ مملوک نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق قبچاقی نسل سے تھا تو مگر وہ مسلمان نہیں تھا۔ کسی عیسائی فرقے کا پرجوش مسیحی تھا۔

اس مملوک امیر کے بارے میں اتنی بہت ساری باتیں معلوم ہونے کے بعد ملک الاشرف نے پوچھا "یہ ساری معلومات تجھے کس نے دیں؟"

بدرالدین نے جواب دیا "مجھ سے سسلی کا ایک عرب تاجر ملا تھا۔ اس نے ایک امیر کو محل سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ اس عرب نژاد سسلی کے تاجر نے اس سے بہت سے سوالات کیے اور پوچھا تو شاہی محل میں کیا لینے گیا تھا اور تجھے وہاں کس نے داخل ہونے دیا تو اس نے عرب نژاد سسلی کے تاجر کو بتایا۔ میں اس نئے سلطان کو قریب سے دیکھنے کا خواہش مند تھا کیونکہ وہ اپنے بقول اس پر حیرت زدہ تھا کہ قاہرہ میں لائق سلطانوں کا ایک سلسلہ چلا آرہا ہے اس لیے یہ نیا سلطان بھی بہت سے غیر معمولی کارنامے انجام دے کر شہرت کے اس بلند ترین زینے تک پہنچ جائے گا' جہاں اس سے کسی کا ملنا آسان نہیں ہوگا۔"

ملک الاشرف یہ ساری باتیں دلچسپی سے سنتا رہا پھر سوال کیا "کیا اس نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا' وہ درست ہوگا؟"

بدرالدین نے جواب دیا "میرا تو یہی خیال ہے کہ اس وقت اس کی ساری باتیں سچ کی کسوٹی پر کھری نہیں ثابت ہوں گی بلکہ وہ شاہی محل میں آپ کو قتل کرنے پہنچا تھا مگر دوسرے امرا کی موجودگی میں وہ اپنے منصوبے پر عمل نہیں کر سکا۔"

ملک الاشرف نے کہا "اگر یہ بات ہے تو اسے تلاش کیا جائے۔"

بدرالدین نے جواب دیا "لیکن وہ ملے گا نہیں کیونکہ وہ جس مقصد سے آیا تھا' اس میں ناکام ہونے کے بعد وہ یہاں ٹھہرے گا نہیں۔"

ملک الاشرف نے حکم دیا "میں اس شخص کو ہر قیمت پر اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ اتنی جلدی فرار نہیں ہو سکتا۔ قاہرہ سے دمیاط اور اسکندریہ تک آدمی دوڑا دیے جائیں۔ اس کا حلیہ بیچنے والوں کو اچھی طرح سمجھا دیا جائے۔ وہ قافلوں کے ساتھ سفر کریں اور تمام قافلوں کو تلاشی لینے کے بعد سفر کی اجازت ملنی چاہیے۔ میں خود بھی قاہرہ کے پڑاؤ پر جا کے اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہوں۔"

بدرالدین نے نئے سلطان کو ایک بات اور سمجھائی "میرا خیال ہے کہ اس شخص کو ہم پڑاؤ اور اور قافلوں میں نہ تلاش کریں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ قاہرہ کے بعض حلقوں میں آپ کی سلطانی ناپسند کی جارہی ہے اور لوگ الگ الگ انحصارِ خیال کررہے ہیں جہاں بھی آپ کی مخالفت کی جارہی ہو' وہیں اس مشکوک اور مشتبہ شخص کو شدت سے تلاش کیا جائے کیونکہ جہاں وہ ہوگا' وہیں آپ کے خلاف باتیں کی جائیں گی اور آپ کے خلاف لوگ کو بھڑکانے والا وہی شخص ہوگا۔ اسے اس کے حامی اور ہم خیال پناہ بھی دے سکتے ہیں۔ اس طرح ہم اسے پکڑ سکتے ہیں۔"

سلطان کو اس کی یہ تجویز پسند آئی اور حکومت کے ذہین اور خاص کارندے پورے قاہرہ میں اس طرح پھیل گئے کہ کسی کو کانوں کان یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ نیا سلطان اور نئی حکومت ایک جعلی اور دھوکے باز مفسد کو تلاش کررہی ہے' جو مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔

اسی رات مملوک امرا شاہی محل دعوت کھانے پہنچ گئے۔

یہ امرا ملک الاشرف کے حامی تو تھے مگر عمّا کی جگہ اس نوجوان کی قیادت میں نہیں لڑنا چاہتے تھے۔

یہ چند امرا جو ایسا خیال رکھتے تھے' ملک الاشرف کی نظروں میں آگئے۔

دعوت شاندار تھی۔ سب امرا نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا پیا اور اکٹھے تو یہ وعدہ کیا کہ وہ عمّا کا معرکہ ملک الاشرف کی سلطانی اور سپہ سالاری میں سر کریں گے۔

کئی گھنٹے شاہی محل میں رہنے کے بعد جب مملوک امرا اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے تو ان میں سے تین کو ملک الاشرف نے روک لیا اور باتوں سے ان کو کریدنا شروع کردیا کیونکہ بدرالدین سے بات چیت کرنے کے بعد یہ طے پا گیا تھا کہ جہاں بھی ملک الاشرف کی سلطانی کے خلاف باتیں ہوں گی' وہ مشتبہ شخص ان مخالفت کرنے والوں کے آس پاس ضرور موجود ہوگا۔

ملک الاشرف ان تینوں کو اپنے محل کے ایک برج میں لے گیا۔ اس برج کی غیر معمولی بلندی سے شہر کے مختلف حصوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔

ملک الاشرف نے برج کے باہر حبشیوں کا ایک دستہ اپنی حفاظت کے لیے کھڑا کردیا اور ان کو حکم دیا کہ انہیں جیسے ہی تالی کی آواز سنائی دے' وہ کسی اجازت کے بغیر ملک الاشرف کے پاس پہنچ جائیں۔

یہ تینوں مملوک امرا اس برج میں کچھ پریشان اور ماؤف الدماغ نظر آرہے تھے کیونکہ سلطان ان تینوں کو تنہا یہاں لے آیا تھا۔

ان لوگوں نے برج کے نیچے جھانکنا چاہا تو سلطان نے ان سب کو وقت سے پہلے ہی یہ بتادیا کہ انہیں کس شک و شبے میں یہاں لایا گیا ہے۔

ایک مملوک امیر کہنے لگا "ہم پر کبھی سلطان جبرس اور ظاہر نے بھی شبہ نہیں کیا مگر آج آپ ہم پر شبہ کررہے ہیں۔ پتا نہیں کیوں اور یہی سے ہمیں یہ اندازہ ہورہا ہے کہ یہ دونوں مملوک سلطانوں اور آپ میں کیا فرق ہے۔"

ملک الاشرف نے پوچھا "کیا فرق ہے؟"

ایک نے جواب دیا "بین فرق یہ ہے کہ وہ تجربے کار' اناس تھے جب کہ آپ ناتجربے کار ہیں اور نہ مرحوم شامل۔ اللہ اس اعلیٰ سلطنت پر رحم فرمائے۔ بدقسمتی سے جس کا آپ کو سلطان بنادیا گیا ہے۔"

ملک الاشرف نے بقیہ دونوں سے پوچھا "کیا تم دونوں بھی اپنے ساتھی کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہو؟"

دونوں نے اثبات میں گردنیں ہلائیں اور دیری سے جواب دیا "ہاں' ہم دونوں اپنے ساتھی کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔"

ملک الاشرف نے کہا "میں بھی تم تینوں پر اعتماد نہیں کرتا اور میرے آس پاس کوئی ایک بھی ایسا شخص موجود نہیں جو تم سے تواتفاق کرلے اور۔"

تینوں نے بیزاری سے کہا "آپ ہمیں جس غرض سے یہاں لائے ہیں' اس سے مطلع فرمائیں تاکہ ہم اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکیں۔"

سلطان نے ذرا سخت لب ولہجہ اختیار کیا اور پوچھا "تم تینوں میرے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے' کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا لیکن خوش قسمتی سے میں اس شخص کو ضرور جانتا ہوں۔"

ایک نے پوچھا "کیا ہم تینوں کے علاوہ بھی کوئی ایسا شخص موجود ہے' جس پر آپ ہماری طرح شبہ کرتے ہیں؟"

سلطان نے پوچھا "تم لوگوں نے ابھی مجھے قریب سے دیکھا بھی نہیں مگر میرے بارے میں رائے زبردست قائم کیے ہوئے ہو۔"

ایک مملوک امیر کھڑا ہوگیا اور ملک الاشرف سے کہا۔ "ہمیں جانے کی اجازت دی جائے اور اگر آپ اپنے بارے میں ہماری حریفانہ بے لاگ تنقید برداشت نہیں کرسکتے تو ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اب ہم آزادی سے سوچنا چھوڑ دیں گے اور آپ کی دوسروں کی طرح دل وجان سے تائید اور اطاعت کرتے رہیں گے۔"

سلطان نے کہا "ٹھیک ہے' اب میں تم سے صرف ایک سوال کروں گا۔ اس کا مجھے صاف اور سچا جواب ملنا چاہیے۔"

تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے۔

ملک الاشرف نے پوچھا "مجھے وہ شخص یا اس کا پتا درکار ہے جس نے تمہیں ہمارے خلاف بھڑکایا ہے۔"

وہ تینوں اس سوال سے بہت پریشان ہوگئے۔ ان کے چہروں کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ بے حد خوف زدہ نظر آرہے تھے۔

ایک نے جواب دیا "ہم کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے' جس کا آپ حوالہ دے رہے ہیں۔"

سلطان نے انتہائی مضبوط لہجے میں کہا "ٹھیک ہے' اگر تم مجھے دھوکا دے کر نکل جانا چاہتے ہو تو اب ایسا ممکن نہیں رہا۔ جب تک تم تینوں یا تم میں سے کوئی ایک اس مطلوبہ شخص کا پتا نہیں بتائے گا' تم تینوں اسی برج میں قید رہو گے۔"

تینوں ایک ساتھ اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور ایک نے غصے سے کہا "سلطان! ایسی غلطی نہ کرنا۔ ہم تینوں سے نادانی سے نہ پیش آئیں۔ یاد رکھیے اگر ہم قید کرلیے گئے اور اپنے گھروں میں نہ پہنچے تو پورے قاہرہ میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوں گے اور ان پر آپ قابو نہیں پاسکیں گے۔"

ان تینوں نے سلطان کی اجازت کے بغیر برج سے نکلنا چاہا تو سلطان نے تالی بجا کے حبشی دستے کو اندر بلالیا۔ سلطان نے مختصراً انہیں حکم دیا "ان تینوں کو یہیں قید کردیا جائے۔ باہر سے مقفل کرکے اور جب تک میں ان کی رہائی کا حکم نہ دوں' ان سے کوئی ملاقات تک نہ کرے۔"

تینوں نے برج سے نکلنے کی کوشش کی مگر حبشیوں نے ان کو دھکیل کر اندر کردیا اور باہر سے دروازہ مقفل کرکے وہیں سامنے پہرہ دینے لگے۔

ملک الاشرف برج سے نیچے آگیا۔

ان تینوں نے جس خطرے کا اظہار کیا تھا' وہ صبح ہوتے ہوتے درست نکلا۔ تینوں اپنے گھر نہیں پہنچ سکے تو ان کے گھر والوں نے کئی مملوک امرا کے ساتھ ان کی تلاش شروع کردی۔ کئی گواہوں سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان تینوں کو شاہی محل میں داخل ہوتے دیکھا گیا تھا لیکن واپس نکلتے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔

چھاؤنی کے آس پاس رہنے والوں نے بازار میں جمع ہو کے ملک الاشرف کے خلاف نعرے لگائے اور اعلان کیا کہ ہم اس ناتجربے کار، کم عمر سلطان کو نہیں مانتے۔

لیکن انہی آبادیوں میں قلاؤن اور اس کے خاندان سے محبت کرنے والے لوگ بھی موجود تھے۔ انہوں نے ان مخالف نعرے لگانے والوں پر حملے شروع کردیے اور فساد شروع ہوگیا۔

یہ خبریں ایوان کبیر اور شاہی محل تک پہنچیں تو ملک الاشرف نے ہنگامہ کرنے والوں کے خلاف فوجی قوت استعمال کی اور چند گھنٹوں میں فسادات پر قابو پالیا۔

کچھ آدمی گرفتار بھی کرلیے گئے۔ گرفتار ہونے والے وہ لوگ تھے جو ملک الاشرف کے خلاف خود نعرے لگا رہے تھے اور دوسروں سے نعرے لگوا رہے تھے۔

یہ گرفتار شدگان کل دس گیارہ آدمی تھے۔ انہیں گرفتار کرنے کے بعد جب تشدد سے بولنے پر مجبور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کسی مملوک امیر نے انہیں ورغلا کے نئے سلطان کے خلاف ہنگامہ آرائی پر مجبور کیا تھا۔

برج میں قید تینوں مملوک امرا کو ملک الاشرف نے ان نئے گرفتار ہونے والوں سے ملوایا اور جب ان چودہ مملوکوں سے پوچھ گچھ شروع ہوئی تو آخر کار اتنا معلوم ہوسکا کہ جس مملوک امیر کی ملک الاشرف کو تلاش تھی، وہ صحرائے سینائی کے راستے فرار ہوچکا ہے۔

ملک الاشرف نے ایک بار پھر مملوک سرداروں کو جمع کیا اور انہیں مشورہ، مفسد اور جبلی امیر کے حوالے سے بتایا کہ اب ہمارا دشمن ہم سے دو محاذوں پر لڑے گا۔ ایک تو میدان جنگ میں جہاں ہم اپنے دشمن کا ہتھیاروں سے مقابلہ کریں گے اور دوسرا محاذ ہوگا اپنا گھر یعنی وہ ہم میں پھوٹ ڈالوا کے خون خرابہ کروائے گا اور اگر یہ نااتفاقی اور پھوٹ فوجیوں میں پہنچ گئی تو ہماری عسکری قوت پارہ پارہ ہوجائے گی۔

ملک الاشرف نے فوراً ہی فیصلہ کرلیا کہ اب اسے قاہرہ میں اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے اور ان سب کو جنگ میں الجھا دینا چاہیے۔ وہ جنگ جو عکا میں لڑی جانے والی تھی جو جنگ نہیں ایک قسم کا جہاد تھا۔

ملک الاشرف نے اعلان کیا کہ اس بار وہ صحرائے سینائی کے راستے غزہ پہنچے گا۔

فوج عکا پہنچنے کے لیے بے قرار تھی۔ منجنیقیں اور دوسرے پتھر برسانے والے آلات پہلے ہی غزہ روانہ کیے جاچکے تھے اور شتیروں کی بہت بڑی کھیپ بھی غزہ پہنچ چکی تھی۔

روانگی سے قبل ملک الاشرف نے خلیفہ سے ملاقات کی اور یہ درخواست بھی کی کہ اس کی عدم موجودگی میں خلیفہ شہر کو قابو میں رکھیں۔

خلیفہ کے علاوہ وہ قاہرہ کے قاضی بدرالدین ابن جماعہ سے بھی ملا۔ پہلے قاہرہ کا قاضی الگ ہوتا تھا اور پورے مصر کا قاضی کوئی اور شخص لیکن ملک الاشرف نے قاضی بدرالدین کو قاہرہ اور پورے مصر کا قاضی مقرر کردیا۔

قاضی کو تخلیے میں لے جاکر سمجھایا "میری عدم موجودگی میں خلیفہ بہت ہاتھ پاؤں مارے گا لیکن تم اسے شہری اور ملکی معاملات میں زیادہ دخیل مت ہونے دینا۔ اگر خلیفہ اپنی حدود سے تجاوز کرے تو مجھے اس کی اطلاع فوراً پہنچائی جائے۔"

قاضی بدرالدین، قلاؤن خاندان کا احسان مند تھا۔ اس نے کہا "مجھے یقین نہیں کہ خلیفہ اپنی حدود سے تجاوز کرے۔ اگر وہ اتنی ہمت کرے گا تو ہم ایوان کبیر کو باہر سے مقفل کردیں گے اور یہ قفل اس وقت تک پڑا رہے گا، جب تک آپ واپس نہیں آجائیں گے۔"

قلبوغانائی ایک مملوک سردار ہے ملک الاشرف کے زیادہ قریب رہنا چاہتا تھا۔ اس نے جو یہ دیکھا کہ ملک الاشرف مخالف امرا، خلیفہ اور قاضی کے چکروں میں پڑا ہوا ہے تو اس نے ملک الاشرف کو علیحدہ لے جاکے سمجھایا "آپ کسی بھی معاملے میں بالکل نہ فکر کریں۔ میری ہمدردیاں اور میرا لشکر پورا تعاون آپ کے ساتھ ہیں۔"

ملک الاشرف کو بھی ایک سہارا درکار تھا۔ یہ سہارا برائے نام ہی سہی لیکن مل تو گیا۔ چنانچہ اس کی نظر میں نہایت اہم امیر قرار پاگیا۔

جس روز فوج نے قاہرہ چھوڑا اور صحرائے سینائی کا رخ کیا، اسی روز عرب کے بدو بھی مشرقی صحرا سے نمودار ہوئے اور اسلامی لشکر میں شامل ہوگئے۔

مملوکوں کا لشکر غزہ میں ٹھہر گیا اور یہیں اس نے اپنے خیمے نصب کروائے۔ بدو اس نوجوان سلطان کے بارے میں کچھ مضحکہ خیز باتیں کررہے تھے مگر اس مخالفت میں ان کا جوش و خروش شامل نہیں تھا۔

ملک الاشرف نے محسوس کیا کہ عرب بدوؤں کو بھی ورغلایا گیا ہے کیونکہ یہ بدو بھی اسی قسم کی باتیں کررہے تھے جس طرح قاہرہ میں ہنگامہ کرنے والوں نے کی تھیں۔

قلبوغا نے ان عرب بدوؤں کو نہایت جوش و خروش سے سمجھایا کہ وہ اپنے نئے سلطان پر بھروسا کریں، اس کا حکم مانیں اور عکا کی تسخیر میں اس کا ساتھ دیں۔



بدوؤں نے قلبوغا سے اس کا نام پوچھا اور انہیں جب نام قلبوغا کا علم ہوا تو کہنے لگے "تیرا نام تو بالکل منگولوں جیسا ہے۔ کیا تیرا تعلق منگولوں سے ہے؟"

قلبوغا نے انہیں بتایا کہ اس کا تعلق بھی میرس کی طرح قپچاق نسل سے ہے اور اس کے آباؤ اجداد بھی کبھی منگول ہی تھے لیکن وہ پکا مسلمان ہے۔

یہیں غزہ میں حبشیوں کا دستہ بھی پہنچا اور سوڈانی بھی پہنچے۔ مسلمانوں کے لشکر میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

ایک ہفتہ غزہ میں قیام کرنے کے بعد ان لوگوں نے عکا کے لیے سفر شروع کردیا۔ راستے میں انہیں عیسائی بستیاں بھی ملیں اور مسلمانوں کے قصبے بھی نظر آئے۔ مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں بھی سنائی دیں اور گرجوں کے گھنٹوں اور گھنٹیوں کی آوازیں بھی کانوں میں پڑیں۔

عیسائی آبادیاں بہت خوف زدہ تھیں لیکن مسلمان خوشی کے نعرے لگا رہے تھے۔

جمعرون کے پہنچتے پہنچتے عکا میں ہر طرف یہ خبریں گشت کرنے لگی تھیں کہ قاہرہ کا اسلامی لشکر عکا کے دروازے تک پہنچ چکا ہے۔ بظاہر اسلامی لشکر کی قیادت ایک نوجوان سلطان کررہا ہے مگر اس اسلامی لشکر کے مقابلے میں بہت زیادہ عیسائی سرفروش بھی عکا پہنچ چکے ہیں۔"

راستوں میں مکانوں کی چھتوں سے اسلامی لشکر کا نظارہ کرنے والے خوش نظر آرہے تھے۔

ان بستیوں سے بھی بہت سے نوجوان اس مذہبی جنگ میں حصہ لینے کے لیے ملک الاشرف کے پاس پہنچتے رہے اور انہیں فوج میں شامل کیا گیا۔ انہیں جنگی تربیت دی گئی۔ اس طرح قاہرہ کا یہ لشکر جمعرون میں نہایت شاہانہ وقار سے داخل ہوا۔ قصبے میں موجود عیسائیوں پر لرزہ طاری تھا اور وہ انفرادی طور پر مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

ان عیسائیوں کو ماضی کی تاریخوں کے حوالے سے یہ ضرور معلوم تھا کہ مسلمان کہیں سے مایوس واپس نہیں ہوئے اس لیے عکا خطرے میں ہے۔

○☆○

جمعرون میں قیام کے دوران میں ہی قاہرہ کے اس لشکر نے عکا والوں کو پیغام بھیج دیا کہ وہ مسلمانوں کے لیے عکا شہر کے دروازے کھول دیں تو انہیں امان دی جائے گی اور اگر دروازے نہ کھلے تو فصیلیں مسلسل سنگ باری کرکے توڑ دی جائیں گی اور شہر میں داخل ہونے کے بعد کسی کے ساتھ بھی رعایت نہیں کی جائے گی۔

ملک الاشرف نے یہ پیغام اپنے ایک تین رکنی وفد کے ذریعے بھیجا تھا اور انہیں ہدایت کی تھی تھی کہ وہ شہر کا اچھی طرح جائزہ بھی لیں اور بتائیں کہ وہاں کتنی عیسائی فوج موجود ہے اور کہاں کہاں سے عیسائی فوجیں عکا پہنچ چکی ہیں۔

اس تین رکنی وفد نے عکا میں داخل ہوتے ہی مشاہدے کا عمل شروع کردیا۔ یہاں انہیں نہایت خوب صورت محلات نظر آئے اور پوچھنے پر یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی محل تو قبرص کے بادشاہ کا ہے اور کوئی جرمنی کے حکمران کا۔ اس طرح فرانس والوں کے بھی محلات موجود تھے۔ تاتئوں کی کوٹھیاں بھی انہیں نظر آئیں۔

شہر میں بڑی رونق تھی اور عیسائیوں کو اپنی قوت پر بھروسا تھا کہ مسلمان اس بار عکا سے ناکام اور مایوس واپس جائیں گے۔

عکا میں پرُ شکوہ کا بطریق اعظم موجود تھا۔ ان تینوں نمائندوں نے بطریق اعظم سے ملاقات کی اور ملک الاشرف کا پیغام پہنچادیا۔

بطریق اعظم نے ان تینوں کو بڑے غور سے دیکھا اور ملک الاشرف کا خط واپس کرتے ہوئے پوچھا "یہ کسے لکھا گیا ہے؟"

ایک نمائندے نے جواب دیا "اپنا تو خیال یہ ہے کہ یہ آپ ہی کو لکھا گیا ہے۔"

بطریق اعظم نے کہا "اس وقت شہر میں پاپائے اعظم کے بھیجے ہوئے سپاہی بھی موجود ہیں اور قبرص کے بادشاہ کی فوج بھی۔ تاتئوں اور ہاسپٹلروں کے جیالے بھی مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے لیے باہی کدورت دور کرکے یکجا ہوگئے ہیں۔ اب ان میں سے کس کو یہ خط دیا جائے۔"

نمائندے نے کہا "میں نے اپنے سلطان کا مکتوب آپ کو دے دیا ہے۔ آپ جسے چاہیں دے دیں۔ ہمیں اس کا جواب درکار ہے۔"

بطریق اعظم نے جواب دیا "اپنے سلطان سے کہو کہ اب مسلمانوں میں نہ تو عبیرس ہے نہ قلاؤن۔ جس نوجوان سلطان نے تم مسلمانوں کی قیادت سنبھال رکھی ہے۔ اس کے تو شاید ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے اور وہ تجربے کاروں کو پڑھانے کھم دے رہا ہے۔ اس سے کہو کہ ہم نے اسے معاف کیا۔ وہ مصر واپس چلا جائے۔ ہم اس کا پیچھا نہیں کریں گے۔"

ایک نمائندے نے کہا "بطریق اعظم! آپ بچوں جیسی باتیں نہ کریں۔ مجھ تو عکا برباد ہوتا نظر آرہا ہے۔ عیسائیوں کو فرار کی کوئی راہ نہیں ملے گی کیونکہ ان کے پیچھے سمندر ہے

اور سامنے ہم مسلمان۔"

بطریق اعظم نے ان تینوں کو اجازت دے دی کہ وہ اِدھر اُدھر گھومیں پھریں۔ اس دوران میں وہ ذمے دار لوگوں سے باتیں کرکے جواب تیار کرلے گا۔

یہ تینوں نمائندگان یہی چاہتے بھی تھے کیونکہ انہیں سلطان نے ہدایت کی تھی کہ وہ شہر کا اچھی طرح جائزہ بھی لیں۔

یہ تینوں بطریق اعظم سے رخصت ہو کر بازار پہنچے۔ یہاں بڑی گہما گہمی تھی اور لوگ بہت زیادہ بشاش نظر آرہے تھے۔

یہ تینوں دور ہی سے پہچانے جارہے تھے۔

اسی بازار کے ایک حصے میں بہت سے دکان داروں نے شامیانے تان کر عارضی بازار قائم کر رکھا تھا اور یہاں مختلف چیزیں فروخت ہو رہی تھیں۔

ان تینوں کو دیکھ کر ایک شامیانے کے نیچے بیٹھا ہوا دکان دار بھاگ کر ان کے پاس پہنچا اور پوچھا "تم تینوں یہاں کہاں؟"

یہ تینوں اس عیسائی دکان دار کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ اس نے تو انہیں پہچان لیا تھا لیکن ان تینوں میں سے کسی نے بھی اس دکان دار کو نہیں پہچانا تھا۔

ایک نے پوچھا "تم ہمیں پہچانتے ہو؟"

دکان دار نے جواب دیا "ہاں جناب! خوب اچھی طرح۔ تم لوگ طرابلس میں داخل ہو رہے تھے اور ہم طرابلس چھوڑ رہے تھے۔ اس وقت تمہارا سلطان قلاؤن تھا۔ ہم نے تمہیں سلطان قلاؤن کے پاس دیکھا تھا۔"

ایک نے کہا "اچھا، تو اب تم لوگ یہاں آگئے ہو۔"

دکان دار نے کہا "ہاں جناب، تم لوگوں نے ہمیں طرابلس سے بے دخل کردیا تھا اس لیے ہمیں یہاں پناہ لینی پڑی۔"

یہ دکان دار تینوں کو اپنی شامیانے والی دکان میں لے گیا۔ یہاں بہت سی دکانیں موٹے کپڑے کی دیواریں تان کر بنائی گئی تھیں۔

دکان دار نے کہا "یہاں جتنے دکان دار ہیں، وہ سب مسلمانوں کے کہیں نہ کہیں سے نکالے ہوئے لوگ ہیں۔ ان کی مالی حالت اتنی مضبوط نہیں ہے کہ یہاں کے بازاروں میں کوئی پختہ دکان خرید سکیں۔ بس انہی خیموں جیسی دکانوں سے کام چل رہا ہے۔"

ایک نے پوچھا "گزر بسر ہو جاتی ہے؟"

دکان دار نے جواب دیا "ہاں جناب! ہو تو جاتی ہے مگر مذہبی جنگوں نے ہمیں کہیں کا بھی نہیں رکھا۔ تم لوگ ہمیں کتنے ہی قلعوں اور شہروں سے بے دخل کر چکے ہو اور ہمیں اپنی زندگی گزارنے کے لیے ہر جگہ از سرِ نو جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔"

دکان دار نے اتنا کہنے کے بعد اپنے پڑوسی دکان داروں کو آوازیں دے دے کر بلوالیا۔ جب یہ دکان دار اس چھوٹی سی دکان میں جمع ہوئے اور انہوں نے ان تینوں مسلمانوں کو دیکھا تو ان کا بھی پہلا سوال یہی تھا کہ یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

دکان دار نے ان سب کو تفصیل بتائی اور کہا "ان کے نئے سلطان نے عکا والوں کو حکم دیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے عکا کے دروازے کھول دیں تاکہ یہ مسلمان اندر داخل ہو کے ہم سب کو یہاں سے رخصت کردیں۔"

یہ سنتے ہی دکان دار بھی ان تینوں مسلمان نمائندوں کو دیکھ کر گھبرا گئے۔

ایک نمائندے نے ان سب کی گھبراہٹ کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا "تمہیں مجبور نہیں کیا جائے گا کہ تم یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ مگر تم سب یہ وعدہ ضرور کرو کہ تم اپنے دور دراز کے عیسائی بھائیوں سے رابطے قائم کرو گے اور پھر مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہوں گی۔ ہم سے ہوں گے اور مقامی مسلمانوں کو مختلف حیلے بہانوں سے ہراساں اور دلبرداشتہ کرو گے۔ عیسائیت کی تبلیغیں ہوں گی لیکن یہ سارے کام چوری چھپے، سازشوں سے کیے جائیں گے جس سے مسلمانوں کو نقصانات پہنچیں گے۔ اب تم لوگ ہمیں یہ بتاؤ کہ مظلوم ہم ہیں یا تم؟"

ایک عیسائی دکان دار نے پوچھا "کیا تمہارے سلطان کے حکم سے عکا کے دروازے کھول دیے جائیں گے؟"

مسلمان نمائندے نے جواب دیا "دور اندیشی کا تقاضا تو یہی ہے کہ تم لوگ خون خرابے سے بچو اور عکا کے دروازے کھول دو۔"

ایک دکان دار نے پرجوش لہجے میں کہا "نہیں جناب! دروازے نہیں کھلیں گے اور اس بار بہت سخت مقابلہ ہوگا۔ ہم اتنے طاقت ور ضرور ہیں کہ مصر سے آئی ہوئی تھکی ہاری فوج کو بھاگنے پر مجبور کردیں گے۔"

لیکن طرابلس کے دکان دار نے نرم لب و لہجے میں کہا۔ "میں جنگ کی تائید نہیں کروں گا کیونکہ کوئی بھی جیتے، بربادیاں تو ہم بے وسیلہ اور بے سہارا لوگوں کی ہوتی ہیں۔"

ایک عیسائی دکان دار نے نہایت خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "جناب! ہمیں تو مفاہمت کی بات کرنی چاہیے۔ جنگ سے عیسائیوں اور مسلمانوں کا نقصان یکساں ہوتا ہے اس لیے ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کی پرورش و پرداخت صلح جویانہ انداز میں کرنی چاہیے ورنہ مجھے تو ان تمام مقاماتِ مقدسہ میں کہیں ترقی اور خوش حالی کے آثار نہیں ملتے۔"

ایک نمائندے نے کہا "ہم تو جنگ سے بچنا چاہتے ہیں لیکن حالات اور فریق مخالف کی اندھی ضد ہمیں سکون سے نہیں رہنے دے گی۔ سوچو کہ ہمارے سلطان نے دروازے کھول دینے کی بات کی ہے۔ اب عیسائیوں کو جواب میں شہر کے دروازے کھول دینا چاہیے اور ایک جگہ بیٹھ کر دوستانہ انداز میں معاملات طے کرلینا چاہیے مگر ہمیں معلوم ہے کہ بطریق اعظم اور اس جیسے دوسرے لوگ جنگ کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ پاپائے اعظم تو پہلے ہی صلیبیوں کو جنگ کے لیے بھیج چکا ہے۔"

ان تینوں کو دیکھنے کے لیے اِدھر اُدھر سے بہت سے عیسائی شامیانے کے نیچے دکان میں پہنچ گئے۔ ان جمع ہونے والوں نے مسلمانوں کے خلاف نعرے لگانا شروع کردیے اور بالکل یہ محسوس ہونے لگا کہ ان تینوں کی بے لگام عیسائی ہجوم پٹائی کردے گا۔

دو عیسائیوں نے ان تینوں نمائندوں کو اپنی پناہ میں لے لیا اور ہجوم کو حکم دیا کہ وہ واپس جائیں کیونکہ اس طرح اس کی دکان داری پر اثر پڑے گا۔

ان تینوں کو چوتھی دکان میں پہنچادیا گیا اور پھر وہاں سے انہیں بحفاظت ایک پختہ بڑے مکان میں لے جایا گیا۔

اس مکان کے سامنے لوہے کا مضبوط جنگلا تھا جس پر غالباً فرانسیسی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ مکان سے زیادہ ایک کوٹھی تھا۔ بظاہر سیدھا سادہ اور پرانی طرز تعمیر کا نمونہ مگر اندر سے یہ بہت شاندار تھا۔

جو دو عیسائی انہیں یہاں لائے تھے، انہوں نے بتایا کہ لو سگنان نامی ریاست کا رئیس زادہ یہاں رہتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ چند نائٹ بھی لایا ہے اور کئی سو پرجوش عیسائی بھی خداوند مسیح کے نام پر گردنیں کٹانے کے لیے یہاں چلے آئے ہیں۔ ان تینوں کو اپنی اس ساری معلومات سے ہنسی آرہی تھی کہ یہ لوگ باتیں تو امن و صلح کی کرتے ہیں ورنہ ان کے رویے، ان کے معاملات میں کہیں بھی صلح پسندی نہیں پائی جاتی۔

کچھ دیر بعد ایک چالیس پینتالیس سالہ شخص دو آدمیوں کے ساتھ ان سب کے پاس آکے کچھ کہنے لگا۔ اس کی زبان ان تینوں کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی تو طرابلس کے دکان دار نے کہا "تم لوگ بالکل پریشان نہ ہو۔ لو سگنان کا یہ رئیس زادہ تمہیں اپنی کوٹھی میں دیکھ کر حیران ہے کہ یہ تینوں مسلمان اس کے پاس کیا لینے آئے ہیں۔"

ایک نمائندے نے کہا "تم اس سے کہو کہ بطریق اعظم ہماری بات مان لے۔ شہر کے دروازے کھول دے تاکہ عزت دار شہری سکون سے رہ سکیں۔"

جب اس مصری نمائندے کی بات لو سگنان کے اس رئیس زادے تک پہنچائی گئی تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور وہ کچھ اول فول بکنے لگا۔

طرابلس کے دکان دار نے کہا "یہ بہت ناراض ہے کہ ہم ان تینوں کو اس کے پاس کیوں لائے۔"

اتنے میں اندر سے کچھ اور لوگ بھی نمودار ہوئے۔ ان میں دو تو ہتھیار بند صلیبی معلوم ہوتے تھے لیکن ایک نوجوان عیسائی لڑکی تھی۔ اس نے بھی ان تینوں کو بہت غور سے دیکھا اور طرابلسی دکان دار سے کوئی سوال کیا۔

طرابلسی دکان دار نے جواب دے کر تینوں سے کہا "یہ لڑکی رئیس زادے کی منگیتر ہے۔ پوچھ رہی ہے کہ یہ مسلمان یہاں کیوں آئے ہیں؟"

تینوں مسلمان اس کشیدہ ماحول سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے طرابلسی دکان دار سے کہا کہ انہیں بطریق اعظم کے پاس پہنچادیا جائے۔

"لڑکی نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے طرابلسی دکان دار سے کچھ پوچھا۔

تینوں مسلمان اس اجنبی ماحول سے تنگ آگئے کہ یہاں کوئی ان سے براہِ راست بات کرنے والا نہیں تھا۔

اچانک طرابلسی دکان دار نے تینوں کو خوش خبری سنائی "مبارک ہو، اب تم تینوں یہاں رہ سکتے ہو۔"

ایک نمائندے نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

طرابلسی دکان دار نے بتایا "جب ہم ان لوگوں کو یہ بتایا کہ تم تینوں کے عیسائی دشمن ہو رہے ہیں اور تمہیں یہاں پناہ دینے کے لیے پہنچایا گیا ہے تو اس لڑکی کے دل میں تمہارے لیے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ کہتی ہے کہ جب تک بطریق اعظم سے ان کی بات ہو رہی ہے۔ یہ رہیں کیونکہ اگر انہیں نقصان پہنچ گیا تو ہماری بدنامی ہوگی۔"

ان تینوں نے یہاں رکنے سے انکار کیا اور اس انکار کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ان کی زبان سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔

طرابلسی دکان دار نے کہا "اس کی تو تمہیں فکر ہی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس کوٹھی کے خدمت گار مقامی ہیں اور انہیں عربی زبان آتی ہے۔"

لیکن یہ تینوں یہاں رکنے کے لیے تیار نہیں تھے کیونکہ انہیں ملک الاشرف کے بقول عکا کا جائزہ بھی لینا تھا۔

لو گنان کے رئیس زادے نے ان تینوں کے معاملات اچھی طرح سمجھنے کے بعد انہیں اپنی کوٹھی ہی میں روک لیا۔ وہ ان تینوں سے مسلمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

ان تینوں نے مجبوراً یہاں رہنا گوارا کرلیا اور رئیس زادے سے کہا "تینوں کی یہاں موجودگی کے بارے میں بطریق اعظم کو آگاہ کردیا جائے۔"

طرابلسی دکان دار دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے چلا گیا اور ان تینوں کو لو گنان کے رئیس زادے نے اپنی کوٹھی کے اس حصے میں ٹھہرایا جو بالکل سڑک کے سامنے تھا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے سڑک پر چلنے پھرنے والوں کو دیکھ سکتے تھے۔

رئیس زادہ..... ان تینوں کو چھوڑ کر اندر چلا گیا۔

یہ تینوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ انہیں عکا کے ماحول میں چلنا پھرنا آزادی سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرنا محال نظر آرہا تھا کیونکہ یہاں کے عیسائی انہیں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ تینوں بھی سوچ رہے تھے کہ آخر یہاں مسلمان بھی تو رہتے ہوں گے۔ ان کے ساتھ یہاں کے عیسائی کیا سلوک کرتے ہوں گے۔

کچھ ہی دیر بعد ایک عیسائی اندر داخل ہوا۔ اس کے گلے میں چاندی کی صلیب پڑی ہوئی تھی۔

اس نے آتے ہی عربی میں باتیں شروع کردیں۔ اس نے بتایا کہ وہ غزہ کا رہنے والا ہے مگر جنگوں سے تنگ آکر عکا چلا آیا اور لو گنان کے رئیس زادے کے خاندان میں ملازمت کرلی۔

ایک نے پوچھا "جب تم غزہ میں رہتے تھے تو مصر بھی گئے ہوگے۔"

ملازم نے جواب دیا "نہیں جناب! میں مصر کبھی نہیں گیا۔ جب ہماری (عیسائیوں کی) بحریہ دمیاط کی طرف جارہی تھی تو میرے دل میں بھی مصر جانے کی خواہش پیدا ہوئی تھی مگر پھر اس خوف سے کہ اگر میں مصر گیا اور عیسائیوں کو شکست ہوگئی تو مجھے تو جنگی قیدی بنالیا جائے گا اور وہاں کی غلاموں کی منڈی میں فروخت کردیا جائے گا۔ بس اسی خوف سے میں دمیاط نہیں گیا۔ ابھی چند سال ہوئے کہ میں بیت المقدس سے یہاں چلا آیا اور رئیس لو گنان کے گھرانے میں ملازمت اختیار کرلی لیکن افسوس اب یہاں بھی جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

تینوں نمائندوں نے کہا "تم کہیں بھی رہو، جنگ کے بادل منڈلاتے ہوئے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

ملازم نے تینوں سے پوچھا "تم کب تک یہاں رہو گے؟"

انہوں نے جواب دیا "جب تک ہمیں اپنے سلطان کے خط کا جواب نہیں مل جائے۔"

ملازم نے بتایا "بطریق اعظم کو آدمی بھیج کر تم تینوں کی یہاں موجودگی سے آگاہ کردیا گیا ہے۔"

یہ ملازم دیر تک موجودہ صورت حال پر باتیں کرتا رہا۔ اسے بھی یہی شکایت تھی کہ جب ہر طرف امن و سکون تھا۔ عیسائیوں نے کوئی چھیڑ چھاڑ بھی نہیں کی تھی پھر مسلمانوں نے عکا پر چڑھائی کیوں کردی۔

یہ تینوں نمائندے ان بنیادی سوالوں کے جوابات سے بچنا چاہتے تھے۔ ایک نے جواب دیا "بطریق اعظم نے بھی کچھ ایسی ہی باتیں کی تھیں۔ ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کے سوال کا جواب سلطان ہی دے سکتا ہے۔"

انہی باتوں کے درمیان لو گنان کا رئیس زادہ بھی کمرے میں داخل ہوا تو ملازم اٹھ کر جانے لگا مگر رئیس زادے نے اس کو روک لیا اور کہا کہ ان تینوں کو عکا گھمانا پھرانا چاہتا ہے تاکہ یہ تینوں عیسائیوں کے مذہبی جوش و خروش کو دیکھ کر اپنے سلطان کو آگاہ کردیں کہ وہ اس جنگ سے بچے کیونکہ اس بار مسلمانوں کے جیتنے کے آثار بالکل نہیں ہیں اور عیسائیوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور عیسائی یہ سوچ کر جنگ لڑیں گے کہ انہیں اس معرکے کے بعد مسلمانوں کو اس لائق نہیں رکھنا ہے کہ وہ بار بار عیسائیوں کو چھیڑتے اور تنگ کرتے رہیں۔

تینوں کو غزہ کے ملازم نے جب یہ بتایا کہ لو گنان کا رئیس زادہ تینوں کو عکا میں گھمائے پھرائے گا تو گویا ان تینوں کی مراد بر آئی۔

شام سے کچھ پہلے رئیس زادے نے ایک گھوڑا ملازم کو دیا اور تینوں گھوڑے ان تینوں کے لیے فراہم کیے گئے اور یہ سب عکا کے کئی بازاروں سے گزر کے ایک بہت بڑے باغ میں پہنچے جہاں پورے باغ میں عیسائی ٹھہرے ہوئے تھے۔ گویا ہزاروں عیسائیوں نے درختوں کے سائے میں پناہ لے رکھی تھی۔ باغ کے باہر میدان میں خیموں کا جنگل تھا۔ یہاں ہر طرف انسان ہی انسان نظر آرہے تھے۔

ان تینوں نے پوچھا "یہ باغ کے باہر اور باغ کے اندر کون لوگ ہیں؟ جنہیں درختوں کے نیچے رہائش اختیار کرنا پڑی ہے۔"



ملازم نے جواب دیا "یہ پاپائے اعظم نجولس کے بھیجے ہوئے آدمی ہیں۔ ان میں سے جو باغ کے اندر ہیں وہ تو جرمنی کے بدنام زمانہ بدمعاش ہیں جو اس صلیبی جنگ میں حصہ لے کر اپنے گناہ دھونا چاہتے ہیں اور جو باہر ہیں، ان کا تعلق قبرص سے ہے۔ قبرص کے یہ جنگجو ان نائٹس کی اولاد ہیں جو سابقہ صلیبی جنگوں میں متواتر حصے لیتے چلے آرہے ہیں۔ اب ان کی اولادیں اس لائق ہوگئی ہیں کہ اس خاص مذہبی جنگ میں حصہ لیں۔"

لو گنان کا رئیس زادہ ان تینوں کو باغ میں گھماتا پھراتا رہا اور اپنے ملازم کے ذریعے ان تینوں کو بتایا۔ "دیکھو اور غور کرو کہ عیسائیوں میں کتنا مذہبی جوش پھیلا ہوا ہے اور یہ سب میدان جنگ میں اپنی جانیں دینے کے لیے آئے ہیں۔ کیا مسلمانوں کا نیا سلطان انہیں شکست دے سکتا ہے؟"

تینوں نے مختصراً جواب دیا "نہیں، عیسائی کتنی ہی فوجیں لے آئیں مگر وہ مسلمانوں پر اس لیے حاوی نہیں آسکتے کہ ان کے یہاں غازی اور شہید کا عقیدہ نہیں ملتا اس لیے میدان جنگ میں ان کے پاؤں جلد اکھڑ جاتے ہیں۔"

لو گنان زادے نے ان تینوں کے جواب سے آگاہ ہونے کے بعد کہا "میں پاپائے اعظم کے ذریعے عیسائیوں میں یہ عقیدہ عام کرنے کی کوشش کروں گا۔"

اسی دوران میں ایک شخص کہیں سے ہانپتا کانپتا لو گنان کے رئیس زادے کے پاس آیا اور تینوں نمائندگان کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے لگا۔

تینوں نے غزہ کے ملازم سے پوچھا "یہ شخص کون ہے؟ اور کیا کہہ رہا ہے؟"

ملازم نے جواب دینے سے گریز کیا اور ان کے پاس سے دور چلا گیا۔

اب یہ تینوں ایک بار پھر گونگے بہرے لوگوں میں پھنس گئے تھے۔

لو گنان کے رئیس زادے نے اس شخص سے باتیں کرنے کے بعد اپنے ملازم کو ادھر ادھر نظروں ہی نظروں میں تلاش کیا اور پھر تینوں کو دھکا دیتا ہوا ایک درخت کے پیچھے جھاڑیوں میں لے گیا اور ہاتھ کے اشارے سے گویا کہا "یہاں چھپ کے بیٹھ جاؤ۔"

یہ تینوں درختوں کی آڑ میں خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا "یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ ہم سلطانی نمائندے ہونے کے باوجود آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتے۔"

دوسرے نے کہا "سلطانی نمائندہ ہونا الگ بات ہے۔ ہمیں یہ عیسائی یہاں آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

تیسرے نے ہنستے ہوئے کہا "بندا! جب ہم فاتح کی حیثیت سے اس شہر میں داخل ہوں گے تو یہاں کے عیسائیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کردیں گے۔"

یہ تینوں اسی طرح سرگوشی میں باتیں کرتے رہے اور لو گنان کے رئیس زادے کا ملازم ان تینوں کو تلاش کرتا رہا۔ لو گنان کا رئیس زادہ باغ کے باہر جاچکا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب دونوں میں سے کوئی ان تینوں کے پاس نہیں پہنچا تو انہیں فکر اور پریشانی تنگ کرنے لگی۔ ان کا دونوں کی عدم موجودگی میں باہر نکلنا انتہائی خطرے کی بات تھی۔

ان تینوں کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ ایک نے غصے سے بلند آواز میں کہا "ہم یہاں چوروں کی طرح مزید نہیں بیٹھ سکتے۔ اب تو مجھے یہ شبہ ستا رہا ہے کہ ہمارے ساتھ دونوں نے دھوکا کیا ہے۔ یہ ہمیں ہجوم میں پھنسا کے اس لیے غائب ہوگئے کہ ہمیں عام لوگ بلوے کی شکل میں گھیر کر ہلاک کردیں اور ہماری ہلاکت کی کسی خاص شخص پر ذمے داری بھی عائد نہ ہو۔"

پھر اچانک لوگوں کا شور و غل بلند ہوا۔ لوگ مختلف زبانوں میں شور کررہے تھے۔ ان میں عربی بولنے والے عیسائی بھی شامل تھے چنانچہ کسی عربی زبان داں کی آواز سنائی دی "بطریق اعظم، ان تینوں کو طلب فرمارہے ہیں، انہیں یہیں کہیں ہونا چاہیے۔"

کسی دوسرے عربی داں عیسائی کی آواز سنائی دی "ہمیں لو گنان کے رئیس زادے نے تو یہی بتایا ہے کہ وہ تینوں یہاں کسی جھاڑی میں ہمارے خوف سے چھپ گئے ہیں۔"

ایک نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا "یہ لو گنان کا رئیس زادہ کیسا آدمی ہے جو ہمیں خوف زدہ کرکے یہاں چھپ جانے کی ہدایات دے کر غائب ہوگیا اور اب کہتا پھر رہا

## قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ براہ کرم ان صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ہے کہ ہم عیسائیوں سے خوف زدہ ہو کر یہاں چھپ گئے ہیں۔"

تینوں سوچے سمجھے بغیر جھاڑیوں سے نکل کر باہر آگئے۔ انہیں اپنے خلاف بزدلی کا طعنہ بہت ناگوار گزرا تھا اس لیے اب انہیں اپنی جانوں کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔

یہ تینوں اپنے لباس اور اپنی وضع قطع سے دور ہی سے پہچانے جا رہے تھے۔

کسی طرف سے آواز بلند ہوئی "دو رہے۔"

اور اس آواز کے ساتھ ہی تلاش کرنے والوں کی توجہ ان تینوں کی طرف ہو گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ تینوں بہت سے عیسائیوں میں گھر گئے۔

کسی عیسائی نے غصے میں پوچھا "یہ اگر سلطانی نمائندے ہیں تو ہمیں کیا۔ انہیں اس طرح ہم میں آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت کس نے دی؟"

اس بھیڑ بھاڑ کو چیرتے ہوئے دو شخص ان سب کے درمیان سے نمودار ہوئے۔ آگے آگے لو سگنان کا رئیس زادہ تھا اور اس کے پیچھے اس کا خدمت گار۔

ان دونوں نے تینوں کو اپنے درمیان میں لے لیا اور جو لوگ ابھی تک بڑے پرجوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے، وہ سب لو سگنان کے رئیس زادے کو دیکھ کر سرد پڑ گئے۔

لو سگنان کے رئیس زادے نے ان سب کے سامنے بولنا شروع کر دیا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا، تینوں کی سمجھ سے بعید از فہم تھا۔

اس کے خدمت گار نے تینوں کو بتایا "ہمارا آقا ان سب کو بتا رہا ہے کہ تم تینوں یہاں اس کے ساتھ آئے ہو اور رہو اس طرح تم تینوں کو، ان سے بچانے کی فکر میں ہے۔ اس نے ان سب کو بتا دیا ہے کہ اس کے ارادے نیک تھے اور وہ تم تینوں کو عیسائیوں کے ہجوم میں پھنسا کے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ ہمارا آقا عیسائیوں کے عظیم الشان لشکر میں گھوما پھرا ہے یہ نفسیاتی پیغام دینا چاہتا ہے کہ اس بار عیسائی ناکام نہیں رہیں گے اور تمہارا ناتجربہ کار نوعمر سلطان عبرت ناک شکست سے دوچار ہو جائے گا۔"

لو سگنان کے رئیس زادے کی مختصر تقریر ختم ہوئی تو کئی لوگ دوڑ کر ان تینوں کے پاس آئے اور کہا "ہم ان تینوں کو قتل کر دیں گے۔ یہ نامہ بروں کی شکل میں بطریق اعظم کے پاس صرف سلطانی پیغام لے کر نہیں آئے ہیں بلکہ یہ اس طرح ہماری فوجی قوت کا اندازہ بھی لگانا چاہتے ہیں۔"

تینوں ہتھیار نہ ہونے کی وجہ سے بے بسی محسوس کر رہے تھے۔ وہ لو سگنان کے رئیس زادے سے یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اگر وہ ان تینوں کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا تو اسے انہیں یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔

اتنے میں کچھ لوگ اچانک ان تینوں کے پاس آئے اور ان پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ یہ تینوں مارنے والوں کے حملوں سے اس طرح دفاع کر رہے تھے کہ گویا ہاتھوں پر حملہ آوروں کے وار روکنے سے یہ تینوں بچ جائیں گے۔

اچانک کچھ دوسرے عیسائیوں نے آگے بڑھ کے حملہ آور عیسائی بھائیوں کے درمیان میں حائل ہو کے تینوں کو بچا لیا اور ان میں سے ایک نے کسی اور ہی زبان میں کچھ کہا تو لو سگنان کے رئیس زادے نے غصے میں کہا "اس کا مفہوم خدمت گار نے سمجھایا "ہمارا آقا کہہ رہا ہے کہ یہ سب جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس سے مسلمانوں میں جذبہ انتقام پیدا ہو جائے گا اور اس کے بعد مسلمان ہم سے صلح کی بات نہیں کریں گے۔"

اب وہ سب ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ خالد کے اب اپنے کیے پر شرمندہ تھے۔

خدمت گار نے کہا "ہمیں تو حیرت ہے کہ تم تینوں اس شیطانی ہجوم سے زندہ سلامت نکلے کیونکر؟"

تینوں یکے بعد دیگرے کہنے لگے "ان لوگوں نے سلطانی قاصد سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ پتا نہیں سلطان اس کا کیا اثر لے گا۔"

خدمت گار ان تینوں کو باغ سے نکل گیا اور کہا "تم تینوں اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر حویلی پہنچو۔ اب تمہیں راستے میں کسی خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

ان تینوں نے اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر لو سگنان کے رئیس زادے کی حویلی کا رخ کیا اور خدمت گار ہجوم میں گھرے ہوئے اپنے آقا کے پاس پہنچا اور اسے یہ خوش خبری سنائی کہ تینوں اس ہجوم سے نکل کر آپ کی حویلی چلے گئے۔

لو سگنان کے رئیس زادے نے ہجوم سے نکلتے ہوئے غصے میں کہا "سانپ تو نکل گیا اب تم سب اس کے نشانات پیٹتے رہو۔"

دونوں باغ سے نکل کر اپنی حویلی پہنچے تو ان تینوں کو حویلی کے احاطے میں ایک پتھر کے چبوترے پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ابھی تک ان کے لیے حویلی کے دروازے بند تھے۔

خدمت گار نے اندر سے دروازے کھول دیے اور تینوں کو ان کے کمرے تک پہنچا دیا۔



خدمت گار پھر غائب ہو گیا اور ان تینوں نے آپس ہی میں باتیں شروع کر دیں۔

ایک نے کہا "ہم تینوں کن چکروں میں پڑ گئے۔"

دوسرے نے کہا "اگر ہمیں عکا کا جائزہ لینے کو نہ کہا گیا ہوتا تو ہم اس مصیبت میں نہ پھنستے۔"

تیسرے نے دونوں کی مذمت کی اور کہا "یہ تم دونوں کیسی کم ہمتی کی بات کرتے ہو۔ ہمیں جو کام سونپا گیا ہے، اسے سو خطرات کا مقابلہ کر کے انجام دینا چاہیے۔"

انہی باتوں کے دوران میں خدمت گار واپس آ گیا اور اس نے بتایا "اب تم تینوں کو بطریق اعظم کے پاس چلے جانا چاہیے کیونکہ یہاں کی عیسائی آبادی تم تینوں کے آزادانہ گھومنے پھرنے کو پسند نہیں کرتی۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح تم لوگ ہماری کمزوریوں کا جائزہ لیتے پھر رہے ہو۔"

تینوں نے خدمت گار سے پوچھا "اگر ہم بازاروں میں گھوم پھر کے کچھ اور بھی لیں گے تو اس طرح ہم کس قسم کا جائزہ لے کر مسلمانوں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔"

خدمت گار نے کہا "بات وہی ہے، جو میں نے بتائی۔ یہ بات کہ تم بازاروں میں گھوم پھر کے کیا دیکھو گے اور تم اپنے سلطان کو کیا بتاؤ گے، جس سے وہ فائدہ اٹھائے۔ ان باتوں سے یہاں کے عیسائیوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ عیسائی سلطانی فوج کے کسی آدمی یا کئی آدمیوں کو عکا میں آزادانہ گھومتے پھرتے دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتے۔"

تینوں میں سے جو زیادہ جری اور حوصلہ مند تھا۔ اس نے پوچھا "تم لوگ ہم تینوں کو بطریق اعظم کے پاس پہنچاؤ گے یا ہمیں خود ہی وہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

خدمت گار نے جواب دیا "اپنے آقا نے تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کی ذمے داری قبول کی تھی تو وہ تمہارے بطریق اعظم کے پاس پہنچنے تک ذمے داری پوری کرتے رہیں گے۔"

کافی دیر بعد لو سگنان کا رئیس زادہ بھی آ گیا اور اس نے پوچھا "کیا تم تینوں اسی وقت بطریق اعظم کے پاس جانا پسند کرو گے؟"

ایک نے جواب دیا "ہاں، اب ہمارا یہاں رکنا فضول ہے کیونکہ ہماری وجہ سے آپ لوگوں کو بھی بدنامیاں سہنا پڑ رہی ہیں۔"

لو سگنان کے رئیس زادے نے خدمت گار کو کچھ سمجھایا اور اس نے تینوں کو مخاطب کیا "ہمارا آقا کہتا ہے کہ اگر تم لوگ قاصد بن کے یہاں کے جائزہ لینے آئے ہو تو تمہارا یہ کام بہت ہی برا ہے۔"

ان تینوں نے کہا "آپ لوگ عقل و خرد سے ماورا باتیں کر رہے ہیں اس کا مطلب کیا ہے؟"

رئیس زادے نے خدمت گار کے ذریعے جواب دیا "یہی تو ہم بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں مگر تم لوگ۔"

تینوں کو اسی وقت بطریق اعظم کے پاس روانہ کر دیا گیا۔

راستے میں یہ تینوں نہایت نڈر ہو کر سفر کرتے رہے۔ عیسائی تینوں کو اسی طرح دیکھ رہے تھے گویا بھیڑیے بگلوں کو دیکھ رہے ہوں۔

تینوں بطریق اعظم کے پاس پہنچے۔ وہ اس وقت سویا ہوا تھا۔ اسے بیدار کر دیا گیا۔

یہاں پہلے سے وینس اور جینوا کے تاجر بطریق اعظم کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

ان تینوں میں سے ایک نے جینوا کے تاجر کو پہچان لیا۔ اس تاجر کے فلاؤن سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ آج یہاں اسے دیکھا تو اپنے ساتھیوں کو اس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا "ان کا یہاں کیا کام؟ اور اگر عکا میں یہ لوگ اس خطرناک ماحول میں موجود ہیں تو فکر کی کوئی بات نہیں اس لیے کہ یہ لوگ لڑنے سے رہے۔"

اتنے میں بطریق اعظم بھی پہنچ گیا اور تینوں سے انتہائی برہمی کی حالت میں پوچھا "تم تینوں کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

ایک نے اپنی پوری روداد بیان کر دی۔

بطریق اعظم نے بدستور غصے میں کہا "تمہیں ہماری اجازت کے بغیر کہیں بھی نہیں جانا چاہیے۔ تم جانتے ہو کہ اگر تم میں سے کسی ایک کو کوئی قتل کر دیتا یا تم تینوں زخمی ہو جاتے تو مجھے سلطان کے روبرو جواب دہ ہونا پڑتا۔"

ایک نے پوچھا "کیا آپ سلطان کے روبرو پہنچنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

بطریق اعظم اور چڑ گیا "تم لوگ مجھ سے مذاق نہیں کر سکتے۔"

دوسرے نے کہا "یہ ہماری مجال ہے کہ ہم آپ سے مذاق کریں۔"

تیسرے نے کہا "مذاق تو کوئی بھی کر سکتا ہے لیکن ہم تینوں آپ سے مذاق نہیں کریں گے۔"

بطریق اعظم نے پوچھا "تو تم تینوں باغ میں کیوں گئے تھے؟"

ایک نے جواب دیا "ہم گئے نہیں تھے بلکہ لے جائے

گئے تھے۔"

بطریق اعظم نے پوچھا "تم تینوں نے وہاں کیا کیا دیکھا؟"

ایک نے جواب دیا "وہاں دیکھنے کی چیز ہی کون سی ہے؟ بس باغات میں عیسائیوں کی فوج دیکھ کر دنگ رہ گئے اور اور اب ہم سلطان کو بتائیں گے کہ وہ محاصرہ اٹھا کر آپ لوگوں سے صلح کی بات کریں۔"

بطریق اعظم نے کہا "ہاں، تم لوگوں کو اپنے سلطان کو یہی مشورہ دینا چاہیے۔"

وہاں موجود جینوا کے تاجر نے بھی بطریق اعظم کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے کہا "ہاں، اس بار تم مسلمانوں کی جیت کا امکان کم ہے اس لیے تم لوگ محاصرہ اٹھا کر واپس چلے جاؤ۔"

بطریق اعظم نے کہا "ہم نے بھی ان تینوں کو یہی سمجھایا ہے۔"

تینوں میں سے ایک نے عکا کے عیسائیوں کی شکایت کی "یہ لوگ فراخ دل نہیں ہیں کیونکہ ہم تینوں عکا کے بازار میں گھوم پھر رہے تھے کہ عیسائیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہ ہمیں قتل کر دینا چاہتے تھے لیکن خدا بھلا کرے لو سکنان کے رئیس زادے کا کہ اس نے ہمیں پناہ دے دی اور ہمیں بطریق اعظم کے پاس پہنچا دیا۔"

جینوا کے تاجر نے کہا "تم تینوں کو بھی احتیاط کرنی چاہیے۔ تم تینوں یہاں کے بازاروں میں گئے ہی کیوں تھے؟"

حوصلہ مند نمائندے نے جواب دیا "تم تاجر تو ایسی باتیں مت کرو۔ سسلی، اٹلی، وینس اور جینوا کے کتنے ہی تاجر قاہرہ، دمیاط اور اسکندریہ کے چکر لگاتے رہتے ہیں اور وہاں کے مسلمان کسی کو بھی زبانی بھی نہیں چھیڑتے اور کسی کو مارا پیٹا، جسمانی یا مالی نقصان پہنچایا۔"

بطریق اعظم کو ان فضول باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ ان تینوں کو معلومات کے مطابق ایک باغ میں عیسائیوں نے گھیر لیا تھا اور وہاں انہیں اتنا خوف زدہ کیا گیا کہ یہ اپنے سلطان کو اس خوف کی وجہ سے یہ مشورہ دیں گے کہ سلطان اس بار جنگ نہ کرے ورنہ اسے شکست ہو جائے گی۔

بطریق اعظم نے تینوں نے دریافت کیا "تم اپنے سلطان کے لیے اس وقت جو اب چاہتے ہو؟ یا عکا کی مزید سیرو تفریح کرنا چاہتے ہو؟"

ایک نمائندے نے سرد آہ بھری اور کہا "کیا آپ ہمیں مقامی عیسائیوں کے ہاتھوں قتل کروانا چاہتے ہیں؟"

بطریق اعظم نے کہا "نہیں، میرے آدمی تم تینوں کے ساتھ ہوں گے اس لیے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

جینوا کا تاجر بطریق اعظم کی اس پیش کش سے خوش نہیں تھا کیونکہ اس کو ڈر تھا کہ کہیں یہ تینوں سلطانی نمائندے عیسائیوں کے ہاتھوں نہ مارے جائے لیکن ان میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ بطریق اعظم کی مرضی کے خلاف کوئی بات کرتے۔

بطریق اعظم نے دو پادری ان تینوں کے حوالے کیے اور کہا "دو دن تک ان تینوں کو عکا کی اچھی طرح سیرو تفریح کروا دی جائے۔"

اور تینوں سے کہا "ان دو نوں پادریوں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے کوئی عیسائی دم بھی نہیں مار سکتا۔"

چند گھنٹوں بعد یہ تینوں دو نوں پادریوں کے ساتھ عکا کی سیرو تفریح کے لیے روانہ ہو گئے لیکن یہ تینوں اب اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ آخر بطریق اعظم کو یہ کیا سوجھی اور وہ اتنا ان تینوں پر مہربان کیوں ہو گیا جو دو پادری ان تینوں کے سپرد کر کے عکا کی سیر کروا رہا ہے۔

ان تینوں کے چلے جانے کے بعد جینوا کے تاجر نے بطریق اعظم سے ڈرتے ڈرتے پوچھا "یہ آپ نے کیا خطرہ مول لے لیا۔ ان تینوں مسلمانوں کے مقامی عیسائی بہت دشمن ہیں اور اب آپ نے ان تینوں کو سیر سپاٹے کے لیے عیسائیوں میں بھیج دیا۔"

بطریق اعظم نے پوچھا "کیا لوگ واقعی تاجر ہو؟"

جینوا کے تاجر نے پوچھا "آپ کو ہمارے تاجر ہونے میں شبہ کیوں ہوا؟"

بطریق اعظم نے کہا "تم نے سنا نہیں کہ مسلمان عیسائیوں سے بہت زیادہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا جس کا میں نے یہ مطلب لیا کہ یہ تینوں ہماری اجتماعی جنگی تیاریوں سے خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ اب اگر انہیں اور زیادہ خوف زدہ کر دیا جائے تو اس کا ہمیں یہ فائدہ پہنچے گا کہ سلطان محاصرہ اٹھا کے واپس چلا جائے گا اور عکا تباہی و بربادی سے بچ جائے گا۔"

جینوا کا تاجر دوسروں کے برعکس، مسلمانوں کو زیادہ بہتر جانتا تھا۔ کہنے لگا "یہ آپ مسلمانوں کے بارے میں کیسی بدگمانی رکھتے ہیں۔ ماضی میں ایسی مثالیں موجود ہیں، جب مسلمان کم تعداد میں اور عیسائی بہت زیادہ ہوتے تھے، تب بھی مسلمان عیسائیوں پر حاوی آ جاتے ہیں۔"

بطریق اعظم نے کہا "کوئی ضروری نہیں کہ ماضی میں تم




فضائی آلودگی ہو یا موسم کی تبدیلی

ہمدرد کی مفید دوائیں - نزلہ، زکام اور کھانسی سے بچائیں

سُعالین

مُفید جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ سُعالین گلے کی خراش اور کھانسی کا آسان اور مؤثر علاج۔ آپ گھر میں ہوں یا گھر سے باہر، سرد و خشک موسم یا گرد و غبار کے سبب گلے میں خراش محسوس ہو تو فوراً سُعالین لیجیے۔ سُعالین کا باقاعدہ استعمال گلے کی خراش اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔

جوشینا

تیار ہو شنبہ

نزلہ، زکام، فلو اور اُن کی وجہ سے ہونے والے بخار کا آزمودہ علاج۔ جوشینا کا روزانہ استعمال موسم کی تبدیلی اور فضائی آلودگی کے مُضر اثرات بھی دُور کرتا ہے۔ جوشینا بند ناک کو فوراً کھول دیتی ہے۔

صُدوری

مؤثر جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ خوش ذائقہ شربت۔ خشک اور بلغمی کھانسی کا بہترین علاج۔ صُدوری سانس کی نالیوں سے بلغم خارج کر کے سینے کی جکڑن سے نجات دلاتی ہے اور پھیپھڑوں کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔

بچوں، بڑوں سب کے لیے یکساں مُفید۔

سُعالین، جوشینا، صُدوری - ہر گھر کے لیے بے حد ضروری

ہمدرد

Adarts-SJS-17/98

لوگوں نے جو دیکھا یا سنا' وہ تاریخ کا مستقل حصہ بن گیا ہو۔ کیا تم اس دور میں یہ نہیں دیکھ رہے ہو کہ عیسائیوں میں ماضی کے مقابلے میں زیادہ جوش و خروش پایا جاتا ہے جب کہ مسلمانوں کے بڑے لوگ رخصت ہو چکے ہیں اور ان کی قیادت کم تر درجے کے لوگوں میں منتقل ہو گئی ہے اسی لیے اب یہ بالکل ممکن ہے کہ مسلمان اور سلطان ہم سے خوف زدہ ہو جائیں اور ہم مسلمانوں پر غالب آجائیں۔"

جینوا کے تاجر نے بطریق اعظم سے اتفاق نہیں کیا اور کہا "آپ دیکھ لیجیے گا۔ واقعات آپ کے اندازوں کے برعکس پیش آئیں گے۔ ہمیں اگر مسلمانوں کا مقابلہ کرنا ہے تو ان فضول قیاسوں اور اندازوں کے برعکس جدوجہد کرنا ہوگی۔"

○☆○

دونوں پادری تینوں کو پہلے لو گنان کے رئیس زادے کی حویلی میں لے گئے اور تینوں کو حویلی کے خدمت گار کے حوالے کر دیا۔ خود لو گنان کے رئیس زادے سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد دونوں پادری لو گنان کے رئیس زادے کے ساتھ واپس آئے اور پھر یہ چھ افراد کی قافلہ عکا کی سیر و تفریح کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

تینوں سلطانی نمائندے عیسائیوں کے اس خصوصی رویے سے سوچ میں پڑ گئے تھے کہ ان تینوں پر اتنی توجہ کیوں دی جا رہی ہے لیکن انہیں یہ خوشی بھی تھی کہ اب یہ تینوں عیسائیوں اور عکا کی حالت کو اچھی طرح دیکھ لیں گے اور مرضی کے مطابق مشاہدات ہو جائیں گے۔

ان تینوں نے اپنے میزبانوں سے خواہش ظاہر کی کہ باغات میں ٹھہرے ہوئے عیسائیوں سے ان کی ملاقات ضرور کروائی جائے چنانچہ انہیں پہلے اسی باغ میں لے جایا گیا جہاں وہ جھاڑی میں چھپنے پر مجبور ہو گئے تھے اور انہیں یہ مشکل عیسائیوں کے شر سے بچایا جا سکا تھا۔

جن عیسائیوں نے ان تینوں کو پہلے بھی دیکھا تھا۔ اب وہ ان کے دوبارہ آنے سے پریشان ہو رہے تھے کہ اب انہیں یہاں دوبارہ کیوں لایا گیا ہے۔

اب چونکہ ان تینوں کے ساتھ لو گنان کا رئیس زادہ اور دو پادری بھی تھے اس لیے کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ تینوں مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے۔

اس باغ کو اس بار ان تینوں نے بہت قریب سے دیکھا۔ یہاں تو ایک درخت بھی ایسا نہیں تھا' جس کے سائے کے نیچے تین چار عیسائی نہ رہتے ہوں۔

یہاں کا ہر عیسائی تینوں مسلمانوں کو حیرت یا غصے سے دیکھ رہا تھا۔

ان میں ایسے عیسائی بھی تھے جنہیں عربی آتی تھی کیونکہ جب یہ تینوں ایسے عربی داں عیسائیوں کے پاس سے گزرے تو انہوں نے آپس میں عربی میں ان پر تبصرے شروع کر دیے۔

باغ کے باہر نالے تک میں عیسائی مقیم تھے اور یہاں ہر کہیں ہتھیاروں پر دھار چڑھائی جا رہی تھی یا پھر تیر کمان تیار ہو رہے تھے۔ برچھی بھالے اور نیزے بھی بکثرت نظر آئے۔

ان تینوں کو حیرت تھی کہ اس بار غالباً عیسائیوں نے نہ ہارنے کا حتمی ارادہ کر لیا ہے۔

نالے کے باہر میدان میں تلوار بازی کی مشقیں ہو رہی تھیں اور آٹھ آٹھ نو نو سالہ لڑکے جنگی تربیت حاصل کر رہے تھے۔

ایک جگہ انہوں نے کئی آدمیوں کو خون میں لتھڑا ہوا دیکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ دونوں مقامی مسلمان ہیں اور انہیں جاسوسی کے شبہے میں پکڑا گیا ہے۔ خیال ہے کہ ان جیسے دوسرے بہت سے مسلمان بھی عکا میں جاسوسی کی خدمات انجام دے رہے ہوں گے اور سلطان نے اپنے تین نمائندے بھیج کر عکا کے حالات اور معمولات جاننے کی کوشش کی ہے' ان تینوں کے علاوہ بھی یہاں بہت سے جاسوس سلطان کے لیے سرگرم عمل ہوں گے۔

جن دو مسلمانوں کو عیسائیوں نے زخمی کر دیا تھا' ان کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں رات سے اس باغ میں موجود تھے اور انہیں اس حال میں پکڑا گیا تھا کہ یہ ایک خیمے سے ہتھیار چوری کر رہے تھے۔

جب کہ لولہان دوسرے مسلمان نے رو رو کے عیسائیوں کے بیان کی تردید کی اور کہا "ہم غلطی سے ادھر بھٹک رہے تھے کہ ہمیں انہوں نے گرفتار کر لیا اور ہم سے پوچھ گچھ کے بغیر ہی ہماری پٹائی شروع کر دی۔ ہم نے کسی خیمے سے کوئی ہتھیار نہیں چرائے۔"

پھر ان دونوں کو عیسائیوں نے اسی وقت ان سب کے سامنے قتل کر دیا اور یہ ماحول اچانک انتہائی سوگوار ہو گیا۔

ان تینوں کو اپنے مقتول مسلمان بھائیوں کا بے حد افسوس ہوا۔

دونوں پادری اور لو گنان کا رئیس زادہ ان تینوں کو عکا کے قلعے کے نیچے پختہ سڑک پر لے گئے اور یہاں سے قرب و جوار کا مشاہدہ کرواتے ہوئے کہا "اب اگر تم مسلمان یہاں تک کسی طرح آ بھی جاؤ تو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے عکا کا قلعہ موجود ہے۔ اپنے سلطان کو بتا دینا کہ عکا اور اس کے قلعے کی تسخیر کا خیال دل سے نکال دے۔"

ایک نے کہا "تم لوگ یہ ساری باتیں ہم سے کیوں کہہ رہے ہو؟ کیا ہم اپنے سلطان سے اتنے بے تکلف ہیں کہ تمہاری یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اپنے سلطان تک پہنچائیں گے۔"

لو گنان کے رئیس زادے نے ان لوگوں کی باتیں سنیں اور دونوں پادریوں سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

ایک پادری نے اسے بتایا کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ یہ ساری باتیں سلطان کو کیوں بتائیں گے کیونکہ ان کی سلطان سے اتنی بے تکلفی نہیں ہے۔

لو گنان کے رئیس زادے نے پادریوں سے کہا "یہ تینوں ہمیں بہت مکار معلوم ہوتے ہیں کیونکہ یہ یہاں کا مشاہدہ کرنے بھی آئے ہیں کیونکہ مسلمانوں کا نامہ بر اور قاصد ان ملکوں اور حکمرانوں کے پاس جاتے ہیں' وہاں یہ نامہ بری انجام دینے کے علاوہ یہ خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔"

ان تینوں کو ایک باغ اور اس کے باہر خیموں کی بستی میں بھی لے جایا گیا۔

یہاں خیموں میں قبرصی آباد تھے یعنی نائٹوں کی اولادیں۔ ان کے سینوں پر رنگ برنگی صلیبیں چسپاں تھیں۔

پادریوں نے ان خیموں کی سیر کرواتے ہوئے تینوں سے کہا "یہ قبرصی جنگجو اس بار یہ فیصلہ اور عہد کر کے آئے ہیں کہ اپنے بزرگوں پر اپنے کارناموں سے ثابت کر دیں گے کہ یہ ان پر فوقیت رکھتے ہیں کیونکہ ان میں سے ایک بھی نادم یہ ان پر فوقیت رکھتے ہیں کیونکہ ان میں سے ایک بھی نادم مرگ میدان جنگ سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں۔ ان کا نعرہ ہے کہ مارو یا مر جاؤ۔ قتل کر دیا قتل ہو جاؤ' اس لیے امید ہے کہ اس بار جنگ کے نتائج مختلف نکلیں گے۔"

ان تینوں نے پادری کی باتیں سن تو لیں مگر جواب نہیں دیا۔

ایک خیمے میں داخل ہونے کے بعد لو گنان کا رئیس زادہ کہیں چلا گیا اور دونوں پادری خیمے کے ایک شخص سے باتیں کرنے لگے۔

دونوں پادری باتیں تو صاحب خیمہ سے کر رہے تھے مگر بار بار دیکھ رہے تھے تینوں سلطانی نمائندوں کو۔

اچانک ایک پادری نے ان تینوں سے کہا "اس خیمے میں قبرص کے حاکم ابلین سے ملاقات ہو گی۔ ابلین کو عربی بہت اچھی آتی ہے۔"

تقریباً پچیس منٹ کے بعد لو گنان کا رئیس زادہ ایک صحت مند اور توانا شخص کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ یہ شخص بہت مشتعل نظر آ رہا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی تینوں مسلمانوں کو دیکھا تو اس کے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا اور اس نے پوچھا "تم تینوں وہی ہو نا جو باغ کی ایک جھاڑی میں چھپے ہوئے تھے اور پھر تمہیں باعزت طریقے سے یہاں سے نکال لے جایا گیا تھا۔"

تینوں میں سے ایک نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ "ہم آپ کے بقول واقعی یہاں کی ایک جھاڑی میں چھپ گئے تھے اور ہمیں واقعی بہت حفاظت اور نگرانی میں یہاں سے لے جایا گیا تھا مگر اب ہم یہاں دوبارہ اس لیے آ گئے ہیں کہ آپ لوگ ہم سے صلح صفائی کر لیں۔ ہم سلطان کو بھی اس پر آمادہ کریں گے کہ وہ محاصرہ اٹھا لے اور اب ہم سب مل جل کے رہیں کیونکہ جنگ و جدل سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

قبرصی حاکم نے غصے میں کہا "نہیں ہم اس بار صلح نہیں کریں گے۔ تم مسلمان جب تمہارے جی میں آتا ہے ہم پر چڑھ دوڑتے ہو۔ تم نے مجھ سے بہت سے ساحلی قلعے بھی چھین لیے۔ آج ان قلعوں کے بے دخل کیے جانے والے لوگ عکا میں آباد ہیں۔ وہ سب تم سے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ تم تینوں کو بطریق اعظم نے عکا میں گھومنے پھرنے کی اجازت کیوں دی۔ کیا وہ اس طرح بے گھر عیسائیوں کے زخموں پر نمک چھڑکنا چاہتا ہے۔ میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔"

یہاں کی تکلیف دہ اور مسلم آزار فضا دیکھ کر ان تینوں کو عکا کے کیتھیڈرل میں لے جایا گیا۔ یہ مرکزی گرجا اس وقت ہاسپٹلرز سے بھرا ہوا تھا کیونکہ اس گرجے کے قریب ہی ہاسپٹلرز کے خیمے نصب تھے اور ان میں جنگجو ہاسپٹلرز مقیم تھے۔

ایک پادری نے ہاسپٹلرز کے خیموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم تینوں انہیں بھی دیکھ لو۔ ان میں ہاسپٹلرز مقیم ہیں اور ان سب نے یہ فیصلہ اور عہد کر رکھا ہے کہ کچھ بھی ہو' عکا کو مسلمانوں کے حوالے نہیں کیا جائے گا اور اسی جنگ سے قاہرہ کی اسلامی حکومت کا زوال شروع ہوگا۔"

لو گنان کے رئیس زادے نے ان تینوں کو کیتھیڈرل میں لے جانا چاہا مگر دونوں پادریوں نے منع کیا کہ اس وقت اس مرکزی گرجے میں ہاسپٹلرز حلف اٹھا رہے

ہوں گے کہ وہ اس جنگ میں اپنی جانیں دے دیں گے مگر پیچھے نہیں ہٹیں گے۔"

لو سگنان کا رئیس زادہ دیر تک دونوں پادریوں سے بحث کرتا رہا اور آخر کار اس نے دونوں پادریوں کو مجبور کردیا کہ وہ ان تینوں کو اس خاص موقعے پر اس بڑے مرکزی گرجے میں ضرور لے جائیں۔

چنانچہ ان تینوں کو اس بڑے مرکزی گرجے میں لے جایا گیا۔

یہاں ایک پادری بہت سے ہا سپٹلرز کو باری باری بلوا کے کوئی حلف لے رہا تھا۔

سلطانی نمائندے نے پادریوں سے پوچھا "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

ایک پادری نے جواب دیا "یہاں خنجر کی نوک سے خون نکال کر اس سے ہا سپٹلرز لکھ کر یہ عہد کر رہے ہیں کہ وہ اس آخری صلیبی جنگ میں مسلمانوں کو ایسی شکست دیں گے کہ تاریخ میں ان کی یہ شکست عظیم عبرت ناک شکست کہلائے گی۔ اس عبارت کے آخر میں یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ اس مذہبی معرکے میں صلیب کے لیے اپنی جانیں دے دیں گے اور مسلمانوں کی جانیں لے لیں گے۔"

لو سگنان کا رئیس زادہ ان تینوں کو گرجے کے پادری کے پاس لے گیا جہاں ان تینوں نے یہ متعصب منظر دیکھا کہ ایک ہا سپٹلر نے خنجر کی نوک سے انگوٹھے کے نیچے پُر گوشت حصے کو نشتر سے چھیڑ دیا جس سے خون جاری ہو گیا اور پھر اس خون میں قلم کے عہد نامے کی عبارت لکھتا رہا۔ یہ عبارت چار سطروں میں لکھی گئی اور نیچے لکھنے والے نے اپنے دستخط کردیے۔

اس وقت کیتھیڈرل میں کئی سو ہا سپٹلرز موجود تھے اور یہ سب فرانسیسی تھے۔

تینوں نے کئی ہا سپٹلرز کو اسی طرح انگوٹھے کے نیچے پُر گوشت حصے میں نشتر سے چرکا لگاتے اور خون سے چار سطری عبارت لکھ کر دستخط کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ سب بہت سنجیدہ اور جذباتی لوگ نظر آرہے تھے۔

گرجے کے باہر ٹمپلرز اور نائٹ اس انتظار میں موجود تھے کہ ہا سپٹلرز کے بعد ان سب کو اسی طرح عہد کرنا تھا۔ یہ کئی سو تھے۔

لو سگنان کے رئیس زادے نے دونوں پادریوں سے کچھ کہا تو ایک پادری نے ان تینوں سے پوچھا "تم تینوں نے جو یہ اثر انگیز منظر دیکھا ہے تو اس کا تم پر کیا اثر ہوا؟"

ایک نے جواب دیا "یہ کہ یہ جنگ جنونی عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان لڑی جائے گی۔ اس کا فیصلہ آنے والا وقت کردے گا۔"

ایک پادری نے جھنجلائے لہجے میں کہا "تو اپنے اسلامی تعصب کے خول سے نکل کر بات کر کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ اپنے دل و دماغ پر ہر وقت اسلام کو مسلط رکھتے ہو اور دنیا کی کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ اس وقت تمہارے دل کی کیفیت کیا ہے کچھ پتا نہیں۔ بظاہر تو تم تینوں پر سکون نظر آرہے ہو حالانکہ یہاں تم تینوں نے جو کچھ دیکھا ہے' اس سے فطری طور پر تمہیں خوف زدہ ہو جانا چاہیے تھا۔"

اچانک ایک شخص دوڑتا ہوا ان کے پاس آیا اور تینوں سے سلطان ملک الاشرف کی خیریت معلوم کی۔

تینوں نے پوچھا "یہ تو نے سلطان کی خیریت کیوں دریافت کر رہا ہے؟ کیا باہر سے کوئی بری خبر موصول ہوئی ہے؟"

اجنبی نے بتایا "نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ہم پر سلطان فلاؤن نے بڑی نوازشیں کی تھیں۔ اس وقت ہماری مالی حالت خراب تھی لیکن اب میں بہت خوش حال ہوں اور میں سلطان فلاؤن کے بیٹے ملک الاشرف سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔"

دونوں پادریوں کو اس شخص کی سلطانی نمائندگان سے بے تکلفانہ گفتگو پسند نہیں آرہی تھی۔ اچانک ایک پادری نے اس کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو' میں تم تینوں کو جو کچھ دکھا رہا ہوں' اس کا ذکر اپنے سلطان سے ضرور کردینا کیونکہ چند سالوں بعد اسلام پر جو برا وقت آنے والا ہے' اس کا ابھی سے تم لوگ سدباب کرلو ورنہ وقت گزر جانے کے بعد تمہاری نسلیں ہاتھ ملتی رہ جائیں گی۔"

اس مرکزی گرجے کے باہر انہیں پاپائے اعظم نکولس کے صلیبی جنگجوؤں کے پاس لے جایا گیا۔ یہ بہت ہی شریر اور اجڈ عیسائی معلوم ہوتے تھے۔ ان میں آپس میں گالی گلوچ اور لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے ان میں خون خرابہ ہو جائے گا مگر تینوں کو جب یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ اسی طرح آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہیں تو تینوں مسلمان بہت حیران ہوئے۔

انہی میں آپس میں ہاتھ پائی شروع ہو گئی اور ایک نے دوسرے کی ناک پر ایک مکا رسید کیا۔ جس سے مضروب



انسان پر گر گیا اور اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ لو سگنان کے رئیس زادے نے دونوں میں بیچ بچاؤ کروانا چاہا تو مکا رسید کرنے والے نے اسے منع کیا کہ وہ ان دونوں کے معاملے میں نہ پڑے کیونکہ یہاں اس قسم کی وارداتیں ہر روز ہی ہوتی رہتی ہیں۔

دونوں پادریوں نے تینوں مسلمانوں کی طرف دیکھا اور کہا "اب مسلمانوں کے زوال کا وقت آچکا ہے کیونکہ عیسائیوں میں ایسے ایسے سر پھرے جنونی موجود ہیں جو تنہا ہزاروں مسلمانوں میں گھس کر قتل عام کرسکتے ہیں۔"

لو سگنان کے رئیس زادے نے بھی کچھ کہا تو پادری نے تینوں کے سامنے اس کی ترجمانی کردی اور کہا "لو سگنان کا رئیس زادہ کہہ رہا ہے کہ یہ جنونی عیسائی شیخ الجبال کے فدائیوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔"

یہاں سے گزرنے کے بعد یہ سب ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بہت سے عیسائی بیٹھے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ان لوگوں نے ان سب کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو ایک دم احتراماً کھڑے ہو گئے اور جب یہ سب ان کے سروں پر پہنچ گئے تو استقبال کے لیے کھڑے ہونے والوں نے دونوں پادریوں سے پوچھا "جناب! اپنا مقدس پادری ری کولڈو جس نے ربانیت اختیار کرلی ہے اور اپنے عہد کا بہت بڑا ولی ہے۔ وہ مسلمانوں کے سلطان کے پاس کچھ بری خبریں دینے گیا تھا' کیا وہ واپس آگیا؟"

دونوں پادری اور لو سگنان کا رئیس زادہ اور تقریباً سب ہی عیسائی راہب ری کولڈو سے واقف تھے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے تھے کہ راہب ری کولڈو مسلمانوں کے سلطان سے کوئی بات کرنے گیا ہوا ہے۔

دونوں پادریوں نے جواب دیا "نہیں' ہمیں کچھ پتا نہیں کہ ولی راہب ری کولڈو اس وقت کہاں ہے۔"

ان عیسائیوں نے بھی تینوں سلطانی نمائندگان کو دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ مسلمان عکا میں کیوں آئے ہیں؟"

انہیں بتایا گیا ہے کہ یہ سلطانی نمائندے ہیں اور سلطان کا کوئی خاص پیغام بطریق اعظم کے نام لائے ہیں۔

ایک خوش فکرے عیسائی نے ہنستے ہوئے ان تینوں سے کہا "تم لوگ تو مسلمان ہو اور تم نے سلطان فلاؤن کے مرنے کا منظر بھی دیکھا ہو گا؟"

کسی دوسرے خوش فکر عیسائی نے کہا "یہ تینوں معمولی درجے کے مسلمان ہیں۔ ان کی رسائی سلطانی محل تک نہیں ہو گی اس لیے انہیں کیا پتا کہ سلطان فلاؤن کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟"

تیسرے عیسائی نے دونوں ساتھیوں کو پیچھے ہٹا دیا اور تینوں مسلمانوں سے کہا "تمہیں نہیں معلوم کہ سلطان فلاؤن اچانک کیوں مر گیا؟"

ایک سلطانی نمائندے نے جواب دیا "ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ کسی آخری معاملے میں سلطان فلاؤن کو زخم لگ گیا تھا۔ اس زخم سے پورے جسم میں زہر دوڑ گیا اور سلطان کی شہادت واقع ہو گئی۔"

سلطانی نمائندے کی باتیں سن کر اوباش خوش فکروں نے زور دار قہقہہ لگایا' ایک نے کہا "غلط بالکل غلط۔ ہمیں تو ہمارے ولی ری کولڈو نے کئی ماہ پہلے یہ بتا دیا تھا کہ سلطان کی موت ری کولڈو کی بددعا سے واقع ہونے والی ہے چنانچہ اس کے جسم پر لگنے والا زخم بھی ری کولڈو ولی کا لگایا ہوا تھا اور مسلمان کچھ بھی کہیں ہم تو یہی کہتے رہیں گے۔"

تینوں نمائندگان نے پادریوں سے کہا "یہ آپ لوگ ہمیں کہاں لے آئے؟ ان لوگوں میں بیٹھ کر تو یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ عکا کسی بھی مصیبت میں گرفتار نہیں اور عیسائیوں کو ری کولڈو نامی ولی راہب مل گیا ہے جو ان کے سارے مسائل اپنی کرامات سے حل کرلے گا۔"

یہ تینوں سلطانی نمائندے یہاں آکے بالکل تھک گئے جس سے عیسائیوں کو اس جگہ تینوں مسلمانوں کو پہنچانے کے بعد احساس ہو گیا کہ ان پر ولی ری کولڈو نے دہشت طاری کردی ہے۔ وہ تینوں کی اکتاہٹ اور بیزاری کو ان کا خوف سمجھ رہے تھے۔

ایک خوش فکرے نے باری باری تینوں کی ٹھوڑیاں پکڑیں اور کہا "تم تینوں فوراً اپنے سلطان کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ اس کی ری کولڈو سے کس قسم کی بات ہو رہی ہے اور اسے ری کولڈو سے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔"

یہ تینوں ان خوش فکروں اور خوش عقیدہ عیسائیوں سے اتنے بیزار ہوئے کہ دونوں پادریوں سے درخواست کی کہ وہ اب عکا میں مزید کچھ نہیں دیکھنا چاہتے۔

لو سگنان کے رئیس زادے نے دونوں پادریوں سے درخواست کی کہ جب تک بطریق اعظم سلطان کے مکتوب کا جواب نہیں لکھتا۔ ان تینوں کو اس کے پاس رہنے دیا جائے۔

دونوں پادریوں نے جواب دیا "تم یہ درخواست بطریق اعظم سے خود کرو۔ اگر وہ اجازت دے دیں تو انہیں اپنے

ساتھ اپنی حویلی میں لے جاؤ۔"

یہ سب شام سے کچھ پہلے بطریق اعظم کے پاس پہنچے مگر وہ اس وقت قلعے میں گیا ہوا تھا اس لیے لو کسٹان کا رئیس زادہ ان تینوں کو اپنی ذمے داری پر حویلی میں لے گیا۔

لو کسٹان کا رئیس زادہ یہ چاہتا تھا کہ وہ تینوں سلطانی نمائندگان سے اتنا بے تکلف اور قریب ہوجائے کہ یہ تینوں واپس جاکے سلطان سے اس کا بطور خاص ذکر کریں اور اس جنگ کے بعد اگر سلطان کامیاب ہوجائے تو یہ تینوں سلطان سے اس رئیس زادے کی سفارش کریں اور اگر عیسائی کامیاب ہوجائیں تو وہ ان تینوں قیدی مسلمانوں کے ذریعے سلطان سے قید خانے میں ملاقات کرے اور سلطان سے اس قسم کی باتیں ہوجائیں جن سے اس رئیس زادے کو تاریخ میں کوئی مقام حاصل ہوجائے۔

تاریخ میں مقام کس طرح حاصل کیا جائے' بس یہ فیصلہ کرنا لو کسٹان کے رئیس زادے کا کام تھا۔ اس نے تو یہاں تک فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ کسی بھی طرح جنگ کے بعد سلطان سے ملاقات ضرور کرے گا اور پھر دھوکے سے سلطان کو قتل کرکے تاریخ میں سلطان کے قاتل کی حیثیت سے مقام حاصل کرلے گا۔ وہ جنونی لوگوں کی طرح اس قسم کی فضول فکروں میں مبتلا تھا اور تینوں سلطانی نمائندگان کو اسی لیے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔

اس نے اپنے خادم کے ذریعے کچھ کچھ عربی زبان بھی سیکھ لی تھی لیکن ایک دن اور ایک رات میں وہ کتنی زبان سیکھ سکتا تھا۔

بطریق اعظم کو قلعے سے واپسی کے بعد جب یہ بتایا گیا کہ تینوں سلطانی نمائندوں کو لو کسٹان کا رئیس زادہ اپنے ساتھ اپنی حویلی میں لے گیا تو بطریق اعظم نے خوشی کا اظہار کیا۔

بطریق اعظم خود لو کسٹان کے رئیس زادے کی حویلی میں پہنچ گیا اور دن بھر ان تینوں مسلمانوں کو جو کچھ دکھایا گیا تھا اور ان پر جو نفسیاتی اثر ڈالا گیا تھا' ساری روداد لو کسٹان کے رئیس زادے کی زبان سے سنی اور بطریق اعظم کو یہ بتا کر مطمئن کیا گیا کہ یہ تینوں عیسائیوں سے اتنے متاثر بلکہ خوف زدہ ہوچکے ہیں کہ شاید ان کے بیان پر سلطان عکا کا محاصرہ اٹھالے اور عیسائیوں سے کوئی دس سال تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرلے۔

اب بطریق اعظم نے ان تینوں کو حویلی کے ایک بڑے کمرے میں بٹھا کے ان سے سارے دن کی روداد سنی۔ ایک نے بطریق اعظم کو مغالطے میں رکھنے کے لیے کہا "جناب! اس بار تو جو میں عیسائیوں میں جنونی جوش و خروش دیکھ رہا ہوں' اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بار ہم مسلمان شکست اٹھا کے قاہرہ واپس چلے جائیں گے۔"

بطریق اعظم نے کہا "میں بھی جنگ وجدل سے نفرت کرتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسلمان ہم پر جب چاہیں چڑھ دوڑیں۔ ہم تو مسلمانوں سے اتنے عاجز آچکے ہیں کہ اب ہم تمہیں ایک ایسا سبق دینا چاہتے ہیں کہ اس کے بعد تم کبھی ادھر کا رخ ہی نہ کرو۔ منگولوں کا خان ہم سے اتحاد کرکے مصر پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے مگر ہم اپنے معاملات میں کسی اور کو شامل یا داخل نہیں کرنا چاہتے اور اب ہم اکیلے ہی قاہرہ کے لیے کافی ہیں۔"

دوسرے مسلم نمائندے نے عاجزانہ درخواست کی "مقدس باپ! اگر ہمیں شکست ہوجائے تو میں آپ کو بتلاتا ہوا آپ کے پاس پہنچوں گا۔ آپ ہمیں پناہ دیں گے۔ اس لیے لو کسٹان کے اس رئیس زادے کے سامنے درخواست کررہا ہوں کہ میں اور میرے ساتھی۔"

اس نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی' دوسرے نے خوشامد شروع کردی۔ اس نے بھی اقرار کیا کہ وہ یا عیسائی مسلمانوں پر حاوی آجائیں گے اور شاید اس کے بعد مسلمان اتنے کمزور ہوجائیں کہ مصر بھی ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

تینوں کی مصلحت آمیز باتوں نے بطریق اعظم کو اتنا متاثر کردیا کہ اس نے ان تینوں کو ایک تحریری معافی نامہ دے دیا اور کہا "یہ تحریر تمہیں کسی بھی عیسائی کے ظلم و ستم سے باز رکھے گی۔"

بطریق اعظم نے تینوں پر زور رکھ کے انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے' اسے نہایت تفصیل سے نہ صرف عکا کو سنائیں بلکہ فوج کے سرداروں کو بھی بتائیں کہ اس بار عیسائیوں کو شکست دینا ناممکن ہے۔

بطریق اعظم نے سلطان کو جواب میں صاف صاف لکھ دیا۔

"تم اپنے بزرگوں کی طرح ہمیں کوئی اطلاع دیے بغیر ہی عکا تک آگئے ہو۔ ہمیں تمہاری اس فوج کشی سے نہ تو حیرت ہوئی اور نہ خوف۔ اس بار ہم نے جنگ سے پہلے یہ مناسب سمجھا کہ تمہارے نمائندگان کو وہ سب دکھایا جائے جس میں ہماری طاقت مضمر ہے اس لیے بہتر تو یہی تھا کہ تم یہاں کے بارے میں سب کچھ جان لینے کی بعد واپس چلے جاؤ مگر ہمیں معلوم ہے کہ تم میں فتوحات کا نشہ چڑھا ہوا ہے اور تم سمجھتے



ہو کہ سدا وقت تمہارے لیے یکساں ہی رہے گا مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تاریخ اپنا رخ بدل رہی ہے اور اب اس نے ہم عیسائیوں کو عروج کے لیے منتخب کرلیا ہے۔ مسیح ہمارا حامی و ناصر ہے۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ شام اور مصر سے ننگے پاؤں مسلمان' عیسائی ہونے کے لیے یروشلم کے کیتھیڈرل کی طرف بڑھ رہے ہیں جنہیں وہاں جگہ نہیں مل رہی' وہ عکا کے کیتھیڈرل کا رخ کررہے ہیں۔ اگر سلطان ذلت سے بچنے کے لیے اور مسلمانوں کو ذلت سے بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے تو وہ جنگ سے پہلے ہم سے دس سالہ معاہدۂ امن کرلے۔ ہم فی الحال سلطان کو دس سال دے سکتے ہیں لیکن اگر سلطان کے دماغ میں فتح کا نشہ چڑھا ہوا ہے تو وہ جو چاہے روش اختیار کرے لیکن اس یقین کے ساتھ کہ اب وقت اور زمانہ مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ اس کے فاتح رخصت ہوگئے۔ چھوٹوں کو بڑے ہونے کا گمان نہیں کہیں کا بھی نہیں رکھے گا۔ عقل مند وہ ہے' جس کی نظریں وقت کو پہچاننے کی نبض پر ہوں۔ ہم نے تمہیں جو کچھ لکھ دیا اس پر گواہی تمہارے تینوں نمائندے صحیح صحیح چشم دید دیں گے۔"

بطریق اعظم نے خط کے آخر میں اپنے دستخط کیے اور مہر لگادی۔

ان تینوں کو نہایت عزت و احترام سے واپس بھیج دیا گیا۔

عکا سے نکلنے کے بعد ان تینوں کو بڑی ہنسی آئی کہ یہ عیسائی کتنے خوش فہم اور احمق ہیں جو مسلمانوں کو کھیل تماشے دکھا کر مرعوب کرنا چاہتے ہیں اور اپنی حماقت سے یہ سمجھ رہے کہ بہت سارے ناتجربے کار' جاہل' اجڈ' فنون جنگ سے ناواقف اور رموز مملکت سے بے بہرہ لوگ تجربے کاروں پر غالب آجائیں گے۔ انہیں لو کسٹان کا رئیس زادہ کچھ عجیب و غریب بے وقوف سا انسان لگا۔ جسے یہ امید تھی کہ اس معرکے کے بعد وہ مسیحی دنیا میں کوئی نمایاں مقام حاصل کرلے گا۔

ان تینوں کے آس پاس بالکل ویرانی چھائی ہوئی تھی کیونکہ مسلمانوں کے محاصرے کے بعد آس پاس کی بستیاں خالی ہوچکی تھیں اور ہر طرف دور دور تک ویرانی نظر آرہی تھی۔

کہیں کہیں مسافر گھوڑوں اور خچروں پر سوار تیزی سے بھاگے چلے جارہے تھے کیونکہ وہ اس جنگ میں گھری ہوئی جگہ اور فضا میں زیادہ دیر رہنا خطرے کی بات سمجھ رہے تھے لیکن جو مسافر مسلمان تھے' انہیں مسلمانوں کے لشکر کے قریب سے گزرنے میں کوئی خوف نہیں محسوس ہوتا تھا بلکہ وہ یہاں ایک قسم کی طمانیت اور براہین محسوس کررہے تھے۔ وہ تاجر جن کا عکا سے واسطہ تھا مگر مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کے عکا کے عیسائیوں سے شکایتیں رہتی تھیں کہ وہ معاملات میں تعصب سے کام لیتے ہیں۔ اب وہ مسلمانوں کا محاصرہ دیکھ کر خوش ہورہے تھے کہ عن قریب اس شہر میں بھی اسلامی پرچم داخل ہوجائے گا اور یہاں بھی مسلمانوں کو یروشلم کی طرح برتری حاصل ہوگی۔

ان تینوں نے ملک الاشرف سے فوراً ملاقات کی اور عکا میں جو کچھ دیکھا تھا' اس صاف صاف بیان کردیا اور آخر میں اپنا تجزیہ بیان کیا کہ عکا کے بطریق اعظم' رئیس زادوں اور تاجروں کو یہ یقین ہے کہ اس بار مسلمانوں کو شکست ہوجائے گی اور وہ مصر کی طرف پیش قدمی کریں گے۔

ان تینوں کو سب سے زیادہ اس بات پر حیرت ہوئی کہ اس وقت ملک الاشرف کے پاس دو اجنبی بھی یہی ساری معلومات سلطان کے گوش گزار کررہے تھے۔

ان دونوں نے سلطان کو یہاں تک بتادیا کہ سمندری ساحل پر جتنے جہاز خالی کھڑے ہیں' وہ عکا والوں کے لیے ناکافی ہیں اور عکا والوں کو پتا نہیں کیوں دھڑکا لگا ہوا ہے کہ اس بار بھی مسلمان یہ جنگ جیت لیں گے اور عیسائی حسب سابق شکست اٹھائیں گے اور ساحل پر کھڑے ہوئے خالی جہاز عکا سے فرار ہونے والوں کے لیے ناکافی ہوں گے۔

ان دونوں نے عکا کے اندرونی حالات کا ذکر کرتے ہوئے سلطان کو بتایا کہ مغربی ملکوں سے آئے ہوئے مسیحی عکا میں عیش و عشرت کے ایسے خوگر ہوچکے ہیں کہ شہر کے ایک خاص حصے میں یونان اور اٹلی کی حسین لڑکیاں اور عورتیں ان کے پہنچنے سے پہلے ہی دکانیں سجا کے بیٹھ گئی ہیں۔ یہ صلیبیوں کو اشاروں کنایوں میں دعوت معصیت دے رہی ہیں اور خوش حال مسیحی اور رئیس زادے اپنا بیشتر وقت انہی بازاری عورتوں اور لڑکیوں میں گزارتے ہیں۔

ان دونوں نے عکا کو راتوں میں گھوم پھر کے بھی دیکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ عکا کے بعض علاقوں میں دن سے زیادہ رات میں رونق ہوتی ہے اور نہ صرف اس علاقے میں چراغاں رہتا ہے بلکہ وہاں بڑی چہل پہل نظر آتی ہے۔ ان علاقوں کے درو دیوار سے نغمے پھوٹتے ہیں۔ کہیں کہیں باہمی رقابت کی وجہ سے مار پیٹ' گالی گلوچ اور بحث و تکرار کا شور بھی سنائی دیتا ہے۔

ان تینوں نے سلطان کو یقین دلایا کہ عکا کے لوگ بطریق اعظم سمیت اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کا اقتدار اپنے تجربے کار مشہور و معروف سلاطین اور مشاہیر سے محروم ہونے کے بعد ناتجربہ کاروں کے ہاتھوں میں منتقل ہوچکا ہے۔ اس لیے اس بار حملہ آور مسلمان ناکام و نامراد واپسی پر مجبور ہوجائیں گے۔

ملک الاشرف ان تینوں کی باتیں نہایت جستجو اور انہماک سے سنتا رہا پھر ان کی طرف سے منہ موڑتے ہوئے ملک الاشرف نے حکم دیا "اب تم تینوں خاموشی سے بیٹھ جاؤ اور سنو کہ یہ دونوں ہمیں کس قسم کی اطلاعات بہم پہنچا رہے ہیں۔"

سلطان نے دونوں کو حکم دیا کہ اب وہ روما کے اس کیتھیڈرل کے حالات بیان کریں' جو پاپائے اعظم نکولس کا مستقل مستقر ہے۔"

ایک نے کہا "حضور والا! جب ہم پاپائے اعظم کے روبرو لے جائے گئے تو وہاں منگولوں کا ایک وفد پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ منگولوں کے ایل خان نے پاپائے اعظم سے ایک خط کے ذریعے درخواست کی تھی کہ وہ منگولوں کی مدد کرے کیونکہ خان عیسائیوں کے لیے یروشلم کو فتح کرنا چاہتا ہے۔"

ملک الاشرف نے پوچھا "ایل خانی وفد نے پاپائے اعظم نکولس سے جو درخواست کی تھی وہ زبانی تھی یا کسی مکتوب کی شکل میں؟"

دونوں میں سے ایک نے جواب دیا "ایک مکتوب کی شکل میں۔ اپنے خط میں ایل خان نے لکھا کہ اس کا بیٹا عیسائی ہوچکا ہے اور جو سردار یہ خط لے کر پاپائے اعظم سے ملا تھا' وہ سردار بھی منگول ہونے کے باوجود عیسائی مذہب اختیار کرچکا تھا اور اس کا نام چاگان تھا۔"

سلطان نے پوچھا "تم دونوں جو یہ معلومات فراہم کررہے ہو' تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم دونوں پاپائے اعظم کی خلوت گاہ تک پہنچے کس طرح؟"

دونوں میں سے ایک نے جواب دیا "میں رشید اپنے اس ساتھی عرفان کے ساتھ ایک جینوی تاجر کے ساتھ ہمراہ پاپائے اعظم سے ملاقات کرنے پہنچے تھے اور ہم نے یہ ظاہر کیا تھا کہ مصر سے آئے ہیں اور عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور پاپائے اعظم کو یہ خوش خبری سنائی تھی کہ اس وقت اگر مصر پر حملہ کردیا جائے تو یہ حملے کے لیے بہترین وقت ہے کیونکہ مصر کا نیا سلطان قاہرہ چھوڑ کر عکا جاچکا ہے۔"

ملک الاشرف نے تیوریوں پر بل ڈالے اور کہا "تو نے تو غضب کردیا کہ منگولوں کو قاہرہ پر حملہ کرنے کی دعوت دے دی۔ واقعی اگر وہ ان حالات میں قاہرہ پر حملہ آور ہوجائیں گے تو میرے لیے بڑی مشکلات اٹھ کھڑی ہوں گی۔"

رشید کے بعد عرفان نے کہا "بے شک' اگر منگول ان حالات میں قاہرہ کا رخ کریں گے تو مصر مصیبت میں گرفتار ہوجائے گا لیکن ہمیں پاپائے اعظم سے یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ منگولوں کو قابل اعتماد دوست نہیں سمجھتے۔ وہ بے حد تنگ نظر اور نرگسیت کے شکار ہیں۔ اس نے چاگان نامی مسیحی منگول سردار سے پوچھا اگر تو اس مکتوب کے مطابق عیسائی ہوچکا ہے تو بتا تجھے بپتسمہ کس نے دیا تھا؟"

اس نے بتایا "ایک شامی پادری نے۔"

نکولس نے چاگان کا مذاق اڑایا اور کہا کہ وہ اس کے بپتسمہ پر یقین نہیں رکھتا اور اسے پاپائے اعظم کے ہاتھوں دوبارہ بپتسمہ لینا چاہیے۔"

ملک الاشرف نے بے چینی سے کہا "یہ تو فضول باتوں میں ہمارا وقت کیوں ضائع کررہا ہے۔ تو ہمیں آگے کی بات بتا کہ نکولس نے چاگان کو جواب کیا دیا؟"

رشید نے بتایا "آپ نے ہمارا مقصود ہی قرار دے رہے ہیں۔ وہ دراصل بڑی کارآمد معلومات ہیں۔ نکولس کی حرکات اور ان باتوں سے پاپائے اعظم کے دل کی حالت ظاہر ہوتی ہے جو وہ منگولوں کے خلاف رکھتا ہے۔ پاپائے اعظم نے وفد سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف منگولوں سے تعاون کرکے یا ان کا تعاون حاصل کرکے یروشلم کو نہیں فتح کرنا چاہتا اس لیے منگول اپنے طور پر جو بھی کرنا چاہیں کریں لیکن عیسائیوں سے کوئی امید نہ کریں۔"

ملک الاشرف نے دونوں سے پوچھا "وہ وفد تم دونوں کے سامنے واپس چلا گیا؟ یا موجود رہا؟"

عرفان نے جواب دیا "نہیں' چاگان' پاپائے اعظم کے جواب سے بہت مایوس ہوا اور باہر نکل کے ہم دونوں سے پوچھا کہ کیا سلطان مصر ان دنوں واقعی قاہرہ میں موجود نہیں ہیں؟ تو ہم نے جواب دیا کہ بے شک وہ عکا میں فوج لے پڑا ہے مگر اس وقت بھی مصر میں پچاس ہزار سپاہی کسی بھی ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود ہیں۔"

ملک الاشرف نے پوچھا "پھر تیری باتوں کا چاگان پر کیا اثر ہوا؟"

عرفان نے جواب دیا "چاگان' پاپائے اعظم کے بے توجہی سے بہت زیادہ مایوس اور افسردہ تھا۔ پاپائے اعظم سمجھ نہیں سکا کہ اس کا آقا ایل خان عیسائیوں سے امیدیں کیوں



رکھتا ہے؟ اسی طرح اسے پاپائے اعظم پر حیرت تھی کہ وہ منگولوں سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتا۔"

ملک الاشرف نے تشویش ناک لہجے میں کہا "تم دونوں نے منگولوں کو مصر پر حملہ آور ہونے کی دعوت دے دی۔ یہ تم نے بہت برا کام کیا۔"

رشید نے کہا "ہم پاپائے اعظم اور منگولوں کا اعتماد اسی طرح حاصل کرسکتے تھے لیکن اب ہمیں یقین ہے کہ منگولوں کی سفارت ناکام گئی اور ایل خان منگولی اب عیسائیوں سے روابط نہیں بڑھا سکیں گے۔ گویا انہوں نے مسلمانوں کے لیے مفاہمت کا در کھول دیا ہے۔ اب اگر ایل خان کے درباری مسلمان اپنے طور پر منگولوں کو دوست بنانے کی کوشش کریں گے تو کامیاب ہوجائیں گے۔"

ملک الاشرف نے رشید کے اس بیان کی روشنی میں استفسار کیا "یہ تو کیسی بے سروپا باتیں کررہا ہے۔ اگر ایل خان کے دربار میں مسلمان موجود ہیں تو کیا وہ اتنا اثر رکھتے ہیں کہ ایل خان ان کی باتوں میں آجائے؟ اور اس سے مسلمانوں کو فائدے پہنچیں۔"

عرفان نے بڑے یقین سے کہا "میری چاگان کے آدمیوں سے باتیں ہوئی ہیں۔ چاگان کے دس رکنی وفد میں دو مسلمان بھی تھے۔ انہیں ہم دونوں کے عیسائی ہوجانے کا غم تھا۔ وہ ہم دونوں پر لعن طعن کررہے تھے کہ اتنے اچھے مذہب اسلام کو چھوڑ کر عیسائی کیوں ہوگئے اور پھر انہوں نے ہمیں بتایا کہ ان دنوں ایل خان کا وزیر اعظم رشید الدین نامی ایک مسلمان ہے اور وہ ایل خان کے سامنے تبلیغ کرتا رہتا ہے۔ امید ہے کہ اس تبلیغ کا اثر ظاہر ہو کر رہے گا۔"

ان دونوں مسلمانوں نے ان دونوں پر بڑی لعنت ملامت کی۔

ملک الاشرف نے کہا "اگر رشید الدین نامی کوئی وزیر اعظم ایل خان کو مسلمان کرنے میں کامیاب ہوگیا تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔"

اسی وقت ملک الاشرف نے دو ہرکارے قاہرہ روانہ کردیے۔ قاہرہ میں عباسی خلیفہ اور ان مملوکوں سرداروں کو جو اس کی عدم موجودگی میں مصر اور قاہرہ کا نظام سنبھالے ہوئے تھے' انہیں آگاہ کیا گیا کہ وہ منگولوں کی طرف سے ہوشیار اور چوکنا رہیں کیونکہ اس دوران میں منگول قاہرہ پر حملہ آور ہوسکتے ہیں۔

ان دونوں ہرکاروں کے علاوہ اس نے تمیز سے غزہ تک راستے میں اپنے جاسوس تعینات کردیے کہ وہ تمیز سے غزہ تک جانے والی شاہراہوں کی نہایت ہوش مندی سے نگرانی کرتے رہیں اور جیسے ہی انہیں کہیں منگول نظر آئیں ملک الاشرف کو عکا میں خبر کردی جائے۔

ان امور سے فارغ ہونے کے بعد ملک الاشرف نے بطریق اعظم کو ایک بار پھر آگاہ کیا کہ وہ عکا کے دروازے کھول دے ورنہ شہری فصیلیں گرادی جائیں گے اور ان سے شکست خوردہ قوموں جیسا سلوک کیا جائے گا۔

بطریق اعظم کو حیرت تھی کہ تینوں سلطانی نمائندگان کے چلے جانے کے بعد بھی سلطان نے بطریق اعظم کو سخت پیغام بھیج کر دھمکی دی تھی کہ فصیلوں کو گروا دیا جائے گا اور شہریوں سے شکست خوردہ قوم جیسا سلوک کیا جائے گا۔

بطریق اعظم نے عکا کے ذمے دار لوگوں سے مشورے کیے کہ ملک الاشرف کو کیا جواب دیا جائے۔

قبرص کا بادشاہ' لوسگنان کا رئیس زادہ' ہاسپٹلرز اور ٹمپلرز کے گرینڈ ماسٹر اپنی جبت کا یقین رکھتے ہیں۔ ان سب نے بطریق اعظم کو اختیار دے دیا کہ وہ جو جواب چاہیں بھیج دیں کیونکہ اب عیسائی کسی سلطان کی دھونس میں نہیں آئیں گے۔"

بطریق اعظم دو دن سوچتا رہا کہ سلطان کو نرم اور مصلحت آمیزی پر مشتمل جواب دیا جائے یا اس کو سخت دھمکیاں آمیز جواب بھیجا جائے۔

آخر کار اسے یہ اچھا نہیں لگا کہ اب بھی عیسائی مسلمانوں کو خوشامدانہ جوابات دیتے رہیں۔

اس نے ملک الاشرف کو مختصراً جواب دیا "تم کیسے حکمران ہو کہ جس بات کا جواب تمہیں دیا جاچکا ہے' وہ تو تمہیں یاد نہیں آرہا ہے اور ہم پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہو کہ ہم عکا کے دروازے کھول دیں ورنہ تم فصیلیں گروا دو گے۔ مصر کے سلطان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے بھی اندرون شہر منجنیقوں کو نصب کردیا ہے۔ یہ منجنیقیں فصیلوں پر بھی پہنچا دی گئی ہیں۔ اب تمہارے لشکر پر پتھروں کی مارش گردی جائے گی اور ہم دیکھیں گے کہ تمہاری منجنیقیں ہماری منجنیقوں کے مقابلے میں کس طرح کام کریں گی۔ یاد رکھو کہ ہم نے بھی بالاتفاق یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اب اگر ہم تمہیں شکست دیں گے تو مسلمان کسی بھی رعایت کے مستحق نہیں رہیں گے۔

تم لوگوں نے اعکا کیہ کو ہم سے چھین لیا۔ طرابلس پر قابض ہوگئے۔ کئی ساحلی اور پہاڑی قلعوں پر قابض ہوگئے' وہاں سے عیسائیوں کو بے دخل کردیا۔ اب ہم ان عیسائیوں

کو دوبارہ ان کے قلعوں اور بستیوں میں آباد کرنا چاہتے ہیں۔

اے سلطان! ہوش کے ناخن لے اور اپنے بزرگوں کے ناموں کی مٹی پلید نہ کر۔ بلاشبہ وہ فاتح تھے اور ان کی دہشت ہم عیسائیوں پر مدتوں طاری رہی لیکن کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں اور وہ وقت آگیا ہے کہ تم سے ہم حساب کتاب کرلیں۔ ہم تمہیں حکم نہیں دے رہے ہیں کہ تم محاصرہ اٹھا کر مصر واپس چلے جاؤ بلکہ یہ ہمارا مشورہ ہے مخلصانہ مشورہ کہ اب جنگ وجدل سے باز آجاؤ۔ اس کے علاوہ اگر مسلمان اس خطے میں امن چین سے رہنا چاہتے ہیں تو تم انہیں ہمارے ذریعے یہاں والوں کے لیے معافی نامہ داخل کردو' ہماری مجلس قائمہ اس پر غور کرے گی اور ہماری سفارش پر مسلمانوں کو رعایت اور نجات دے دی جائے گی۔ دیکھو اب مراسلت اور خط وکتابت میں اپنا اور ہمارا وقت نہ ضائع کرو۔ تم جو کارروائی کرنا چاہتے ہو کرو اور ہمارے جواب کے منتظر رہو لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ نا تجربے کاری کا ثبوت مت دو۔ وقت ابھی ہم دونوں کی گرفت میں ہے لیکن جب یہ ہماری گرفت سے نکل جائے گا تو ہم دونوں بے اختیار وقت کے قابو میں چلے جائیں گے اور اس وقت یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے گا' کچھ پتا نہیں۔"

بطریق اعظم کے جواب نے ملک الاشرف کو کارروائی کرنے پر مجبور کردیا۔ اس نے عکا کے تین اطراف منجنیقیں نصب کروادیں اور فوراً ہی سنگ باری کا حکم دے دیا۔

اب چونکہ بطریق اعظم کے خط سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ اس بار عیسائی بھی منجنیقوں سے کام لیں گے تو اب مسلمانوں کو بھی عیسائیوں کی سنگ باری سے بچنے کا انتظام کرنا ہوگا۔

اس نے فصیلوں کے مقابل بلند ترین جگہوں پر اپنے مشاہدین بھیج دیے اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ فصیلوں پر نصب شدہ منجنیقوں کا مشاہدہ کریں اور سلطان کو بتائیں کہ کن کن حصوں سے مسلمانوں پر سنگ باری کی جاسکتی ہے۔

شام تک مشاہدین کی تحقیق کا سلطان کو علم ہوگیا۔

سامنے قلعہ تھا اس لیے قلعے کی بلندی سے منجنیقوں کی کارکردگی کا امکان نہیں تھا اور مشاہدین بھی قلعے کے بالائی حصوں کا جائزہ نہیں لے سکتے تھے اس لیے سلطان کو دو سمتوں سے آگاہ کردیا گیا کہ چار چار منجنیقیں فصیلوں پر موجود ہیں اور یہیں سے مسلمانوں پر حملہ کیا جاسکتا ہے۔

سلطان نے اپنی منجنیقیں' خندقیں کھدوانے کے اس طرح نصب کروائیں کہ نشیب میں بیٹھے ہوئے منجنیقیں چلانے والے عیسائیوں کے حملوں سے محفوظ رہیں اور انہیں یہ حکم دیا گیا کہ سنگ باری کا عمل متواتر اور شدت سے جاری رکھا جائے۔ دشمن کو سوچنے اور دم لینے کا وقت نہ دیا جائے۔ یہ بھی حکم دیا گیا کہ فصیلوں کے بالائی اور درمیانی حصوں کو توڑ دینے کی کوشش کی جائے کیونکہ بالائی دیواروں کے ٹوٹنے سے فصیلوں کی چھتوں کو بھی نقصان پہنچایا جاسکتا تھا اور درمیانی حصوں کو توڑ دینے سے اندر داخلے کے راستے مل سکتے تھے۔

منجنیقوں کی گھن گرج سے ماحول پر ہیبت اور دہشت طاری ہونے لگی۔ مسلمان منجنیقوں کے آگے اور فصیلوں کے قریب پہنچنے کی فکر میں تھے کیونکہ فصیلوں کے قریب پہنچنے سے دیواروں پر شدید ضربیں لگائی جاسکتی تھیں۔

ملک الاشرف' بیبرس اور اپنے باپ فلاؤن کی طرح فصیلوں کے اردگرد چکر لگا رہا تھا اور یہ جاننے کی فکر میں تھا کہ محاذ کا کون سا حصہ ٹوٹ سکتا ہے اور کس حصے سے داخل ہونے میں پہل کی جاسکتی ہے۔

دوپہر تک حملے جاری رہے۔ دیواریں اتنی مضبوط تھیں کہ ان پر مسلسل سنگ باری سے بھی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔

منجنیقیں چلانے والوں نے اپنے تیر بھی منجنیقوں کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کردیا۔

ایک دن میں تیز رفتاری سے آگے بڑھنا عیسائیوں کے لیے بڑا حوصلہ شکن عمل تھا۔

عکا کے اندر عیسائیوں کا جوش وخروش ماند پڑنے لگا۔ کئی پادریوں نے بطریق اعظم کو آگاہ کیا کہ وہ ایسی حکمت عملی وضع کرے جس سے عیسائیوں میں جوش وخروش بڑھ جائے۔

کچھ کی یہ رائے تھی کہ مقابلہ خشکی کے بجائے پانی میں کیا جائے تاکہ عیسائیوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں بہادری اور جوش وخروش دکھانا اور ثابت کرنے کا کھلا موقع میسر آجائے۔

قبرص کا بادشاہ بھی یہی چاہتا تھا کہ مسلمانوں سے مقابلہ کھلے میدان میں ہونا چاہیے لیکن ہاسپٹلرز کے گرینڈ ماسٹر نے دوسروں کی تجاویز سے اختلاف کیا۔ وہ بھی چاہتے تو یہی تھے کہ مسلمانوں کا مقابلہ کھلے میدان میں ہونا چاہیے لیکن فی الحال کھلے میدان میں عیسائیوں کا جانا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لیے وہ چاہتے تھے کہ منجنیقوں کے استعمال میں زیادتی اور تیزی ہونی چاہیے تاکہ مسلمانوں میں بدحواسی اور شکست خوردگی کے آثار پیدا ہوں' اس عالم میں اگر ان پر اچانک حملہ کردیا جائے تو اس کے نتائج عیسائیوں کے حق میں نکلیں گے۔



فصیلوں پر مزید منجنیقیں پہنچادی گئیں اور پتھروں کا ذخیرہ بھی اوپر پہنچادیا گیا اور پھر ایسا انتظام کیا گیا جس سے اوپر پتھروں کی کمی نہ ہو۔

چونکہ منجنیقوں کے معاملے میں بھی مسلمانوں کو زیادہ تجربات حاصل تھے اور انہوں نے منجنیقوں کے ذریعے بڑے بڑے قلعے سر کرلیے تھے جب کہ عیسائیوں کو اس معاملے میں مسلمانوں پر فوقیت حاصل نہیں تھی اور انہیں اس معاملے میں مہارت بھی حاصل نہیں تھی اس لیے بہت جلد فصیلوں کے اوپر یہ صورت حال پیدا ہوگئی کہ منجنیقوں میں استعمال کیے جانے والے پتھر گرنے لگے اور منجنیقوں کو حرکت میں لانے کے لیے کئی کئی گھنٹے پتھروں کا انتظار کرنا پڑا اور جن حصوں میں بھی یہ صورت حال ہوتی مسلمانوں کی منجنیقیں وہاں برق رفتاری سے سنگ باری کا سلسلہ جاری رکھتیں۔

اب گویا دونوں طرف جنگی حکمت عملی میں تبدیلی واقع ہوچکی تھی۔ مسلمان عیسائیوں کی کمزوری سے آگاہ ہوگئے تھے اور عیسائیوں میں جنگی نظم وضبط باقی نہیں رہا اور ان میں سستی اور غیر ہم آہنگی آگئی اس لیے ان کی منجنیقوں کی کارکردگی متواتر حرکت میں نہیں رہ سکی تھی ایسا کیوں ہوا؟ مسلمانوں کو اس کا علم نہیں تھا مگر سلطان نے اندازہ لگالیا کہ منجنیقوں کو چھتوں کی مسلسل ترسیل کسی وجہ سے ممکن نہیں رہی جس سے ان کی سنگ باری میں وقفہ پیدا ہوجاتا ہے۔

مسلمانوں نے سنگ باری سے محروم حصوں پر شدت سے سنگ باری شروع کردی۔

عیسائیں نے یہ چالاکی اختیار کی کہ جو پتھر فصیل پر پہنچ رہے تھے' ان کو جمع کرنے پر اپنے آدمی مقرر کردیے اور یہی پتھروں مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی منجنیقوں سے کام میں لائے جانے لگے۔

اسی دوران میں کئی پتھروں نے فصیلوں پر موجود عیسائیوں کو غیر معمولی زخمی کردیا جس سے ہر طرف دہشت اور ہیبت پھیل گئی اور جو زخمی ہو کر چھت پر گرتا' وہ اس کو فوراً چٹا کردیتے۔

مغرب کے وقت تک یہ طوفانی اپنے اپنے محاذوں پر اپنی کارکردگی دکھاتے رہے لیکن سارے دن کی یہ قیامت خیز لمحات عیسائیوں کو مایوس کردینے کے لیے کافی تھے۔ فصیلوں پر ان کے کئی آدمی کام آچکے تھے جن کی لاشیں فصیلوں سے نیچے ان کے اعزہ میں پہنچائی گئیں تو وہاں شور قیامت برپا ہوگیا۔ بین کرنے والے خود روتے اور دوسروں کو رلاتے۔ وہ مرنے والے کے اوصاف رو رو کر بیان کرتے اور مسلمانوں کو کوسنے دیتے۔ جن کی وجہ سے اور جن کے ہاتھوں سے ان کے عزیز قتل کردیے جاتے تھے..... سلطان کو ایک دن کی جنگ سے اندازہ ہوگیا تھا کہ عکا کی فصیلیں عکا والوں کو ماہ دو ماہ بھی محفوظ نہیں رکھ سکیں گی۔ اس لیے اس کے خیال میں اس جنگ کا فیصلہ دو چار ہفتوں کے اندر ہی ہوجانا چاہیے۔

اب وہ عکا والوں کی بدحواسی اور اندرونی کیفیت جاننا چاہتا تھا کیونکہ جو عیسائی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اس بار ان کی فوجیں مسلمانوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوجائیں گی' اب وہ کیا سوچ رہے ہیں؟

○☆○

بطریق اعظم نے کئی پادریوں کو اس کام میں مشغول کردیا کہ وہ رئیس زادوں اور نائٹوں کو دیکھیں کہ وہ ان حالات میں کیا کررہے ہیں؟

ایک پادری نے بطریق اعظم کے اس حکم پر نہایت دیانت داری اور مستعدی سے کام شروع کردیا۔ وہ تو سگنان کے رئیس زادے کے پاس پہنچا تو اس کی حویلی میں خاموشی طاری تھی۔ مسلسل دستکیں دینے کے بعد دروازہ کھلا اور غرزہ کا ملازم نمودار ہوا۔ اس نے رئیس زادے کے بارے میں بتایا کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہے۔ کسی محاذ پر موجود ہوگا۔

لیکن پادری کو کسی راہ گیر نے بتایا کہ رئیس زادہ میری نامی ایک شامی حسین لڑکی کی خلوت میں شراب کے نشے میں غرق حسن وشباب کے مزے لے رہا ہے۔

پادری کو بے حد غصہ آرہا تھا کہ رئیس زادے کو محاذ پر ہونا چاہیے تھا مگر وہ اس نازک اور خطرناک وقت میں بھی رئیس زادگی کے مشاغل سے باز نہیں آیا۔

پادری رئیس زادے کو تلاش کرتا ہوا اس بازار میں پہنچ گیا جہاں رئیس زادوں اور بہت زیادہ مصروف رہنے والوں کی دل بستگی کے لیے منتخب روزگار حسن وشباب کے پیکر جمع کردیے گئے تھے۔ ان کا کاروبار اس جنگی ماحول اور فضا میں بھی عروج پر تھا۔

پادری کو رئیس زادے تک پہنچنے میں کوئی خاص دشواری نہیں پیش آئی۔

جب رئیس زادے اور اس کی محبوبہ کو یہ بتایا گیا کہ ایک پادری رئیس زادے سے ملنا چاہتا ہے تو دونوں نے اپنی ناشائستہ حالت کو شائستگی میں بدل دیا اور پادری کو اندر بلوالیا۔

یہاں اور بھی کئی حسینائیں تھیں۔ وہ پادری کو رئیس

زادے کے پاس جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور اپنی ہنسی کو دبائے ہوئے صرف مسکراہٹ پر قناعت کر رہی تھیں۔

پادری نے اندر داخل ہوتے ہی ماحول کا جائزہ لیا۔ رئیس زادے کی حسینہ میری اس وقت بھی مسکرا رہی تھی۔

پادری نے رئیس زادے کو شرم دلائی اور کہا "آپ یہاں ہیں جب کہ میں اور بطریق اعظم کے بھیجے ہوئے کئی آدمی آپ کو جنگی محاذوں پر تلاش کرتے رہے۔"

رئیس زادے نے جواب دیا "ہاں میرا ارادہ تو کسی محاذ پر پہنچنے ہی کا تھا مگر میں نے اپنی کئی آدمی لڑنے کے لیے بھیج دیے ہیں۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ میں اس گھبراہٹ کا علاج کرنے کے لیے یہاں چلا آیا۔"

پادری نے کہا "آپ کو کچھ پتا ہے کہ مسلمانوں کی اسی منجنیقیں سنگ باری میں مشغول ہیں۔ پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے فصیلوں کو توڑ دینے کی۔۔۔"

رئیس زادے نے پادری کی بات کاٹی اور کہا "مسلمان فصیلوں میں شگاف ڈالنے کے بعد بھی شہر میں داخل نہیں ہو سکیں گے کیونکہ فصیلوں کے قریب گہرے گہرے نالے اور خندقیں کھدی ہوئی ہیں اور ان میں پانی بھر دیا گیا ہے۔ آخر یہ مسلمان کس طرح شہر میں داخل ہوں گے۔"

پادری نے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے کہ اپنی قوم کے سمجھ دار لوگ جب حالت جنگ میں بھی حسین عورتوں اور لڑکیوں میں رنگ رلیاں مناتے نظر آئیں تو اس قوم کا خدا مالک۔"

اسی دوران میں ایک نائٹ اندر داخل ہوا۔ وہ بہت زخمی تھا۔

ایک حسین لڑکی نے آگے بڑھ کے اس کا استقبال کیا اس نے آہستہ سے کہا "میں قریب المرگ ہوں۔ میدان جنگ سے اس زخمی حالت میں بھاگ کے تیرے پاس اس لیے آیا ہوں کہ تو مجھے اپنی آغوش میں زندگی کی بقیہ سانسیں پوری کر لینے دے۔"

پادری کو بڑی حیرت تھی کہ یہ بہادر نائٹ کیسی باتیں کر رہا ہے۔

نائٹ نے پادری کو نہیں دیکھا تھا لیکن لڑکی نے نائٹ کو دیکھ رکھا تھا۔ وہ زخمی نائٹ کو سہارا دیتے ہوئے اندر لے گئی۔

پادری نے رئیس زادے سے کہا "یہ عیسائیوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس خطرناک حالت میں بھی میدان جنگ میں مرجانے کو ترجیح نہیں دیتے۔"

رئیس زادے نے پادری سے کہا "ایسا اس لیے ہے کہ ان نائٹوں نے اپنی زندگیاں اپنے مذہب کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ یہ ہمیشہ ان رنگین ساعتوں سے دور رہے یا محروم رکھے گئے تو اب جو انہیں یہ موقع میسر آگیا اور اسے اِدھر اُدھر جانے کی آزادی بھی مل گئی تو وہ اپنی جان اپنی محبوبہ کی آغوش میں دے کر ابدی سکون حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

پادری نے افسوس کرتے ہوئے کہا "اگر ہمیں اسی صورت حال کا سامنا رہا تو ہم یہ جنگ بھی ہار جائیں گے۔"

رئیس زادے نے پادری کو سمجھایا "آپ ہم لوگوں کی فکر نہ کریں۔ کیتھیڈرل میں بیٹھ کر ہمارے حق میں دعا کریں اور خداوند مسیح سے کہیں کہ وہ ہمیں فرشتوں کی مدد فراہم کریں تاکہ ہم مسلمانوں کو شکست دے کر دین مسیح اور اپنے بھائیوں کو سرخرو کریں۔"

پادری نے رئیس زادے کو بطریق اعظم کا فیصلہ سنایا۔ "میں یہاں کی رنگین محفلوں میں رنگین مزاج عیسائی بھائیوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے شرم آتی ہے۔ تمہیں اسی وقت محاذ پر پہنچ جانا چاہیے۔ اگر تم لوگوں کے خلاف بطریق اعظم کی طرف سے کوئی خطرناک فیصلہ سنا دیا گیا تو اس وقت تم لوگ کیا کرو گے؟"

رئیس زادے نے بے نیازی سے جواب دیا "ہم یہاں اپنی مرضی سے مسلمانوں سے مقابلہ کرنے آئے ہیں۔ اس میں کسی شخص نے ہمیں مجبور نہیں کیا۔ اب اگر ہم بطریق اعظم کے کسی خطرناک حکم کے نتیجے میں کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے تو اس سے بھی عیسائیت کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان ہی پہنچے گا۔"

پادری نے غصے میں کہا "میں یہاں ان فضول مباحث میں حصہ لینے کے لیے نہیں آیا اس لیے تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم یہاں کب تک رہو گے اور محاذ جنگ پر کب جاؤ گے؟"

رئیس زادے نے کہا "میں کسی وقت بھی محاذ جنگ پر پہنچ سکتا ہوں۔ اگر آپ یہاں آئے نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ میں فوراً ہی یہاں سے محاذ جنگ پر پہنچ جاتا لیکن یہ میری غیرت کے خلاف ہے کہ میں ایک معمولی پادری کا معمولی سا حکم مان لوں۔ میں نے کہہ تو دیا کہ میں ایک رئیس زادہ ہوں اور رئیس زادے کو حکم کوئی نہیں دے سکتا۔"

پادری نے ملامت کی "تو اگر رئیس زادہ ہے تو بطریق اعظم تم سب کی جان و مال کا مالک ہے۔ تم سب کو پاپائے اعظم اور بطریق اعظم کے حکم پر یہاں آنا پڑا۔ اب اسی کی

طرف سے تمہیں حکم دیا جارہا ہے کہ کسی بھی محاذ جنگ پر پہنچ جاؤ اور ان فضول رنگین صحبتوں سے خود کو کچھ عرصے کے لیے دور رکھو۔"

رئیس زادے کی محبوبہ نے پادری کو نہایت بے رخی سے حکم دیا "اب تم یہاں سے جاؤ کیونکہ اگر خود بطریق اعظم یہاں تشریف لے آئیں تو بڑی بدمزگی پیدا ہوجائے گی اور یہ ممکن ہے کہ اس کو بازار حسن فروشی سے نکال باہر کیا جائے۔"

رئیس زادے نے بڑی بدمزگی اور گستاخی آمیز لہجے میں کہا "بس جناب! اب آپ اس فضول بحث میں نہ پڑیں۔ آپ نے بطریق اعظم کا پیغام ہمیں پہنچادیا اور اپنا بہت قیمتی وقت ہمیں سمجھانے میں ضائع کردیا۔ اب آپ کیتھیڈرل میں پہنچ کر ہمارے لیے اور عیسائیت کے لیے دعائیں کریں ہم محاذ جنگ سنبھالتے ہیں۔"

رئیس زادہ کھڑا ہوگیا اور اور اپنی محبوبہ سے کہا "یہ شخص حسن وشباب کا دشمن ہے۔ یہ دو سروں کو بھی اس سے دور رکھنا چاہتا ہے اس لیے اب ہمیں محاذ پر جانا چاہیے تو میرا انتظار کرو کیونکہ ممکن ہے کہ میں اس نائٹ کی طرح اپنی زندگی کی آخری سانسیں تیرے آغوش میں گزاردوں۔"

رئیس زادہ چلا گیا مگر پادری وہیں موجود رہا۔

رئیس زادے کی محبوبہ اسے دیکھتی رہی اور جب یہ محسوس کیا کہ شاید پادری بھی اس کے حسن سے متاثر ہے اور کچھ دیر اس کے پاس رکنا اور بیٹھنا چاہتا ہے تو بڑے پیار سے پیش کش کی "مقدس باپ! آپ رئیس زادے کی جگہ بیٹھ سکتے ہیں۔ تلقین اور نصیحتوں کے بہانے کچھ وقت میری صحبت میں گزار سکتے ہیں۔ کسی کو آپ کی موجودگی پر اعتراض نہیں ہوگا اور آپ یہاں کی رنگین ساعتوں سے لطف اندوز بھی ہوتے رہیں گے۔"

پادری نے اس کی طنزیہ باتیں سمجھ لیں اور اس کا چرکا محسوس کرتے ہوئے کہا "افسوس کہ فصیلوں پر عیسائی جنگجو حق وباطل کی جنگ لڑ رہے ہیں مگر تجھے اور تجھ جیسی بہت سی حسین اور خوبرو لڑکیوں اور عورتوں کو اس کا احساس تک نہیں کہ ان قیمتی ساعتوں کا فیصلہ دین عیسوی پر کتنا خوش گوار یا برا اثر چھوڑے گا۔ تم نہیں جانتیں کہ اگر عکا بھی عیسائیوں سے چھین لیا گیا تو عیسائیوں کو اس مقدس سرزمین میں کوئی جائے پناہ نہیں ملے گی اور مسلمان بزور شمشیر ہم عیسائیوں کو بھی مسلمان کرلیں گے۔"

جب پادری یہ باتیں کررہا تھا تو آس پاس سے سازوں اور گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان آوازوں میں فصیلوں پر برسنے والے پتھروں کی آوازیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ کہیں ڈھول اور نقارے بھی پیٹے جارہے تھے۔ ان کا شور بھی دل ودماغ کو متاثر بلکہ خوف زدہ کررہا تھا۔ جنگ' سنگ باری' زخمیوں کی چیخ وپکار اور ان آوازوں میں ڈھول نقاروں کی آوازیں بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کہیں کوئی خوشی کی تقریب برپا ہو۔

پادری نے رئیس زادے کی محبوبہ سے کہا "ذرا سی دیر کے لیے سانس روک کے ڈھول اور نقاروں کی آوازیں سن اور سوچ کے بتا کہ اس خطرناک اور خوف ناک ماحول میں یہ ڈھول اور نقارے کہاں بج رہے ہیں؟ کون بجارہا ہے؟"

رئیس زادے کی محبوبہ نے آنکھیں بند کرلیں اور ڈھول اور نقاروں کی آوازیں سننے کی کوشش کی اور جب یہ آوازیں سننے میں کامیاب ہوگئی تو اسے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ خوشی کے شادیانے کہاں بج رہے ہیں؟"

پادری نے کہا "مجھے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے نقارے اور ڈھول بجانے والوں کو بھی اپنے ساتھ رکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان آوازوں سے لڑنے والوں کا جوش وخروش اور دشمنوں پر خوف غالب آجاتا ہے۔"

پادری کچھ دیر باتیں بنا کر چلا گیا۔ اس نے واپس جاتے ہوئے پلٹ کر اپنے آس پاس کا جائزہ نہیں لیا۔ اس کے پیچھے دائیں بائیں خوب صورت لڑکیاں اور عورتیں پادری کو دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

یہ پادری دن بھر عکا میں گھومتا پھرتا رہا اور شام تک اس نتیجے پر پہنچا کہ عیسائیوں میں مسلمانوں جیسا جوش نہیں پایا جاتا اور وہ اسے معمولی جنگ سمجھ رہے ہیں۔

رات کو بطریق اعظم کو سارے دن کی روداد سے آگاہ کردیا گیا اور اپنی رائے دیتے ہوئے پادری نے کہا "اگر یہ جنگ اسی طرح لڑی گئی تو عیسائی شکست اٹھانے کے لیے تیار رہیں۔"

دوسرے پادریوں نے بھی کچھ اسی قسم کی خبریں پہنچائیں جس سے بطریق اعظم کو بہت دکھ پہنچا۔ اس نے یہ جنگ جتنے کا عقیدہ اختیار کررکھا تھا کیونکہ اس وقت عیسائی جتنی زیادہ تعداد میں عکا میں جمع ہوچکے تھے' اس سے ہر دیکھنے والے کو یہ گمان ہوسکتا تھا کہ مسلمان یہ جنگ ہار جائیں گے اور عیسائی کامل فتح حاصل کرلیں گے لیکن رئیس زادوں اور عیسائیوں نے اس وقت جو روش اختیار کررکھی تھی' اس سے عیسائیں کی کامیابی مشکوک ہورہی تھی۔

بطریق اعظم نے پادریوں کو حکم دیا کہ وہ دوسرے دن بھی سارے شہریں پھیل جائیں اور پہلے دن سے زیادہ جوش وخروش سے اپنا کام جاری رکھیں۔

○☆○

عکا میں کیا ہورہا تھا اور عیسائیوں نے محصور ہونے کے بعد مسلمانوں کے خلاف کون سی حکمت عملیاں اختیار کی تھیں اور وہ کس حد تک اس جنگ میں کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ ملک الاشرف انہی پہلوؤں پر غور کررہا تھا۔ اسے یہ بات تو معلوم ہوچکی تھی کہ عیسائیوں میں کوئی موثر منصوبہ بندی اور حکمت عملی نہیں پائی جاتی اور ان کی منجنیقیں بھی متواتر کارکردگی دکھانی سے معذور ہیں۔ اب اس نے روغن نفت کا بھی استعمال شروع کردیا اور آگ کی فلیتیں سنگ کی طرح فصیلوں پر برسائے جانے لگیں۔ اس نئی حکمت عملی سے عیسائیوں میں غلبلی مچادی۔

فصیلوں پر شگاف کے آثار پیدا ہورہے تھے لیکن ان شکست خوردہ حصوں تک پہنچنا اس لیے مشکل تھا کہ مسلمانوں اور فصیلوں کے درمیان خندقیں اور نالے حائل تھے۔ ان میں پانی موجود تھا۔ ملک الاشرف نے حکم دیا کہ آس پاس کے جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر لائی جائیں۔ اس حکم پر نہایت تیزی سے عمل کیا گیا۔ یہ لکڑیاں روغن نفت میں بھی کام آرہی تھیں اور خندقوں اور نالوں میں بھی ڈالی جارہی تھیں۔ ان سے نالے اور خندق کو پاٹنے کا کام لیا جارہا تھا۔ آخر کار اس نے یہ حکم دیا کہ کمزور اور مردار جانوروں کو بھی کاٹ کر خندقوں اور نالوں میں ڈال دیا جائے۔

اس حکم پر بھی تیزی سے عمل کیا گیا اور جو جانور کمزور تھے' انہیں کاٹ کر خندقوں اور نالوں میں ڈال دیا گیا۔ موٹے موٹے تنے بھی اسی کام میں لائے گئے۔

لیکن یہ نالے اور خندقیں اتنے وسیع اور گہرے تھے کہ ان کا اس طرح پاٹنا بہت مشکل کام تھا۔

وہ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا فصیل کے آخری سرے تک چلا گیا۔ یہاں اس نے عیسائیوں کو کچھ سست اور بے عمل دیکھا کیونکہ اس حصے سے عیسائیوں کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں کی جارہی تھی۔

ملک الاشرف نے چند منجنیقیں فوری طور پر اس جگہ منتقل کروادیں اور فوراً ہی سنگ باری اور روغن نفت سے آتش بازی کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔

عیسائیوں نے جب اس کمزور حصے میں مسلمانوں کی اتنی سخت یورش محسوس کی تو وہ گھبراہٹ کے شکار ہوگئے۔

بطریق اعظم نے خود بھی ان محاذوں کا جائزہ لیا اور عیسائیوں کو ملامتیں کیں کہ وہ اس طرح کیوں کر مسلمانوں کا مقابلہ کریں گے۔

محاذوں پر جو صورت حال تھی' اس کے اثرات شہریوں پر اس طرح پڑنا شروع ہوگئے کہ بازاروں اور گلی کوچوں میں افواہیں گشت کرنے لگیں۔ شہریں عام تاثر یہ تھا کہ فصیلیں کمزور پڑتی جارہی ہیں اور مسلمان کسی وقت بھی فصیلوں کو توڑ کر شہر میں داخل ہوجائیں گے۔ ان کے سیکڑوں جنگجو فصیلوں سے دیکھ رہے تھے کہ خندقوں کو پاٹنے کا عمل بھی زور وشور سے جاری ہے اور اگر خندقیں اور نالے کسی طرح پاٹ دیے گئے تو مسلمان فصیلوں کی شکستہ دیواروں کو بھی توڑنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور مسلمانوں کا اسلامی لشکر نہایت جارحانہ انداز میں عکا میں داخل ہوجائے گا۔

یہ افواہیں شہریوں کے سکون کو برباد کردینے کے لیے کافی تھیں۔

اب ہاسپٹلرز خود کو بے بس اور مجبور محسوس کررہے تھے۔ انہوں نے پہلے اس حکمت عملی کی مخالفت کی تھی کہ جنگ شہر کے باہر کھلے میدان میں لڑی جائے۔ اگر اس حکمت عملی پر عمل کیا جاتا تو لوگ فی الحال جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے' کھلے میدان میں جنگ لڑی جاتی تو وہ بھی جنگ میں شامل ہوتے اور اسی طرح عیسائیوں میں مذہبی جوش وخروش برقرار رہتا اور خوف طاری نہ ہوتا لیکن کئی دنوں تک جنگجوؤں کے بے کار رہنے سے ان کا جذبہ سرد پڑتا جارہا تھا جس کا بظاہر یہی مطلب لیا جاسکتا تھا کہ عیسائیوں کی اکثریت جنگ میں حصہ نہ لینے کی وجہ سے معطل تھی۔

عیسائی مختلف اکائیوں میں تقسیم تھے۔ جس سے ان پر کسی مرکزی قوت کا اثر وانتداب نہیں تھا اور یہ اکائیاں جن قوتوں کے زیر اثر تھیں' وہ قوتیں بھی برتری اور کمتری کے احساسات میں مبتلا تھیں جس سے ان کا اتحاد اور اتفاق ختم ہوگیا تھا۔ جب کہ مسلمانوں میں ایک سلطان تھا اور اس سلطان کے سب ہی سردار اور جنگجو پابند احکام سلطانی تھے۔ یہاں ایک حکم دیا جاتا تھا اور اس کی تعمیل ہوجاتی تھی۔

منجنیقوں نے فصیلوں کی دیواروں کو جگہ جگہ سے کمزور کردیا تھا مگر ان کمزور حصوں تک پہنچنا فی الحال ناممکنات میں سے تھا۔ بڑے بڑے تناور درختوں کو مویشیوں کے ذریعے کھینچ کر خندقوں تک پہنچایا جاتا اور پھر انہیں خندقوں میں گرا دیا جاتا۔ پانی کی چھینٹیں اوپر تک آتیں اور اس سے اوپر موجود لوگوں کے کپڑے تر بتر ہوجاتے۔

پھر اچانک سلطان کا حکم جاری ہوا کہ مرے ہوئے جانوروں کے ساتھ پتھر بھی خندقوں کے ان حصوں میں ڈالے جائیں جن کے سامنے فصیلوں کی دیواریں کمزور ہو چکی ہیں۔

اس پر بھی تیزی سے عمل درآمد شروع ہوا اور اسی کے ساتھ ہی نقاروں اور ڈھولوں کی آوازوں میں بھی تیزی اور شدت پیدا ہو گئی اور فصیلوں پر موجود عیسائیوں کے دلوں میں دہشت اور خوف گھر کرنے لگا۔

بطریق اعظم نے خود بھی ڈھول اور نقاروں کی آواز سے جھرجھری محسوس کی۔ یہ آوازیں کہیں قریب سے آرہی تھیں اور بطریق اعظم یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ مسلمان بہت ہی منظم اور متحد ہیں۔ اتنے زیادہ منظم اور متحد کہ وہ کبھی ان کے اس پہلو سے آگاہ نہیں ہو سکا تھا۔

اب اسے صلح کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی مگر یہ صلح کی بات چیت کس ذریعے سے سلطان سے کی جائے۔ اب اسے سلطان کے ان تین آدمیوں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو سلطان کا مکتوب لے کر بطریق اعظم سے ملے تھے اور بطریق اعظم نے ان تینوں پر نفسیاتی اثر ڈالنے کے لیے عکا کی سیر کرادی تھی۔ اس نے سلطان کو اپنی دانست میں مرعوب کرنے کا لاجواب عمل کیا تھا اور تسلی آمیز لب ولہجے میں تینوں کو مرعوب کرنے کے لیے جو کچھ کیا تھا' اس کے نتیجے میں بطریق اعظم کو اسی دس سالہ معاہدۂ امن کا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا مگر یہاں تو مسلمانوں کا طریقہ جنگ یہ بتا رہا تھا کہ مسلمان اور سلطان اپنے تینوں نمائندوں کی کسی بات سے بھی نہ تو مرعوب ہوئے اور نہ متاثر۔ ان کی جارحانہ کارروائیاں جاری تھیں۔

ان خطرناک ساعتوں میں سلطان نے اپنی صفوں میں ہلکی سی انحرافی کیفیت محسوس کرلی۔ سلطان جو بھی طریقہ جنگ اختیار کیے ہوئے تھا اور مسلمانوں نے جس طرح فصیلوں کو گرانے' دشمن کو نقصان پہنچانے اور شہریوں کو خوف زدہ کرنے کی تدابیر اور وحکمت عملی اختیار کر رکھی تھیں' اس کے نتائج فی الفور حاصل نہیں ہو رہے تھے اور کئی مملوک سرداروں کا خیال تھا کہ اس جنگ میں تیزی پیدا کی جا سکتی ہے اور عکا کو بہت جلد فتح کیا جا سکتا ہے۔ وہ خندقوں کو کسی بھی طرح جا بجا جلد عبور کرنے کے ارادوں سے سرشار تھے۔ وہ جانوں پر کھیل کر فصیلوں کی کمزور دیوار تک پہنچنے کے لیے بے قرار تھے مگر سلطان ملک الاشرف جلد بازی سے انحراف کر رہا تھا کیونکہ اسے عکا کی تسخیر میں جلد بازی پسند نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ عکا کے عیسائی کتنی ہی مدافعتی تدبیریں کرلیں' وہ مسلمانوں کے سیل بے کراں کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ عکا کی تسخیر فلاؤن کا آخری بڑا منصوبہ اور زبردست آخری خواہش تھی۔ شاید فلاؤن کو اپنی آخری ساعتوں میں یہ یقین نہ ہو کہ اس کا نوجوان بیٹا ملک الاشرف اس کی یہ خواہش پوری کردے گا۔

مملوک عمر رسیدہ سردار بھی اس وسوسے اور خیالوں میں مبتلا تھے۔ عکا کی تسخیر اتنی آسان نہیں ہے' جتنی نوجوان ملک الاشرف سمجھتا ہے۔ وہ اسے ناتجربے کار اور جذباتی سلطان سمجھ رہے تھے۔ جو عمر رسیدہ مملوک امیروں اور سرداروں کے مشورے کے بغیر اتنا بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا تھا لیکن اپنے عمر رسیدہ سرداروں کی سوچ سے آگاہ یہ نوجوان سلطان یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ بزعم خود تجربے کار سرداروں کی تجویزوں اور منصوبوں سے لاتعلق رہ کے صرف اپنی حکمت عملیوں سے عکا کو فتح کرلے گا تاکہ اس کے باپ کی روح اس کے اس کارنامے سے خوش ہو جائے۔

بطریق اعظم نے ہر گزرتے ہوئے دن اسے موجودہ دن کو عیسائیوں کے لیے بدتر محسوس کیا۔ اس کے شریر دماغ میں مسلمانوں کے خلاف جو تدبیریں اور منصوبے تھے' ان میں ایک منصوبہ اچانک القا کی طرح دل پر وارد ہوا کہ جن عیسائی عورتوں اور لڑکیوں نے رئیس زادوں' امیروں اور نائٹوں کو اپنی زلف گرہ گیر اور حسن وشباب کا اسیر کر رکھا ہے' انہیں اگر مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جائے تو شاید یہ تدبیر عیسائیوں کو بہت فائدہ پہنچائے اور عکا کی تسخیر کو مسلمانوں کے لیے مشکل اور دشوار کار ناممکن کر دیا جائے۔

اس نے اپنے اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے بڑی فکر کی اور وہ گھنٹوں اسی منصوبے پر غور کرتا رہا لیکن اس منصوبے پر اس وقت تک عمل کرنا ناممکن تھا جب تک ان عیسائی لڑکیوں اور عورتوں کو صدق دل سے اس میں شامل نہ کرلیا جائے۔

بطریق اعظم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس نے اس پادری کو طلب کرلیا جس نے رئیس زادے اور اس کی محبوبہ سے بہت سی باتیں کرکے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ان عورتوں اور لڑکیوں نے ان نازک ساعتوں میں بھی عیسائیت کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

جب یہ پادری بطریق اعظم سے ملا تو اس سے پہلا سوال یہ کیا گیا "تو نے رئیس زادے کی محبوبہ میری اور اس کے آس پاس خوب صورت لڑکیوں اور عورتوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس سے باتیں بھی کی ہیں۔ اب ان کے بارے میں تجھ سے کچھ مزید باتیں کرنا اور جاننا چاہتا ہوں۔"

پادری نے فراخ دلانہ بڑے جوش خروش سے کہا "ٹھیک ہے' آپ ان کے بارے میں جو کچھ جاننا چاہتے ہیں' پوچھیں۔ میں وہاں کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں' صاف صاف بتادوں گا۔"

بطریق اعظم نے کہا "تو مجھے یہ بتا کہ رئیس زادے کی محبوبہ اور اس کے اردگرد رہنے والی لڑکیاں اور عورتیں حسن وجمال میں کیسی ہیں؟ کیا انہیں مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے؟"

پادری نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا "کیوں نہیں مگر شاید اس بات پر آپ نے غور نہیں کیا کہ موجودہ حالات میں کچھ آپ سوچ رہے ہیں' اس پر عمل درآمد مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔"

بطریق اعظم نے کہا "نہیں' ناممکن کچھ بھی نہیں۔ اگر کوئی منصوبہ ہمارے لیے سود مند ہے تو ہم اسے کسی بھی طرح روبہ عمل لائیں گے۔"

پادری نے کہا "آپ ایک رئیس زادے کی محبوبہ کی بات کر رہے ہیں اور اس طرح آپ نے گویا یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ عورت سب سے زیادہ حسین اور کارآمد ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ اسے اس خطرناک ماحول میں مسلمانوں میں پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں کہ عکا بری طرح مسلمانوں کے محاصرے میں ہے۔ کیا ہم اس محاصرے کو توڑ کر کسی معمولی طریقے سے ان عورتوں یا لڑکیوں کو مسلمانوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ اگر ہم غلطی سے ایسا کرنا بھی چاہیں تو ان میں کئی لڑکیوں اور عورتوں کو مسلمانوں میں پہنچانا ناممکن ہوگا۔"

بطریق اعظم نے حقارت سے پادری کی باتیں گویا ہوا میں اڑا دیں اور کہا "میں ان لڑکیوں کو سلطان کے پاس نہایت ہوشیاری سے پہنچاؤں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ بظاہر یہ کام مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آرہا ہے لیکن میں یہ کام کرکے دکھاؤں گا اور اس عہد کے کئی مورخوں کو اس سچائی کو للکارنے کی ترغیب دوں گا۔ اگر میں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا تو تم دیکھنا کہ میں اس غیر معمولی کام کو کس طرح پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔"

ان کی باتوں کے درمیان ایک لڑکی اندر داخل ہوئی اور بطریق اعظم سے کہا "جناب! غضب ہو گیا۔ فصیلوں میں شگاف پڑ رہے ہیں اور کسی وقت بھی ان شگافوں کے راستے سے مسلمان عکا میں داخل ہو جائیں گے۔"

بطریق اعظم نے کہا "میں جب تک موجود ہوں' ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اس پادری کو رخصت کر دیا گیا کیونکہ اس کے زیادہ بیٹھنے سے ان پر منفی اثرات پڑ سکتا تھا۔

بطریق اعظم فصیل کے شکستہ حصے کو دیکھنے چلا گیا لیکن اس حصے کو دیکھنا مشکل تھا' فصیل کے نیچے اندرونی حصوں کو دیکھتا ہوا وہ ایک جگہ رک گیا۔ یہاں کچھ سوراخ نظر آرہے تھے جو دیوار کے ٹوٹنے سے پیدا ہو گئے تھے۔

بطریق اعظم نے اس کمزور حصے کی فصیل پر کئی منجنیقیں پہنچادیں اور حکم دیا کہ یہاں سے مسلمانوں پر مسلسل سنگ باری کی جائے۔

لیکن اب مسلمانوں نے اس حصے پر بہت زیادہ دباؤ بڑھا دیا۔ سنگ باری کے ساتھ ساتھ تیراندازی بھی شروع کر دی گئی کیونکہ مسلمانوں کو اندازہ تھا کہ یہ حصہ ان کے داخلے کے لیے مناسب ہے اور یہیں سے مسلمان عکا میں داخل ہو جائیں گے۔

بطریق اعظم نے فصیل پر موجود عیسائی جوانوں سے پوچھا "تم میں سے کوئی کسی طرح نیچے خندق کا جائزہ لے کر بتائے کہ ہم خندق سے کس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

کئی عیسائیوں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نیچے خندق کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ وہ پُر ہو گئی تھیں۔ اس میں مرے ہوئے جانور' لکڑیاں اور پتھر اتنی زیادہ تعداد میں ڈالے جا چکے تھے کہ ذرا سی مزید کوشش اور جدوجہد کے بعد مسلمان اس خندق کو عبور کر سکتے تھے۔

لیکن اسی دوران میں بطریق اعظم نے مسلمانوں کے خلاف ایک خطرناک منصوبہ بنایا۔ اس نے شہر کی حسین ترین لڑکیوں کو مسلمانوں میں بھیجنے کی منصوبہ بندی کی اور ان لڑکیوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ کسی طرح سلطان تک رسائی حاصل کرلیں۔ نیا سلطان نوجوان اور ناتجربے کار ہونے کی وجہ سے ان کے عشوہ وغمزہ کا شکار ہو سکتا ہے۔ اگر سلطان کو کسی طرح غافل کر دیا جائے اور انہیں سنگ باری سے روکا جا سکے تو عکا کی حفاظت آسانی سے کی جا سکے گی۔

لو سکنان کا رئیس زادہ نائٹوں میں ایسا پھنسا کہ اسے اپنی محبوبہ یاد نہیں آئی اور اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ بطریق اعظم نے اس کی محبوبہ کو سلطان کو رجھانے کے لیے آمادہ کرلیا ہے اور اب رئیس زادہ اپنی محبوبہ کی شکل بھی نہیں دیکھ سکے گا۔

بطریق اعظم نے اپنے مقصد کے لیے آٹھ لڑکیوں کو تیار کیا اور انہیں دیر تک یہ درس دیتا رہا کہ اس مذہبی جنگ میں جو جس حیثیت سے بھی حصہ لے گا' اسے خداوند کی خوشنودی حاصل ہوگی اور اسے آسمانی بادشاہت میں داخلے کی سعادت حاصل ہوگی۔ اس نے ان لڑکیوں کو یہ بھی بتایا کہ وہ اب تک جن گناہوں میں مبتلا رہی ہیں' انہیں بھی اس کارِ خیر کے ذریعے دھویا جائے گا۔

لو سگنان کا رئیس زادہ بطریق اعظم کی کوششوں سے لاعلم تھا۔ نائٹوں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف جدوجہد میں مشغول تھا۔ اس نے کئی منجنیقوں کی کارکردگی دیکھی تو اسے مایوسی ہوئی کیونکہ ان منجنیقوں کے لیے پتھر میسر نہیں تھے۔ وہ بھاگا ہوا نیچے پہنچا اور پتھروں کی ترسیل پر جو لوگ مامور تھے' ان کو تاکید کی کہ کسی بھی طرح پتھر مسلسل فراہم کیے جائیں۔ خواہ اس سلسلے میں پہاڑیوں کو کاٹنے میں بہت زیادہ لوگ لگا دیے جائیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی طرف سے جو پتھر آرہے تھے' انہیں بھی یکجا کرنے کا حکم دیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ عیسائیوں کی جنگی حکمت عملی اور ان کا نظم و نسق بالکل مسلمانوں کے برعکس ہے اور اس سے مسلمانوں کو شکست نہیں دی جاسکتی۔

یوں تو عکا میں صلیبیوں کی بھرمار تھی اور ہر طرف عیسائی سورما نظر آرہے تھے مگر جنگ کے معاملے میں وہ اتنے مستعد اور چاق و چوبند نہیں تھے' جتنے مسلمان نظر آرہے تھے۔

قبرص کا حکمران بھی عکا میں موجود تھا۔ اس کی فوج بھی تعداد میں بہت زیادہ تھی مگر اس کی کارکردگی ان کی تعداد کے اعتبار سے صفر تھی۔

قبرصی جنگجو کو کہ صلیبی جنگجوؤں کی اولاد تھے اور انہیں اپنے اجداد پر فخر بھی تھا مگر عکا میں آنے کے بعد یہاں کی پیشہ ور عورتوں نے انہیں کہیں کا بھی نہیں رکھا تھا اور ان کا زیادہ وقت میدانِ جنگ کے بجائے ان حسینوں کے شبستانوں میں گزر رہا تھا۔

اسی عالم میں رات کی تاریکی میں لو سگنان کی محبوبہ اور دوسری سات لڑکیوں کو قلعے کے ایک چھوٹے دروازے سے باہر نکال دیا گیا۔ یہ عورتی ڈری سہمی' آنسو بہاتی مسلمانوں کے لشکر کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ مسلمانوں کے ایک گشتی دستے نے ان عورتوں کو پکڑ لیا۔

یہ عورتیں اپنی گرفتاری کے بعد زار و قطار رونے لگیں اور مسلمانوں سے پناہ کی درخواست کی۔

اس دستے نے ان لڑکیوں کو سلطان کے خیمے میں پہنچا دیا مگر سلطان کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کو سلطان کے خیمے سے ملحق دوسرے خیمے میں بٹھایا گیا اور ان کی نگرانی کے لیے خیمے کے باہر دو آدمی تعینات کردیے گئے۔

رات میں بھی مسلمانوں کی کارروائیاں جاری تھیں اور ان کی طرف سے روغن نفت کی بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ آس پاس اور آتش گیر مادے گرنے کی جگہوں پر مسلسل روشنی ہو رہی تھی اور اس روشنی میں فصیلوں پر موجود سپاہیوں کو دیکھا جاسکتا تھا۔

سلطان کا زیادہ وقت انہی حصوں کی دیکھ بھال میں گزر رہا تھا۔ اسے محاذ جنگ پر اطلاع دی گئی کہ آٹھ عیسائی عورتیں روتی بین کرتی ہوئی سلطان کے پاس آئی ہیں' جنہیں سلطان کے ملحقہ خیمے میں دو آدمیوں کی نگرانی میں پہنچا دیا گیا ہے۔

سلطان کو فصیل کے نیچے دیوار کے اس حصے کی فکر تھی جو بہت زیادہ شکستہ ہوچکا تھا اور اس حصے سے امیدوں کے برعکس عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں پر دباؤ بہت زیادہ بڑھتا جا رہا تھا۔ فصیل کی جس دیوار کو توڑا گیا تھا' رخنے اس لائق سمجھا جا رہا تھا کہ یہاں سے مسلمان عکا شہر میں داخل ہوسکیں گے۔ سلطان نے دیوار کے متاثرہ حصے کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تقریباً بیس گز کا شکستہ حصہ ہے اور اس حصے پر مسلسل سنگ باری جاری رہتی تو اسے توڑا جاسکتا تھا۔

اس کے سامنے کی خندق بھی تقریباً اوپر تک پٹ گئی تھی اور مسلمان اس پر سے گزر کر شکستہ دیواروں تک پہنچ سکتے تھے۔

لیکن حیرت انگیز طور پر عیسائیوں نے اس حصے میں اپنا مدافعتی دباؤ بہت زیادہ بڑھا دیا اور سنگ باری کے علاوہ اطراف سے بھی تیر اندازی بھی شروع کردی اور مسلمانوں کا خندق تک پہنچنا دشوار ہوگیا۔

سلطان نے اس حصے کے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ سنگ باری جاری رکھیں اور جیسے ہی آگے بڑھنے کی گنجائش نظر آئے تو وہ خندق پار کرجائیں۔

سلطان دوسرے حصوں کا جائزہ لینے کے بعد اپنے خیمے میں صبح کے وقت پہنچا۔ خیمے کے باہر مسلمانوں نے نماز فجر ادا کی تو ایک عمر رسیدہ مملوک سردار نے سلطان کو اس کی غلطیوں سے آگاہ کیا۔ اس مملوک سردار کا کہنا تھا کہ اگر فصیل کا کوئی حصہ کمزور ہوچکا ہے تو اس پر بہت زیادہ دباؤ بڑھا دیا جائے اور دوسرے حصوں کو فی الحال نظر انداز کردیا جائے کیونکہ اس شکستہ فصیل سے اگر مسلمان عکا میں داخل



ہوجانے میں کامیاب ہوگئے تو عیسائی فصیلیں چھوڑ چھوڑ کر شہر میں داخل ہوجائیں گے اور پھر مسلمان ان کے خلاف ہر طرف سے زبردست فوجی کارروائی کرکے انہیں خوف زدہ کردیں گے جن سے ان کے حوصلے پست ہوجائیں گے۔

اسی دوران میں اندر داخل ہونے والے مسلمان کوشش کریں گے کہ شہر کا مرکزی پھاٹک کھول دیں اگر مسلمان اس میں کامیاب ہوگئے تو پھر عکا کی تسخیر آسان ہوجائے گی۔

سلطان ملک الاشرف عمر رسیدہ سردار کی تجویز سے متفق ضرور تھا مگر اسے عیسائی افواج کے بارے میں اب تک جو معلومات حاصل ہوئی تھیں' ان سے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ اگر ایک طرف سے مسلمان عکا میں داخل ہوں گے تو کسی دوسری سمت سے عیسائی باہر نکل کر مسلمانوں کے عقب میں آجائیں گے اور پھر مسلمان اندر باہر موجود عیسائی فوجوں کے نشانے میں ہوں گے۔ محاذ جنگ کا یہ نقشہ بڑا تشویش ناک تھا' اس لیے سلطان کی رائے یہ تھی کہ مسلمان شکستہ فصیل سے اندر داخل تو ہوں گے مگر کوشش یہ کریں کہ اندر لڑ بھڑ کر شہر کا مرکزی دروازہ کھول دیں۔

مملوک سردار نے بے دلی سے کہا "آپ جس ترکیب یا تجویز کا ذکر کررہے ہیں' اس سے تو اس شہر کی تسخیر میں مہینوں لگ جائیں گے۔"

سلطان نے جواب دیا "مہینوں لگ جائیں گے تو کامیابی بھی غیر مشتبہ ہوگی لیکن تو جس طریقہ جنگ کی بات کررہا ہے' اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مجھے عکا کی تسخیر فوری چاہیے اور تیری جلدی میں مجھ کو اپنی بربادی اور تباہی کا شبہ ہوتا ہے۔ میں عکا کو فتح کرنا چاہتا ہوں مگر اس طرح کہ جب تاخیر سے ہم شہر میں داخل ہوں تو عیسائی تھک کے چور ہوچکے ہوں۔ ان میں مقابلے کی سکت تک باقی نہ رہے۔"

بوڑھے مملوک سردار نے منہ بناتے ہوئے کہا "تب پھر آپ اس چھوٹے سے شہر کو فتح کرنے میں اپنی زندگی گزار دیں گے اور اس دوران میں ہمارے فوجی اتنا کھا پی جائیں گے کہ اس کے لیے سامان رسد کا ملنا بھی ایک مسئلہ ہوگا اور تاخیر سے اپنی فوج میں بھی بددلی پھیل جائے گی۔"

سلطان نے کہا "اس وقت میں سلطان ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ کس وقت مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے سامان رسد کا بھی خیال ہے۔ سپاہیوں کی بے دلی اور خوش دلی کا بھی اندازہ ہے۔ مجھے عکا کے عیسائیوں کے مذہبی جوش و خروش کا بھی علم ہے اور میں ان کی اس کمزوری سے بھی واقف ہوں کہ ان کی فوج میں کوئی ایک سپہ سالار نہیں ہے' جس کی عیسائی فوج اطاعت کرے۔ قبرصی فرانسیسیوں کا حکم نہیں مانیں گے اور ہاسپٹلرز' ٹمپلرز کی تجویز سے اختلاف کریں گے۔ نائٹ خود کو عام سپاہیوں سے برتر سمجھتے ہوئے' عام سپاہیوں کے کسی فوجی سردار کی تجویز پر عمل نہیں کریں گے جب کہ ہماری فوج میں اس قسم کی افراتفری نہیں پائی جاتی۔"

نماز فجر کے بعد اس عمر رسیدہ مملوک سردار نے سلطان کو بہت زیادہ بددل کردیا اور اس کے ذہن سے یہ بات بھی نکل گئی کہ آٹھ عیسائی لڑکیاں اور عورتیں اس کے ملحقہ خیمے میں بیٹھی اس کا انتظار کررہی ہیں۔

ادھر سے فارغ ہونے کے بعد سلطان ملک الاشرف عیسائی عورتوں کے پاس پہنچا۔ یہ عورتیں آنکھیں بند کیے خیمے میں بچھی ہوئی کھجور کی چٹائیوں پر نیم غنودگی کے عالم میں تھیں۔

انہیں بیدار کرکے بتایا گیا کہ سلطان تشریف لا رہے ہیں۔

ان سب نے اپنے اپنے ہاتھوں سے آنکھیں ملیں اور رونا شروع کردیا۔ چنانچہ جب سلطان اندر داخل ہوا تو آٹھ لڑکیاں اور عورتیں زار و قطار روتی نظر آئیں۔ سلطان حیران ہوا کہ وہ رو کیوں رہی ہیں۔

لو سگنان کے رئیس زادے کی محبوبہ میری نے سلطان کو اپنی داستان غم سنائی کہ اس پر قلعے کے اندر بڑا ظلم کیا گیا۔ ہر رئیس زادہ اس کی محبت اور نظر کرم کا خواہش مند ہے مگر وہ بیک وقت سب کو خوش نہیں رکھ سکتی تھی۔ رئیس زادوں میں رقابتیں بڑھیں تو آپس میں لڑنے جھگڑنے کے علاوہ الگ الگ میری دباؤ ڈالنے لگے کہ وہ سب سے تعلقات منقطع کرکے کسی ایک ہی ہوجائے۔

سلطان نے اس کے طولانی قصے میں اکتاہٹ محسوس کی' کہا "بات مختصر کر۔ تو مجھ سے کیا چاہتی ہے؟"

اس کے بعد سلطان نے بقیہ عیسائی عورتوں کو دیکھا اور ان سب سے ایک ہی سوال کیا "کیا تم سب اسی عورت کی طرح کسی نہ کسی مصیبت کی شکار ہو؟"

میری نے کہا "ہاں' ہم سب کے مسائل یکساں ہیں۔ ہمیں عیسائیت میں اپنے لیے فلاح و بہبود کی کوئی راہ نظر نہ آئی تو مجبوراً اس ماحول کو چھوڑنے پر ہم مجبور ہوگئے۔"

سلطان نے پھر وہی سوال کیا "تم سب مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

میری نے جواب دیا "پناہ' سلطان کے دامن عاطفت

میں پناہ۔"

سلطان نے ان کے حسن کی دل ہی دل میں داد تو دی مگر وہ یہ بھی سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اس جنگی ماحول میں ان عورتوں کو مسلمانوں کے دامن عاطفت میں پناہ لینے کی کیا سوجھی اور یہ یہاں تک آئیں کس طرح؟ شہر والوں نے ان کو نکلنے اور فرار ہونے کیونکر دیا؟ اسے میری کی داستان غم پر یقین نہیں آیا۔

باہر میدان جنگ میں ڈھول اور طبل، نقارے نہایت زور و شور سے بج رہے تھے جس سے پورا ماحول انتہائی خوف ناک ہوگیا تھا۔ یہ عیسائی عورتیں حقیقتاً ان آوازوں سے دہشت زدہ تھیں، وہ بات کچھ کہنا چاہتی تھی اور ان کی زبانوں سے نکل کچھ رہا تھا۔

میری نے سلطان سے درخواست کی "کیا آپ ان شور کرنے والوں کو کچھ دیر کے لیے منع نہیں کرسکتے کہ یہ خاموش ہوجائیں۔"

سلطان نے جواب دیا "ابھی تو تو ڈھول نقاروں کی آواز بند کرنے کی درخواست کررہی ہے اور کچھ دیر بعد کہے گی کہ جنگ رکوادی جائے۔ یہ باتیں کہاں ممکن ہیں۔"

میری نے کہا "ہم تو یہاں یہ سوچ کر آئے تھے کہ ہم عیسائیوں کے خوف زدہ ماحول سے نکل کر طاقت ور اور بہادر مسلمانوں میں سکون محسوس کریں گے مگر یہاں ڈھول اور نقاروں کی آوازیں دل دہلا رہی ہیں۔"

سلطان نے تالی بجائی اور جب جواب میں کئی خدمت گار اندر داخل ہوئے تو سلطان نے ان کو حکم دیا "جاؤ، باہر دیکھو، اونٹوں پر سوار ڈھول اور نقارے بجانے والے ہمیں قریب ہونے کی وجہ سے مجھے باتیں نہیں کرنے دیتے۔ ان کو میری طرف سے حکم دو کہ وہ اپنے اونٹوں کو دور فصیل کے قریب لے جائیں۔"

یہ خدمت گار سلطانی فرمان لے کر ڈھول اور نقارہ بردار لوگوں کے پاس پہنچے اور سلطانی فرمان گوش گزار کردیا۔

ان لوگوں نے اپنے اونٹ آگے بڑھائے اور پھر ڈھول اور نقاروں کی آوازیں پہلے کی بہ نسبت کم ہوگئیں اور اب عورتیں سلطان سے بہ آسانی باتیں کرسکتی تھیں۔

میری نے جملہ سات عورتوں کی بھی نمائندگی کی۔ اس نے بتایا "جناب! شہر کے اندر بڑی افراتفری مچی ہوئی ہے۔ عیسائیوں کے حوصلے پست ہوچکے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی نفسانی خواہشوں میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی اور وہ ہم عورتوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ان حرکتوں کو ہم مفصل آزادی سے بیان نہیں کرسکتے۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ خدا نے مسلمانوں کی شکل میں ان پر عذاب نازل کردیا ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ زار و قطار رونے لگی اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر جذباتیت اس کی زبان پکڑ لیتی ہے اور گلا اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

اسی عالم میں پرجوش حبشیوں کا ٹولہ اندر داخل ہوا۔ ان آنے والوں نے سلطان سے داخلے کی اجازت بھی نہیں لی تھی۔ سلطان کو ان کی یہ جرأت ناگوار گزری۔ یہ حبشی کچھ کہنا چاہتے تھے مگر سلطان نے ان سب کو حکم دیا کہ وہ فی الحال باہر چلے جائیں اور فرمان طلبی کا انتظار کریں۔

حبشی خیمے سے نکل گئے اور سلطان نے ان عورتوں سے پھر وہی سوال کیا "تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

میری نے جواب دیا "آپ ہمیں مسلمان کرلیں۔ اب ہم عیسائیوں میں واپس نہیں جائیں گے۔"

سلطان نے کہا "یہ تو بڑی دشوار بات ہے۔ یہاں ہمارے ساتھ مردوں کے علاوہ کوئی بھی نہیں۔ ہمارے ساتھ عورتیں بھی آئی ہیں مگر وہ محاذ جنگ سے اور خیموں میں رہ رہی ہیں۔ تم سب کو میں شام تک ان کے پاس بھیج دوں گا۔"

لیکن ایک بھی عیسائی عورت مسلم خواتین میں جانے کے لیے تیار نہ تھی اور ان سب نے ایک ہی اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر وہ مسلمان خواتین میں پہنچیں بھی تو اجنبیت کی وجہ سے مسلم خواتین معلوم نہیں ان سے کیا سلوک کریں۔ انہیں مسلم خواتین سے ڈر لگتا ہے۔

سلطان کو ہنسی آگئی "لگتا ہے۔ سبحان اللہ، تمہارے خوف کی کیا تعریف کروں کہ تم کو مسلمان مردوں میں آکے تو کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوا مگر میں مسلم خواتین میں تم سب کو بھیجنا چاہتا ہوں تو تمہیں ان سے ڈر لگ رہا ہے۔"

ایک دوسری عیسائی عورت نے کہا "آپ لوگ ہمیں کچھ دن اسی خیمے میں رہنے دیں۔ اس کے بعد جب آپ لوگ خود اپنی خواتین میں جائیں تو ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ خوف سے زیادہ بات تکلف کی ہے۔ ہم مسلمان خواتین سے واقف نہیں مگر آپ لوگوں کے ساتھ آپ کی خواتین میں جائیں گے تو بات ہی کچھ اور ہوگی۔"

سلطان کے لیے ان خواتین کو اپنے خیمے میں ٹھہرانا خطرے سے خالی بات نہیں تھی۔ چنانچہ سلطان نے ان سب کو حکم دیا "تم سب اسی خیمے میں رہو، اگر ہمیں اپنی سوجھ بوجھ، بہادری اور جنگی حکمت عملیوں سے فتح حاصل ہوگئی



اور عکا پر قابض ہوگئے تو تمہیں کہیں اور جانا نہیں پڑے گا اور تمہارا فیصلہ تمہاری مرضی سے ہوجائے گا۔"

میری نے سلطان سے درخواست کی کہ اسے سلطان کسی اور کے حوالے نہ کرے۔ وہ سلطان ہی کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔

سلطان اس وقت بہت پریشان تھا۔ وہ ان عیسائی عورتوں کو مردوں کے درمیان رکھنا نہیں چاہتا تھا مگر یہ عورتیں جس طرح رو دھو کر اپنے مصائب بیان کرچکی تھیں اور جس طرح ساتھ رہنے کی التجائیں کررہی تھیں، ان سے سلطان مجبور ہوگیا اور اس وقت وہ جس خیمے میں تھا اسی میں رہنے کی اجازت دے دی۔ ان کے خیمے کے باہر پہرہ بٹھادیا گیا۔

میری نے سلطان سے کہا "میں فی الحال تم سب کو اس خیمے میں رہنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ یہ تم سب کی بھی ذمے داری ہے کہ تم احتیاط سے کام لو اور مسلمانوں سے لاتعلق اور الگ تھلگ رہو کیونکہ میں تمام مسلمانوں کو فرشتہ نہیں سمجھتا۔"

ادھر سے فارغ ہونے کے بعد سلطان اپنے خیمے میں چلا گیا اور حکم دیا کہ باہر منتظر حبشیوں کو اس کے پاس بھیجا جائے۔

کچھ دیر بعد ان حبشیوں کو سلطان کے خیمے میں جانے کی اجازت مل گئی۔

یہ حبشی شہر کے قلعے والے حصے سے آئے تھے، انہیں امید پیدا ہوگئی تھی کہ قلعے میں شگاف پڑچکا ہے اور اس کے بعد لازمی طور پر یہ ہوگا کہ مسلمان قلعے میں داخل ہوجائیں گے لیکن داخلے کے لیے ان سب کو بہت زیادہ آدمی درکار ہوں گے اور اس وقت ان حبشیوں کے پاس اتنے زیادہ آدمی نہیں تھے۔

چنانچہ ان سب نے جب زیادہ آدمیوں کا مطالبہ کیا تو سلطان کی آنکھوں میں خوشی سے چمک پیدا ہوگئی اور اس نے نہایت پرجوش لہجے میں کہا "تم لوگ قلعے یا شہر کو فتح تو کرو پھر تمہیں جتنے آدمی بھی درکار ہوں گے، ہم مہیا کردیں گے لیکن خیال رہے کہ شہر یا قلعے میں داخلے کے بعد تم عورتوں، بوڑھوں اور بچوں اور بیماروں کے ساتھ زیادتی نہیں کرو گے۔ انہیں امان دی جائے گی۔"

حبشیوں نے بڑی بے قراری سے کہا "ہم لوگ شہر میں داخلے کا اعزاز اپنے نام رکھنا چاہتے ہیں اور ہم کبھی یہ برداشت نہیں کریں گے کہ قلعے میں داخل ہونے کی کوشش ہم کریں اور اسی دوران میں چالاک لوگ ہمیں پیچھے چھوڑ کر خود اندر داخل ہوجائیں۔"

سلطان نے کہا "لیکن تم کسی کو خود سے پہلے داخل کیوں ہونے دو۔ اگر کچھ مسلمان تمہیں پیچھے چھوڑ کر شہر میں پہلے داخل ہونے میں کامیاب ہوجائیں تو ہمیں ان کی لیاقت، قابلیت، صلاحیت اور بہادری پر فخر کرنا چاہیے۔ یہ جنگیں کسی اصول اور اخلاقی ضابطے میں نہیں لڑی جاتیں۔ یہ اس دوڑ کے مصداق ہوتی ہیں جو اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ دینے کی جدوجہد میں کچھ بھی کر گزرتے ہیں اور کامیابی کے بعد کسی کو بھی اس کی کامیابی پر احساس ندامت نہیں ہوتا۔ تم ہم سے گلہ شکوہ یا کسی بھی قسم کی پیش بندی کے بجائے آگے بڑھو اور سب سے پہلے شہر یا قلعے میں داخل ہونے کا اعزاز حاصل کرلو۔"

ایک حبشی نے ذرا تکلف کے ساتھ عیسائی خواتین کے بارے میں پوچھا "یہ عیسائی عورتیں اس دھواں دار میدان جنگ میں یہاں کیا لینے آگئیں؟"

سلطان نے تحمل سے کہا "تم اپنے کام سے کام رکھو۔"

یہ حبشی واپس چلے گئے اور سلطان نے عیسائی خواتین کی نگہبانی کرنے والوں کو سختی سے ہدایت کردی کہ ان عیسائی خواتین کے پاس کسی مسلمان کو نہ جانے دیا جائے۔

لیکن ان خواتین کا آناً فاناً اتنا شہرہ ہوگیا کہ بہت سے مسلمانوں میں ان کے لیے جستجو پیدا ہوگئی۔ وہ انہیں ایک نظر دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے۔ حبشیوں نے ان کا جگہ جگہ اتنا چرچا کردیا کہ ان خواتین سے واقف ہوجانے والوں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی جو مسلمان سنجیدگیوں پر نعمتیں تھے اور وہ مسلسل کارگزاری دکھا رہے تھے اور تھکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ اب انہیں تکان محسوس ہونے لگی اور اب وہ کچھ دیر کے لیے سنجیدگیوں سے دور جاکے سستانا چاہتے تھے۔

ان عیسائی خواتین کے خیمے کے باہر سپاہیوں کی آمدورفت میں اضافہ ہوگیا۔

قطبونا نامی مملوک سردار کو ان عیسائی خواتین کی موجودگی سے الجھن ہورہی تھی، وہ پہلے ہی اس نوجوان سلطان سے منافقانہ عناد رکھتا تھا اور اسے ملک الاشرف کی تدبیروں اور تجویزوں سے شدید اختلاف تھا۔ اب جو اسے ان عیسائی خواتین کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے دوسرے مملوک سرداروں سے کہا "یہ اپنے نوجوان سلطان کو کیا سوجھی کہ ان عیسائی خواتین کو اپنے ملحقہ خیمے میں آباد کردیا۔"

جن مملوک سرداروں کو ملک الاشرف سے عقیدت تھی اور وہ قلاؤن کے بیٹے کو اس کے مرتبے اور مقام سے نیچے لانا پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے قطبوغا کو منع کیا کہ وہ میدان جنگ میں ایسی باتیں نہ کرے جس سے فوج میں سلطان کے بارے میں بد ظنی پیدا ہو جائے۔

قطبوغا نے جنوبی محاذ سنبھال رکھا تھا لیکن وہ محاذ کے بجائے بار بار سلطان سے ملنے اور مشورہ کرنے سلطان کے خیمے کے چکر لگا رہا تھا۔ اسے خیمے کے پہرے داروں نے بتایا کہ سلطان کا زیادہ تر وقت عکا شہر اور قلعے کے آس پاس گزر رہا ہے اور اس کا اپنے خیمے میں گزر بہت کم ہوتا ہے۔

قطبوغا نے ملحقہ خیمے میں زبردستی داخل ہونے کی کوشش کی تو اس خیمے کے نگہبانوں نے اسے باہر ہی روک دیا۔

قطبوغا نے پوچھا "میں اندر کیوں نہیں جا سکتا؟ کیا یہ کوئی ایسی ممنوعہ جگہ ہے جہاں سلطان کے علاوہ کوئی نہیں جا سکتا؟"

پہرے داروں نے جواب دیا "ہمیں یہ سب تو نہیں معلوم، بس اتنا جانتے ہیں کہ اندر آٹھ عیسائی خواتین نے پناہ لی ہوئی ہے۔"

اس شخص نے عورتوں کے خیمے میں داخل ہونے کے بعد پہرے داروں سے کہا "تم لوگ سلطان کا خیال رکھو، جیسے ہی سلطان کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہو، مجھے فوراً خبر کر دو۔"

پہرے داروں کو قطبوغا کی یہ باتیں بہت بری لگ رہی تھیں کیونکہ یہ سب سلطان کے سامنے جواب دہ تھے مگر قطبوغا کا رویہ کچھ ایسا تاثر دے رہا تھا، گویا وہ سلطان کا شریک حکومت ہے۔"

ایک پہرے دار نے کہا "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

قطبوغا نے جواب دیا "میں وہی کر رہا ہوں، جو مجھے کرنا چاہیے۔ تمہیں گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود جواب دے لوں گا۔"

قطبوغا کے اس جواب سے کوئی پہرے دار بھی مطمئن نہیں ہوا لیکن انہیں قطبوغا کی حیثیت سے ڈر لگتا تھا۔ یہ خود سر اور مغلوب الغضب مملوک کسی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا اور سلطان کو گہری نیند سونے کی حالت میں بھی بیدار کرنے کی جرأت کر سکتا تھا۔

قطبوغا نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا "میں میدان جنگ میں عورتوں کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتا اور وہ بھی عیسائی عورتیں؟ وہ یہاں کیا لینے آئی ہیں؟"

قطبوغا کی آواز نے عیسائی خواتین کو بھی چوکنا کر دیا۔ وہ سوچنے لگیں کہ یہ سلطان کے علاوہ کون ہے، جو ان کے خیمے میں داخل ہو کے زور زور سے باتیں کر رہا ہے۔

میری نے اپنی ساتھی خواتین سے کہا "مجھے تو یہاں آ کے اپنے منصوبے میں کامیابی نظر نہیں آتی کیونکہ سلطان ہماری روداد سننے کے بعد غائب ہو گیا اور ایسا لگتا ہے کہ اس نے ہمارا اثر قبول ہی نہیں کیا۔"

کیتھرائن نامی نوجوان لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا کہ سلطان پر ہم میں سے کسی کا کوئی اثر ہی نہ ہوا ہو۔"

میری نے کہا "اب یہ شخص شور و غل کرتا ہوا آیا ہے۔ پتا نہیں کون ہے لیکن دیری سے یہی لگتا ہے کہ اسی بھی سلطانی مساواتی اختیارات حاصل ہیں کہ اسے سلطان سے ڈر نہیں لگا۔"

قطبوغا نے بہ آواز بلند انہیں حکم دیا "عورتو! ادھر آؤ میرے پاس اور مجھے بتاؤ کہ تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

میری نے کیتھرائن کا ہاتھ پکڑا اور بقیہ عیسائی خواتین سے کہا "تم سب یہیں بیٹھی رہو۔ ہم دونوں اس سے بات کر لیں گے۔"

یہ دونوں قطبوغا کے سامنے پہنچ گئیں۔ اس نے ادب سے سلام کیا اور پوچھا "آپ ہم سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

قطبوغا نے کہا "اس دھواں دھار میدان جنگ میں جہاں ہماری طرف سے روغن قلت اور پتھروں کی بارش ہو رہی ہے۔ باہر نکل کے دیکھو، جگہ جگہ زمین سیاہ پڑ گئی ہے۔ اونٹوں پر سوار رفتار چی اور ڈھول پیٹنے والے لوگوں کے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہے ہیں۔ اس مہیب ماحول میں تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

کیتھرائن نے نہایت چستی سے پتلیوں کو حرکت دی اور مسکراتے ہوئے شرمیلے لہجے میں جواب دیا "ہمیں عیسائیوں نے عکا سے نکال دیا۔ وہ ہم سے بے جا تعلقات رکھتے تھے۔ ہمیں پیشہ ور بنانا چاہتے تھے۔ ہم نے احتجاجاً عکا کو ہی چھوڑ دیا۔"

قطبوغا نے کیتھرائن کو دیکھا اور اس کی باتیں سنیں تو معلوم ہوا کہ وہ واقعی قیامت ہے۔

قطبوغا خود کو کیتھرائن سے نہیں بچا سکا۔ بطور خاص اس سے پوچھا "تو یہاں کیا لینے آئی ہے؟ کیا ہم مسلمانوں سے شادی کرنا پسند کرے گی؟"



کیتھرائن نے برجستہ جواب دیا "کیوں نہیں، جب ہم نے مکا چھوڑ دیا، بطریق اعظم سے نفرت کا اظہار کیا، نائٹوں، ہاسپٹلرز، عکا کے بادشاہ، سب ہی کو نظر انداز کر دیا کیونکہ ہمیں ان کے اطوار پسند نہیں تھے۔ مسلمانوں کے دامن عاطفت میں پناہ لے لی تو ان میں رہنے کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ مسلمان ہو جانا، اور مسلمانوں سے شادیاں کر لینا۔"

میری، کیتھرائن کی دلیرانہ گفتگو پر حیران رہ گئی۔

قطبوغا نے کچھ آسرا دیکھا تو بالکل کیتھرائن کے روبرو کھڑے ہو کے پوچھا "میرے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟"

کیتھرائن نے جواب دیا "مجھے ایسے آدمی پسند ہیں جو وسیع اختیارات رکھتے ہوں اور حکومت اختیارات کے مالک ہونے کے علاوہ بہادر، حوصلہ مند اور اچھی شہرت کے مالک ہوں۔"

قطبوغا نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مجھ میں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں۔"

میری نے کیتھرائن کو مزید باتیں کرنے سے روک دیا۔ "ہم فی الحال تمہارے سلطان کے مہمان اور پناہ گزین ہیں۔ ہمیں کچھ پتا نہیں کہ سلطان کا ہمارے لیے کیا حکم ہوگا۔"

قطبوغا نے کہا "سلطان ابھی ناتجربے کار ہے اور ہم سب اس کے مشیر اور معاون ہیں۔ اگر ہم تم میں سے کسی کو پسند کر لیں گے تو سلطان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

اسی دوران میں سلطان بھی وہاں پہنچ گیا اور قطبوغا کو دونوں سے مصروف گفتگو دیکھ کر چراغ پا ہو گیا، پوچھا "تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

قطبوغا نے ڈھٹائی سے جواب دیا "مہمانوں کی مزاج پرسی کرنے آیا تھا۔"

کیتھرائن اور میری، قطبوغا کے جواب سے حیران رہ گئیں کہ یہ واقعی سلطان سے سلطانی لب و لہجے میں باتیں کر رہا ہے۔

سلطان نے حکم دیا "اب تو یہاں سے چلا جا۔"

قطبوغا نے جواب دیا "چلا جاؤں گا، پریشان نہ ہوں۔"

سلطان نے کہا "میں کیا کہہ رہا ہوں، تو فوراً یہاں سے چلا جا۔"

قطبوغا نے کہا "پہلے آپ مجھ سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کر لیں کہ ان عورتوں کے بارے میں کیا کرنا چاہیے۔"

سلطان نے کہا "تو ہمیشہ کچھ اسی طرح باتیں کرتا ہے جس سے میری تضحیک اور تذلیل ہونے لگتی ہے۔ آخر اس طرح کا تیرا رویہ کیا ظاہر کرتا ہے۔"

قطبوغا نے کہا "سلطان! میں شروع سے یہی کہہ رہا ہوں کہ آپ ابھی ناتجربے کار ہیں۔ میدان جنگ میں آٹھ عیسائی عورتوں کی موجودگی سے ہم میں انتشار پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کا میدان جنگ میں ہمارے آس پاس موجود رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ یہ کوئی فتنہ نہ کھڑا کر دیں۔ اس لیے ان سب کا جلد از جلد کوئی بندوبست کر دیا جائے۔ یہ لڑکی مجھے پسند ہے۔ میں اس سے شادی کر سکتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے کیتھرائن کی طرف اشارہ کیا۔

سلطان نے حکم دیا "تو اسی وقت یہاں سے چلا جا۔ تو نے ان عورتوں کے سامنے اپنی جس جسارت کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے یہ عورتیں ضرور متاثر ہوئی ہوں گی مگر اب میں تجھے یہاں سے نکال کر اور تیری کسی اور سے شادی کرا کے ان عورتوں کو یہ بتاؤں گا کہ تیری ہم میں کیا حیثیت ہے۔ تو اپنی عمر رسیدگی کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔"

قطبوغا نے اپنی بے عزتی ہوتے دیکھی تو کیتھرائن کی ٹھوڑی پکڑلی اور اس کے چہرے کو ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "میں تجھ سے شادی ضرور کروں گا۔"

قطبوغا وہاں سے نکل گیا اور ملک الاشرف نے دونوں کو سمجھایا "دیکھو، یہ شخص صحیح الدماغ نہیں ہے۔ اسے اپنے تجربے کار ہونے کا بڑا خیال رہتا ہے اور اسی قسم کی فضول اور بے معنی باتیں کرتا رہتا ہے۔ میں اسے اب مزید باتیں کرنے کے لیے نہیں چھوڑوں گا۔"

سلطان نے کیتھرائن سے پوچھا "کیا تو اس عمر رسیدہ شخص سے شادی کر کے خوش رہے گی؟"

کیتھرائن نے جواب دیا "مجھے صاحب حیثیت اور اقتدار والے لوگ پسند ہیں جب کہ نوجوانوں میں ایسے لوگ نہیں ملیں گے۔"

سلطان نے کہا "تجھے معلوم ہے کہ یہ شخص جیسی گستاخانہ باتیں کر گیا ہے، اس سے اس کو بھی ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔"

کیتھرائن نے سلطان کی خوشامد کی "مجھے یہ شخص پسند ہے۔ آپ اسے معاف کر دیں۔"

میری نے کیتھرائن کو سمجھایا "تو سلطان کی مہمان ہے۔ اس لیے تجھ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہییں۔ یہ سلطان کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ جس سے مناسب سمجھے گا، تیری شادی کر دے گا۔"

کیتھرائن نے نہایت بے باکی سے سلطان سے پوچھا "آپ مجھ سے شادی کریں گے؟"

سلطان نے میری کی طرف دیکھا اور یہ تاثر دیا کہ وہ میری سے شادی کر سکتا ہے اسی لیے کیتھرائن سے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

کیتھرائن نے بادشاہ کا مفہوم سمجھ لیا اور کہا "جب سلطان مجھ سے شادی نہیں کر سکتے جو نوجوان بھی ہیں تو مجھے اس عمر رسیدہ بہادر سے شادی کر لینے دیں۔"

سلطان نے کہا "لڑکی، تو ہماری مہمان ہے اس لیے تجھے کچھ نہیں معلوم کہ تجھے ہم میں رہنا بھی ہے یا عیسائیوں میں واپس چلا جانا ہے۔"

میری نے کہا "خیر، میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی ہوں۔ اس لیے سلطان کو بھی اپنے دل و دماغ سے یہ خیال نکال دینا چاہیے کہ ہمیں مسلمانوں میں آنے کے بعد واپس بھی چلا جانا ہوگا۔"

سلطان نے کہا "مجھے اپنے دل و دماغ سے کیا نکال دینا چاہیے اور کیا نہیں نکالنا چاہیے اس کا فیصلہ میں کروں گا۔ فی الحال قطبوغا کو اس کے منصب سے الگ کر دیا جائے گا۔"

کیتھرائن نے کہا "آپ ایسا نہ کیجیے۔"

میری نے کیتھرائن کو سمجھایا "ہم سلطان سے درخواست تو کر سکتے ہیں مگر اپنی درخواست کو منوانے پر سلطان پابندی نہیں کرا سکتے۔"

سلطان نے پہرے داروں کو خواتین کے سامنے بلوا کے ڈانٹ دیا "تم سب کس قسم کی پہرے داری کرتے ہو کہ قطبوغا تمہارے ہوتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔"

ایک پہرے دار نے کہا "ہم نے تو اسے روکا تھا مگر وہ ہماری پروا کیے بغیر ہمیں کہنیوں سے ہٹاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت تو ہمیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ قطبوغا اتنی دلیری سے اندر داخل ہو رہا ہے تو وہ سب اپنی مرضی سے کر رہا ہے یا آپ سے اجازت لے کر یہاں آیا ہے۔ اسی غلط فہمی میں وہ یہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔"

سلطان نے کہا "آئندہ ایسی غلطی نہ ہو، ورنہ جرأت کا مظاہرہ.... کرنے والا اور اس مظاہرے میں اس کا ساتھ دینے والا دونوں قتل کر دیے جائیں گے۔"

سلطان نے اپنا حکم سنا کر چلا گیا اور عیسائی خواتین میں کھلبلی مچ گئی لیکن قطبوغا اور سلطان کی چپقلش کھل کر جو عیسائی خواتین کے سامنے آئی تو انہیں موقع ملا کہ وہ اس چپقلش سے فائدہ اٹھائیں اور اس طرح بطریق اعظم کے منصوبے کو کامیاب بنائیں۔

○☆○

قطبوغا نے دوبارہ کیتھرائن اور میری سے ملنے کی کوشش کی مگر پہرے داروں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔

لیکن قطبوغا کو اپنی تجربے کاری اور عمر رسیدگی پر ناز تھا۔ گویا وہ سلطان کو بالکل ہی ناتجربے کار سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے حلقہ احباب میں سلطان کی مخالفت شروع کر دی۔ اسے سلطان کی مسلسل سنگ باری بھی پسند نہیں آ رہی تھی کیونکہ اس کے لیے بہت زیادہ، مسلسل پتھروں کی ضرورت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سلطان کو اپنی منجنیقوں سے مسلسل کام نہیں لینا چاہیے کیونکہ اسی منجنیقوں کے لیے جتنے پتھر درکار تھے، ان پر قرب و جوار کی پہاڑیوں میں مسلمانوں کی بڑی تعداد کام کر رہی تھی۔ یہ پتھروں کو پہاڑیوں سے کاٹ کر لانے والے اگر فوج میں رہ کر حملہ آوری کی جنگ میں شریک ہوتے تو ان کی مدد سے مسلمانوں کو بہت فائدے حاصل ہو سکتے تھے مگر قطبوغا کے بقول اس ناتجربے کار سلطان میں اتنی دور اندیشی ہی نہیں تھی حالانکہ عیسائیوں کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ جو جنگ لڑ رہے ہیں، اس میں تاخیر تو ہو سکتی ہے مگر مسلمانوں کو فتح مندی سے نہیں روکا جا سکتا۔ سلطان یہ فتح جلدی حاصل کر سکتا ہے۔

کئی دن کی مسلسل کوششوں کے بعد بھی جب قطبوغا کی کیتھرائن سے ملاقات نہ ہو سکی اور کسی قسم کا رابطہ قائم نہ ہوا تو قطبوغا نے فوج میں سلطان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ وہ برملا یہ کہتا پھر رہا تھا کہ جس طرح سلطان ملک الاشرف عکا کو تسخیر کرنا چاہتا ہے، اس سے تو یہ اپنی پوری زندگی گزارنے کے بعد بھی کامیاب نہیں ہوگا۔ اس نے اپنی ہی فوج میں یہ خفیہ سازشیں شروع کر رکھی تھیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوج دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ ملک الاشرف کا ساتھ دے رہا تھا اور دوسرا حصہ قطبوغا کا ہمنوا تھا لیکن سلطان نے منجنیقوں والوں کو اپنے کام میں مسلسل مشغول رکھنے اور اس میں کسی قسم کا تساہل نہ برتنے کا رویہ برقرار رکھا۔ جس سے فصیلوں کو مسلسل نقصان پہنچتا رہا لیکن پھر اچانک قرب و جوار کی پہاڑیوں سے پتھر ڈھو ڈھو کر لانے والوں کی کارکردگی میں کمی واقع ہو گئی، اس کے پیچھے بھی قطبوغا کا ہاتھ تھا۔

اس کے علاوہ اس نے عکا کے عیسائیوں سے بھی بات چیت شروع کر دی اور اس نے عیسائیوں کو اطمینان دلایا کہ

اگر وہ ثابت قدمی سے ڈٹے رہے اور شب و روز کا خیال نہ کیا تو سلطان ناکام اور مایوس ہو جائے گا۔

بطریق اعظم بھی جان چکا تھا کہ ان کا واسطہ جن لوگوں سے پڑا ہے' انہیں میدان جنگ میں شکست نہیں دی جا سکتی اور اس کی بھیجی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں نے جو کام شروع کر رکھا ہے' اس سے مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو چکا ہے۔ فوج دو حصوں میں بٹتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ یہ مسلمانوں کے حق میں خطرناک مرحلہ ہے۔

بطریق اعظم عیسائی لڑکیوں اور عورتوں کو کوئی پیغام یا تجویز نہیں بھیج سکتا تھا۔ اس نے بڑی کوششیں کیں کہ کوئی رابطہ یا واسطہ میسر آ جائے۔ بالآخر اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے قطبوغا کے آدمیوں سے کام لینے کا منصوبہ بنایا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ابھی تک قطبوغا کے آدمیوں سے واقف نہیں تھا اور یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ بطریق اعظم کو یہ امید تھی کہ قطبوغا کا کوئی نہ کوئی آدمی بطریق اعظم سے ملنے ضرور آئے گا۔ وہ کئی دن تک اسی فکر میں کبھی فصیلوں پر پہنچ جاتا اور کبھی قلعے میں یا کبھی باہر سے کسی تیر کا منتظر رہتا کیونکہ قطبوغا اب تیر ہی کے ذریعے بطریق اعظم کو اپنا پیغام بھیج سکتا تھا۔ اس نے فصیلوں اور فصیلوں کے اندر تعینات سپاہیوں اور کارکنوں کو ہدایت کر دی کہ وہ باہر سے آنے والے کسی بھی تیر کو ضائع نہ کریں کیونکہ درپردہ سلطان سے صلح کی کوشش ہو رہی ہے اور یہ خط اگر کسی اور کے ہاتھ لگ گیا تو اس سے عکا کو سخت نقصان پہنچ جائے گا۔

چنانچہ ایک دن بطریق اعظم کو ایک ایسا تیر مل ہی گیا۔ اس خط میں جو تیر کے ذریعے فصیل پر پہنچایا گیا تھا' بطریق اعظم کو بتایا گیا کہ میری اور کیتھرائن اپنے منصوبے میں کامیاب ہو چکی ہیں اور وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب اسلامی فوج آپس میں ہی لڑ بھڑ کر تباہ و برباد ہو جائے گی۔ عکا کا محاصرہ اٹھ جائے گا اور مسلمان اپنی اپنی جگہوں پر واپس چلے جائیں گے۔ یہ خط میری کا تھا جسے قطبوغا کی مدد سے بھیجا گیا تھا۔

بطریق اعظم نے ایک بار پھر اپنے سپاہیوں کو دیکھا اور ان کی کارکردگی کا اندازہ لگایا کہ اگر مسلمانوں کو واقعی خانہ جنگی کی مصیبت نے گھیر لیا اور یہ شدت اختیار کر گئی تو اس سے زیادہ خوش قسمت دن عیسائیوں اور عکا والوں کو دوبارہ نہیں مل سکتا تھا۔

مسلمانوں کی منجنیقوں کی کارکردگی میں فرق آ گیا۔ قرب و جوار کی پہاڑیوں میں پتھروں کے کاٹنے والے سستی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

سلطان ملک الاشرف اس تغیر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اسے صرف اس بات پر حیرت تھی کہ قطبوغا نے قاہرہ میں ملک الاشرف کا بہت ساتھ دیا تھا۔ جب وہاں مملوکوں کا ایک حلقہ اس کی سلطانی کے خلاف آوازیں بلند کر رہا تھا تو اس وقت قطبوغا اس کی حمایت کر رہا تھا۔ اب عکا کے محاذ پر اس نے سلطان کی مخالفت شروع کر دی تھی اور اس مخالفت میں اتنی وسعت اور پھیلاؤ آ گیا کہ قطبوغا کے بہت سے ہمنوا بھی پیدا ہو گئے اور ان ہمنواؤں کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہونے لگا۔

ملک الاشرف نے وہی ترکیب استعمال کی جو پہلے مبیرس اور قلاؤون کام میں لاتے رہے تھے یعنی فوج میں اپنے انتہائی قابل اعتبار جاسوس چھوڑ دیے۔ یہ جاسوس مذہبی علما اور جہاد کی تلقین کرنے والے بھی تھے اور وہ بھی جنہیں گفتگو کا فن آتا تھا اور لوگوں کو اپنی باتوں سے متاثر اور قائل کر لیتے تھے۔

ان میں وہ لوگ بھی تھے جو دوست بنانے میں ماہر تھے اور دوسروں سے دلی راز اگلوا لیتے تھے۔

اب اسلامی لشکر میں جنگی مصروفیات اور [illegible] کے علاوہ دوسرے مشاغل بھی پیدا ہو چکے تھے اور بحیثیت مجموعی یہ فوج کسی ایک مقصد پر متحد اور ہم خیال نہیں تھی۔ قطبوغا نے رشوت سے کام لیا کہ اس طرح اس کا کیتھرائن سے رابطہ قائم ہو جائے اور کیتھرائن اور میری نے قطبوغا کے تعاون سے تیر کے ذریعے بطریق اعظم کو پیغام بھیج دیا کہ میری اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اسلامی فوج میں جو تقسیم ہو گئی ہے' وہ روز بہ روز بڑھتی جائے گی اور بالآخر عیسائیوں کو اسی تقسیم سے وہ فائدہ حاصل ہو جائے گا جو عیسائی خواہش مند ہیں۔

سلطان ملک الاشرف نے جب اپنے چھوڑے ہوئے جاسوسوں سے یہ معلومات حاصل کر لیں کہ فوج میں انتشار اور نااتفاقی کا جو زہر تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے' اس کا روح رواں قطبوغا ہے اور اسے روکا نہ گیا اور اس سازش کا حکمت عملی سے کوئی موثر توڑ نہ کیا گیا تو مسلمانوں کے قدم اکھڑ جائیں گے اور کسی دن بھی عکا کے جنگجو اپنے قلعے اور شہر سے باہر نکل کر میدان جنگ میں مسلمانوں کا مقابلہ کر کے غداروں کے ذریعے ہمیں شکست دے دیں گے۔

یہ لمحہ فکریہ نہیں تھا بلکہ لمحات فکری تھے' جن کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔



سلطان نے اس معاملے میں کسی سے مشورہ بھی نہیں کیا کیونکہ اسے اب اپنی فوج کے کسی بھی مملوک اور غیر مملوک سردار پر بھروسا نہیں تھا۔ اسے میدان جنگ میں اب سارے فیصلے خود ہی کرنے تھے۔ اسے اب یہ فکر پریشان کر رہی تھی کہ اگر عکا کو فتح نہ کیا جا سکا تو اس کے باپ کی روح کو بڑی تکلیف پہنچے گی اور دنیا بھر کے عیسائیوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ ان میں جو یہ خیال پیدا ہو چکا ہے کہ مسلمانوں میں مبیرس اور قلاؤون کے بعد کوئی لائق حکمران یا فوجی سپہ سالار باقی نہیں رہا اور یہ نوجوان سلطان تو بالکل ہی ناتجربہ اور ناتجربے کار سلطان ہے۔ اسے شکست دے دینا عیسائیوں کی متحدہ قوت کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ اس طرح نوجوان سلطان ملک الاشرف کی ہوا اکھڑ جائے گی اور وہ اپنی فوج میں بھی غیر اہم اور ناپسندیدہ شخصیت قرار پا جائے گا اور قاہرہ کے لوگ بھی اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں گے۔ لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہو جائے گی۔ سازشوں کے در کھل جائیں گے اور یہ سازشیں میں سب سے آگے آگے رہنے کے لیے آپس میں خون خرابہ بھی ہو سکتا ہے۔ خلیفہ کسی کا یہ خیال بھی ہو سکتا ہے۔

ان اندیشوں نے سلطان ملک الاشرف کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ ان نازک لمحات میں سلطان نے جو خاص فیصلہ کیا وہ تھا آپس میں لڑنے سے گریز۔ اس تلخی اور شرارت کو محبت' خوش اخلاقی' مروت اور تحمل سے جھیل جانا اور اپنے اوصاف کی مدد سے قطبوغا کو اس کی حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کرنا۔ اسے ایک تجربے کار مملوک سردار کی حیثیت سے آگے آگے رکھنا۔ اس کی اہمیت اور برتری کو وقتی طور پر تسلیم کر لینا۔ اسے یہ یقین دلا دینا کہ اس کی شادی کیتھرائن سے کر دی جائے گی۔ یہی وہ حربے تھے' جن سے وہ قطبوغا کے دل و دماغ کو جیت سکتا تھا۔

چنانچہ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ کیتھرائن' میری اور ان کی چھ ساتھی خواتین کو اس نے میلوں دور وہاں روانہ کر دیا جہاں مسلمانوں کی خواتین اور رشتے دار ٹھہرے ہوئے تھے۔

اس کے بعد اس نے قطبوغا کو ایک خاص محاذ جنگ پر لے جا کے کھڑا کر دیا اور کہا "مسلسل ناکامیوں کے بعد یہ احساس غالب آ گیا ہے کہ مجھے تم جیسے تجربے کاروں سے فائدہ اٹھانا چاہیے ورنہ مجھے اپنی انتہائی طاقت کے باوجود شکست ہو جائے گی۔"

ابھی تک قطبوغا کو یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ میری' کیتھرائن اور ان کی ساتھی چھ عیسائی خواتین کو میلوں دور سلطانی رشتے دار خواتین میں پہنچا دیا گیا ہے۔

قطبوغا نے یہ نئی ذمے داری قبول تو کر لی مگر ساتھ ہی سلطان کو مشورہ دیا "آپ عکا کی تسخیر سے اس لیے باز آ جائیں کہ اب ہمیں جذباتی انداز زندگی سے گریز کرنا چاہیے اور کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مسلمان اور عیسائی مل جل کر رہیں۔ آپ چاہیں تو میں عکا جانے کو تیار ہوں۔ وہاں بطریق اعظم' قبرص کے بادشاہ' پاپ لیز اور ٹمپلرز کے گرینڈ ماسٹروں سے مفاہمت کی بات کر سکتا ہوں۔"

سلطان نے پوچھا "تجھ کو یہ نیا فکری انداز کہاں سے ملا؟ یا تجھے مفاہمانہ روش اختیار کرنے کی ترغیب کس نے دی؟ عکا کا محاصرہ سلطان قلاؤون کی خواہش کے مطابق کیا گیا ہے اور ہم اس سلسلے میں عیسائیوں سے مفاہمت نہیں کر سکتے۔"

قطبوغا نے اپنی ضد برقرار رکھی اور کہا "آپ میری باتوں پر غور کر کے کوئی فیصلہ کریں۔ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم عیسائیوں سے رشتے داریاں قائم کر لیں۔ باہمی شادیوں سے رشتے داریاں قائم کی جا سکتی ہیں اور یہ سلسلہ جتنی وسعت اختیار کرے گا' ہم دونوں ایک دوسرے میں گھلتے ملتے چلے جائیں گے۔"

سلطان نے کہا "قطبوغا! میرے پاس ان فضول باتوں کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔ جن رشتے داریوں کی تو بات کر رہا ہے' کیا مسلمان لڑکیاں یا عورتیں عیسائی مردوں سے شادیاں کر سکتی ہیں؟"

قطبوغا نے کہا "نہیں لیکن عیسائی لڑکیاں اور خواتین تو مسلمانوں سے شادی کر سکتی ہیں؟"

سلطان نے کہا "ایسا مسلسل اور مستقلاً ہونا ممکن نہیں۔ اگر ہم مخلوط رہن سہن اختیار کریں گے تو ہماری عورتیں اور لڑکیاں بھی عیسائی گھرانوں میں منتقل ہونا شروع ہو جائیں گی اور اس وقت میرے پاس حالت جنگ میں اس وسیع اور خطرناک مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے وقت بھی نہیں ہے۔ اگر تو کیتھرائن سے اور کیتھرائن تجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے تو میں یہ کام کروا دوں گا۔ اس سلسلے میں بطریق اعظم کو بیچ میں ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ میں نے عیسائی لڑکیوں اور عورتوں کو میلوں دور اپنی عورتوں اور رشتے داروں میں بھیج دیا ہے۔ ہم پہلے عکا کو فتح کریں گے اور اس کے بعد عکا کی جامع مسجد میں تیری شادی کیتھرائن سے کر دیں گے۔"

سلطان کے ان انکشافات' دلائل اور ارادوں سے واقف ہونے کے بعد قطبوغا نرم پڑ گیا اور اس کی ساری منصوبہ بندی دیکھتے ہی دیکھتے خاک میں مل گئی۔

اس نے حیرت اور بے بسی سے پوچھا "ان عیسائی عورتوں اور لڑکیوں کو اگر عگا واپس بھیج دیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔"

سلطان نے جواب دیا "انہوں نے عیسائیوں میں واپس جانے سے انکار کردیا تھا اس لیے میں نے انہیں اپنی خواتین اور عزیزوں میں بھجوادیا۔ کیتھرائن اور تم شادی کرنے پر رضامند ہوا اس لیے عگا کو فتح کرلینے کے بعد یہ کام بھی انجام دے دوں گا۔"

قطبوغا نے خود کو ایک بڑی مصیبت میں گھرا ہوا محسوس کیا۔ اس نے تو بطریق اعظم سے رابطہ قائم کرلیا تھا اور فوج میں بھی اپنے ہم خیالوں اور ہمنواؤں کا ایک ٹولہ بنالیا تھا لیکن سلطان نے ان سب پر پانی پھیردیا۔ اب وہ عیسائی خواتین اور لڑکیوں کی عدم موجودگی میں بطریق اعظم اور عیسائی ذمے دار ارکان سے کیا باتیں کرتا۔

سلطان نے کہا "دیکھ قطبوغا! اگر تو نے میری حکم عدولی کی تو اس سے ہم مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچ جائے گا اور اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ عیسائیوں کو دوست بنانے کے تو ان سے زیادہ فائدے حاصل کرسکتا ہے اور ہم سے تجھے کچھ نہیں ملے گا تو یہ تیری نادانی اور کم عقلی ہوگی۔ نئے دوست جو اپنی معاشرتی، مذہبی اور تہذیبی اقدار میں ضد رکھتے ہیں، تجھ کو ہم سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچاسکتے اس لیے اب تجھے وہی کرنا ہوگا جس کا تجھے حکم دیا جائے گا جس سے ہمیں، ہماری فوج اور اسلام کو فائدہ پہنچے۔"

قطبوغا نے بدرجہ مجبوری پوچھا "ہمیں اس محاذ پر کیا کرنا ہوگا؟"

سلطان نے جواب دیا "مسلسل سنگ باری، اس میں تعطل اور تساہل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ فصیل کی دیواریں کمزور پڑچکی ہیں۔ کسی وقت بھی ان میں بڑا سا شگاف پیدا ہوجائے گا اور ہم یہ سامنے کی خندقیں عبور کرکے اس شگاف سے شہر میں داخل ہوجائیں گے۔"

اس حکم کے بعد سلطان نے قطبوغا کے حامیوں کو محاذ کے دوسرے حصے میں بھیج دیا۔ اب قطبوغا جنوبی فصیل کے سامنے محاذ پر فائز تھا اور اس کے حامی شمالی فصیلوں کے سامنے تعینات کردیے گئے تھے اور دونوں کے ساتھ سلطان نے اپنے حامیوں کو لگادیا۔

قطبوغا اور اس کے حامی ایک دوسرے سے دور ہونے کی وجہ سے بالکل بے دست وپا ہوچکے تھے لیکن قطبوغا اپنی ناکامی اور اور ایک ناتجربے کار اور نوجوان سلطان کے ہاتھوں شکست کھاجانے کے احساس نے بے چین، بے قرار اور بالکل سانپ کی طرح تلملا کر رکھ دیا تھا جو چوٹ کھانے کے بعد ادھر ادھر بھاگا پھر رہا ہو۔

اسی دوران میں سلطان نے اپنی کئی اہم معاملوں میں قطبوغا سے مشورے بھی کیے اور کئی دنوں کی کوششوں کے بعد قطبوغا میں یہ تاثر راسخ کردیا کہ اب نوجوان سلطان قطبوغا کے مشوروں کا پابند ہوگیا ہے اور اس کی تجربے کاری اور اس کی فہم و فراست نے اپنا لوہا منوالیا ہے۔

بطریق اعظم خوش فہمی میں مبتلا اپنے معتمدوں سے کہتا پھر رہا تھا کہ عن قریب مسلمان آپس میں لڑائی جھگڑا شروع کردیں گے اور عیسائی متحد ہوکر قاہرہ کے ان فسادیوں کو مار بھگائیں گے۔

لو سٹگنان کا رئیس زادہ، بطریق اعظم کے منصوبے سے آگاہ ہونے کے بعد اور اپنی محبوبہ سے محرم ہونے کی وجہ سے بطریق اعظم کو دل سے پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے بطریق اعظم سے یہ شکایت بھی تھی کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے آخر اس کی محبوبہ سے کیوں کام لیا گیا۔ جب کہ وہ کام میں بدکار، خوب صورت عورتوں اور لڑکیوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس رئیس زادے کو میری سے صرف لگاؤ نہیں بلکہ وہ میری سے شدید محبت کرتا تھا۔

جب بطریق اعظم نے اس رئیس زادے کو اپنے منصوبے میں کامیاب ہوچکا ہے اور اس کی بھیجی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں نے وہ کام کردیا ہے کہ اب مسلمانوں میں لڑائی جھگڑے شروع ہوجائیں گے اور جب یہ جھگڑے شدت اختیار کرجائیں گے تو فرانس کے اشارے کے ساتھ ہی عیسائیوں کی متحدہ فوجی قوت قاہرہ سے باہر پہنچ جائے گی اور پھر جو مار کاٹ شروع ہوگی تو دو طاقتوں میں بٹ جانے والی فوج کا ایک حصہ قطبوغا کی وجہ سے عیسائیوں کا ساتھ دے گا اور سلطان کا کمزور حصہ اتنا طاقت ور نہیں رہے گا کہ وہ خود اپنوں اور عیسائیوں کی متحدہ قوتوں کا مقابلہ کرے۔

بطریق اعظم خیالی کامیابیوں پر نازاں اور نشے میں چور اب سلطان کو گرفتار کرلینے کی فکر میں تھا۔

لیکن اب قطبوغا کی طرف سے اسے کوئی پیغام بھی نہیں مل رہا تھا۔ اسے جس حصے میں رکھا گیا تھا، اوپر فصیل سے صاف دیکھا جاسکتا تھا جو لوگ قطبوغا کو دور سے پہچان سکتے تھے، انہوں نے بطریق اعظم کو بتادیا کہ اب قطبوغا فصیل کے سامنے جنوبی محاذ پر مستقل موجود رہتا ہے اور غالباً یہاں جتنے لوگ کام کررہے ہیں وہ سب ہی قطبوغا کے حامی ہیں۔



ہوں گے۔ چنانچہ ایک تیر کے ذریعے بطریق اعظم نے قطبوغا کو یاد دلایا کہ وہ بقیہ پروگرام کے عمل درآمد کا وقت دے تاکہ وہ بھی اپنے حصے کا کام مکمل کرکے اس مہم کو انجام تک پہنچائے۔

قطبوغا کو بطریق اعظم کو پیغام ملا مگر وہ اب اس کا کیا جواب دیتا۔ وہ بطریق اعظم کو یہ بتاتا کہ سلطان نے بطریق اعظم کی بھیجی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کو میلوں دور اپنی خواتین میں پہنچادیا ہے اور خود سلطان عگا کو فتح کرنے کے بعد کیتھرائن کی شادی قطبوغا سے کردینے کے لیے تیار ہے اس لیے اب بطریق اعظم کے تعاون سے قطبوغا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

لیکن قطبوغا میں یہ سب لکھنے کی ہمت نہیں تھی کیونکہ جس سازش کا اس کی طرف سے آغاز ہوا تھا، اب اس سے قطبوغا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اس نے بطریق اعظم کے خط کو نذر آتش کردیا اور اپنے محاذ سے ایسی سنگ باری کا سلسلہ شروع کیا کہ اوپر فصیلوں پر تعینات عیسائی خوف زدہ ہوگئے۔

بطریق اعظم نے یہ سارے خواب دیکھے تھے اور قبرص کے بادشاہ کو اپنی کارکردگی کا جو نقشہ دکھلایا تھا اور گرینڈ ماسٹر بطریق اعظم کی کامیابیوں کے جن نتائج کا انتظار کررہے تھے، اب ان سب کو بات آگے بڑھتی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔ رکاوٹ کہاں اور کیوں پیدا ہوگئی تھی، بطریق اعظم کے معتمد اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔

بطریق اعظم کو جب اپنے خط کا کئی دن تک جواب نہیں ملا تو اس نے فصیل پر پہرہ دینے والوں اور منجنیقوں سے سنگ باری کرنے والوں سے الگ الگ دریافت کیا کہ انہوں نے جس قطبوغا کو اپنے جنوبی محاذ پر دیکھا ہے، وہ قطبوغا ہی ہے یا کوئی اور؟ کیونکہ اگر وہاں قطبوغا ہوتا تو اس کے دوسرے خط کا جواب ضرور ملتا۔

فصیل کے جو لوگ قطبوغا کو پہچانتے تھے، انہوں نے تصدیق بطریق اعظم کو یقین دلایا کہ ان کے سامنے اس محاذ پر قطبوغا ہی تعینات ہے اور اسے تیر کے ذریعے بھیجا گیا خط بھی مل گیا ہوگا مگر اس نے اب تک خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

بطریق اعظم نے تیر کے ذریعے قطبوغا کو ایک مختصر پیغام بھیجا۔ کیا میرا پہلا پیغام مل گیا؟ مجھے اس کا جواب درکار ہے۔ اگر نہیں ملا تب بھی منصوبے کی پیش رفت سے آگاہ کیا جائے۔"

قطبوغا کو بطریق اعظم کا یہ پیغام بھی مل گیا اور قطبوغا نے اس کا مختصر جواب دے دیا کہ وہ بطریق اعظم سے ملاقات اور بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ رات میں اس علاقے کو تاریکی میں رکھے گا۔ بطریق اعظم فصیل سے باہر آجائیں۔ ادھر سے قطبوغا خندق کو عبور کرکے بطریق اعظم کے پاس پہنچ جائے گا۔ یہ کام رات کے پچھلے پہر تاریکی میں ہونا چاہیے۔

قطبوغا کا یہ پیغام بطریق اعظم کو پہنچ گیا مگر بطریق اعظم اس منصوبے سے اس لیے اختلاف تھا کہ اس میں وہ خود کو خطرے میں محسوس کررہا تھا۔ وہ کسی بھی مسلمان پر اتنا اندھا اعتماد نہیں کرسکتا تھا۔

لیکن مجبوری یہ تھی کہ قطبوغا نے جو منصوبہ بنایا تھا، اس پر رات کے پچھلے پہر تاریکی میں قطبوغا کی طرف سے تو عمل ہوجائے گا اور اگر بطریق اعظم ملاقات کے لیے مذکورہ جگہ نہ پہنچ سکا تو اتنا بڑا منصوبہ بالکل دم توڑ جائے گا اور اس نے مسلمانوں کو شکست دینے کا جو عزم کررکھا ہے اور جس کی اس میں اس کے معتبر اور مقتدر ساتھی چشم براہ ہیں تو اب قطبوغا کے بلانے پر اس کے نہ پہنچنے سے اس منصوبے کو جو نقصان پہنچے گا، اس کا وہ دوسروں کے سامنے کس طرح اظہار کرے گا۔

انہی فکروں میں شام ہوگئی اور پھر رات بھی آگئی۔ اس نے ذرا سی دیر کے لیے یہ بھی سوچا کہ اپنی جگہ اپنے کسی معتبر ساتھی کو بھیج دینا چاہیے۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد بطریق اعظم نے ایک دوسرے بشپ انتھونی کو آمادہ کرلیا کہ وہ رات کے پچھلے پہر بطریق اعظم کے نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے قطبوغا سے ملاقات کرے اور اس سے آئندہ کے منصوبہ بندی کی تفصیلات حاصل کرے۔

قطبوغا نے رات کے پچھلے پہر سنگ باری کا سلسلہ موقوف کردیا اور اس کے جواز میں یہ بتایا کہ صبح مزید پتھروں کے آجانے کے بعد سنگ باری کا سلسلہ دوبارہ شروع کردیا جائے۔

خندق تقریباً پاٹ گئی تھی اور قطبوغا اسے بہ آسانی عبور کرکے دوسری فصیل کے زیر سایہ پہنچ گیا۔ اس نے فصیل کی دیواروں کے مضروب حصوں کو ٹٹول کر دیکھا تو وہ بہت کمزور اور شکستہ تھے اور یہ کسی وقت بھی شگاف کی شکل اختیار کرسکتے تھے۔

یہاں اسے ایک قسم کی طمانیت اور سکون میسر آیا۔ وہ بطریق اعظم کا انتظار دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ کر کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد اسے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ یہ آہٹ فصیل کے مغربی حصے سے آرہی تھی۔

ہر طرف گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

بشپ انتھونی نے قطبوغا کے قریب پہنچ کے پوچھا "کون ہے؟ قطبوغا یا کوئی اور؟"

قطبوغا نے کھڑے ہو کر بشپ کا استقبال کیا اور کہا "میں قطبوغا' آپ کون ہیں؟"

بشپ نے جواب دیا "میں بطریق اعظم کا نمائندہ بشپ انتھونی۔"

قطبوغا کو ایک جھٹکا سا لگا اور پوچھا "کیا بات ہے؟ بطریق اعظم خود تشریف کیوں نہیں لائے؟"

بشپ انتھونی نے جواب دیا "وہ شہر اور قلعے کے کئی اندرونی مسائل میں الجھ گئے ہیں اس لیے مجھے ان کی نمائندگی کرنا پڑی۔"

قطبوغا نے بے مروتی سے کہا "یہ سراسر خلاف قاعدہ بات ہے۔ مجھے بطریق اعظم سے براہِ راست بات کرنا تھی۔ اگر ان کے نمائندے بشپ سے ہی بات کرنا ہے تو میں بھی واپس جا کے اپنا نمائندہ یہاں بھیج دوں گا۔"

بشپ انتھونی نے بات ختم ہوتے دیکھی تو گھبرا کے درخواست کی "آپ مجھے بطریق اعظم کی جگہ سمجھیں اور مجھ سے کھل کر باتیں کریں کیونکہ مجھے بطریق اعظم نے کھل کر بات کرنے کے اختیارات دیے ہیں۔"

قطبوغا نے غصے میں کہا "تمہیں ان مسائل کا کیا پتا جن سے میں دوچار ہوں۔ اب اگر میں انہیں ظاہر بھی کردوں تو تمہارے پاس نہ تو ان کا کوئی جواب ہوگا اور نہ کوئی حل۔"

بشپ انتھونی نے کہا "آپ مجھ سے بات تو کریں اور پھر دیکھیں کہ میرے پاس آپ کی باتوں کا حل بھی ہے اور جواب بھی۔"

قطبوغا نے غصے میں کہا "جناب! وہ جو آٹھ عورتیں اور لڑکیاں ہمارے پاس آئی تھیں' ان سب کو سلطان ملک الاشرف نے میلوں دور اپنے کنبے میں بھیج دیا ہے اس لیے اب ان لڑکیوں اور عورتوں کا ذکر نہیں ہونا چاہیے اور ان کے بغیر ہمارا منصوبہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔"

بشپ انتھونی نے کہا "بطریق اعظم کو شکایت ہے کہ ان کے کسی مکتوب کا آپ نے جواب نہیں دیا۔"

قطبوغا نے کہا "میرا سلطان ملک الاشرف سے اس بات پر اختلاف ہوا تھا کہ میں کیتھرائن سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر اس وقت سلطان اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب وہ راضی ہوگیا ہے اور اس شادی کو فتح عکا سے مشروط کردیا ہے یعنی ہم عکا کو فتح کرنے کے بعد عکا کی جامع مسجد میں کیتھرائن سے شادی کرسکتے ہیں۔"

بشپ انتھونی نے قطبوغا سے جو کچھ سنا تھا' وہ ناقابل یقین تھا۔ حیرت سے پوچھا "آپ ہیں کون؟ قطبوغا یا کوئی اور؟ آپ کی شادی تو بطریق اعظم کے ذریعے کیتھرائن سے ہونا تھی۔"

قطبوغا نے کہا "میں صاف صاف باتیں کرنے کا عادی ہوں۔ بطریق اعظم نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا اس لیے وہ حسب وعدہ یہاں نہیں آئے پھر میں ان پر کس طرح اعتبار کرلوں؟"

بشپ انتھونی نے تھک ہار کر پوچھا "پھر میں بطریق اعظم کو کیا جواب دوں؟"

قطبوغا نے جواب دیا "مجھے جو کچھ کہنا تھا' کہہ دیا۔ تم بطریق اعظم کو جو جواب دینا چاہو دے دو۔"

قطبوغا واپس جانے لگا تو بشپ انتھونی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "نہیں جناب! میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گا۔ مجھے آپ کی طرف سے کوئی 'حل' سمجھ میں آنے والا جواب ملنا چاہیے۔"

قطبوغا نے کہا "میں نے جو کچھ کہا' غالباً اس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جو تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔"

بشپ انتھونی نے پوچھا "سلطان نے ہماری عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے کنبے میں کیوں بھیج دیا؟"

قطبوغا نے جواب دیا "اس سوال کا جواب سلطان سے مل سکتا ہے۔ چاہو تو میرے ساتھ سلطان کے پاس چلے چلو۔"

بشپ انتھونی مسلسل محسوس کررہا تھا کہ بات بگڑتی جارہی ہے اور قطبوغا شروع سے آخر تک ایک اکھڑا سا آدمی ہے۔

قطبوغا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور کہا "اگر مزید باتیں کرنا ہوں تو میرے خیال میں اب اس کی گنجائش نہیں رہی۔"

بشپ انتھونی نے بے قراری سے پوچھا "میں بطریق اعظم کو کیا جواب دوں؟"

قطبوغا نے کہا "مجھے جو کچھ کہنا تھا' کہہ دیا۔ اب تم ان کا مفہوم اخذ کرکے جو جواب دینا چاہو' دے دو۔"

بشپ انتھونی بہت پریشان تھا کہ اس کو قطبوغا سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ وہ بطریق اعظم کو کیا جواب دے گا؟



رات کی تاریکی میں جس طرح دونوں خاموشی سے ملے' اسی طرح خاموشی سے جدا ہوگئے۔

قطبوغا نے جو کچھ اب تک سازشی جدوجہد کی تھی' وہ اس میں بری طرح ناکام ہوگیا تھا کیونکہ اب اسے بطریق اعظم کی طرف سے کچھ مل نہیں سکتا تھا اور اب اگر وہ بطریق اعظم کا کسی طرح ساتھ دیتا تو اس میں خود اس کی اپنی بربادی مضمر تھی اور اسلامی لشکر کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا۔

انتھونی بشپ نے واپس جا کے بطریق اعظم کو قطبوغا سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کردیا۔

بطریق اعظم نے پوچھا "تم دونوں نے آپس میں طے کیا کیا؟"

بشپ انتھونی نے جواب دیا "اس نے تو مجھ سے ساری گفتگو غصے کی حالت میں کی ہے۔ وہ آپ کے نہ پہنچنے سے بہت ناراض تھا۔ پہلے تو وہ مجھ سے کسی قسم کی بات کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ کہتا تھا کہ کیتھرائن سے شادی کے معاملے میں بطریق اعظم سے جو حالات طے پائے تھے' اب ان کی اس لیے ضرورت باقی نہیں رہی کہ سلطان ملک الاشرف نے وعدہ کرلیا ہے کہ وہ کیتھرائن سے خود اس کی شادی کروادے گا اور یہ شادی فتح عکا کے بعد عکا کی جامع مسجد میں ہوگی۔"

بطریق اعظم نے بشپ انتھونی پر الزام رکھ دیا کہ وہ صحیح نمائندگی نہیں کرسکا ورنہ قطبوغا اتنی بھلی کئی باتیں نہ کرتا۔

اب بطریق اعظم کو بڑی شرمندگی اس بات سے تھی کہ اس نے اپنی خاندانی کامیابی کے جو چرچے کررکھے تھے' اسے وہ کا ہیرو بننے کا جو سنہری موقع مل رہا تھا' وہ ایک خواب و خیال بن کر رہ گیا تھا۔

اب وہ قطبوغا کو سازش برقرار رکھنے پر کس طرح آمادہ کرے؟

بشپ انتھونی' بطریق اعظم کے تردد اور متفکر چہرے سے یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اس وقت بطریق اعظم بہت زیادہ اداس اور پریشان ہے۔ اس نے مشورہ دیا "آپ اگر قطبوغا سے اپنی سیاسی حکمت عملی کے رشتے کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس سے ایک ملاقات ضرور کرلیں کیونکہ میں نے تو یہی محسوس کیا کہ آپ کے وہاں نہ پہنچنے کی وجہ سے اس کو بہت دکھ پہنچا۔"

بطریق اعظم نے کہا "تو یہ کہہ رہا ہے کہ کیتھرائن سے اس کی شادی سلطان نے طے کردی ہے اور وہ فتح عکا سے مشروط ہوگی تو اب وہ مجھ سے بات کیوں کرے گا؟"

بشپ انتھونی نے کہا "اگر میں آپ کو کوئی مشورہ دوں گا تو آپ میرا مذاق اڑائیں گے۔"

بطریق اعظم نے ذرا سی امید کی کرن دیکھی تو پوری طرح بشپ کی طرف متوجہ ہوگیا اور کہا "تیرے پاس اگر کوئی ایسی تجویز یا مشورہ ہے جس سے قطبوغا اپنے سابقہ منصوبے پر کام کرنے کے لیے آمادہ ہوجائے تو مجھے ضرور بتا۔"

بشپ انتھونی نے کہا "آپ اس سے ایک بار تخلیے میں ضرور مل لیں اور اس کو بتائیں کہ اگر قطبوغا کی مدد سے عکا کے لوگ کامیاب ہوجائیں گے تو عیسائی عورتیں اور لڑکیاں بھاگنے والے مسلمانوں سے چھین لی جائیں گی۔ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے۔ آپ قطبوغا سے وعدہ کرلیں کہ کیتھرائن سے شادی کرنے کے علاوہ دو تین اور عیسائی خوب صورت لڑکیاں قطبوغا کی زوجیت میں دے دی جائیں گی اور عکا کی حکومت بھی اس کے حوالے کردی جائے گی۔"

بطریق اعظم نے کہا "یہ تو مجھے کیسے مشورے دے رہا ہے۔ کیا میں چار عیسائی لڑکیوں کی قطبوغا سے شادیاں کردینے کے بعد عکا کی حکومت بھی اس کے حوالے کردوں۔ یہ ممکن ہی نہیں۔"

بشپ انتھونی نے کہا "اس وقت آپ مشتعل' مایوس اور افسردہ ہیں اس لیے میرے مشورے کی تہ تک نہیں پہنچ رہے ہیں۔"

بطریق اعظم نے کہا "تو کیا تیرے مشورے کی کوئی تہ' کوئی گہرائی بھی ہے؟ جہاں تک میری سمجھ نہیں پہنچ رہی ہے۔"

بشپ انتھونی نے کہا "میں آپ کی سمجھ بوجھ اور عقل پر شبہ نہیں کررہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ غصے اور انتشار کی حالت میں غور و فکر سے کام نہیں لے رہے ہیں۔"

بطریق اعظم نے کہا "میں قطبوغا کو اس کی خدمات کے صلے میں نقد تو بہت کچھ دے سکتا ہوں لیکن اس کی چار عیسائی لڑکیوں سے شادی نہیں کرا سکتا اور نہ ہی اس کو عکا کا حاکم بنا سکتا ہوں۔"

بشپ انتھونی نے کہا "میں تو قطبوغا کی خدمات کے صلے میں کچھ دینے کا قائل ہی نہیں ہوں۔ آپ غیر معمولی نقدی' معاوضے ادا کرنے کی بات کررہے ہیں اور میں یہ کہتا ہوں کہ کسی غدار کو کچھ بھی نہیں ملنا چاہیے بلکہ اسے اپنی قوم کے خواص و عام کے سامنے عبرتناک سزا دی جائے۔ تاکہ اپنی قوم کے لوگ کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کا خیال تک دل میں نہ لاسکیں۔"

بطریق اعظم کچھ دیر خاموش رہا اور بشپ انتھونی کے

مشورے پر غور کرتا رہا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد حکم دیا "میں اس سے ملاقات کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم کسی طرح اس سے رابطہ کرکے مجھ سے ملاقات کرنے پر آمادہ کرلو۔"

بشپ انتھونی نے جواب دیا "رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ تیر ہے۔ آپ تیر کے ذریعے اپنا پیغام قطبوغا کو بھیج دیں اور جیسے ہی آپ کو جواب ملے، آپ اس سے ملاقات کرلیں۔"

بطریق اعظم کو اس وقت بھی قطبوغا پر اعتماد یا اطمینان نہیں تھا اور وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ قطبوغا دوبدو ملاقات میں اس کو گرفتار بھی کروا سکتا ہے اس لیے قطبوغا سے روبدو ملاقات نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن ملاقات نہ کرنے کے نقصانات زیادہ تھے۔ اسے ناکامی کی صورت میں اپنوں میں بہت زیادہ شرمندگی اٹھانا پڑے گی اور اگر مسلمانوں نے عکا فتح کرلیا تو اپنا سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا اور عیسائی غلام بنالیے جائیں گے اس لیے یہ خطرہ گوارا کرلینا چاہیے کہ قطبوغا سے ایک ملاقات کرلی جائے۔ اگر قطبوغا اسے گرفتار بھی کرلے تو اس سے عیسائیوں کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور شاید اس عالم میں عیسائی زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کریں اور یہ جنگ جیت لی جائے۔

تفکرات کے اندھیروں میں آخر کار بطریق اعظم، قطبوغا سے ملاقات کرنے پر آمادہ ہوگیا اور دوسرے دن فجر کی نماز سے پہلے ہی تیر کے ذریعے قطبوغا کو آگاہ کردیا گیا کہ بطریق اعظم اس سے فوری ملاقات کرنے کے لیے بے قرار ہے اس لیے بتایا جائے کہ یہ ملاقات کب اور کہاں اور کس طرح ہوسکتی ہے؟

مسلمانوں کا یہ محاذ جنگ کلی طور پر قطبوغا کے اختیار میں تھا چنانچہ بطریق اعظم کا تیر قطبوغا کے آدمیوں نے اس کے حوالے کردیا۔

قطبوغا نے جواب میں لکھ دیا "اب ملاقات کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس قسم کے رابطوں سے قطبوغا کو نقصان پہنچ جائے گا اور اس سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

بطریق اعظم نے نہایت عاجزانہ درخواست کی کہ مجھ سے ایک ملاقات ضرور کرلی جائے۔

قطبوغا نے وعدہ کرلیا کہ ٹھیک ہے آنے والی رات کے پچھلے پہر وہ اسی جگہ پہنچ جائے گا لیکن اس بار وہ بطریق اعظم کے کسی نمائندے سے بات نہیں کرے گا۔

جس سرگرمی اور رازداری سے یہ مراسلت ہو رہی تھی،



اس سے سلطان ملک الاشرف کا ایک مخبر بھی آگاہ ہوگیا اور اس نے سلطان کو ساری روداد سے خبردار کردیا۔

سلطان نے اپنے مخبر کو ہدایت کی کہ اب وہ بالکل خاموش ہوجائے اور اس کا کسی اور سے ذکر نہ کرے۔

سلطان نے قطبوغا کے جانے کے وقت سے آگاہی حاصل کرلی تھی۔

قطبوغا اسی ترکیب سے خندق کے اس پار پہنچ کے بطریق اعظم کا انتظار کرنے لگا اور بطریق اعظم نے وہاں جانے سے پہلے اپنے کئی آدمیوں سے یہ تصدیق کرلی کہ قطبوغا مذکورہ جگہ پر تنہا پہنچا ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔

بطریق اعظم بدرجہ مجبوری ڈرا سہما قطبوغا کے پاس پہنچا۔ اس وقت بھی تین عیسائی بطریق اعظم کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے۔

یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ دونوں نے اندھیرے میں ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے کی کوششیں کیں۔ قطبوغا نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور بطریق اعظم نے کاندھے سے پاؤں تک سیاہ لبادے میں خود کو چھپا رکھا تھا۔ بس دونوں کی داڑھیاں ستاروں کی روشنی میں نمایاں نظر آرہی تھیں۔

بطریق اعظم نے پوچھا "کیا میں اس وقت قطبوغا کے قریب کھڑا ہوں؟"

قطبوغا نے جواب دیا "آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ قطبوغا اپنے کسی نمائندے کے ذریعے بات نہیں کرتا۔"

بطریق اعظم نے کہا "ہم دونوں کے پاس باتیں کرنے کا وقت بہت کم ہے اور ہم اپنا اہم اور ضروری مقصد حاصل کرنے کے لیے اہم نکات بھی طے نہ کرسکے تو لاحاصل رہے گی۔"

قطبوغا نے پوچھا "آپ یہ بتائیں کہ آپ کے نمائندے بشپ انتھونی نے جو کچھ آپ کی طرف سے بات چیت کے حوالے سے بتایا، اس کے بعد آپ کیا بات کریں گے اور مجھ سے آپ کس قسم کی توقعات رکھیں گے؟"

بطریق اعظم نے بشپ انتھونی کی پیش کش یا تجویز قطبوغا کے سامنے رکھ دی "اگر ہم تمہاری مدد سے کامیاب ہوجائیں گے تو تم ایک کیتھرائن کی خواہش کررہے ہو، میں اس جیسی اور اس سے زیادہ حسین بیک وقت چار کیتھرائن پیش کرسکتا ہوں۔ تمہارے مذہب نے بھی چار شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی بہت بڑی خواہش ہے کہ وہ عکا پر حکومت کریں۔ میں فتح حاصل کرنے کے بعد عکا کی حکومت تمہارے حوالے کردوں گا اور میں سمجھتا ہوں کہ



ہماری طرف سے اتنی دلکش اور اس سے زیادہ نفع بخش دوسری کوئی پیش کش نہیں دی جاسکتی۔"

قطبوغا نے جواب دیا "مجھے چار شادیوں کا کوئی شوق نہیں۔ میں صرف کیتھرائن سے شادی کرنے کا خواہش مند ہوں اور اس کا سلطان ملک الاشرف نے مجھ سے وعدہ بھی کرلیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ کی مجھے عکا کی حکمرانی کی پیش کش تو یہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اب اگر میں آپ کی اس پیش کش کے مطابق عکا کی فتح میں آپ کا ساتھ بھی دے دوں اور آپ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوجائیں تو اس کے بعد بھی یہ بات ناقابل فہم رہتی کہ آپ عکا کی حکومت میرے حوالے کردیں گے۔"

بطریق اعظم نے کہا "مگر پہلے تو تم میرا ساتھ دینے کے لیے تیار تھے۔ اب پیچھے کیوں ہٹ رہے ہو؟"

قطبوغا نے جواب دیا "جناب! یہ وقت وقت کی باتیں ہیں۔ آپ نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا اور مجھ سے بات کرنے کے لیے اپنا نمائندہ بھیج دیا۔ یہ بے اعتباری میرے لیے ناقابل برداشت ہوئی اور مجھے اپنا انداز فکر بدلنا پڑا۔"

بطریق اعظم نے کہا "اگر یہ بات تھی تو تمہیں مجھ سے دوبارہ ملاقات نہیں کرنا چاہیے تھی تضیع اوقات سے ہم دونوں کو حاصل کچھ نہ ہوگا۔"

دونوں میں اسی طرح کچھ دیر مباحثہ جاری رہا اور بطریق اعظم قطبوغا کو غداری پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر کار قطبوغا نے پوچھا "وہ جو آپ نے چار شادیوں اور شہر کی حکومت کی پیش کش کی تھی، جو ہم دونوں کے لیے ناممکن ہے۔ میں چار شادیاں نہیں کروں گا اور آپ وعدہ اور معاہدہ کرنے کے بعد بھی عکا کی حکومت مجھے نہیں دے سکیں گے۔ تو ان دونوں کے علاوہ آپ کے پاس مجھ کو دینے کے لیے کیا ہے؟"

بطریق اعظم نے افسردگی سے کہا "خیر، میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتا ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ مسلمان متعدد شادیاں کرنے کے شوقین ہوتے ہیں اور اگر صاحب حیثیت ہوتے ہیں تو کنیزیں بھی رکھتے ہیں۔ جہاں تک عکا کی حکومت کا سوال ہے تو وہ تمہیں دی جاسکتی ہے۔ صرف اس خیال سے کہ فلاؤن کی آخری خواہش یہی تھی کہ عکا پر مسلمانوں کی حکومت ہوجائے۔ میں تمہیں عکا کی نام نہاد حکومت دے کر تمہارے مرحوم سلطان کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں۔ اب رہ گئی کوئی دوسری دل نشین پیش کش تو میں تمہاری خدمات کے صلے اور معاوضے میں بہت زیادہ سونا چاندی دینے کو تیار ہوں۔ اس سونے چاندی سے تمہیں نسلیں مزے کریں گی۔"

قطبوغا نے کہا "ہاں، آپ کی یہ پیش کش قابل غور ہے لیکن مجھے فیصلہ کرنے کے لیے کم از کم ایک دن درکار ہے۔"

بطریق اعظم کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی پیدا ہوگئی۔ گویا اس نے ناراض قطبوغا کو راضی کرلیا تھا۔

اسے واپس جانے کی جلدی تھی اور قطبوغا پیچھے چھڑانے کی عجلت میں تھا۔

بطریق اعظم نے پوچھا "توکل صبح تک مجھے تم بتادو گے کہ تمہیں مجھ سے اپنی خدمات کے صلے میں کتنا سونا چاندی درکار ہوگا۔"

قطبوغا نے جواب دیا "درست ہے، ہوسکتا ہے کہ مجھے جلد ہی فیصلہ کرنا پڑے کیونکہ ان معاملات میں سستی اور تاخیر مناسب نہیں ہوتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں کوئی فیصلہ تو کرلوں مگر حالات اور واقعات ایسا پلٹا کھا جائیں کہ میں آپ کو اپنی پیش کش سے بروقت مطلع نہ کرسکوں اس لیے آپ کو کچھ زیادہ انتظار کی زحمت گوارا کرنا ہوگی۔ رہ گئی مایوسی، ہم مسلمان اللہ کی رحمتوں سے کسی حال میں بھی مایوس نہیں ہوتے۔"

بطریق اعظم نے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور کہا "میں بہرحال آپ کے مطالبے کا انتظار کروں گا اور آپ ہی کے بقول خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں گا۔"

اور یہ ملاقات اچانک ختم ہوگئی۔ بطریق اعظم نہایت تیزی سے واپس چلا گیا اور قطبوغا خندق عبور کرکے اپنے محاذ پر پہنچ گیا۔

منجنیقوں سے تقریباً نصف میل دور چند خیمے نصب تھے اور ان خیموں میں منجنیقوں پر تعینات لوگ آرام کرنے کے لیے یا جز وقتی دم لینے کے لیے چلے جاتے تھے۔

قطبوغا بہت تھکا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ ان منجنیقوں پر تعینات آدمیوں کو ساتھ لے کر مذکورہ خیمے میں چلا گیا۔ وہ جیسے ہی خیمے میں داخل ہوا، اسے چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ یہاں سلطان ملک الاشرف اور اس کے بارہ تیرہ سپاہی پہلے ہی موجود تھے۔

قطبوغا نے سلطان اور اس کے آدمیوں کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا "کیا بات ہے؟ یہ آپ لوگ یہاں کیا کررہے ہیں؟"

سلطان نے اس کو گرفتار کرکے کہیں بھیج دیا اور یہ محاذ ایک دوسرے مملوک سردار جلال الدین کے سپرد کردیا اور

حکم دیا کہ سنگ باری کا عمل تیز کردیا جائے۔

خندق تو پٹ گئی تھی اور فصیل کے نیچے دیوار بھی کمزور پڑ گئی تھی اس لیے اب عکا میں داخل ہونا کوئی دشوار مسئلہ نہیں تھا۔

بطریق اعظم نے منجنیقوں کی کارکردگی میں شدت دیکھی تو اس کی سمجھ سے یہ بعید تھا کہ جب سارے معاملات قطبوغا سے طے پا چکے ہیں تو سنگ باری میں شدت کا عمل تیز کیوں کردیا گیا۔

فصیلوں پر تعینات لوگوں نے بطریق اعظم کو خبر کردی کہ قطبوغا کا دور دور کہیں کوئی پتا نہیں اور قطبوغا کے محاذ پر کوئی نیا سردار نظر آرہا ہے۔

قطبوغا تو شہر کے جنوبی حصے میں تعینات کیا گیا تھا مگر شہر کے سامنے اور شمالی حصے میں جو سردار تعینات تھے انہوں نے بھی اپنی کارروائی میں تیزی پیدا کردی اور ایسا لگتا تھا کہ گویا مسلمانوں کی منجنیقیں اسی وقت خاموش ہوں گی جب مسلمان دیوار میں توڑ کر شہر میں داخل ہو جائیں گے۔

بطریق اعظم سے لوگ پوچھ رہے تھے کہ وہ جو آپ کا کسی مسلمان سردار سے معاملہ ہوا تھا' اس پر عمل درآمد کب ہوگا؟ اور عیسائی کمزور مسلمانوں پر باہر نکل کر کب حملہ آور ہوں گے؟

بطریق اعظم کے پاس پوچھنے والوں کے لیے کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ اس لیے وہ جھنجلا کر خاموش زادِ ضرر اور مار کھا رہا تھا۔

بطریق اعظم کو اب بھی یہ امید تھی کہ قطبوغا ضرور اس کا ساتھ دے گا۔ اس کی حکمت عملی تو بدل سکتی ہے مگر وہ سونے چاندی کے لالچ میں اپنا منصوبہ نہیں بدلے گا۔

قبرص کے حکمران نے بطریق اعظم کی حالت دگرگوں دیکھی اور مسلمانوں کی کارروائیوں میں غیر معمولی شدتوں میں بھی زیادتی محسوس کی تو اس نے ایک خوب صورت بہانہ فرار ہونے کا سوچ لیا۔

اس نے پاپائے اعظم سے درخواست کی کہ وہ فوراً مزید صلیبیوں کی فکر میں قبرص جا رہا ہے اور بہت جلد بہت سی فوج لے کر واپس آجائے گا۔

قبرص کا حکمران تو اس بہانے سے عکا سے نکل گیا۔

لو سکنان کا رئیس زادہ بہت پریشان تھا۔ منجنیقوں کا شور اسے پہلے ہی بہت پریشان کر رہا تھا مگر اب جو عیسائیوں میں سستی اور بے دلی دیکھی اور یہ بھی دیکھا کہ قبرص کا حکمران عکا چھوڑ گیا ہے تو وہ بھی مایوس ہو کر سست پڑ گیا۔



باغات اور میدانوں میں صلیبی جنگ جو مہینوں سے مذہبی جنگ لڑنے کے لیے پڑے ہوئے تھے اور خیالوں ہی خیالوں میں مسلمانوں کو شکستیں دے چکے تھے۔ اب عکا کی کسمپرسی کے ماحول میں وہ سب خوف زدہ ہو گئے تھے اور کوئی ایک شخص بھی یہ یقین نہیں رکھتا تھا کہ عیسائی مسلمانوں پر غالب آجائیں گے۔

ہوا کا رخ یک بیک بدل گیا اور عیسائیوں کو اپنی صفوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں نظر آرہا تھا جو عیسائیوں کی مختلف اقوام کی فوجوں کی قیادت کرتا۔

ہاسپٹلرز اور ٹمپلرز عکا شہر سے زیادہ قلعے کی حفاظت میں مشغول تھے اور انہوں نے شہریوں کو مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

لو سکنان کا رئیس زادہ بھاگا بھاگا بطریق اعظم کے پاس پہنچا اور اسے موجودہ صورت حال کے بارے میں معلومات چاہی تو بطریق اعظم نے بشپ انتھونی کو بھی طلب کرلیا اور اسے اپنی ملاقات کی ساری تفصیل بتانے کے بعد مجبور کیا کہ وہ کسی طرح قطبوغا سے رابطہ قائم کرے تاکہ مسلمانوں کی حقیقی صورت حال سے آگاہی حاصل ہو۔

بشپ انتھونی نے معذوری ظاہر کی تو کہا۔ ”ہمیں قطبوغا تو کہیں نظر نہیں آتا۔ اب جو لوگ اس محاذ پر تعینات کیے گئے ہیں' ہم ان پر اعتبار نہیں کرسکتے۔“

لو سکنان کے رئیس زادے نے غصے میں پاؤں پٹختے ہوئے کہا ”عیسائیوں نے تو ہمیں ذلیل و خوار کرکے رکھ دیا ہے۔ ہم مسلمانوں کو تین دن سے مسلسل سنگ باری کرتے دیکھ رہے ہیں۔ ان تین دنوں میں مسلمانوں کی طرف سے کسی وقت بھی تاخیری کارروائی نہیں کی گئی۔ جب کہ عیسائیوں میں کسی دن بھی مسلمانوں کے خلاف غیر معمولی جوش و خروش دیکھنے کو نہیں ملا۔ ہم اس طرح مسلمانوں پر کیسے فتح حاصل کریں گے؟“

بطریق اعظم نے لو سکنان کے رئیس زادے کی ڈھارس بندھائی کہ اب بھی مسلمانوں کو شہر میں داخل ہونے نہیں دیا جائے گا اور عکا کا بچہ بچہ اپنے شہر کے لیے کٹ مرے گا۔

جن دیواروں کے شکستہ حصوں سے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ ان سے مسلمان کسی وقت بھی اندر داخل ہو جائیں گے' ان کی تعمیر اور مرمت پر بہت زیادہ لوگ تعینات کردیے گئے کہ جیسے ہی کسی دیوار میں ٹوٹ پھوٹ آثار نظر آئیں یا پیدا ہو جائیں تو ان دیواروں کی تعمیر جنگی بنیادوں پر ہونی چاہیے لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنا بطریق اعظم سمجھ رہا تھا یا دوسروں کو باور کروا رہا تھا۔ جب دیواروں پر مسلسل سنگ باری ہو رہی ہو اور دیواروں کی حفاظت کرنے والے وہ غیر محفوظ ہوں تو وہاں کون سا شہری دیواروں کی مرمت کرنے کا حوصلہ کرے گا۔

اب فصیلوں کی مرمت کرنے والوں کی کمی پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے اس کی ہمت کی مگر چند گھنٹے کام کرنے کے بعد خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

شہریوں نے بھاگنے کے راستے تلاش کیے تو وہ سب مسدود ہو چکے تھے۔ بس صرف سمندری ساحل ان کے اختیار میں تھا۔ جہاں خالی جہاز کھڑے ہوئے گویا جھگڑوں کا انتظار کر رہے تھے۔

لو سکنان کا رئیس زادہ تلملایا پھر رہا تھا۔ وہ بہت سے صلیبی جنگجوؤں سے ملا تو سب ہی کے حوصلے پست دیکھے۔ ان کے دف' ڈھول اور نقارے الگ خوف زدہ کر رہے تھے۔ یہاں تک بعض جگہ اگر عیسائیوں نے حوصلے سے کام لیا تو مرنے والے مجاہدین رکاوٹ بنے رہے' وہ زندہ مجاہدوں کے لیے آڑ کا کام دے رہے تھے اور مسلمان ہمت سے مقابلے پر آئے۔ اس لیے عیسائیوں کو تیر اندازی اور سنگ باری سے ٹھکانے لگا دیتے تھے۔

اب لو سکنان کے رئیس زادے کو صرف ان تینوں سلطانی نمائندگان سے ملنے کی فکر تھی جن کے ذریعے وہ زندہ رہ سکتا تھا اور اسے سلطان سے معافی مل سکتی تھی مگر ان جنگی ہنگاموں میں تینوں مسلمان نمائندگان کو وہ کہاں تلاش کرتا۔

وہ ایک بار پھر بطریق اعظم کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ بطریق اعظم کئی دن سے غائب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی محاذ پر موجود ہو اور فوجوں کی قیادت کر رہا ہو۔

لیکن شہریوں کی حالت دیکھ کر خوش گوار مستقبل کی پیش گوئیاں اب ممکن نہیں رہی تھیں۔ یہ شہر واقعی عیسائیوں کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا اور عکا کی آبادی اب بہت جلد مسلمانوں کے اختیار میں جانے والی تھی۔ وہ ابھی تک اسے ناقابل تسخیر سمجھ رہے تھے لیکن اب عکا کو بچانا ناممکنات میں سے تھا۔

لو سکنان کے رئیس زادے کو ہر طرف سے مایوسی کا سامنا رہا۔ اب کوئی ذمے دار شخص بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا جس سے وہ کوئی مشورہ کرتا۔

لمحہ بھر کے لیے اس نے یہ بھی سوچا کہ اب اسے ہاسپٹلرز اور ٹمپلرز کو عکا کی جنگ میں حصہ لینے پر مجبور کرنا چاہیے مگر وہ اتنے خود سر' خود رائے اور خود بیں تھے کہ وہ کسی رئیس زادے' حاکم یا سردار کی بات مان لینے کو اپنی تحقیر سمجھتے تھے اس لیے ان کے سامنے لو سکنان کے رئیس زادے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

پاپائے اعظم تھولس کے بھیجے ہوئے عیسائی بھی مسلمانوں کے مقابلے پر جاتے ہوئے ڈر رہے تھے اور قبرص اور فرانس کے جنگ جو اس انتشار اور ابتری میں مسلمانوں کے مقابلے پر جانے کو اپنی ہلاکت اور بربادی سمجھ رہے تھے اس لیے وہ بھی ساحل پر کھڑے ہوئے خالی جہازوں میں بیٹھ کر واپس جانے کو غنیمت سمجھ رہے تھے۔

چند ہی دنوں میں عکا کا یہ حال ہو گیا کہ سمندری ساحل پر پورا شہر پہنچ گیا اور وہ سب جہازوں کے ذریعے عکا سے فرار ہو جانا چاہتے تھے۔

لیکن جہاز والے صرف غیر ملکیوں کو لے جانا اپنا فرض سمجھتے تھے کیونکہ وہ غیر ملکیوں کے لائے ہوئے ساحل پر کھڑے تھے۔

جہازوں میں بیٹھنے کے لیے کشمکش اور جدوجہد شروع ہو گئی اور اس میں ہر کوئی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا رہا۔ ہر کوئی اپنے مقابل کو پیچھے دھکیل کر خود جہاز پر بیٹھ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لوگ جو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آئے تھے یا عکا کے وہ جنگجو جو اپنے شہر کو مسلمانوں سے بچانا چاہتے تھے' اب وہ جہاز پر بیٹھنے کے لیے آپس ہی میں لڑ بھگڑ رہے تھے۔

مسلمانوں کو کچھ پتا نہ تھا کہ عکا کے اندر سمندر کے کنارے کس قسم کی جنگ چھڑ چکی ہے۔

جو جنگجو فصیلوں پر موجود تھے' انہوں نے اپنے افسر اور سرداروں کو غائب جو دیکھا تو انہیں اپنی فکر لاحق ہوئی اور وہ خود کو بے سہارا محسوس کرنے لگے۔

اب فصیلوں پر منجنیقوں کے لیے نہ تو پتھر پہنچ سکتے تھے اور نہ پتھر ڈھونے والوں کا کہیں کوئی پتا تھا۔

مسلمانوں نے خندقوں کو عبور کرکے دیواریں توڑ دیں اور شہر میں داخل ہو گئے۔ وہ ڈھول' نقارے اور دف جو باہر بج رہے تھے' اب وہ شہر میں بج رہے تھے اور شہر کے گلی کوچوں میں مسلمانوں کے خوف سے بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔

لو سکنان کا رئیس زادہ تین دن سے بطریق اعظم کو تلاش کرتا رہا تھا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا اور جب اس نے دوسروں سے یہ سنا کہ سمندر کے کنارے جہازوں پر بیٹھنے کے لیے آپس میں جنگ ہو رہی ہے تو اس نے خود بھی ساحل سمندر کا رخ کیا۔

غزہ کا خدمت گار عکا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنے آقا سے کہا "میں نے مسلمانوں کے خوف سے غزہ کو چھوڑا اور عکا میں پناہ لی۔ اب عکا کو چھوڑ کر میں کہاں پناہ لوں گا؟"

لو سگنان کے رئیس زادے نے کہا "تب پھر تو یہ کرکہ بطریق اعظم کا پتا لگا کہ وہ کہاں چلے گئے؟"

غزہ کے خدمت گار نے بتایا "جناب! لوگ کہتے ہیں کہ بطریق اعظم تین دن پہلے ہی عکا سے فرار ہوگئے۔ میں انہیں کہاں تلاش کروں گا؟"

لو سگنان کے رئیس زادے نے کہا "تب پھر تو مسلمانوں میں ان تینوں سلطانی نمائندگان کو تلاش کر۔ وہ ہمیں سلطان سے معافیاں دلوا سکتے ہیں۔"

غزہ کے خدمت گار نے کہا "یہ تو اسی وقت ممکن ہوگا جب میں اسلامی لشکر کے ہجوم سے زندہ سلامت بچوں گا ورنہ مجھے تو لوگ دیکھتے ہی ہلاک کردیں گے۔"

رئیس زادے نے کہا "بہرحال تو کسی بھی طرح ان تینوں سلطانی نمائندگان سے ملنے کی کوشش کر۔ تو عربی زبان جانتا ہے۔ میں اس زبان سے واقف نہیں۔ اس لیے مجھے تو مسلمان فوراً قتل کردیں گے۔"

غزہ کا خدمت گار اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہوئے اسلامی لشکر کی طرف روانہ ہوگیا۔

مسلمانوں نے شہر میں داخل ہونے کے بعد وہ کارروائیاں شروع کردیں جو فاتح قوم مفتوح کے علاقوں میں داخل ہونے کے بعد کرتی ہے۔

سلطانی سوار اور پیادے بطریق اعظم اور دوسرے بڑے عیسائی عہدیداروں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے مگر انہیں کوئی ایک بھی نہیں ملا اور انہیں بتایا گیا کہ وہ سب جہازوں کے ذریعے عکا کو چھوڑ گئے۔

سلطان ملک الاشرف جب بھگوڑوں کی تلاش میں سمندر کے ساحل پر پہنچا تو جہاز ساحل سے دور جاچکے تھے اور ہزاروں عیسائی سمندر کے اندر دور تک پھیلے ہوئے جانے والے جہازوں کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے یہ سمندر میں کھڑے ہوئے عیسائی سمندر میں تیر کر فرار ہوجائیں گے۔

سلطان نے اپنے آدمیوں سے کہا "جاؤ ان سے معلوم کرو کہ وہ خشکی کو چھوڑ کر پانی میں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟"

سلطانی نمائندے سمندر میں کھڑے ہوئے لوگوں کے پاس پہنچے اور ان سے سلطان کا سوال کیا تو ان سب نے رو رو کر ایک ہی جواب دیا کہ خود غرض جہاز والوں نے ان کو جہاز میں نہیں بیٹھنے دیا۔ ان کا نہ بٹھانے سے متعلق عذر یہ تھا کہ جہاز میں مزید مسافروں کے لیے گنجائش نہیں رہ گئی تھی اس لیے ان سب کو ساحل پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ سمندر میں کھڑے ہوا جاتے ہوئے جہازوں کو حسرت سے دیکھ رہے ہیں اور انہیں برا بھلا بھی کہتے جارہے ہیں۔

سلطان نے ان سب کو حکم دیا "سمندر سے باہر آجاؤ۔ تمہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی اور نہ تمہیں گرفتار کیا جائے گا۔"

بار بار ان اعلانوں کے بعد لوگ سمندر سے نکل کر سلطانی پناہ گاہ میں آگئے۔ انہیں سلطان کے اعلان پر یقین نہیں آرہا تھا مگر مجبوری یہ تھی کہ وہ سمندر میں زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتے تھے۔

ان سب کے سمندر سے نکل آنے کے بعد سلطان نے ان سے کسی قسم کی پچھ پچھا نہیں کی۔

لوسگنان کا خدمت گار سمندر سے نکلنے والوں میں شامل ہوگیا۔ اب وہ بالکل محفوظ تھا جب کہ سلطان کے تینوں نمائندگان لو سگنان کے رئیس زادے کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ اس رئیس زادے نے عکا کے کیتھیڈرل میں پناہ لی اور جب اسے کسی ذریعے سے یہ معلوم ہوا کہ سلطان کے کئی آدمی رئیس زادے کو تلاش کررہے ہیں تو وہ گرجے سے باہر نکل آیا۔ اب اسے اپنے خدمت گار کی تلاش تھی اور اس مسلمان کی جو اسے بہ امن وعافیت سلطان تک پہنچادے۔

کیتھیڈرل کے گرجے کو بھی مسلمانوں نے گھیر لیا اور اس کے پادری کو باہر بلوایا۔ اس سے پوچھا "بطریق اعظم کہاں ہے؟"

پادری نے جواب دیا "جناب! وہ تو تین چار دن پہلے ہی عکا کو خالی کرگیا۔ اب پتا نہیں اس وقت وہ کہاں روپوش ہے۔"

لو سگنان کے رئیس زادے کو کیتھیڈرل کے گوجے سے نکال کر سلطان کے پاس پہنچادیا گیا۔

راستے میں تینوں سلطانی نمائندوں کو لو سگنان کے رئیس زادے نے دیکھا۔ وہ معلوم نہیں کس طرف سے نمودار ہوئے اور والہانہ انداز میں رئیس زادے کے پاس پہنچ کر باری باری گلے لگ گئے۔

ان لوگوں نے رئیس زادے کو بتایا کہ وہ اسے حویلی میں بھی تلاش کر آئے مگر جب وہ انہیں نہیں ملا تو تینوں کو شبہ گزرا کہ کہیں رئیس زادے کو کسی نے قتل تو نہیں کردیا۔

اسے سلطان کے پاس لے جایا گیا۔ تینوں نے سلطان کو بتایا کہ اس رئیس زادے نے ان تینوں کا بہت ساتھ دیا تھا اور جب جنونی عیسائی تینوں کو قتل کردینا چاہتے تھے تو یہ رئیس زادہ ان کی ڈھال بن گیا تھا۔



سلطان نے اسے اپنا ایک مخصوص خیمہ دے دیا اور کہا "میں عکا کے معاملات سے فراغت پالوں اس کے بعد رئیس زادے سے بات کروں گا۔"

تینوں نے اسے سلطان کے عطا کردہ خیمے میں پہنچادیا۔

سلطان نے کیتھیڈرل گرجے میں پادریوں اور ان کے مقلدین کو مخاطب کیا "لوگو! میں نے بہت چاہا کہ اس شہر میں تم لوگوں کی اجازت سے بہ امن عافیت داخل ہوجاؤں مگر بطریق اعظم، نائٹوں اور دوسرے بہت سے جنونی عیسائیوں نے میری درخواست ٹھکرادی۔ اب ہمیں تم سب فاتح کی حیثیت سے خوشی کے نعرے کے ساتھ قبول کرنے پر مجبور ہو۔ میں تمہارے گرجے کو گرانے نہیں آیا۔ تم مجھ سے بالکل نہ ڈرو۔ مجھے آج کے دن کی خوشی بھی ہے اور افسوس بھی۔ خوشی اس بات کی کہ جو کارنامہ میسرس اور میرے باپ فلاوین انجام نہیں دے سکے تھے، آج وہ ہمارے ہاتھوں انجام پایا۔ میرے باپ کی روح بہت خوش ہوگی۔ تم لوگ مجھے یہ بتاؤ جب تمہارے پاس عظیم الشان فوج موجود تھی۔ بطریق اعظم تمہارے سر پر ستی کررہا تھا۔ پاپائے اعظم نکولس کے بھیجے ہوئے جنگجو تمہارے ساتھ تھے، قبرص کا حکمران بھی اپنی فوج لے کر یہاں آگیا تھا، فرانس کے جنگجو عیسائی بھی عکا میں موجود تھے، قلعے کے نائٹ، ٹمپلرز اور ہاسپٹلرز بھی عکا کی حفاظت پر مامور تھے پھر یہ سب اچانک کائی کی طرح پھٹ کیوں گئے؟ تم لوگوں نے ہمارا بہادروں کی طرح مقابلہ کیوں نہیں کیا؟ ہر کوئی اچانک نفسا نفسی کا شکار کیوں ہوگیا؟ میں نے سمندر میں بہت سوں کو دیوانوں کی طرح جہازوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے۔ اب اگر تم سب یہ سمجھتے ہو کہ تم مسلمانوں پر غالب نہیں آسکتے تو تم بار بار متحد ہو کر ہمارے مقابلے پر کیوں آتے ہو؟ بلاوجہ دونوں طرف جانیں ضائع ہوجاتی ہیں۔ عمارتیں ٹوٹتی ہیں، املاک جلادی جاتی ہیں اور لوگ قتل کردیے جاتے ہیں، شہری دربدر ہوجاتے ہیں، عورتیں چھن جاتی ہیں اور تنکوں کی طرح بک جاتی ہیں، بتاؤ یہ ساری روداد ہمیں یا تمہیں کیا سبق دیتی ہیں؟"

بہت سے عیسائی سلطان کی تقریر سے متاثر ہوئے اور اس کی باتوں سے اتفاق کیا مگر دلوں میں عیسائیت اور مسلم دشمنی موجود رہی۔

سلطان نے کیتھیڈرل گرجے کے پادری سے کہا "تو آزادی سے اپنے فرائض انجام دیتا رہ۔"

کیتھیڈرل سے نکل کر سلطان قلعے کے سامنے پہنچ جو ابھی تک عکا شہر سے الگ تھلگ اپنی انفرادی حیثیت میں سر اٹھائے کھڑا ہوا تھا۔

سلطان نے قلعے کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اوپر موجود سپاہی سلطان کا دور سے مذاق اڑا رہے تھے اور ان کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر سلطان نے عکا شہر فتح کرلیا تو یہ کوئی اتنا بڑا کارنامہ نہیں۔ اصل کارنامہ قلعے کی تسخیر ہوگا اور قلعے کے جنگجو اسے کبھی بھی سرنگوں نہیں ہونے دیں گے۔

سلطان نے ابھی تک قلعونا کو قید کررکھا تھا لیکن شہر میں داخل ہوتے ہی قلعونا کو آزاد کردیا اور اسے یقین دلا دیا کہ اب وہ نہ صرف آزاد ہوگا بلکہ اپنے پرانے منصب پر فائز بھی ہے اور جیسا کہ اس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ عکا کی فتح کے بعد کیتھرائن کی شادی اس سے کردی جائے گی چنانچہ اب یہاں کی جامع مسجد میں کیتھرائن کے ساتھ تجھے وابستہ کردیا جائے گا۔"

قلعونا کو بڑی شرمندگی تھی اور وہ جس انعام کا مستحق نہیں تھا، وہ اسے دیا جارہا تھا۔

لیکن عین اس وقت جب کیتھرائن سے کہا گیا کہ اب اسے قلعونا سے وابستہ کردیا جائے گا تو اس نے سلطان سے دریافت کیا "کیا یہ درست ہے کہ قلعونا پر غداری کا الزام ہے؟ اور اسے اس کے عہدے سے ہٹایا جاچکا ہے؟"

سلطان نے جواب دیا "ہاں، یہ سب درست مگر اب اسے اس کے سابقہ منصب پر بحال کردیا گیا ہے۔"

کیتھرائن نے کہا "لیکن اب میں اس معزول، رحم زدہ شخص سے شادی نہیں کروں گی۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں شادی اس شخص سے کروں گی جس کی کوئی حیثیت ہوگی۔"

قلعونا حیران تھا کہ کیتھرائن کیسی باتیں کررہی ہے۔

کیتھرائن نے میری کا مشورہ دیا کہ وہ بھی ان حالات میں کسی مسلمان سے شادی نہ کرے لیکن یہیں سلطان کے قریب میری نے لو سگنان کے رئیس زادے کو بھی دیکھ لیا اور رئیس زادے نے میری کو دیکھا تو دونوں بے چین ہوگئے۔

بالکل خلاف امید میری نے رونا شروع کردیا اور سلطان سے کہا "اب جب کہ عکا کو آپ نے فتح کرلیا ہے اور یروشلم کا سب سے بڑا پادری بطریق اعظم جو پاپائے اعظم کا عظیم نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ ہم سب کا ساتھ چھوڑ گیا تو میں مناسب سمجھتی ہوں کہ میں اپنی ساری حقیقت سلطان کے سامنے بیان کردوں۔"

سلطان نے حیرت سے میری کو دیکھا اور کیتھرائن نے شور مچانا شروع کردیا کہ خدا کے لیے تو اپنی زبان بند رکھ کیا تو ہم سب کو قتل کروانا چاہتی ہے۔"

میری نے سلطان سے درخواست کی کہ وہ لو سگنان کے

رئیس زادے سے شادی کرنا چاہتی ہے اور اس سے بہت محبت کرتی ہے اور یہاں سلطان کے پاس ایک خاص مقصد سے بھیجی گئی تھی۔

سلطان کے پاس فی الحال اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ میری کی سازش کی داستان سن کر اس میں مبتلا ہو جاتا اس سے قلعے کی تسخیر میں دیر لگ جاتی۔ اس نے آٹھوں عورتوں اور لڑکیوں کو قید خانے میں ڈلوادیا اور قلبوغا کو اس کے منصب پر بحال رکھا اور تاکید کی کہ وہ آئندہ ایسا ویسا کوئی قدم نہ اٹھائے۔ اس نے قلعے کا بھی ایک حصہ قلبوغا کے سپرد کردیا کہ اس پر بھی سنگ باری شروع کردی جائے۔

جو کچھ قلبوغا کے ساتھ پیش آیا تھا' اس سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کو حیرت تھی کہ کیتھرائن نے شادی سے انکار کردیا تھا۔

جن طاقتوں سے اس کا معاہدہ ہوا تھا' وہ دھوکا دے کر بتائے بغیر ہی غائب ہو گئیں تھی اور وہ گرفتار کرلیا گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ اسلامی لشکر اس کی غداری کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جاتا تو اسے نہ تو کیتھرائن ملتی اور نہ عکا کی حکومت اور نہ سونا چاندی اور بالکل ممکن تھا کہ عیسائی اسے قتل کردیتے۔

اب وہ نئے جوش و خروش کے ساتھ عکا کے قلعے کی تسخیر میں مشغول ہو گیا اور اتنی شدت سے سنگ باری کی کہ قلعے کی دیواریں تین دن میں ٹوٹ گئیں۔ نائٹ' ٹمپلرز اور ہاسپٹلرز دیوانہ وار قلعے سے نمودار ہوئے اور مسلمانوں نے انہیں اپنے ہتھیاروں کی زد میں لے لیا اور ان کا اتنی تیزی سے صفایا کیا گیا کہ چند ہی ٹمپلرز اپنی جان بچا کر بھاگ سکے۔ ان کا گرینڈ ماسٹر قلبوغا کے تیر کا نشانہ بنا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور مسلمانوں نے عکا کے شہر کے بعد اس کے قلعے پر بھی قبضہ کرلیا۔ یہ ان کا آخری مضبوط اور بڑا قلعہ تھا جسے نوجوان' ناتجربے کار سلطان ملک الاشرف خلیل نے فتح کرلیا تھا۔

لوسگنان کا رئیس زادہ یہ سب کچھ دیکھ کر دم بہ خود رہ گیا اور وہ جو اس نے تاریخ میں مقام حاصل کرنے اور شہرت دوام پانے کے طریقے اور تدبیریں سوچ رکھی تھیں' سب کی سب دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ مسلمانوں میں تنہا عیسائی رہ گیا تھا۔ بہت سے عیسائیوں نے اسلام قبول کرلیا تھا مگر لوسگنان کا رئیس زادہ مسلمان نہیں ہوا۔ میری نے اس ساری سازش کی تفصیل سلطان کو بتادی۔ سلطان کو بے حد افسوس ہوا کہ عیسائیوں میں کوئی اخلاقی حدیا معیار نہیں۔ وہ اپنی مطلب براری کے لیے کتنے گر جاتے ہیں۔

سلطان نے ان سب کو اپنی فوج میں تقسیم کردیا۔

قاہرہ میں اس فتح کی بڑی خوشیاں منائی گئیں اور جب یہ فاتح لشکر قاہرہ میں داخل ہوا تو اس کا سابقہ فاتح سلطانوں کی طرح شاندار استقبال کیا گیا اور یہیں سلطان ملک الاشرف خلیل کو اچانک یہ بتایا گیا کہ قلبوغا اب بھی سازشوں سے باز نہیں آیا اور وہ بدستور نوجوان سلطان کو ناتجربے کار سمجھ رہا ہے اور خود کو سلطان سے زیادہ لائق اور تجربے کار سمجھتا ہے۔

بعد میں سلطان کو کسی نے یہ بتایا کہ قلبوغا نے سلطان کی مخالفت اس لیے شروع کردی کہ سلطان نے کیتھرائن کسی اور کو بخش دی اور قلبوغا اپنی اس محرومی کی وجہ سے سلطان کا دشمن بن گیا ہے۔

سلطان ملک الاشرف خلیل نے باپ کی خواہش پوری کردی تھی اس لیے اب اسے سلطانی کی ضرورت نہیں رہی تھی چنانچہ اس نے از خود سلطانی چھوڑ دی اور ایک دوسرے محسن منصور کو اپنی جگہ سلطان بنادیا۔ خلیفہ نے نئے سلطان کا نام خطبے میں شامل کردیا اور نوجوان خلیل کو اب سلطان تو نہیں تھا مگر ملک الاشرف اب بھی کہلواتا تھا۔

اس حیرت انگیز اور خلاف توقع تغیرات کے دوران میں اسے منگولوں کے بارے میں عجیب و غریب خبریں ملیں۔ منگولوں کے شاہی خاندان کے کسی شہزادے نے اسلام قبول کرلیا تھا اور تبریز میں ہر طرف مسلمانوں کا دور دورہ تھا۔ عیسائی حیرت زدہ یہ تبدیلی دیکھ کر پریشان تھے اور انہوں نے اس نو مسلم شہزادے کے مقابلے میں دوسرے منگول شہزادوں کو آگے بڑھادیا تھا۔ اب کچھ عرصے کے لیے منگولوں کی توجہ قاہرہ کی طرف سے ہٹ گئی تھی اور وہ آپس ہی میں برسرپیکار تھے۔ اسلام اور آسمان میں کشمکش شروع ہو گئی تھی کیونکہ جس اسلام کو خلافت کے نام سے بغداد سے نکال باہر کیا گیا تھا' اب وہی اسلام تبریز کے منگول شاہی خاندان اور شاہی محل میں عزت و وقار سے داخل ہو گیا تھا اور جو آسمان پرست اس کے خلاف مزاحمت کررہے تھے' اسلام ان کو پیچھے دھکیل رہا تھا اور ان سب پر پوری طرح حاوی آجانے کی کوشش کررہا تھا۔ اسلام اور آسمان پرستوں کا یہ خوف ناک معرکہ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے والا تھا۔

(جاری ہے)


کارہائے نمایاں مظفر کے ریٹنگ

صلاح الدین — صلاح الدین — تاریخ ابن خلدون — حروب صلیبیہ — مہمات صلیبی — تتاریوں کی یلغار — تاریخ الخلفاء

لین پول — ھنری رنڈ لیب — علامہ ابن خلدون — رچرڈ ڈیوک آف نارمنڈی — جلال الدین سیوطی — ھنری رنڈ لیب — جلال الدین سیوطی




دوپہر کا ٹائم تھا۔ میں حکیم خیر محمد کے شفاخانے کی طرف جارہا تھا۔ دور ہی سے دیکھا کہ حکیم صاحب پرانی لکڑی کے تخت پر ٹانگیں پسارے بیٹھے ہاون دستے پر شاید کسی دوا کا سفوف تیار کررہے تھے۔ معمول کے مطابق اوپر والا ہونٹ دانتوں میں اندر اور نیچے والا ہونٹ باہر کی طرف نکلا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہاون دستہ ایک طرف کھسکایا اور گھٹنوں سے ہاتھ پونچھے۔

میں نے جیسے ہی شفاخانے کی چوکھٹ عبور کی' حکیم اٹھ کر آگے آیا۔ پیار سے گلے لگایا۔ اپنا منہ میرے کان کے پاس لاکر کہنے لگا "کچھ سنا ہے؟"

میں نے وہیں اپنی گردن کو انکار کی صورت ہلا کر کہا۔ "نہیں۔"

اس نے ہندوؤں کے زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی پیڑھی کھسکائی اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔

حکیم نے چاروں طرف رازدارانہ نظریں گھمائیں اور میرے منہ کے قریب آواز کو بہت آہستہ کرکے بولا "کچھ بھی نہیں سنا؟"

"نہیں۔ لیکن کس کے بارے میں؟"

حکیم نے جواب نہیں دیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا اور میری طرف دیکھا اور گول گول دیدے پھاڑ کر کہا "ارے حیف ہو' اتنی بڑی خوشخبری نہیں سنی تو جیسے پیدا ہی نہیں ہوئے۔ ٹھہر' دیکھتا ہوں۔ باہر کوئی ہے تو نہیں" یہ کہہ کر حکیم باہر کی طرف نکل گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر ایسی کون سی بات ہے جس کے لیے حکیم اتنی رازداری برت رہا تھا اور کافی سوچ بچار کے بعد بھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ آخر حکیم


فلک بوس پہاڑوں میں محصور ہو کر مطلق العنان بادشاہ کو تاج و تخت کی قربانیوں کی داستان عبرت

مانک رنجام ساقی

حویلی کے راز

فطرت اپنا راستہ خود بناتی ہے اور کوئی پابندی اسے روک نہیں سکتا۔ ایسی ہر کوشش اسے مہمیز دیتی ہے اور پھر وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کا تصور بھی محال ہوتا ہے۔


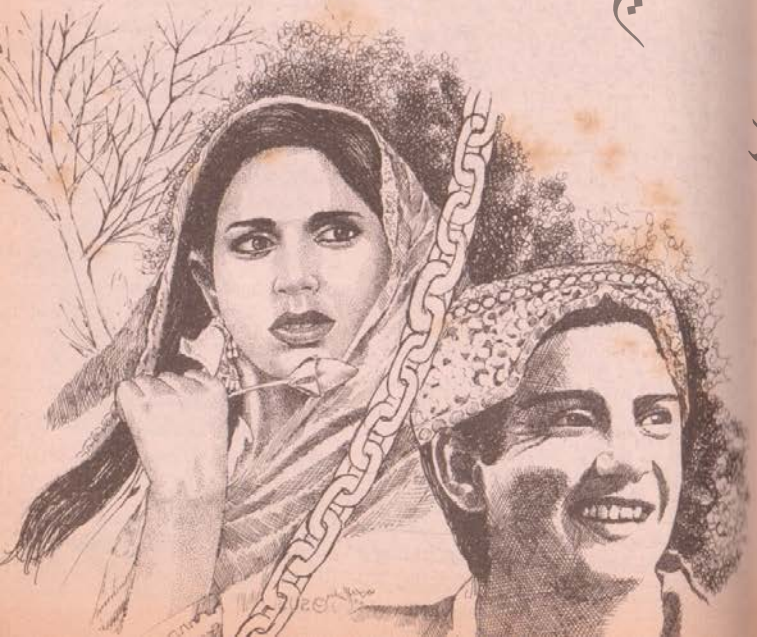

اپنی جوتی کھسکاتا اندر آیا۔ آتے ہی اپنا منہ میرے کان کے قریب لاکر بولا "ارے سن، سائیں ڈھل کی چھوٹی بیٹی بھاگ گئی۔"

"ہیں۔۔۔ کیا کہا؟"

"ارے آہستہ، حویلی پاس میں ہے میاں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"سائیں ڈھل کی سب سے چھوٹی لڑکی۔۔۔"

"جو اب جوان ہوئی تھی اور ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی قرآن شریف کو بخشوائی گئی تھی۔"

"کس کے ساتھ بھاگی ہے؟"

"جمعہ شیدی کے ساتھ۔"

"جمعہ شیدی۔۔۔! کون سا جمعہ شیدی؟"

"ارے وہی جمعہ شیدی جو حویلی کا پانی بھرتا تھا، جس کو دادا، دادا کرکے سب بلاتے تھے۔"

"ارے وہ گنجا، توے جیسا کالا؟"

"ہاں، ہاں" حکیم رازدارانہ لہجے میں بول رہا تھا اور اپنے گول گول دیدے گھما بھی رہا تھا۔ میں حیرت سے حکیم صاحب کا منہ تک رہا تھا۔ "ارے حیران کیوں ہوگئے، سمجھ کیا رہے ہو بچہ، زمانہ ترقی پر ہے، لوگ چاند پر پہنچ رہے۔" سانس روک کر بولنے کی وجہ سے حکیم کا سینہ بھر آیا اور منہ سے لمبا سانس لے کر سانس بحال کیا "آخر کب تک ظلم ہوتا رہے گا، کبھی تو ظالم کی بھی مات ہوگی۔ ارے ظلم دیکھو، انسان کی قرآن سے شادی۔۔۔ اور وہ بھی عورت کی۔۔۔ حکیم جالینوس کا قول ہے کہ عورت کو مرد سے چالیس گنا زیادہ جسمانی خواہش ہوتی ہے۔ اچھا کیا ورنہ حویلی میں عمر گزر جاتی۔ جیسے اور بی بیوں کی عمریں گزر گئی ہیں۔ شادی، وہ بھی قرآن سے۔۔۔ واہ رے سندھ کے وڈیرے۔۔۔" حکیم اپنے منہ میں بڑبڑاتا رہا۔

حکیم کی یہ باتیں سن کر میرے ذہن میں ایک کرنٹ دوڑا۔ سائیں ڈھل کی چھوٹی لڑکی؟

"ارے اس کا نام شہ بانو تھا۔ بڑی بی بی اسے پیار سے شاہو کہہ کر پکارتی تھی۔"

"شاہو؟ دادا شیدی کے ساتھ بھاگ گئی! دادا شیدی، ایک کالا، گنجا۔۔۔ بن مانس کے ساتھ!" میں زیرلب بڑبڑایا اور حکیم کی طرف دیکھا۔ کہیں وہ میری بات سن تو نہیں رہا؟ حکیم وہ اپنی دھن میں دوا بنانے کے ساتھ اپنے آپ سے باتوں میں مصروف تھا۔

میں جب چھوٹا تھا، آٹھ نو سال کا، سائیں ڈھل کی حویلی میں لسی لینے جاتا تھا۔ مائی شاداں جو حویلی کی سب سے پرانی ملازمہ تھی، وہی لسی بناتی تھی۔ میں ہر روز صبح خالی ڈبا لے جاکر ماسی شاداں کے پاس رکھتا تھا اور بھی بہت سے گاؤں کے چھوٹے بڑے، بچے لڑکے لڑکیاں لسی لینے کے لیے سلور کے ڈبے، لوٹے اور کٹلے ماسی شاداں کے پاس جمع کرتے تھے۔ لسی بنانے کے بعد ماسی شاداں سب کو برابر لسی ڈال کر دیتی تھی۔ میں عمر میں سب بچوں سے بڑا تھا۔ حویلی میں اور ملازمائیں بھی ہوتی تھیں۔ جوان، نوجوان، ادھیڑ عمر اور بوڑھیاں، سب کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی تھیں۔ بڑی بی بی سارا دن جھولے میں جھولتی رہتی تھیں شاید کوئی بیماری تھی اس لیے زیادہ چل پھر نہیں سکتی تھیں۔ سائیں ڈھل کبھی کبھی حویلی میں آتا تھا، نہیں تو اکثر نئے بنگلے میں یا کراچی یا لاہور میں رہتا تھا۔ سب کی لاڈلی اور پیار کا مرکز سائیں ڈھل کی سب سے چھوٹی بیٹی شہ بانو تھی۔

شاہو سارا دن اپنے بڑے سارے آنگن میں کھیلتی کودتی رہتی تھی۔ سائیں ڈھل کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی سوائے دو بیٹیوں کے۔ شاہو چھوٹی ہونے کے ناتے زیادہ لاڈلی تھی۔ شاہو جو رات بھاگ گئی، اس وقت اس کی عمر مشکل نو دس سال تھی۔ رنگ صاف شفاف، گول چہرہ، آنکھیں خوبصورت اور کالی تھیں۔ بھنوئیں کالی اور تلوار کی طرح تھیں، جب کھینچ کر دو چوٹیاں باندھتی تھی تو پیشانی چاند کی طرح نظر آتی تھی۔ حویلی میں شاہو کی بڑی بہن بھی رہتی تھی، بڑی بی بی جنت۔ سائیں ڈھل کی بڑی لڑکی۔ وہ بڑی بی شاہو سے تین چار سال بڑی تھی۔ اس کے نقوش بھی ہو بہو شاہو جیسے تھے۔ شاہو ابھی ادھ کھلی کلی تھی جبکہ جنت کھلا ہوا گلاب۔ جس کی نازک ونرم پنکھڑیاں اچھی طرح کھلی ہوئی تھیں اور بھنوروں کے لیے مقناطیسی کشش رکھتی تھیں۔ بچپن کی یادوں کا سلسلہ دریائے سندھ کی لہروں کی طرح پلٹتا رہا۔

میں وڈیرے کی حویلی میں لسی لینے جاتا تھا۔ اس وقت شاہو چھوٹی تھی۔ ان دنوں میں بڑی بی جنت بھی قرآن شریف سے بخشوائی گئی تھی کیونکہ وڈیرے کے خاندان میں اس کے جوڑ کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ کہہ رہے تھے کہ ملکیت بٹوارے کا بھی مسئلہ ہے۔ دادی نے (جو بخشوانے کی رسم کو پرگلی تھیں) بتایا کہ بڑی بی کو دلھن کی طرح سجایا گیا تھا۔ اس کو ریشمی لال جوڑا، ہاتھوں پر مہندی لگائی گئی تھی۔ قرآن شریف ایک طرف رحل پر رکھا ہوا تھا اور بڑی بی گھونگھٹ میں نیچے منہ کیے بیٹھی تھیں۔ اس کا دل دھڑا جارہا تھا۔ سماگ رات کے بارے میں۔ انجانے خوف، پُرلطف درد، بے انتہا خوشی کے نازک دھاگوں سے بنے ہوئے خوبصورت خواب۔ ساجن سے مل کر ایک ہونے کی گہری تڑپ۔ جوانی میں سمائی جوان کنواری امنگوں کی انتہاء گہرائیوں کے بجائے ریشمی کپڑے میں لپٹا ہوا قرآن شریف۔ اس کا دل ڈوبا جارہا تھا۔ قرآن شریف کے پاس ایک شیشے کی پیالی میں کافور جل رہا تھا جس کی خوشبو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں موجود ایک جوان لڑکے کو لگا جیسے اس پیالے میں بی بی کے خواب جل رہے ہوں اور جل جل کے راکھ بن گئے ہوں۔

قرآن شریف سے شادی کے بعد بی بی جنت کو دورے پڑنے لگے۔ حویلی میں سب کہتے کہ بی بی نے قرآن شریف سے شادی کی ہے، اس وجہ سے اس بی بی میں کوئی نیک روح آگئی ہے۔ مسجد کا مولوی کہتا کہ روح بھی بھی اس گنوار دنیا میں نہیں آسکتی۔ باقی بی بی پر جن کا اثر ہے۔ جن بھی جنوں کا سردار ہے اور حویلی میں مہمان بن کر آتا ہے۔ جب بی بی کے اندر جن آتا تو وہ ساری لال ہوجاتی تھی۔ بال کھول کر سر کو زور زور سے ہلاتی تھی اور سارا جسم گرم ہوکر کانپنے لگتا تھا اور جو بھی قریب ہوتا اسے لپٹ کر کاٹنے لگتی تھی۔ پنجے مارتی تھی اور جلد چوس کر خون نکال دیتی تھی۔ جب تک اس میں جن ہوتا تھا، تب تک آدمی چیز کو چھوتی رہتی تھی۔

میں بی بی جنت سے بہت ڈرتا تھا۔ جب بھی لسی لینے جاتا، یہ سوچتا جاتا تھا کہ خدانہ کرے اس وقت بی بی پر جن آیا ہو۔ اگر وہ مجھے کاٹ کر خون پی لیں تو؟ پھر مولوی صاحب کی یہ بات یاد آتی کہ یہ ڈھیٹ جن بڑا حرامی اور بے ایمان ہوتا ہے۔ اگر کسی عورت ذات پر آتا ہے تو اس وقت اگر کوئی مرد وہاں موجود ہو تو وہ ڈھیٹ جن کی لپیٹ میں آجاتا ہے اور جن اس کا گلا دبادیتا ہے تو میں کانپ جاتا تھا اور جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھنی شروع کردیتا تھا اور قمیص کے بٹن جلدی سے کھول کر اپنے سینے پر پھونک مارتا اور کہتا یا اللہ، پیران پیر دستگیر کے صدقے، بی بی کو جن سے بچانا۔

سوچ کے گہرے سمندر میں تیرتی ہوئی جیسے حویلی کی ہر چیز میرے سامنے آنے لگی۔ اس دن روزانہ کی طرح میں لسی لینے کے لیے اس حویلی گیا۔ میں نے اپنا ڈبا بڑھیا مائی شاداں کے پاس رکھا اور خود چارپائی کے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔ ابھی کوئی دوسرا بچہ نہیں آیا تھا۔ مائی شاداں اپنی دھن میں لسی بنانے میں مگن تھی۔ بڑی بی بی ہرے رنگ کی شال اوڑھے سو رہی تھی۔ شاہو، جس کی اچھل کود اس ویران آنگن کو زندگی بخشتی تھی۔ وہ بھی شاید اندر حجرے میں تھی۔ عجب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف لسی بلونے کی آواز بڑی عجیب لگ رہی تھی۔ میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھا تھا کہ اسی وقت جنت بی بی اندر سے نکلی۔ اس کی آنکھیں خمار آلود تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اسی وقت بستر سے اٹھی ہوں۔ اور ساری نیند کرنے کے بجائے ساری رات کروٹیں بدلتے گزری ہے مگر ہونٹوں پر خوبصورت مسکراہٹ اور آنکھوں میں پرکشش چمک تھی۔ اس کی چال میں ایک نئی قسم کی لچک تھی۔ وہ میرے پاس آئی اور میری ٹھوڑی اوپر کرکے کہنے لگی "لڑکے، چیز کھاؤ گے؟" میں نے کوئی بھی جواب نہیں دیا اور گردن جھکا کر قمیص کا دامن انگلیوں کے گرد لپیٹنے لگا۔ مجھے اس وقت یہ بات یاد آنے لگی کہ جب بی بی صاحبہ کو جن آتا ہے تو اس کا منہ لال ہوجاتا ہے اور سانس تیز تیز چلنے لگتی ہے اور میں نے اس وقت اس کی یہ حالت دیکھی۔ اس نے میرے کاندھے پر جب ہاتھ رکھا تو میرا دل تیز تیز چلنے لگا۔ میں ڈرا۔ خوف سے میں اس کا منہ تکنے لگا۔ "ڈرو نہیں لڑکے، چلو تمہیں چیز دوں۔" اپنے ہونٹ گول دائرے کی طرح بنا کر اس نے مجھے پچکارا اور میرا بازو اپنے قبضے میں کرکے مجھے اپنے کمرے میں لے آئی۔ میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ دل میں سوچا بچے، آج تو مارا گیا۔ میری ساری جان نکل گئی۔ آیت الکرسی پڑھنے کی کوشش کی، ڈر کی وجہ سے وہ بھی یاد نہیں آرہی تھی۔ کمرے میں اندر داخل ہوتے ہی بی بی نے مجھے زور سے گلے لگالیا اور چومنے لگی۔

یہ باتیں یاد کرکے میں ایک دم چونک اٹھا۔ خیالوں کا

قد بڑھایئے
پُروقار
شخصیت
اپنایئے!
میری اس خوبصورت شخصیت کا راز کچھ تو ضرور ہے....
یہ جاننے اور اپنے قد کو بڑھا کر اپنی شخصیت کو خوبصورت بنانے کے لئے ہر پست قد کے مرد و خواتین اپنی عمر اور موجودہ قد سمیت اپنی جوابی لفافے کے ہمیں لکھ بھیجیں!
کے بی ہوم
پوسٹ بکس نمبر 2535 کراچی 74600

سلسلہ ایک دم ٹوٹ گیا۔ چاروں طرف دواخانے میں نظریں دوڑائیں۔ حکیم بدستور سفوف بنانے میں لگا ہوا تھا اور فارسی کا کوئی شعر بھی گنگنا رہا تھا اور رہ رہ کر کھانسے جا رہا تھا۔ خدا کی مار ان گاؤں والوں پر، آج کوئی آیا ہی نہیں۔ اس گاؤں والے ویسے ہی ہر چیز میں کنجوس ہیں مگر بیماری میں کنجوسی۔" اس کی اس گفتگو پر میں مسکرا دیا تھا۔ اپنی یادوں سے جان چھڑانے کی خاطر دل میں سوچا "ہولے۔ بے ہودا خیال" مگر یہ یادیں دماغ میں سے نکلنے کے بجائے شعور کی صاف شفاف سطح پر آنے لگیں۔ یادوں کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہوا اور کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی۔

میں نے اس کی حالت دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ سوچنے لگا کہ مرگیا، بی بی پر ڈھیٹ جن آیا ہوا ہے، آج خیر نہیں ہے۔ میرے مولا! خیر کرنا۔ ایک مرتبہ پھر آنکھیں کھول کر دیکھا۔ بی بی کی وہی کیفیت دیکھ کر پھر آنکھیں بند کرلیں۔

بی بی کا سارا بدن کانپ رہا تھا اور وہ حد سے زیادہ تیز تیز سانس لے رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ اس کی گرفت زور آور ہوتی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بی بی بے حال ہو کر گر پڑیں۔ مجھے اپنے بازوؤں سے آزاد کیا۔ ان کی آنکھیں ادھ کھلی ہوئی تھیں۔ مدت سے ترسی ہوئی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر تیر رہی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑے بی بی کو دیکھ رہا تھا۔ بی بی ابھی تک لیٹی ہوئی تھیں۔ بھاگنے کے لیے موقع اچھا تھا مگر پھر خیال آیا کہ اگر بی بی کا جن پیچھے سے حملہ کرکے میری گردن توڑ دے تو؟ یہ سوچ کر پھر حیرت، پیار اور تجسس سے بی بی کو دیکھنے لگا۔ سچ پوچھو تو خوف میں بھی بی بی کو دیکھ کر ایک انجانا لطف تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بی بی اٹھیں۔ اور میرے گال پر چٹکی بھر کر کہنے لگیں "دیکھو لونگے"، کسی سے کہنا نہیں" میں نے جھکی ہوئی گردن سے ہی انکار کیا۔ پھر بی بی نے نعمت خانے سے ایک مرتبان سے سوکھے ہوئے بیر میری جیب میں بھرے۔ کھجوروں کی چار عدد گریاں اور تلوں کا ایک لڈو میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "لو کھاؤ" میرے من" اور ایک آنہ میری جیب میں ڈالتے ہوئے کہا "لو" اس کی دکان سے چیز کھالینا۔ دیکھو، یہ بات کسی سے کہنا نہیں" یہ کہہ کر وہ فاتحانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر مجھے دیکھنے لگیں۔ جیسے لاکھوں کا خزانہ ان کے ہاتھ آگیا ہو۔

میں کسی لے کر گھر واپس آیا اور یہ بات کسی سے نہیں کہی۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا، کہیں بی بی کی ڈھیٹ جن میری گردن ہی نہ توڑ دے اور اس طرح میں کسی لینے جاتا تھا۔ اور اکثر اوقات بی بی جنت کے کمرے میں جا کر میں سو تا بھی تھا۔ اب مجھے بالکل ڈر نہیں لگتا تھا، جن کا بھی نہیں۔ ڈر کے بجائے اپنائیت، خوف کے بجائے انجانا مزہ۔ اور اجنبیت کے بجائے مقناطیسی کشش محسوس ہوتی تھی۔ اب میں بالکل بے خوف بی بی سے لپٹ جاتا تھا۔ بی بی کا نرم نرم بدن مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ ریشم سے بنا ہوا بدن، جب میں اس پر ہاتھ پھیرتا تھا تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کے بدن کی چڑی سفید بوسکی کی طرح چمک دار، ریشمی اور پھسلتی ہوئی بہت اچھی لگتی تھی۔ دل چاہتا تھا ہمیشہ سوتا رہوں۔ ایک پل کے لیے بھی اس سے الگ نہ رہوں۔ اس طرح میں حویلی سے کسی لینے جاتا تھا اور بی بی جنت کی عنایتوں سے مستفید بھی ہوتا تھا۔ دو سال کے قریب میں نے ایسا کیا۔ آخر ایک دن میں کسی لینے کے لیے جیسے ہی اپنا ڈیاما سی شاداں کے پاس رکھ کر خود چارپائی پر بیٹھا تو بڑی بی بی نے مجھے آواز دی اور میرے منہ کو غور سے دیکھ کر کہنے لگی۔

"بیٹا، اب تم بڑے ہو گئے ہو، منہ پر مونچھوں کی ہلکی لکیریں ظاہر ہو رہی ہیں، اس لیے حویلی کے اندر مت آیا کرو، کسی کے لیے اپنا چھوٹا بھائی بھیج دیا کرو۔" اس آخری دن بی بی جنت نے مجھے بہت زیادہ وقت دیا۔ چلتے وقت انہوں نے زور سے گلے لگا کر انہوں نے کہا تھا "تم مجھے یہاں سے بھگا کر لے جاؤ، دور سے ملک۔"

میں ان کے یہ الفاظ سن کر کانپ گیا اور بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کرلی اور اپنے آپ کو ان سے دور کرتے ہوئے کہا "نہیں، نہیں۔ میں تمہیں کہاں لے کر جاؤں گا۔ تمہاری شادی تو قرآن شریف سے ہوئی ہے۔ میں نے اگر تمہیں بھگایا تو دریائے سندھ کا پانی سوکھ جائے گا۔"

انہوں نے ڈھیلی ہوئی گرفت کو پھر جوش و جذبے سے مضبوط کرتے ہوئے کہا "دیکھو، میرے من! ایسا مت سوچا کرنا اس کے نیچے روز آجانا، میں تمہیں پیسے بھی بہت دوں گی۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ خیالات کا سلسلہ چلتا رہا مجھے یاد آیا بی بی شہ بانو، بی بی جنت کی چھوٹی بہن بھی حسن میں اپنی مثال آپ تھیں۔ ان کی شادی حویلی والوں نے بی بی جنت کی طرح قرآن سے کروائی تھی۔ کیا بی بی شہ بانو بھی جمعہ شیدی کے ساتھ سوتی ہوں گی؟ جیسے بی بی جنت نے مجھے کہا تھا بھاگنے کو، ویسے ہی شہ بانو نے بھی جمعہ شیدی کو بھاگنے کے لیے کہا ہوگا۔ مگر جمعہ شیدی تو بہت بدصورت ہے، کالا رنگ، موٹی ناک، منہ پر چیچک کے نشان۔ اس کے ساتھ بھاگ گئیں۔ خود تو بی بی ایسی ہیں جیسے گلاب کا



پھول۔۔۔ میں تو بالکل بزدل ہوں۔ میں بھی بی بی جنت کو بھگا لے جاتا تو مزہ آجاتا۔۔۔ مگر وہ وڈیروں کی اولاد ہے۔ سائیں ڈھل کی بیٹی، جو لاکھوں کا مرشد ہے۔ یہ خیالات آتے ہی میری آنکھوں میں سائیں ڈھل کی تصویر گھوم گئی۔ جلالی چہرہ، شراب میں ڈوبی ہوئی خمار آلود لال انگارہ آنکھیں۔ کالے ہونٹوں پر مڑی ہوئی مونی مونچھیں۔ گوشت سے بھرا ہوا چہرہ۔ موٹی گردن۔ اپنی موٹی گردن کو پیچھے کرکے جب وہ قہقہہ مارتا تھا تو جیسے گرج پیدا ہوتی تھی۔ اس کی شکل یاد کرکے مجھ پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔

جمعہ کی خیر نہیں ہے۔ حویلی والوں کی لڑکی بھگانی ہے اس نے۔ وہ بھی سائیں ڈھل کی بیٹی۔ سندھ کے سرداروں کا سردار، ذات ذات، اکو ہردم اس کے سلامی۔ اس کے علاوہ سپر اسپلی۔ جمعہ کے تو سائیں ٹکڑے ٹکڑے کروے گا۔ اگر سائیں کو میری خبر ہوگئی تو۔۔۔ یہ سوچتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"میاں، چپ چاپ بیٹھے کیا سوچ رہے ہو، ایک تو سارا دن کوئی آیا نہیں، ایک تم ہو۔۔۔ وہ بھی اپنی سوچوں میں گم۔" حکیم مونڈھے کو کھسکا کر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ سائیں ڈھل، جمعہ شیدی کے ٹکڑے کروادے گا۔"

"ارے رہنے دو۔ یہ صرف سندھ میں شیر ہیں، باہر دیکھو۔۔۔ بالکل گیدڑ۔"

"مگر سائیں کے مرید باہر بھی تو ہیں۔ سائیں اپنی پر آئے تو اس کا قیمہ کروادے۔" میں نے کہا۔

"ارے چھوڑو یار، یہ سندھ کے لوگ سادے، معصوم۔۔۔ ارے میاں، زمانہ بدل گیا ہے۔ کہاں پہنچ گیا ہے۔ بھئی اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ مرشد کی بیٹیاں بھگانے والے واپس کہاں سے کریں گے؟"

"مگر حکیم صاحب، بی بی تو قرآن کو بخشی ہوئی تھی نا، قرآن تو اللہ کا ہی کلام ہے۔ جمعہ شیدی نے دریائے سندھ ہی مار دیا۔" اس بات پر حکیم صاحب نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور کہا۔

"میاں، خاموشی ہی اچھی ہے۔ یہ شاہوا اس گنجے کو ہی راس آتی لیکن جناب۔۔۔" حکیم نے پھر کہنا شروع کیا "جمعہ شیدی کو شاباش ہے۔ جناب ماننا چاہیے، مرد کا بیٹا ہے۔"

حکیم صاحب کے یہ الفاظ مجھے تیر بن کر لگے۔ مجھے ایسا لگا کہ حکیم صاحب مجھے کہہ رہے ہوں کہ تم ہی بہت کم ہمت نکلے۔

○☆○


خدمتِ انسانیت ایک عظیم عبادت ہے
ارشاد نبوی ﷺ

آپ پریشان آخر کب تک؟

اگر خدانخواستہ آپ کسی بھی اندرونی بیماری اعصابی کمزوری، تبخیر معدہ یعنی گیس ٹربل شوگر یا دیگر قابل علاج امراض کی پریشانی میں مبتلا ہیں تو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی گناہ ہے۔ ہمارا بلند معیار۔ بااصول مستند ادارہ آپ کو سستا، آسان، اصولی، تسلی بخش مستقل اور مختصر علاج فراہم کرے گا۔

ہمارا طریقہ علاج

دوسرے اداروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جس سے بعض اوقات مرض بڑھ کر ختم ہو جاتی ہے اور دوبارہ علاج کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

ادویات بذریعہ ڈاک منگوائی جاسکتی ہیں

اندرون و بیرون ملک حضرات اپنے تمام حالات مفصل لکھ کر مشورہ حاصل کرسکتے ہیں۔ فیصلہ راز ایک امانت ہوگی۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ اپنی مرض کو لمبی پرانی یا لاعلاج نہ بنائیں بلکہ جس قدر جلد ممکن ہو۔ اپنا اصولی، تسلی بخش اور مستقل علاج کروائیں۔ کیونکہ اگر صحت اچھی ہوگی تو تب ہی ساری خوشیاں بھی اچھی لگیں گی

تندرستی ہزار نعمت ہے

منیجر مستند ادارہ انجم الصحت

شریف دواخانہ قائم شدہ ۱۹۴۱ء

پوسٹ بکس ۹ حافظ آباد پوسٹ کوڈ ۵۲۱۱۰ پاکستان

گزشتہ قسط کا خلاصہ

الپا کی خواہش تھی کہ وہ کسی بھی طرح پارس کو اپنے قابو میں کرنے میں پہلی پر ہی ہوئی اور جیکب راہبن کی قربانی کی وجہ سے وہ پارس کو قابو میں کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ میں عبداللہ واسطی کے ساتھ جین میں تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ وہاں اپنے ارادے کی شاخ قائم کریں گے ہمارے ساتھ اور بھی کئی سراغ رساں وہاں موجود تھے ان میں سے ایک احمد زبیری تھا جو برطانوی جاسوسہ جوزلین کے آگے اپنا دل ہار بیٹھا اور اس کی ناپسندیدہ کر گرمیوں کے باوجود اسے چینی حکام سے معافی دلوا کر برطانیہ بھجوا دیا۔ ادھر اسکاٹ لینڈ یارڈ کی افسر شیوانی بھاسکر قسمی بے کے لیے عذاب بن گئی تھی۔ اس نے بے کے بعد دیگرے بے ٹھکانہ اور بے قابو کو اپنا غلام بنا لیا اور اب بے سامو کو اپنا معمول بنانا چاہتی تھی۔ ہندوستان میں بھیا کی شامت آئی ہوئی تھی۔ جمونت پال کی ماں نئی ہنومانی حاصل کر کے براسے لوٹی تھی اور راستے کے سفر میں پورس پر عاشق ہو گئی تھی۔ ہندوستان میں بھیا کی شامت آئی کے چکر میں تھا۔ بھیا سخت پریشانی کا شکار تھا پھر جمونت مارا گیا اور بھیا کو اس میں سانے کا موقع مل گیا۔ ہر طرح ناکامی کے بعد امریکا نے اسکاٹ لینڈ یارڈ سے جین میں بننے والی نرانیار مرمشین کی تیاری روکنے کے لیے مدد طلب کی۔ سودا ایک کروڑ پونڈ میں طے ہوا اور شیوانی نے اس مشن کے لیے تمادی ظاہر کر دی۔ کوئی نہیں جانتا کہ مقدر کس کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ شیوانی کا ساتھ بھی دے سکتا تھا۔

دو سو چھیاسی واں مہینہ

# پیوپے

فرہاد علی تیمور


اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا طویل ترین سلسلہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

الپا کی یہ شدید خواہش رہی تھی کہ کسی طرح پارس کو غلام بنالے۔ یہ خواہش برسوں سے دل میں مچلتی رہی تھی۔ برسوں کے بعد اب قسمت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ پارس کو ٹریپ کرنے 'قیدی بنانے اور اس پر تنویمی عمل کرکے اسے اپنا غلام بنانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

ویسے اندر سے مطمئن نہیں تھی۔ اب تک پارس کے مقابلے میں ناکام رہی تھی۔ اس پر تنویمی عمل کرنے کے باوجود دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ پتا نہیں تنویمی عمل کامیاب ہوا ہے یا نہیں؟ اس عمل کا اثر پارس پر ہوا ہے یا نہیں؟ اور کیا وہ غلام بن چکا ہے؟

الپا کے تنویمی عمل کے بعد پارس گہری تنویمی نیند سو رہا تھا۔ اس کے بیدار ہونے کے بعد معلوم ہونے والا تھا کہ الپا کو کامیابی حاصل ہوئی ہے یا نہیں؟

کامیابی کی صورت میں وہ الپا کے سامنے سر جھکا لیتا۔ ناکامی ہوتی تو پھر الپا کے لیے مصیبت بن جاتا۔ اس اندیشے کے باعث اس نے تنویمی عمل کرنے کے باوجود اسے آہنی سلاخوں کے پیچھے قیدی بنا کر رکھا تھا۔ تاکہ وہ غلام نہ بنے تو قیدی بن کر ضرور رہے۔

بوبی نے کہا "الپا! تم دوسرے دشمنوں کے مقابلے میں پارس سے بہت زیادہ محتاط رہتی ہو۔ یہ درست ہے کہ وہ چالبازی سے ہمیشہ تمہارے لیے مسائل پیدا کرتا رہا ہے لیکن اب کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرے گا وہ غلام بن چکا ہے۔"

"ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ جب وہ نیند سے بیدار ہوگا۔ تب ہی نتیجہ سامنے آئے گا۔"

"اس کی وجہ سے ٹرانسفارمر مشین کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔ اگر یہ ہمارے ملک میں نہ آتا تو ہم اس وقت مشین کی تیاری کے ابتدائی مراحل میں ہوتے۔"

"ہاں پارس کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے لیکن یہ میرا غلام بن جائے گا تو اس کی موجودگی سے فائدہ پہنچے گا۔ یہ ٹرانسفارمر مشین کا ماہر مکینک ہے۔ ہمارے پاس پہلے ہی جیکی ہنر جیسا ماہر مکینک ہے دو مکینک بڑی کامیابی سے مشین تیار کر سکیں گے۔"

بوبی نے کہا "مجھے جیکی ہنر کے پاس جانا چاہیے۔ وہ اپنے بنگلے میں تنہا ہے۔ اسے زیادہ دیر تک تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

الپا نے کہا "یہ بڑی مشکل ہے۔ اب میں جیکی ہنر کے دماغ میں نہیں جا سکتی۔ اس کے دماغ میں جب تک وہ کیل پیوست رہے گی کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا اس کے دماغ میں نہیں جا سکے گا۔ میں نے دشمنوں کو اس کے دماغ میں جانے سے روکنے کے لیے وہ کیل پیوست کرائی تھی۔"

وہ سوچنے لگی۔ ایک طرح سے اس نے دانش مندی سے کام لیا تھا۔ دوست اور دشمن خیال خوانی کرنے والے جیکی ہنر کے دماغ میں نہیں جا سکتے تھے۔ اس کا سراغ نہیں لگا سکتے تھے کہ الپا نے اسے کہاں چھپا کر رکھا ہے؟

جیکی ہنر بہت اہم تھا۔ وہی ٹرانسفارمر مشین تیار کر سکتا تھا۔ جیکب رابن نے جیکی ہنر اور بوبی کے سروں میں کیلیں پیوست کرنے سے پہلے کہہ دیا تھا کہ وہ بھی ان دونوں کے دماغوں میں نہیں جا سکے گی۔

جیکب رابن نے کہا تھا "جب تک میں زندہ ہوں' میرے منتروں کے ذریعے جیکی ہنر اور بوبی کے چور خیالات پڑھ سکو گی۔ ورنہ وہ کیلیں تمہاری خیال خوانی کا راستہ روکتی رہیں گی۔"

الپا نے جیکب رابن کی اس بات کو مان لیا تھا کہ وہ ضرورت کے وقت اس کے منتروں کے ذریعے جیکی اور بوبی کے دماغوں میں جایا کرے گی اس وقت دانش مندی یہی تھی کہ ٹرانسفارمر مشین تیار کرنے والے جیکی اور بوبی کے دماغوں کو مقفل رکھا جائے۔ دوسرے لفظوں میں تمام ٹیلی پیتھی جاننے والے دشمنوں سے انہیں محفوظ رکھا جائے۔

لیکن تقدیر اپنا کھیل دکھا رہی تھی۔ الپا جو سوچ بھی نہیں سکتی تھی' وہ ہو گیا۔ جیکب رابن کی موت کا مطلب یہ تھا کہ ان دونوں کے دماغ الپا کے قابو لائے ہوگئے۔ منتروں کے ذریعے اسے ان کے دماغوں میں انٹر کرنے والا نہیں رہا تھا۔

اب ایک ہی راستہ تھا کہ وہ جیکی اور بوبی کے سروں سے وہ کیلیں نکال دے جو اسے ان کے دماغوں میں جانے اور ان کے چور خیالات پڑھنے کے مواقع ملتے رہتے۔ وہ معلوم کرتی رہتی کہ وہ دونوں ہدایتوں کے تکلم میں ہیں یا نہیں؟

اگر نہیں تو پھر وہ تکلم نہیں' آہستہ سے سانپ ہوتے۔ ٹیلی پیتھی کی دنیا میں ایسے سائے پر بھی بھروسا نہیں کیا جاتا لیکن جیکب رابن کی اچانک موت کے باعث الپا ان دونوں پر بھروسا کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

وہ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ پارس کو اپنا غلام بناتے ہی جیکی ہنر کو زنجیریں پہنا کر رکھے گی۔ وہ اپنے بنگلے سے باہر نہیں جا سکے گا اور بوبی کو اس نے پیار کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ اسے اپنے قرب رکھنے کے بہانے اس کی کڑی نگرانی کر سکتی تھی۔

بوبی نے ٹیلی فون کے پاس آکر ریسیور اٹھایا پھر رابطہ کرنے کے بعد دوسری طرف سے فون کی گھنٹی سننے لگا۔ الپا نے پوچھا "خاموش کیوں ہو؟ کیا جیکی فون اٹینڈ نہیں کر رہا ہے؟"

"نہیں۔ وہاں فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ ہو سکتا ہے' ٹیلی فون باتھ روم میں ہو۔ میں دس منٹ بعد فون کروں گا۔"

وہ ریسیور رکھ کر خود باتھ روم میں چلا گیا۔ الپا بے بسی سے سوچنے لگی "ایسے ہی وقت ٹیلی پیتھی کام آتی ہے۔ ٹیلی فون کے ذریعے معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ جیکی باتھ روم میں ہے یا بنگلے سے باہر چلا گیا ہے؟"

اس نے جیکی کو سختی سے منع کیا تھا کہ کبھی بنگلے کے باہر قدم نہ رکھے۔ اسے صرف بوبی کے ساتھ باہر جانے کی اجازت تھی۔ میک اپ کے ذریعے جیکی ہنر کا چہرہ اور حلیہ بدل دیا گیا تھا۔ اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ وہ پہچان لیا جائے گا۔ البتہ یہ خدشہ تھا کہ تنہا باہر جائے گا تو پتا نہیں کہاں بھٹک جائے گا پھر اسے تلاش کرنے کا مسئلہ پیدا ہوگا۔ دشمن تو کسی بھی غلطی یا کمزوری کی تاک میں رہتے ہیں۔ وہ جیکی کے بھٹکنے کا فائدہ اٹھا سکیں گے۔

اس نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ بوبی واپس نہیں آیا تھا۔ وہ خود ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی پھر ریسیور کو کان سے لگا کر سننے لگی۔ دوسری طرف فون کی گھنٹی بج رہی تھی لیکن جیکی فون اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ یہ تشویش میں مبتلا کرنے والی بات تھی۔ وہ یقین میں بدل رہا تھا کہ جیکی تنہا بنگلے سے باہر چلا گیا ہے۔

اس نے باتھ روم کے دروازے کے پاس آکر دستک دی "بوبی! باہر آؤ۔ جیکی فون اٹینڈ نہیں کر رہا ہے۔ فوراً وہاں جاؤ۔"

بوبی پتلون پہنتا ہوا باہر نکلا۔ وہ بولی "میں پارس کو پٹا ٹائز کر رہی تھی۔ اس وقت تمہیں جیکی کے پاس جانا چاہیے تھا۔"

"میں ابھی جا رہا ہوں۔ جیکی کے پاس پہنچتے ہی تمہیں فون کروں گا۔ فکر نہ کرو۔ وہ اپنے بنگلے میں ہی ہوگا۔"

وہ بیڈ روم سے باہر چلا گیا۔ الپا صوفے پر بیٹھ گئی اور پریشان ہو کر سوچنے لگی "اگر جیکی کہیں چلا گیا ہوگا تو ٹرانسفارمر مشین کی تیاری میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ اگرچہ پارس کو معمول بنا کر مشین تیار کی جا سکتی تھی لیکن وہ اتنے اہم معاملے میں صرف پارس پر بھروسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ خیال خوانی کی پرواز کرتی ہوئی پارس کے دماغ میں پہنچی۔ اس کے اندر گہری خاموشی تھی۔ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کا خوابیدہ ذہن کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔ الپا نے جو تنویمی عمل کیا تھا اس کے مطابق وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

وہ مطمئن ہو کر دماغی طور پر حاضر ہو گئی۔ اب اس کی تمام توجہ اور تمام پریشانیاں جیکی ہنر کی وجہ سے تھیں۔ وہ بار بار یہ سوچ کر جھنجلانے لگی کہ کیلی پیتھی کے ذریعے اس کے دماغ میں نہیں پہنچ پا رہی ہے۔ ٹیلی فون کی محتاج ہو گئی ہے۔ بوبی وہاں سے فون کرے گا تب جیکی کے بارے میں اچھی یا بری خبر مل سکے گی۔

اسے خیال آیا کہ تقریباً بارہ گھنٹے گزر چکے ہیں' اس نے اسرائیلی اکابرین سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ وہ سب پریشان ہوں گے۔ اس نے فوراً ہی فوج کے ایک اعلیٰ افسر کے اندر پہنچ کر اسے مخاطب کیا "ہیلو کرنل! میں ہوں الپا۔"

"الپا! تم کہاں ہو؟ تم نے کل سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ ایسے وقت ہم اندیشوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ڈر سا لگتا ہے کہ دشمنوں نے کہیں تمہیں ٹریپ نہ کر لیا ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ جب دشمن مجھ پر غالب آئیں گے تو یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔ میں برسوں سے تمہارے لڑتی آ رہی ہوں۔ آج تک کوئی مجھے شکست نہ دے سکا اور نہ ہی دے سکے گا۔"

"آج تم نے کسی خاص دشمن کو گرفتار کرنے کے لیے اس شہر کے ایک علاقے کی ناکہ بندی کی تھی۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ تم نے اسے قیدی بنا لیا ہے۔ کون ہے وہ؟"

"وہ میرا بہت ہی خاص قیدی ہے۔ ابھی میں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"تم ہمارے ملک اور قوم کی بھلائی کے لیے مصلحتاً رازداری سے کام لیتی رہتی ہو لیکن یہ راز کھل چکا ہے کہ تم امریکا سے ٹرانسفارمر مشین کا نقشہ.... حاصل کر چکی ہو اور تم نے اس مشین کے ایک ماہر مکینک کو بھی اغوا کیا ہے۔ امریکی حکام ہم سے شکایتیں کر رہے ہیں۔"

"امریکی حکام کو کیا جواب دیا گیا ہے؟"

"یہی کہ تم نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔ کسی ثبوت کے بغیر تمہیں اتنا بڑا الزام نہ دیا جائے۔ ویسے الپا! ہم سب کو اور پوری قوم کو تم پر ناز ہے۔ ہمارے ملک میں ٹرانسفارمر مشین تیار ہوگی تو پھر ٹیلی پیتھی جاننے والی یہودی فوج تیار ہوگی۔ دنیا کے نقشے میں اسرائیل ایک نقطے کے برابر چھوٹا سا ملک ہے۔ مگر تم ہمارے اس ملک کو سپر پاور بنا رہی ہو۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ الپا نے کہا "کرنل! میں ایک ضروری کال اٹینڈ کر رہی ہوں۔ آپ تمام اکابرین سے بعد میں رابطہ کروں گی۔"

اس نے خیال خوانی کا رابطہ ختم کیا۔ پھر ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتی ہوئی بولی "ہیلو! میں بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے بوبی کی آواز سنائی دی "الپا! غضب ہو گیا۔ جیکی ہنر یہاں سے بنگلے میں نہیں ہے۔"

"نو نان سینس! وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

"مجھے نان سینس کہہ رہی ہو؟ میرا کیا قصور ہے؟"

"تمہاری حماقت سے وہ بھاگ گیا ہے۔ یاد رکھو اگر وہ نہ ملا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ جاؤ اسے تلاش کرو ہر پندرہ منٹ بعد موبائل فون کے ذریعے اطلاع دیتے رہو کہ تم اسے تلاش کرنے کے لیے کیا کر رہے ہو؟"

وہ غصے سے ریسیور پٹخ کر ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ جیکی کے غائب ہونے سے ٹرانسفارمر مشین کے سلسلے میں ناکامی کے آثار پیدا ہو گئے تھے پہلا پریشان کرنے والا خیال یہی تھا کہ جیکی اپنے امریکی سراغ رسانوں کے ہاتھ لگے گا تو وہ اسے اپنے ملک لے جائیں گے۔ جیکی وہاں جا کر اسرائیل کے خلاف گواہی دے گا کہ یہودیوں نے اپنے مخصوص مقاصد حاصل کرنے کے لیے اسے اغوا کیا تھا۔

الپا کو امریکی مخالفت کی پروا نہیں تھی۔ اسے ٹرانسفارمر مشین کی فکر تھی۔ اس کی کامیابی ناکامی میں بدلتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت اس کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ کسی طرح جیکی ہنٹر کے دماغ میں پہنچ جائے اور یہ معلوم کر لے کہ وہ کہاں ہے؟

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہاتھ آئے گا تو سب سے پہلے اس کے سر سے کیل نکالے گی۔ اس کے دماغ میں آنے جانے کا راستہ بنائے گی۔ اسے پھر کبھی گم نہیں ہونے دے گی۔ ایسا کرنے سے ایک اندیشہ رہے گا کہ دشمن بھی جیکی کے دماغ میں آئیں گے۔ ان دشمنوں کو روکنے کا ایک عام طریقہ تھا۔ وہ جیکی کے دماغ کو تویزی عمل کے ذریعے لاک کر سکتی تھی۔

بوبی ہر پندرہ منٹ کے بعد فون کے ذریعے رابطہ کر رہا تھا اور یہ کہہ کر مایوس کر رہا تھا کہ جیکی ہنٹر شہر میں کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔ الپا نے کہا "کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ کھلی جگہ سڑکوں پر، یا پارک وغیرہ میں گھومتا پھرتا رہے۔ وہ کسی ہوٹل میں یا کسی مکان میں پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے چھپ کر رہ سکتا ہے۔"

وہ فون کے ذریعے انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر سے بولی۔ "اپنے تمام سراغ رسانوں کو ایک شخص کی تلاش پر مامور کرو۔ کوئی ہوٹل، کلب یا مکان نہ چھوڑو۔ ہر جگہ چھان کر اسے تلاش کرنے کا حکم دو۔"

اس نے جیکی ہنٹر کا موجودہ حلیہ بتایا پھر شہر سے اور ملک سے باہر جانے کے تمام راستوں کی ناکہ بندی کا بھی حکم دیا۔ وہ جیکی تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی پھر بھی مطمئن نہیں ہو رہی تھی بے چینی اور پریشانی ایسی تھی کہ اپنے بنگلے میں سکون سے نہ بیٹھ سکی۔ اپنی کار میں بیٹھ کر خود اس کی تلاش میں نکل پڑی۔

ادھر پارس آہنی سلاخوں کے پیچھے قیدی بنا ہوا تھا۔ الپا نے پہلے اسے جسمانی طور پر قید کیا تھا پھر تویزی عمل کے ذریعے دماغی طور پر بھی اسے قیدی بنا لیا تھا۔ تویزی نیند پیدا کرنے کے بعد اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد بھی وہ خود کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دیکھ چکا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ الپا اس کے دماغ میں آئی تھی اور اس نے اس پر تویزی عمل کیا تھا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا "کیا میں الپا کا معمول بن چکا ہوں۔"

الپا، جیکی ہنٹر کو تلاش کر رہی تھی۔ ہوٹلوں، کلبوں اور تفریح گاہوں میں جا کر اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ پارس کی طرف سے بھی غافل نہیں تھی۔ اس نے ایک سڑک کے کنارے کار کو روک کر خیال خوانی کی پرواز کی۔ پارس کے دماغ میں پہنچ کر اس کے خیالات پڑھے پھر اس سے کہا "ہاں تم میرے معمول اور محکوم بن چکے ہو۔ اب تم میرے ایک اشارے پر ناچو گے۔"

وہ قید خانے کے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا پھر بولا "آج تک کوئی مرد مجھے نچا نہیں سکا۔ تم کیا نچاؤ گی؟"

"آج تمہارے غرور کا سر نیچا ہوگا۔ فرہاد علی تیمور کا بیٹا میرے حکم پر ناچے گا۔ ابھی ناچو گے۔"

الپا نے پارس کے [illegible] حکم دیا "اٹھو، کھڑے ہو جاؤ۔"

اس کا دماغ اپنے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ الپا نے کہا "ایک ٹانگ اٹھاؤ اور دوسری ٹانگ پر کھڑے رہو۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ بولی "میں نے دنیا کو دو ٹانگوں پر ناچتے دیکھا ہے۔ آج ایک بیر کا ناچ دیکھنا چاہتی ہوں۔ اب ایک ٹانگ پر ناچو۔"

یہ نیلی چھتری، یہ تویزی عمل بڑی ظالم چیز ہے۔ شہ زوروں کو بھی ننگی کا ناچ نچا دیتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی شکست نہیں کھائی تھی مگر حالات نے اسے مات دے دی۔ ہماری دنیا میں ہر عروج کو زوال ہے۔ مجھے بھی زوال آتا ہے۔ میرے بیٹے کو بھی آیا۔ وہ ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر ناچنے لگا۔

افسوس، یہ میری لاعلمی میں ہو رہا تھا۔

○☆○

اسکاٹ لینڈ یارڈ کی اعلیٰ افسر شیوانی نے بڑی حکمت عملی سے جے کافو اور جے فلو کو اپنا معمول اور محکوم بنا لیا تھا۔ اب ان کا تیسرا ساتھی جے سامو رہ گیا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کے دونوں ساتھی اپنی آزادی کھو چکے ہیں۔ ایک طویل مدت تک آزاد اور ناقابلِ شکست رہنے کے بعد ایک عورت کے غلام بن گئے ہیں۔

جے سامو نے جے فلو سے کہا تھا کہ وہ صبح کی فلائٹ سے لندن پہنچنے والا ہے۔ شیوانی اپنے ذرائع سے یہ معلوم کر چکی تھی۔ اس کے ماتحت جاسوس جے سامو کو حراست میں لینے کے لیے صبح ایئرپورٹ پہنچ گئے تھے لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔ اسکاٹ لینڈ کی ایک جاسوسہ جے سامو کو پھانس کر وہاں لانے والی تھی۔ اسی جاسوسہ کے ذریعے شیوانی، جے سامو کو پھانسنے والی تھی مگر اس جاسوسہ نے لندن پہنچ کر کہا "جے سامو اچانک کہیں گم ہو گیا ہے۔ وہ مجھ سے روم کے ایئرپورٹ پر ملنے والا تھا۔ میں جہاز کے پرواز کرنے تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن وہ نہیں آیا۔"

شیوانی نے پوچھا "وہ نہیں آیا۔ تمہیں بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہیں اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ تم اس کے ساتھ کسی دوسری فلائٹ سے آ سکتی تھیں۔"

"میں یہی چاہتی تھی۔ روم میں رہ کر اس کا انتظار کرنا تھا لیکن یہ محسوس کر رہی تھی کہ میرا دماغ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی یہاں چلی آئی ہوں۔"

"ہوں! اس کا مطلب ہے، جے سامو نے خطرہ محسوس کر لیا ہے۔ محتاط ہو گیا ہے۔ اسے ٹریپ کرنے کے لیے دوسری چال چلنی ہوگی۔"

شیوانی نے جے کافو کے بعد جے فلو پر تویزی عمل کرایا تھا۔ ہپناٹائز کرنے والے نے کامیابی سے عمل کیا تھا لیکن اس نے جے کافو اور جے فلو کے دماغوں کو لاک نہیں کیا تھا۔ شیوانی نے بھی اس پہلو پر دھیان نہیں دیا تھا۔

پچھلی رات جے سامو نے اپنے ساتھی جے فلو سے رابطہ کیا تھا۔ اور پوچھا تھا "کیا تم لندن پہنچ گئے ہو؟"

جے فلو نے کہا "میں لندن میں ہوں۔ یہاں شیوانی سے دوستی ہو گئی ہے۔"

"دوستی؟" اس نے حیرانی سے پوچھا "شیوانی ہماری دشمن ہے اس نے ہمارے دوست جے کافو کو اپنا غلام بنا لیا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ شیوانی سے دوستی ہو گئی ہے؟"

"سامو! پلیز شیوانی کو دشمن نہ کہو۔ ہم اسے غلط سمجھ رہے تھے۔ اس نے ہمارے ساتھی کو غلام نہیں بنایا ہے۔ مجھے بھی معمول نہیں بنایا ہے۔ تمہیں بھی نہیں بنائے گی۔ فوراً چلے آؤ۔"

"بس رہنے دو۔ تمہاری ان باتوں نے سمجھا دیا ہے کہ جے کافو کی طرح تمہیں بھی معمول بنا لیا گیا ہے۔"

"تم مجھ جیسے دوست کو غلط سمجھ رہے ہو۔ تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔"

"میں پہلے یہ اچھی طرح سمجھوں گا کہ مجھے بھروسا کرنا چاہیے یا نہیں؟ اس کے بعد لندن آؤں گا۔"

سامو اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ جے فلو نے اسے مخاطب کیا۔ اسے آوازیں دیں لیکن اس نے یہی تاثر دیا کہ وہ دماغ سے جا چکا ہے۔ تھوڑی دیر بعد شیوانی نے جے فلو کے پاس آ کر کہا "تمہیں چین کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ کیا تم نے ان معلومات کو ذہن نشین کر لیا ہے؟"

جے فلو نے کہا "سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہاں فرہاد علی تیمور کے علاوہ بابا صاحب کے ادارے سے تعلق رکھنے والے اہم افراد پہنچے ہوئے ہیں۔ ان میں علی تیمور بھی ہے۔"

شیوانی نے پوچھا "اس سے بھی زیادہ اہم بات کیا ہے؟"

جے فلو نے کہا "بابا صاحب کے ادارے کے تعاون سے وہاں ایک ٹرانسفارمر مشین تیار کی جانے والی ہے۔ ہم اس مشین پر چین جا رہے ہیں کہ اس ٹرانسفارمر مشین کو کسی قیمت پر بھی تیار نہیں ہونے دیں گے۔"

جے سامو بڑی خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان تھری جے نے ابتدا ہی سے یہ طے کیا تھا کہ کبھی کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے سے نہیں ٹکرائیں گے۔ بابا صاحب کے ادارے سے ٹکرانے کا تو وہ خواب بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے لیکن اب وہی جے کافو اور جے فلو مجھ سے اور علی تیمور سے ٹکرانے کی جرأت کر رہے تھے۔

جے سامو نے ان کے احمقانہ فیصلے سے سمجھ لیا کہ وہ دونوں بے شک و شبہ شیوانی کے غلام بن چکے ہیں۔

پھر شیوانی اور جے فلو کے درمیان مزید گفتگو ہوئی تو یہ پتا چلا کہ روم میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ایک جاسوسہ جے سامو کو محبت کے جال میں پھانس کر لندن لا رہی ہے۔

اس کے بعد ہی جے سامو محتاط ہو گیا۔ اس نے حیران ہو کر سوچا کہ اس نے اب تک اس جاسوسہ کے چور خیالات کیوں نہیں پڑھے تھے؟ جب عقل آئی تو اس نے جے فلو کے آس پاس رہنے والے چند سراغ رسانوں کے دماغوں میں جگہ بنائی۔ دوسری صبح وہ جاسوسہ لندن پہنچی تو اس کے اندر رہ کر وہ اور کئی اہم افراد کے دماغوں میں پہنچ گیا۔ ان کے خیالات سے معلوم ہوا کہ شیوانی، جے کافو اور جے فلو کے علاوہ دو بہت ہی ذہین سراغ رساں بھی چین جانے والے ہیں۔

جے سامو نے ان دونوں سراغ رسانوں کے دماغوں میں بھی جگہ بنائی۔ اب وہ دور رہ کر اپنے دونوں ساتھیوں کو شیوانی کے شکنجے سے نجات دلانے کی تدابیر پر عمل کر رہا تھا۔

شیوانی نے اسکاٹ لینڈ کے ان تمام سراغ رسانوں سے رابطہ کیا' جو روم میں تھے۔ ان سے کہا گیا کہ جے سامو روم میں یا اٹلی کے دوسرے علاقوں میں چھپا ہوگا' اسے ہر حال میں تلاش کیا جائے۔

ای میل کے ذریعے جے سامو کی تصویر حاصل کی گئی تھی۔ اسی تصویر کے ذریعے اسے پہچانا جاسکتا تھا۔ جے سامو اتنا نادان نہیں تھا کہ وہی چہرہ لیے پھرتا رہتا۔ اس کے چہرے پر عارضی میک اپ تھا۔ شیوانی کی چالبازی اور اس جاسوسہ کے فریب کا علم ہوتے ہی اس نے عارضی میک اتار دیا تھا۔ اس کے بعد کوئی اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔

شیوانی نے جے کانفو اور جے فلو کو حکم دیا کہ وہ خیال خوانی کے ذریعے جے سامو سے رابطہ کریں۔ اسے اپنی طرف مائل کریں اور اس کے دماغ میں رہنے کے دوران میں یہ معلوم کرتے رہیں کہ وہ کس ملک کے کس علاقے میں ہے؟ اور جگہ تبدیل کرتے ہوئے کہاں کہاں جارہا ہے؟

ان دونوں نے اس کے دماغ میں پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔ اس نے کہا "میرے جان سے زیادہ عزیز ساتھیو! میں جب تک تم دونوں کو شیوانی سے نجات نہیں دلاؤں گا' تب تک تم میں سے کسی کو اپنے دماغ میں نہیں آنے دوں گا۔ اب یہاں سے جاؤ۔"

اس نے سانس روک لی۔ ان دونوں نے واپس آکر شیوانی سے کہا "ہمارا دوست ہم سے بدظن ہوگیا ہے۔ وہ ہمیں اپنے دماغ میں نہیں آنے دے گا۔ ابھی اس نے سانس روک کر ہمیں بھگا دیا ہے۔"

شیوانی نے کہا "ہم کل کی فلائٹ سے چین جائیں گے۔ جے سامو کو تلاش کرنے اور ٹریپ کرنے کا وقت نہیں ہے۔ واپس آکر اس سے نمٹ لیا جائے گا۔"

اسکاٹ لینڈ یارڈ کے اعلیٰ افسر نے شیوانی سے کہا۔ "ہماری ایک جاسوسہ کا نام ماریہ ہے۔ وہ جاسوسی کے لیے چین گئی تھی۔ وہاں حکومت چین کے خلاف کارروائی کرتی ہوئی پکڑی گئی تھی۔ اسے یہاں واپس بھیج دیا گیا اور یہ پابندی عائد کردی گئی کہ ماریہ آئندہ کبھی چین کی سرزمین پر قدم نہیں رکھے گی۔"

شیوانی نے کہا "چین میں ملک دشمن عناصر کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ تعجب ہے کہ انہوں نے ماریہ کو گولی نہیں ماری اور اسے یہاں واپس بھیج دیا۔ حکومت چین نے ماریہ پر یہ خاص مہربانی کیوں کی؟"

اعلیٰ افسر نے کہا "ہمیں شبہ ہوا تھا کہ چین میں ماریہ کا برین واش کیا گیا ہے۔ اسے اپنی طرف مائل کرکے ہمارے خلاف جاسوسی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ہمارے خاص آدمی اس کی نگرانی کرتے رہے ہیں لیکن وہ یہاں کسی قابلِ اعتراض معاملے میں ملوث نہیں ہے۔"

"کیا یہ بات قابلِ اعتراض نہیں ہے کہ وہ استعفیٰ دے رہی ہے؟ کیا آپ نے پوچھا کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ جیسے بڑے ادارے کو کیوں چھوڑ رہی ہے؟"

"وہ جلد ہی شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کی پسند کا نوجوان لندن آنے والا ہے۔ وہ اس سے شادی کرنے کے بعد ازدواجی گھریلو زندگی گزارنا چاہتی ہے۔"

"یہ ملازمت چھوڑنے کا معقول جواز نہیں ہے۔ عورتیں شادی کے بعد بھی ملازمت جاری رکھتی ہیں۔ وہ نوجوان کون ہے' جس کی آمد سے پہلے ہی وہ ہمارے ادارے سے الگ ہو رہی ہے؟"

"اس نے اپنے آئیڈیل نوجوان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔"

"اس نے نہیں بتایا ہے۔ ہمیں معلوم کرنا چاہیے۔ وہ نوجوان لندن میں نہیں رہتا۔ کہیں باہر سے آنے والا ہے۔ ماریہ نے اس سے کہاں ملاقات کی تھی؟ وہ تو چین میں رہ کر آئی ہے۔ کیا اس نے کسی چینی باشندے کو پسند کیا ہے؟"

"جب اس کا آئیڈیل لندن آئے گا' تب ہی معلوم ہوسکے گا۔"

"میں ابھی معلوم کروں گی۔ ہمارے پاس دو ٹیلی پیتھی جاننے والے ہیں۔ ان کے اندر کی تمام باتیں معلوم کرلیں گے۔"

اس نے جے کانفو سے فون پر کہا "میں مس ماریہ کا فون نمبر بتا رہی ہوں۔ فون پر اس کی آواز سنو۔ پھر اس کے اہم خیالات پڑھ کر مجھے بتاؤ۔ میں انتظار کررہی ہوں۔"

اس نے فون نمبر بتا کر رابطہ ختم کیا۔ جے کانفو نے اس نمبر پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے ماریہ نے پوچھا "ہیلو! کون؟"

جے کانفو ریسیور رکھ کر اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ بڑے پیار سے احمد زبیری کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ بے وقت فون کی گھنٹی بجنے پر جھنجلا گئی تھی پھر جے کانفو نے فون پر کچھ کہا بھی نہیں تھا۔ وہ ریسیور کریڈل پر پٹخ کر پھر اپنے محبوب کی یادوں میں گم ہونے لگی۔

جے کانفو اس کے خیالات پڑھنے لگا۔ معلوم ہوا کہ جس محبوب کو یاد کررہی ہے' وہ چین میں ہے۔ بیجنگ میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ ماریہ اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر اس سے محبت کرنے لگی تھی۔

اس کے خیالات نے بتایا کہ وہ چین کے ایک اہم شعبے کا راز معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس راز کی ایک فلم اسے حاصل ہونے والی تھی۔ اس وقت ایک اعزازی ٹیلی پیتھی جاننے والا اسے ٹیلی پیتھی کے ذریعے ٹریپ کرکے وہ فلم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایسے وقت اس کے محبوب احمد زبیری نے اسے دشمن سے محفوظ رکھا تھا۔

جے کانفو نے ماریہ کے دماغ میں سوال پیدا کیا کہ احمد زبیری نے اس ٹیلی پیتھی جاننے والے دشمن سے اسے کس طرح محفوظ رکھا تھا؟

ماریہ کے خیالات نے کہا "احمد زبیری نے کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے دوست کے ذریعے اس کے دماغ کو لاک کرا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ دشمن اس کے دماغ میں نہ آسکا۔ نہ اسے کسی طرح کا نقصان پہنچا سکا۔"

جے کانفو نے ماریہ کی اپنی سوچ میں کہا "اس کا مطلب ہے۔ احمد زبیری کے ساتھی ٹیلی پیتھی جانتے ہیں۔"

ماریہ کی سوچ نے کہا "شاید جانتے ہوں گے۔"

"شاید نہیں' یقیناً جانتے ہیں۔ جب کسی نے تمہارے دماغ کو لاک کرایا ہے تو پھر وہ یقیناً ٹیلی پیتھی جانتے ہیں بلکہ احمد زبیری بھی ٹیلی پیتھی جانتا ہوگا۔"

"وہ نہیں جانتے ہے۔ وہ مجھے دل و جان سے چاہتا ہے۔ مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا ہے۔"

"چین میں جو مسلمان ٹیلی پیتھی جاننے والے ہیں' ان کا تعلق بابا صاحب کے ادارے سے ہے۔ کیا زبیری نے یہ بات بتائی ہے؟"

ماریہ محبوب کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔ اس نے بیڈ پر لیٹ کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا "ہائے! اس کے پیار نے مجھے بھی مسلمان بنا دیا ہے۔ میری یہ زندگی اسی کے نام ہے۔ وہ مجھے سزائے موت سے نہ بچاتا تو وہاں مجھے گولی مار دی جاتی۔ گویا مجھے یہ نئی زندگی ملی ہے۔"

جے کانفو نے اس کی سوچ میں سوال کیا "کیا۔ سچ مچ میں مسلمان ہوگئی ہو؟"

"بے شک' وہ محبت ہی کیا' جو اپنے محبوب کے رنگ میں نہ رنگ دے۔"

جے کانفو نے پھر اس کی سوچ میں سوال کیا "میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ملازمت سے استعفیٰ کیوں دے رہی ہوں؟"

"میں یہ ملازمت جاری رکھوں گی تو پھر مجھے کبھی نہ کبھی مسلمانوں کے خلاف جاسوسی کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ میں نے زبیری سے وعدہ کیا ہے کہ میں مسلمانوں اور حکومت چین کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گی۔"

"میں زبیری کو اس قدر چاہتی ہوں۔ کیا وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتا ہے۔ کیا وہ میری خاطر چین سے یہاں آئے گا؟"

"ہاں آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ میں اسی کا انتظار کررہی ہوں۔"

جے کانفو نے شیوانی کے دماغ میں آکر کہا "ماریہ کا دل بدل گیا ہے۔ دماغ بدل گیا ہے۔ دین بدل گیا ہے۔ وفاداری بدل گئی ہے۔ وہ مسلمان ہوگئی ہے۔ اس کی وفاداری بدل گئی ہے۔ وہ ہمارے لیے نہیں' مسلمانوں کے لیے جاسوسی کرے گی کیونکہ ایک مسلمان اس کے جسم و جان کا مالک بن کر آنے والا ہے۔ معاملہ بڑا سنگین ہے۔"

"وہ مسلمان کون ہے؟ یہاں کب آرہا ہے؟"

"یہ پتا نہیں' کب آرہا ہے۔ ماریہ کی ملاقات اس سے چین میں ہوئی تھی۔ وہیں اس کے عشق میں گرفتار ہوئی اور یہاں آکر اس کا انتظار کررہی ہے۔"

"کیا وہ مسلمان ٹیلی پیتھی جانتا ہے؟"

"اس نے دشمنوں سے جس طرح ماریہ کی حفاظت کی ہے' اس سے یہی شبہ ہوتا ہے کہ وہ ٹیلی پیتھی جانتا ہے۔"

"اگر وہ ٹیلی پیتھی جانتا ہے تو اس کا تعلق بابا صاحب کے ادارے سے ہوگا۔ اس ادارے کے لوگ وہاں ٹرانسفارمر مشین تیار کررہے ہیں۔ یہ ماریہ ہمارے بہت کام آئے گی۔"

"اس سے کیا کام لیا جاسکتا ہے؟"

"میں ماریہ کو اپنے ساتھ چین لے جاؤں گی۔"

"ماریہ کو وہاں داخلے کی اجازت نہیں ملے گی۔"

"اس کا چہرہ اور شخصیت بدل دی جائے گی۔ ہم اسے ایک نئے نام سے وہاں لے جائیں گے۔ اسے کوئی نہیں پہچانے گا مگر وہ اپنے محبوب کو پہچانے گی۔ اگر اس کا محبوب ٹیلی پیتھی جانتا ہوگا تو وہ بھی اس کے اندر پہنچ کر اسے پہچان لے گا۔ ہم اس کے عاشق کے ذریعے ٹرانسفارمر مشین بنانے والوں تک پہنچتے رہیں گے۔"

وہ ماریہ کے ذریعے کم سے کم وقت میں بابا صاحب کے ادارے کے افراد تک پہنچ سکتی تھی۔ اس نے جے کانفو کو حکم دیا کہ وہ ماریہ پر تنویمی عمل کرکے اسے اپنی معمولہ بنالے۔

شیوانی اپنی آنکھوں کی غیر معمولی قوت سے کسی کو بھی اپنا محکوم بنا لیتی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اس کے ٹیلی پیتھی جاننے والے معمول جے کانفو اور جے فلو بھی ٹیلی پیتھی کے ذریعے اس کے مطلوبہ افراد کے دماغوں میں پہنچتے رہیں اور اپنے احکامات کی تعمیل کراتے رہیں۔

جے فلو' ماریہ کے دماغ میں پہنچ کر اسے سونے پر مجبور کرکے اس پر تنویمی عمل کرنے لگا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا دیرینہ دوست جے سامو بھی ماریہ کے دماغ میں جگہ بنانے کے لیے پہنچا ہوا ہے۔

○☆○

اس دنیا کا کوئی بھی صاحب اقتدار ہمیشہ اقتدار میں نہیں رہتا۔ جب تک اس کے پاس طاقت اور اختیارات ہوتے ہیں۔ تب تک ایسا ہی لگتا ہے جیسے وہ ناقابلِ شکست ہے۔ اسے کبھی زوال نہیں آئے گا۔ وہ قیامت تک مالک و مختار بنا رہے گا۔

تھری جے کو بڑی زبردست طاقت اور اختیارات حاصل ہوئے تھے۔ انہوں نے امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو اور وہاں کے اکابرین کو اپنا معمول بنالیا تھا۔ ٹرانسفارمر مشین ان کی ملکیت بن گئی تھی۔ گویا وہ تینوں امریکا کے حکمران بن گئے تھے۔

ان حالات میں یہی نظر آرہا تھا کہ وہ تھری جے ہمیشہ روپوش رہ کر وہاں حکمرانی کرتے رہیں گے۔ وہاں کے ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے اپنے احکامات کی تعمیل کراتے رہیں گے۔ انہوں نے یہ منصوبہ بھی بنایا تھا کہ ٹرانسفارمر مشین کے ذریعے وہ اپنی ایک علیحدہ ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی فوج بنائیں گے۔

زوال کبھی رفتہ رفتہ آتا ہے اور کبھی اچانک آتا ہے۔ ان تھری جے پر اچانک ہی زوال آگیا۔ ان میں سے جے کانفو اور جے فلو اپنی بدقسمتی سے شیوانی کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے اور جے ساموا اپنے دونوں دوستوں کو شیوانی کے چنگل سے نجات دلانے کی تدابیر پر عمل کر رہا تھا۔

اب تھری جے کی جگہ آندرے اور سائمن کو اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ آندرے اور اس کے چار ساتھی ٹیلی پیتھی جانتے تھے۔ ان کا تعلق بھی امریکا سے تھا لیکن وہ امریکی حکام سے باغی ہو کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے تھے۔

اب مقدر نے ساتھ دیا تھا۔ انہوں نے تھری جے کی طاقت اور اختیارات چھین لیے تھے۔ امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والے لیزی گارڈ، کینی بال، ڈینی جانسن، مارک فورڈ اور مارٹن کریس کو اپنا معمول بنا کر ٹرانسفارمر مشین پر قبضہ جما چکے تھے۔

ہر ملک کے حکمران بدلتے رہتے ہیں لیکن ملک کے مسائل اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ آندرے نے امریکی اکابرین اور ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے کہا "تم سب چاہتے تھے کہ چین میں ٹرانسفارمر مشین تیار نہ ہوسکے مگر تم ناکام ہوتے جارہے ہو۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

لیزی گارڈ نے کہا "ایسا نہیں ہوگا۔ ہم پانچ ٹیلی پیتھی جاننے والے ہیں اور مسٹر آندرے آپ کے ساتھیوں سمیت آپ کی تعداد بھی پانچ ہے۔ اس طرح ہم ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی تعداد دس ہوچکی ہے۔ ہم چین میں اپنے امریکی سراغ رسانوں کے دماغوں میں رہ کر اب بہت کچھ کرسکیں گے۔"

"اب جو کرنا ہے، ہم کریں گے۔"

ڈینی جانسن نے کہا "میں زبردست پلاننگ کروں گا۔ خود چین جاکر ٹرانسفارمر مشین بننے دوں گا اور نہ ہی اس کا نقشہ وہاں رہنے دوں گا۔"

آندرے نے کہا "تم وہی ڈینی ہو، جو برفانی پہاڑیوں میں ناکام ہوچکے تھے۔ ولیر آفریدی نام کے ایک جوان کے پاس مائیکرو فلم تھی۔ اس مائیکرو فلم میں ٹرانسفارمر مشین کا نقشہ تھا۔ مگر وہ فلم تم حاصل نہ کرسکے۔"

"ایک بار ناکامی ہوئی۔ بار بار نہیں ہوگی۔"

"بار بار ہو رہی ہے۔ بابا صاحب کے ادارے سے ٹیلی پیتھی جاننے والے چین گئے۔ تم میں سے کوئی انہیں روک نہ سکا۔ وہ مشین کا نقشہ وہاں لے گئے لیکن کوئی وہ نقشہ ان سے چھین نہ سکا۔ اب اگر ہم نے کوئی ٹھوس پلاننگ نہ کی تو اس مشین کو وہاں تیار ہونے سے پھر کبھی نہیں روکا جاسکے گا۔"

"مسٹر آندرے! تمہاری ٹھوس پلاننگ کیا ہے؟"

"میں پلاننگ نہیں بتاؤں گا۔ جو حکم دیتا جاؤں گا، اس پر عمل کرتے رہو گے۔ بعد میں نتیجہ سامنے آجائے گا۔"

"ہم سب ٹیلی پیتھی جاننے والے دوست اور رازدار ہیں۔ تم ہم سے اپنی پلاننگ کیوں چھپا رہے ہو؟"

آندرے نے کہا "تم پانچ ٹیلی پیتھی جاننے والے ہمارے رازدار نہیں ہو بلکہ ہمارے غلام ہو۔ تم پانچوں چین کا ویزا حاصل کرکے جلد سے جلد روانہ ہوجاؤ۔"

"ہمیں چین جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم یہاں سے بیٹھے ہی بیٹھے خیال خوانی کے ذریعے اپنے مخالفین سے مقابلہ کرکے انہیں ٹرانسفارمر مشین کی تیاری سے باز رکھ سکتے ہیں۔"

"تم سب آج تک گھر بیٹھے خیال خوانی کرتے رہے اور اہم معاملات کو نمٹانے میں ناکام ہوتے رہے۔ اب تم امریکا سے نکلو۔ عملی طور پر چین جاکر کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔"

"ہم سب پوری کوششیں کریں گے لیکن ناکامی ہوگی اور ہم وہاں بے نقاب ہوجائیں گے تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں یہی چاہتا ہوں، ناکام ہونے والوں کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ تم سب کو آج تک سزا نہیں ملی۔ اب سزائے موت کے خوف سے تم لوگ پوری ذہانت اور ذمے داریوں سے کامیاب ہونے کی کوشش کرو گے۔"

"مسٹر آندرے! یہ کون سی عقل مندی ہے؟ ہم ٹیلی

پیٹھی جاننے والے اپنے ملک کا سرمایہ ہیں۔ تم اس سرمائے کو داؤ پر لگا رہے ہو؟"

"ہمارے پاس ٹرانسفارمر مشین ہے۔ تم پانچوں اپنی ناکامی کے باعث مرجاؤ گے تو ہم دس ٹیلی پیتھی جاننے والے پیدا کرلیں گے۔ لہٰذا خود کو سرمایہ نہ کہو' سپاہی کہو اور سپاہی کی طرح ہارنے یا جیتنے کے لیے چین روانہ ہوجاؤ۔ اس کے آگے اور کوئی بحث نہ کرو۔ دیٹس آل۔"

آندرے اپنی جگہ دماغی طور پر حاضر ہوگیا۔ وہ پیرس کے ایک اپارٹمنٹ میں اپنے ساتھی سائنس کے ساتھ تھا۔ باقی تین ٹیلی پیتھی جاننے والے ساتھی لندن میں تھے۔ سائنس نے کہا "میں لیزی گارڈ کے دماغ میں رہ کر تمہاری باتیں سن رہا تھا۔ تم نے انہیں معقول جواب دیا ہے اور ان پانچوں کو چین بھیجنے کا دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔"

آندرے نے کہا "وہ پانچوں ہمارے معمول ہیں۔ چین جانے سے انکار نہیں کریں گے۔ مجبور ا جائیں گے پھر وہاں سے زندہ سلامت واپس آنے کے لیے پوری توجہ اور ذمے داریوں سے کام کریں گے۔"

"بے شک' اب تک ان پانچوں پر کوئی سختیاں کرنے والا نہیں تھا۔ اب ان پر آرام حرام ہوگا۔ وہ اپنی سلامتی کی خاطر جی جان سے کامیابی کی کوششیں کرتے رہیں گے۔"

"تم اسکاٹ لینڈ یارڈ کے اعلیٰ افسر سے رابطہ کرو۔ معلوم کرو کہ وہ ہمارے لیے کیا کررہے ہیں؟"

سائنس نے ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ "ہیلو! میں سائنس بول رہا ہوں۔ ڈائریکٹر جنرل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

دوسری طرف سے لیڈی سیکریٹری نے انتظار کرنے کو کہا۔ پھر چند سیکنڈ کے بعد شیوانی کی آواز سنائی دی "ہیلو مسٹر سائنس! میں شیوانی بول رہی ہوں۔"

"ہیلو مس شیوانی! کیا بات ہے' جب بھی ہم ڈائریکٹر جنرل سے بات کرنا چاہتے ہیں' وہ فون پر نہیں ملتے؟"

"مسٹر سائنس! تمہارا کیس میرے پاس ہے۔ مجھ سے ہی باتیں ہوسکتی ہیں۔ ڈائریکٹر جنرل کا چین اور ٹرانسفارمر مشین کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تم نے کہا تھا' جلد ہی چین کے لیے روانہ ہوجاؤ گی اور وہاں اس مشین کو تیار نہیں ہونے دو گی۔"

"تین گھنٹے بعد فون کرو گے تو میرے فون کو بے آواز پاؤ گے۔ میں ایک جہاز میں سفر کررہوں گی۔"

"گویا تم اپنی ٹیم کے ساتھ جارہی ہو؟"

"ہاں۔ ہماری پچیس لاکھ ڈالرز کی دوسری قسط ادا کردو۔"

"آج ہی ادا کردی جائے گی۔ چین میں ہمارے ایجنٹس موجود رہیں گے۔ تم مشین کا وہ نقشہ ان کے حوالے کرو گی۔"

"یہ تمام معاملات طے ہوچکے ہیں پھر انہیں کیوں دہرا رہے ہو؟"

"برا نہ ماننا۔ ٹرانسفارمر مشین کے سب ہی ضرورت مند ہیں۔ تم بھی اپنے ملک کے لیے اس مشین کا نقشہ حاصل کرنا چاہو گی اور ہم یہ نہیں چاہیں گے۔ وہ نقشہ حاصل کرتے ہی تم ہمارے ایک ایجنٹ کے حوالے کردو گی۔"

"برا نہ ماننا۔ جب مجھ پر بھروسا نہیں ہے تو اتنا بڑا کیس تم نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے حوالے کیوں کیا ہے؟"

"بھروسا ہے۔ میں احتیاطاً تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ یہ بات یاد رکھو کہ ہمارے پاس ٹیلی پیتھی کی قوت ہے' تم ہماری مرضی کے خلاف کوئی کام کرو گی تو ہمیں فوراً معلوم ہوجائے گا۔"

"میرے دماغ میں آؤ گے تو معلوم ہوگا۔ کیا میرے اندر آسکتے ہو؟"

سائنس اور آندرے نے کئی بار اس کے دماغ میں جانے کی کوششیں کی تھیں اور ناکام رہے تھے۔ اس وقت سائنس کے دماغ میں رہ کر فون پر ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے سائنس کی زبان سے کہا "شیوانی! تمہارے دماغ کے دروازے بند رہتے ہیں۔ ہم تمہارے خیالات پڑھ نہیں سکتے لیکن اپنے آلہ کاروں کے ذریعے تمہاری نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں کبھی فریب دینا چاہو گی تو نقصان اٹھاؤ گی۔ بہتر ہے' قابل اعتماد دوست بن کر رہو۔"

"تمہارے مشوروں کا شکریہ۔ میری روانگی کا وقت ہورہا ہے۔ اب نہ فون پر باتیں ہوں گی اور نہ ہی تم میرے دماغ میں آسکو گے۔ تمہارا جو بھی ایجنٹ چین میں ملے گا' اس سے رابطہ رکھوں گی۔ گڈ بائی۔"

فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔ سائنس نے ریسیور رکھ کر کہا۔ "شیوانی بہت چالباز ہے۔ بابا صاحب کے ادارے والوں کے لیے دردِ سر بن جائے گی۔"

"دردِ سر ہمارے لیے بھی بن سکتی ہے۔"

"ہم اسے بننے نہیں دیں گے۔ ہمارے تین ساتھی لندن میں ہیں۔ اس کی نگرانی کررہے ہیں۔ وہ نہیں جانتی کہ ہمارا ایک ساتھی اس کی نگرانی کرتا ہوا چین جائے گا۔ ہم اس کی ٹیم کے دو سراغ رسانوں کے دماغوں میں گھسے رہیں گے۔ ہم اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھیں گے تو وہ ہمیں کبھی دھوکا نہیں دے سکے گی۔"

وہ دونوں سر جھکا کر سوچنے لگے۔ انہوں نے ٹرانسفارمر



مشین کے سلسلے میں ہر پہلو سے خوب سوچ سمجھ کر منصوبہ بنایا تھا اور اس منصوبے پر بڑی کامیابی سے عمل کررہے تھے لیکن آخری کامیابی کا دارومدار شیوانی پر تھا۔ آخری تیر سامنے آنے تک شیوانی سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کرسکتی تھی۔

○☆○

پورس ممبئی پہنچنے کے بعد کرشمہ کا مہمان بن کر اس کے ساتھ گھوا آگیا تھا۔ اسے یہ معلوم ہوچکا تھا کہ کرشمہ کی ماں جمنا کماری کالا جادو جانتی ہے۔ اس نے کالے جادو کے ذریعے خود کو ایک جوان دوشیزہ بنالیا تھا۔

جمنا کا بیٹا یعنی کرشمہ کا بھائی جسونت پال بھی جادوگر تھا۔ لیکن بھیما کے کالے جادو کے مقابلے میں کمزور تھا۔ وہ کلپنا کو حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اس کلپنا کے اندر بھیما کی آتما سمائی ہوئی تھی۔ جمنا اپنی جادوئی شکتی سے بھیما کی آتما کو کلپنا کے اندر شانت کرنے والی تھی تاکہ اس کا بیٹا جسونت' کلپنا کو اپنی دلہن بنا سکے۔

جمنا کو اپنی جادوئی شکتی دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ اس سے پہلے ہی بازی پلٹ گئی۔ جسونت کو جب معلوم ہوا کہ اس کی بہن کرشمہ ایک مسلمان شہباز (پورس) سے محبت کرتی ہے تو وہ پورس کو مارنے پر تل گیا پھر اسے مار تو نہ سکا' خود ہی مرگیا۔

اس کی موت کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بڑی عجیب تھی۔ جمنا اپنے جوان بیٹے کی لاش سے لپٹ کر رونے لگی۔ پورس خیال خوانی کے ذریعے جسونت پال کی موت کا یقین کرچکا تھا۔ جمنا رو رو کر اپنی بیٹی کرشمہ کو کوس رہی تھی کہ اس کے عاشق پورس کی وجہ سے جوان بیٹا مارا گیا ہے۔

وہ بیٹے سے لپٹ کر اس کے سینے پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔ ایسے ہی وقت اس نے بیٹے کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ اپنا سر اٹھا کر حیرانی سے دیکھا۔ مردہ بیٹا زندہ ہوگیا۔ آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھنے لگا۔ جمنا نے خوشی سے چیخ کر کہا "میرا بیٹا زندہ ہے۔ میں اناڑی ہوں۔ نبض ٹٹولنا اور دل کی دھڑکنیں سننا نہیں جانتی ہوں۔ خوا مخواہ مردہ سمجھ رہی تھی۔"

ایک ملازم دوڑ کر فرسٹ ایڈ باکس لے آیا تھا۔ کرشمہ زندہ ہونے والے بھائی کے زخموں کی مرہم پٹی کرنے لگی۔ پورس حقیقت کو سمجھ رہا تھا۔ وہ خیال خوانی کے ذریعے اس کے اندر گیا تھا اور اس کے دماغ کو مردہ پاکر واپس آیا تھا۔ اب پھر خیال خوانی کے ذریعے اس کے اندر جاکر اس کے دماغ کو زندہ پا رہا تھا۔

پھر پدمنی کو نھی کے اندر سے دوڑتی ہوئی آئی۔ اس نے کہا "ماتا جی! وہ۔۔۔ وہ ادھر کلپنا مرگئی ہے۔"

جمنا بیٹے کو زندہ پاکر خوش تھی۔ اس نے کہا "مرنے دو کمینی کو۔ خوا مخواہ مصیبت بنی ہوئی تھی۔ میرے بیٹے کو دیوانہ بنا دیا تھا۔"

کرشمہ نے پوچھا "وہ اچانک کیسے مرگئی؟"

پدمنی نے جواب دیا "میں اس کے کمرے کے پاس سے گزر رہی تھی۔ وہ مجھ سے بولی' اے پدمنی! ان سے جاکر کہہ دے' میں مرگئی ہوں۔ بس اتنا کہتے ہی وہ فرش پر گر کر مرگئی۔ میں نے کئی بار آوازیں دیں مگر وہ سچ مچ مرچکی ہے۔ تم خود جاکر دیکھ لو۔"

کرشمہ نے ملازموں سے کہا "جاؤ۔ کلپنا کے کمرے کا دروازہ کھولو اور دیکھو' وہ زندہ ہے یا واقعی مرچکی ہے۔"

دو ملازم ادھر چلے گئے۔ جسونت کے دوبارہ زندہ ہوتے ہی پورس سمجھ گیا تھا کہ بھیما کی آتما کلپنا کا جسم چھوڑ کر جسونت کے مردہ جسم میں سما گئی ہے۔ اس طرح جسونت کو دوبارہ زندگی مل گئی ہے۔

پورس سمجھ گیا تھا مگر کرشمہ اور اس کی ماں جمنا نے اس پہلو پر دھیان نہیں دیا کہ جو بھیما جسم بدل کر کلپنا کے اندر آسکتا ہے۔ وہ دوسری بار کلپنا کو چھوڑ کر مردہ جسونت کے جسم میں بھی سما سکتا ہے۔

دراصل ان ماں بیٹی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ جسونت کو موت نہیں آئی تھی۔ اس کی موت کا دھوکا ہوا تھا۔ ایک منٹ کے اندر ہی وہ آنکھیں کھول کر سانسیں لیتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی زندگی بتا رہی تھی کہ وہ مرا تھا نہ بھیما کی آتما اس کے اندر آئی تھی۔

کرشمہ اس کی مرہم پٹی کررہی تھی۔ وہ دوبارہ زندگی حاصل کرنے کے بعد سوچ رہا تھا "ہے بھگوان! مجھے تھوڑی دیر کے لیے کیا ہوگیا تھا؟ مجھے ایسا لگا جیسے میں مرگیا تھا۔ شکر ہے' میں زندہ ہوں۔"

پورس بڑی خاموشی سے اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ جمنا بیٹے سے لپٹ کر کہہ رہی تھی "میرا لال! میرا بیٹا زندہ ہے۔ میرے بیٹے کو میری عمر بھی لگ جائے۔ میں سو بھکاریوں کو کھانا کھلاؤں گی۔"

بھیما اس کے اندر کہہ رہا تھا "جسونت! بھگوان کے ساتھ میرا بھی شکر ادا کرو۔ میری آتما تمہیں نئی زندگی دے رہی ہے۔"

جسونت کی سوچ نے پریشان ہو کر کہا "یہ کیا؟ میں اپنے اندر اپنے دشمن بھیما کی آواز سن رہا ہوں۔"

"ہاں۔ میری آواز اندر سنتے رہو۔ اندر سوچ کے ذریعے بولتے رہو۔ زبان سے بولو گے تو تمہاری ماں کو معلوم ہوجائے گا۔ وہ خوش ہورہی ہے کہ جوان کبھرو بیٹا زندہ ہے۔ تم اسے بتاؤ گے کہ میری آتما سے تمہیں زندگی مل رہی ہے تو

اس کی تمام خوشیاں، ماتم میں بدل جائیں گی۔"

جسونت سوچ میں پڑ گیا کہ وہ زندہ ہے۔ اپنی ماں کے بیٹے کی حیثیت سے جسمانی طور پر زندہ ہے۔ اگرچہ آتما پرائی ہے مگر جسم وہی ہے، جسے ماں نے جنم دیا تھا۔ ماں اپنے پیدا کیے ہوئے جسم کو مردہ تسلیم نہیں کرے گی پھر وہ خود اپنی ماں کو یہ کہہ کر کس دل سے صدمہ پہنچائے گا کہ وہ حقیقتاً مر چکا ہے۔

اس نے بھیما سے کہا "تم مجھ سے بہت برا انتقام لے رہے ہو۔ میں کلپنا کی عزت سے کھیلنا چاہتا تھا مگر تم نے۔"

"کلپنا کی نہیں، میری عزت سے کھیلنا چاہتے تھے کیونکہ میں اس کے اندر تھا۔ عزت آتما کی ہوتی ہے۔ جسم کیا چیز ہے۔ کلپنا کا جسم فنا ہو گیا مگر میں باقی ہوں۔ تم بھی فنا ہو چکے تھے مگر میں زندگی دے رہا ہوں۔ آئندہ مجھ سے سمجھوتا کرتے رہو گے تو تمہیں زندگی ملتی رہے گی اور تم ماں کو خوش دیکھتے رہو گے۔"

وہ بے بسی سے بولا "ٹھیک ہے۔ میں سوچوں گا۔ غور کروں گا کہ ماں کو خوش رکھنے کے لیے مجھے تمہاری آتما کا محتاج رہنا چاہیے یا نہیں؟"

جسونت زخموں کی تکلیف کے باعث کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ ایک ملازم کا سہارا لے کر ماں کے ساتھ کار تک اندر جانے لگا۔ وہاں باغیچے میں کرشمہ رہ گئی۔ وہ ماڈرن اور اسمارٹ تھی اور ایک اچھی فائٹر بھی تھی۔ پہلی بار تماشائی میں پورس سے شرمانے لگی۔

اس نے قریب آ کر اس کے بازوؤں کو تھام کر کہا "تم مجھے ایسے غصہ دکھایا کرتی تھیں جیسے نفرت کرتی ہو مگر دل سے مجھے چاہتی رہی ہو۔"

"تم میری ماں کے کاندھے پر بندوق رکھ کر مجھے نشانہ بنایا کرتے تھے سیدھی طرح مجھ سے محبت ظاہر نہیں کرتے تھے، اس لیے تم پر غصہ آتا رہتا تھا۔"

"میری انگیٹھی میں چلو۔ سیدھی طرح پیار کروں گا۔"

وہ اس کے ساتھ انگیٹھی کی طرف جاتی ہوئی بولی "تم نے ماں کو محبت کا فریب دیا، وہ ٹھیک ہے۔"

"وہ بھی جھوٹی جوانی کا فریب دے رہی ہے۔ کیا میں فریب کھا جاتا؟" ہم دونوں جوان ہیں۔ نہ میں کسی بوڑھی کے اور نہ تم کسی بوڑھے کے فریب میں آنا چاہو گی۔"

"ہاں جوانی، جوانی کے ساتھ چلتی ہے، بڑھاپے کے ساتھ نہیں، میں ماں کو سمجھا لوں گی۔ ورنہ وہ انتقام لینے کے لیے تم پر کالا جادو کرے گی۔"

"تم ماں کی فکر نہ کرو۔ تمہیں دھڑکنوں سے لگائے رکھنے کے لیے اپنی سانس سے نمٹ لوں گا۔ پتا نہیں، اس دنیا میں کتنے بے چارے اپنی اپنی سانس سے نمٹتے رہتے ہیں۔"

وہ انگیٹھی میں پہنچ کر بولی "میں نہیں چاہتی کہ پھر میرے بھائی سے جھگڑا ہو۔"

"اس کے لیے تو ابتدا سے ایک ہی کہاوت ہے، ساری دنیا ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف۔ میرا خیال ہے، آج کی پٹائی کے بعد وہ ایک ہی طرف رہے گا۔ ہماری طرف نہیں آئے گا۔"

وہ اسے بازوؤں میں سمیٹ کر بولا "دنیا کو بھول جاؤ۔ صرف اپنی کہو اور میری سنتی رہو۔ دونوں کا بھلا ہوتا رہے گا۔"

دروازہ بند ہو گیا۔ پادر ہاؤس والوں کا انتظام خوب ہوتا ہے۔ جس کمرے کا دروازہ بند ہوتا ہے، اسی کمرے کی بجلی جاتی ہے۔ اس بند کمرے کی بجلی بھی چلی گئی۔

کوٹھی کے ایک بیڈ روم میں جسونت پال لیٹا ہوا تھا۔ ماں تیمارداری کرتی ہوئی کہہ رہی تھی "یہ کرشمہ بہت ہی بے شرم ہو گئی ہے۔ اسے اپنے پیار بھائی کے پاس رہنا چاہیے، مگر وہ باغیچے میں اپنے پارٹنر کے ساتھ ہنس بول رہی ہے۔"

"ماں! میں بیمار نہیں ہوں، زخمی ہوں۔ ہاں ابھی میں نے باغیچے میں ایک جوان کو دیکھا تھا، کون ہے؟"

جمنا نے حیرانی سے کہا "ہائے بیٹا! کیا تم شہباز کو نہیں جانتے جس سے تم جھگڑا کرتے کرتے زخمی ہو گئے ہو، وہ اسے دوپہر سے دیکھ رہے ہو۔ اور اب بھول رہے ہو۔"

بھیما کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے پورس کو تھام کر بار دیکھا تھا۔ اسے جسونت کے دماغ سے معلوم کرنا چاہیے تھا لیکن اس نے یہ سوال جمنا سے پوچھ لیا تھا۔

اس نے فوراً ہی جسونت کے دماغ کو ڈھیل دی۔ اسے آزاد چھوڑا تو وہ بولا "اوہ ماں! میں گہری چوٹ لگی ہے۔ میں بھول گیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اس جوان کا نام شہباز ہے۔ کرشمہ اس سے پیار کرتی ہے اور میں یہ پسند نہیں ہے۔"

وہ غصے سے بولی "میں نے ایسی دشمن بیٹی نہیں دیکھی۔ میں اسے اپنا مرد بنانا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا اسے اپنا مرد بنا لیا ہے۔"

"ماں! تم بھی بیٹی کی طرح بے شرمی کی باتیں کر رہی ہو۔ ایک انار ہے اور دو ماں بیٹی بیمار ہیں۔ اس انار کو اٹھا کر باہر پھینک دوں گا تو ماں بیٹی کا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔"

"نہ بیٹا! تم پھر اس سے جھگڑا نہ کرنا۔ وہ بڑا خطرناک ہے۔ اس بار تم بچ گئے۔ اگلی بار اس کے منہ نہ لگنا۔ میں اسے یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دوں گی۔"

"وہ کوئی چالباز ہے۔ پتا نہیں کس ارادے سے آیا ہے؟ اپنی باتوں سے اس نے پہلے تمہیں بے وقوف بنایا۔ اب کرشمہ کو بنا رہا ہے۔"

"وہ باتیں کرنا بھول جائے گا۔ میں ایسے منتر پڑھوں گی کہ جب بھی وہ بولنا چاہے گا تو منہ کھولتے ہی کتے کی طرح بھونکنے لگے گا۔"

پدمنی نے ڈاکٹر کو فون کیا تھا۔ وہ علاج کرنے آ گیا۔ اس نے جسونت کا معائنہ کیا۔ اس کے زخموں کو صاف کیا۔ ان کی مرہم پٹی کی۔ ایک انجکشن لگایا پھر کھانے کے لیے دوائیں دے کر چلا گیا۔

جمنا نے پدمنی کو ایک طرف لے جا کر پوچھا "کرشمہ کہاں ہے؟"

"تھوڑی دیر پہلے انیکسی میں تھیں۔ اب اپنے کمرے میں ہیں۔"

"وہ انیکسی میں کیا کرنے گئی تھی؟"

"میں کیا بتاؤں مالکن؟ یہ تو سمجھنے کی بات ہے۔ میری سمجھ میں نہیں ہے۔"

"بکواس مت کر۔ بڑی آئی سمجھنے اور سمجھانے والی۔ چل جا یہاں سے۔"

پدمنی چلی گئی۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی کرشمہ کے بیڈ روم میں آئی وہ ہنسٹر لیٹی انگلیٹ لے رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔ اس کے خیالوں میں پورس ناچ کی طرح مسکرا رہا تھا۔

جمنا نے کمرے میں آتے ہی پوچھا "تجھے ہماری عزت کا کچھ خیال ہے؟"

اس نے پوچھا "تمہاری عزت کو کیا ہوا ہے ماں؟"

"میری عزت کو کیا پوچھتی ہے۔ تیری عزت رہی ہے یا نہیں؟"

"دنیا میں کوئی اتنی عزت نہیں دیتا، جتنا ایک پیار کرنے والا دیتا ہے۔ شہباز جو محبت اور عزت دے رہا ہے، اسے تم نہیں سمجھ سکو گی۔"

"بکواس مت کر۔ آج آدھی رات کے بعد میں ایسا کالا جادو کروں گی کہ وہ یہاں سے کتے کی طرح بھنگتا ہوا بھاگے گا پھر ساری زندگی بول نہیں سکے گا۔ جب بھی منہ کھولے گا، بھونکنے لگے گا۔"

"تم ایسا کوئی جادو نہیں کرو گی۔ تم ماں ہو، میری خوشیوں کی دشمن نہ بنو۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

"کیا اچھا نہیں ہو گا؟ تم کیا کر لو گی؟ کیا میرے بھیانک جادو سے اسے بچا سکو گی۔"

"اگر اسے نہ بچا سکی تو تمہارے بھیانک جادو کے جواب میں تم سے بھیانک انتقام لوں گی۔"

"یہ دھمکی کسی اور کو دینا۔ کیا تو نہیں جانتی کہ میں کتنی ضدی ہوں۔"

"کیا تم نہیں جانتیں کہ میں ضدی ماں کی ضدی اور خطرناک بیٹی ہوں۔"

اس نے گھور کر بیٹی کو دیکھا پھر پوچھا "کیا کرے گی تو؟"

"تم شہباز سے دشمنی کرو گی۔ میں تمہارے بیٹے سے دشمنی کروں گی؟"

"کیا۔۔۔؟ تو اپنے بھائی سے دشمنی کرے گی؟"

"جب تم دشمن بن جاؤ گی اور ماں نہیں رہو گی تو وہ کس رشتے سے میرا بھائی رہے گا؟"

"میں تجھے اپنے بیٹے کے قریب بھی نہیں جانے دوں گی۔"

"قریب جانا ضروری نہیں ہے۔ دور سے بھی گولی ماری جا سکتی ہے۔"

"کیا۔۔۔؟ کلموہی! تو میرے بیٹے کو گولی مارے گی؟"

"تم میرے دل کی دنیا اجاڑو گی۔ میں تمہاری کوکھ اجاڑ دوں گی۔"

جمنا نے غصے سے مٹھیاں بھینچ کر دانت پیستے ہوئے اسے دیکھا پھر پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ کرشمہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی کہنے لگی "یہ اچھی طرح یاد رکھنا، جب بھی تم شہباز کے خلاف کالا جادو کرنے بیٹھو گی اور منتر پڑھنے میں مصروف رہو گی، اس وقت تمہارے بیٹے کی حفاظت کرنے والا اور اسے میرے انتقام سے بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔"

جمنا چلتے چلتے اس کی بات سن کر جسونت کے کمرے کے سامنے رک گئی۔ سوچ میں پڑ گئی پھر بولی "میں بھول گئی تھی کہ کالے جادو کی طرف دھیان رہے گا تو اپنے زخمی بیٹے کی طرف دھیان نہیں دے سکوں گی۔ ٹھیک ہے، آج نہ سہی، جب میرے بیٹے کے زخم بھر جائیں گے۔ تب وہ تجھے زنجیریں پہنا کر کمرے میں بند کر دے گا پھر میں شہباز کو کتا بنا کر یہاں سے بھگا دوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ جسونت کے کمرے میں آ گئی۔ جسونت نے کہا "ماں! تم نے یہ ٹھیک سوچا ہے۔ ابھی شہباز کو بھول جاؤ۔ میرے زخم بھر جائیں گے تو ہم دونوں مل کر اس سے نمٹ لیں گے۔"

ان ماں بیٹے کے لیے فی الحال یہی مناسب تھا۔ انہوں نے شہباز کے خلاف کچھ کرنے کا فیصلہ ملتوی کر دیا لیکن جسونت کے اندر بھیما سوچ رہا تھا "یہ شہباز کون ہے؟" اس نے جسونت کو بری طرح زخمی کر کے مار ڈالا تھا۔ یقیناً شہ زور ہونے کے علاوہ یوگا کا ماہر بھی ہو گا۔ میں اس کے دماغ میں جاؤں گا تو وہ سانس روک لے گا۔ شبہ کرے گا کہ کلپنا کے اندر رہنے والا ٹیلی پیتھی جانتا تھا، اس کی آتما ابھی تک یہاں موجود ہے۔"

وہ درست سوچ رہا تھا۔ پورس کو آمنہ کے ذریعے معلوم ہوچکا تھا کہ کلپنا کے جسم میں جو آتما تھی ہوئی ہے، وہ ٹیلی پیتھی بھی جانتی تھی۔ لہٰذا بھیما نے احتیاطاً یہ فیصلہ کیا کہ پہلے پورس کو کسی طرح کمزور بنائے گا پھر اس کے دماغ میں پہنچے گا۔

بھیما کے پاس اپنی آتما شکتی کے کمزور ہونے کا بھی حساب تھا۔ بار بار جسم بدلنے کے باعث آتما کی شکتی کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ دو بار جسم بدل کر تیسرے جسم میں آیا تھا۔ یعنی بھیما پہلی بار اپنے پیدائشی جسم سے محروم ہو کر کلپنا کے جسم میں پہنچا تھا۔ اس وقت پہلی کمزوری آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا۔ موقع ملتے ہی تپسیا کرے گا اور کھوئی ہوئی تھوڑی سی شکتی حاصل کرلے گا۔

لیکن اسے موقع نہ مل سکا کیونکہ کلپنا کا جسم جسونت پال کا قیدی بن گیا تھا۔ بھیما ایک لڑکی کے جسم میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ آخر وہ موقع مل گیا۔ جسونت پال کے مرتے ہی وہ اس کے جسم میں سما گیا۔ یوں دوسری بار جسم بدلنے کے باعث اس کی آتما شکتی اور کمزور ہوگئی۔

اب وہ تیسرے جسم میں تھا اور یہ فیصلہ کررہا تھا کہ جسونت کے زخم بھر جائیں گے۔ وہ پوری طرح صحت مند ہوجائے گا تو وہ چالیس دنوں تک تپسیا کرنے کے بعد آتما شکتی کو مکمل کرلے گا۔

پورس انجینی میں تھا۔ بیڈ پر آرام سے لیٹا ہوا جسونت پال کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ جسونت اور بھیما کے خیالات مشترک تھے۔ یوں پورس بڑی خاموشی سے بھیما کے ارادوں کو سمجھ رہا تھا۔

اس نے جمنا سے کہا "ہاں! جب میرے زخم بھر جائیں گے تو میں آتما شکتی حاصل کرنے کے لیے تپسیا کروں گا۔"

جمنا نے تعجب سے پوچھا "تم آتما شکتی حاصل کرنا چاہتے ہو؟ تم چالیس دنوں کی تپسیا سے گھبراتے رہے ہو۔ تم نے ایسا کوئی جادو نہیں سیکھا، جسے سیکھنے کے لیے لمبی تپسیا کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"ہاں۔ اسی لیے میں ایک معمولی سا جادو گر بن کر رہ گیا لیکن اب میں چالیس دنوں کی کڑی تپسیا کروں گا۔"

"بیٹے! آتما شکتی حاصل کرنے کے ساتھ درجے ہوتے ہیں۔ ہر درجے سے گزرنے کے لیے چالیس دنوں کی تپسیا ضروری ہے۔ اس حساب سے سات درجوں کو پورا کرنے کے لیے دو سو اسی دنوں تک تپسیا کرنی ہوگی۔ اور یہ تمہاری بس کی بات نہیں ہے۔"

وہ نہیں جانتی تھی کہ بھیما دو سو اسی دنوں کی تپسیا پوری کرکے سات مرحلوں سے گزر کر مکمل آتما شکتی حاصل کرچکا ہے۔ اب صرف کھوئی ہوئی شکتی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اس نے کہا "ماں! یہ نہ کہو کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ مجھے حوصلہ دو۔ میں پہلے چالیس دنوں تک تپسیا کروں گا۔ اس میں کامیاب رہوں گا تو آگے بھی میرا حوصلہ بڑھتا جائے گا۔"

آگے حوصلہ کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اسے صرف چالیس دنوں تک سکون اور خاموشی کی ضرورت تھی اور اس کوٹھی میں ایسی جگہ موجود تھی۔ جمنا نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں اس کی مدد کرے گی۔

پورس کو فی الحال ماں بیٹے کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں رہا تھا۔ اسے آرام سے سوجانا چاہیے تھا لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ ابھی ایک اور حل طلب مسئلہ رہ گیا تھا۔

ایک انجینی ٹیلی پیتھی جاننے والا تین بار کرشمہ کے دماغ میں آچکا تھا۔ اس نے کرشمہ سے کہا تھا کہ اس نے ایک فارن میگزین میں اس کی تصویر دیکھی ہے۔ تب سے وہ اس پر ہزار جان سے عاشق ہوگیا ہے۔

کرشمہ پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی بے چین ہوجاتی تھی۔ سانس روک لیتی تھی۔ ایسا کرنے کے باعث وہ انجینی دھمکی دے کر چلا گیا تھا کہ رات کو پھر آئے گا اور اس بار وہ تنویمی عمل کے ذریعے اسے اپنی معمولہ بنالے گا۔

اور اب رات ہوچکی تھی۔ آدھی رات گزرنے والی تھی۔ پورس وقفے وقفے سے کرشمہ کے دماغ میں جارہا تھا۔ اس انجینی ٹیلی پیتھی جاننے والے کا انتظار کررہا تھا۔

پورس کی سوچ کی لہروں کو محسوس کرکے وہ بے چین نہیں تھی۔ کیونکہ پورس اس انجینی ٹیلی پیتھی جاننے والے سے پہلے ہی کرشمہ پر تنویمی عمل کرچکا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ باتیں نقش کردی تھیں کہ وہ اس کی سوچ کی لہروں کو بھی محسوس نہیں کرے گی۔

دوسری بات یہ نقش کی تھی کہ انجینی ٹیلی پیتھی جاننے والے کو اپنے دماغ میں آنے دے گی اور اسے تنویمی عمل کرنے دے گی۔ وہ تنویمی عمل کا توڑ کرے گا لیکن وہ یہی ظاہر کرتی رہے گی کہ اس انجینی کی معمولہ بن چکی ہے۔ اس طرح وہ اس کے ذریعے اس انجینی کی اصلیت معلوم کرتا رہے گا۔

پورس کو بڑی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ آخر رات کے دو بجے کرشمہ کے اندر اس کی آواز سنائی دی۔ اس نے آتے ہی پوچھا "سو رہی ہو؟"

وہ گہری نیند میں بولی "میں سو رہی ہوں۔"

"اگر تم سانس روک کر بھاگو گی تو میں پھر اچانک آکر تمہارے اندر زلزلہ پیدا کروں گا۔ تم نہیں جانتیں کہ اس عمل سے کس طرح دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا ہے۔



بولو، کیا زلزلہ پیدا کروں؟"

وہ پورس کی مرضی کے مطابق بولی "نہیں، میں دماغی تکلیف برداشت نہیں کرسکوں گی۔ کیا تم مجھ پر تنویمی عمل کرو گے؟"

"کیا تم اعتراض کرو گی؟"

"نہیں۔ مگر دشمن بن کر عمل نہ کرو۔ پہلے دوست بن جاؤ۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔ اس لمحے سے مجھے دوست سمجھو۔"

"کیسے سمجھوں؟ دوست اجنبی نہیں ہوتے۔ اپنا تعارف پیش کرو۔"

"پہلے مجھے یقین کرنے دو کہ کوئی دوسرا کبھی تمہارے دماغ میں آکر میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں کرسکے گا۔"

"تمہیں یقین کیسے آئے گا؟"

"جب تم میری معمولہ بن جاؤ گی اور میں تمہارے دماغ کو کنٹرول کرلوں گا۔ تب یقین ہوگا۔ کوئی تمہارے اندر چھپ کر گھس نہیں آئے گا اور نہ ہی تم میرے حکم کے بغیر کسی کے سامنے زبان کھول سکو گی۔"

پورس نے اس کے جواب میں کرشمہ کو خاموش رکھا۔ یہ سمجھ گیا کہ وہ اسے ہپناٹائز کیے بغیر کبھی اپنی اصلیت نہیں بتائے گا۔

وہ کرشمہ کو ٹرانس میں لاکر تنویمی عمل کرنے لگا اور وہ پورس کی مرضی کے مطابق اس انجینی کے معمولہ بننے لگی۔ انجینی نے تنویمی عمل کے اختتام پر ایک مخصوص آواز اور لہجہ اس کے ذہن میں نقش کیا پھر حکم دیا کہ وہ اس آواز اور لہجے کو اپنے دماغ میں محسوس نہیں کرے گی باقی تمام پرائی سوچوں کو محسوس کرتے ہی سانس روک کر انہیں بھگا دیا کرے گی۔

اس کے بعد اس نے اسے تنویمی نیند سونے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ دوسرے دن کسی وقت اس کے دماغ میں آئے گا۔ اس کے جانے کے بعد کرشمہ کے اندر خاموشی رہی اور وہ تنویمی نیند سوتی رہی۔

پورس نے اس آسرے پر کرشمہ کو اس کی معمولہ بننے دیا کہ وہ اس انجینی کی مقرر کی ہوئی آواز اور لہجہ اختیار کرکے اس کے اندر پہنچ سکتا تھا۔ ابھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ جب اس انجینی کا نام اور مقام معلوم ہوجاتا تو وہ کرشمہ کو اس کے تنویمی عمل سے با آسانی نجات دلا سکتا تھا۔

بہرحال انجینی پراسرار بنا ہوا تھا۔ دوسرے دن اسرار کا پردہ اٹھنے کی توقع تھی۔

○☆○

الپا کو اپنی خوش قسمتی کا یقین ہوگیا کیونکہ اس کی برسوں کی تمنا پوری ہوگئی تھی۔ پارس سچ مچ اس کا غلام بن گیا تھا۔ اس کے حکم کے مطابق عمل کررہا تھا۔ اس نے اسے ایک ٹانگ پر کھڑا رہنے کا حکم دیا تو وہ ایک ٹانگ پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ایک ٹانگ پر ناچنے کا حکم دیا تو وہ ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر ناچنے لگا۔

غلام بن جانے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا تھا کہ جو پارس بڑے بڑے خطرناک دشمنوں کو نچایا کرتا تھا۔ وہ خود ناچنے لگا تھا۔ الپا ایک ناقابلِ شکست شہ زور کو بری طرح شکست دے چکی تھی۔

اب وہ سوچ رہی تھی "کیا اتنا ثبوت کافی ہے؟ یا اسے اور آزمایا جائے۔"

پارس کے سلسلے میں یہ مشہور تھا کہ وہ اپنی مما سونیا کی طرح بلا کا مکار ہے۔ دشمنوں کو اس کی مکاری کا پتا اس وقت چلتا تھا، جب پانی سر سے گزر جاتا تھا۔ الپا کے دماغ میں کامیابی کے باوجود اندیشہ تھا کہ کہیں وہ مکاری نہ کررہا ہو؟

وہ اتنی جلدی اس پر اعتماد نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ پھر اسے کسی دوسری طرح آزمائے۔ اسے کوئی ایسا حکم دے کہ جس کی تعمیل کرتے ہوئے وہ اپنی ذلت اور توہین محسوس کرے۔ وہ اس حکم کی تعمیل سے انکار کرے گا تو اس کی مکاری کا بھید کھل جائے گا۔

وہ کسی طرح آزمانے کی بات سوچ رہی تھی۔ ایسے وقت موبائل فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے کار کی رفتار سست کرتے ہوئے اسے ایک فٹ پاتھ سے لگا کر روکا پھر موبائل کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر بولی "ہیلو۔"

دوسری طرف سے بوبی نے چہکتے ہوئے کہا "الپا! خوش خبری ہے۔ میں نے جیکی ہنٹر کو ڈھونڈ نکالا ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولی "او۔ ویری گڈ بوبی! وہ کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ ہے۔ میں نے اسے پکڑ کر اپنی کار میں بٹھالیا ہے۔"

"تم خرو بنگلے سے باہر کیوں گیا تھا؟ وہ تمہیں کہاں ملا ہے؟"

"بنگلے میں شراب کا اسٹاک ختم ہوگیا تھا۔ وہ نشے کی طلب میں بنگلے سے نکل گیا تھا۔ میں نے اسے ایک تھڑ دکاس بار میں پکڑا ہے۔"

"اسے فوراً بنگلے میں لے جاؤ۔ میں وہاں آرہی ہوں۔"

اس نے فون کو بند کرکے ساتھ والی سیٹ پر پھینکا پھر کار اسٹارٹ کرکے ڈرائیو کرتی ہوئی رفتار بڑھانے لگی۔ اب اسے اور زیادہ خوشی کا یقین ہوگیا تھا۔ ٹرانسفارمر مشین کا ماہر مکینک جیکی کسی دشمن کے بستے نہیں چڑھا تھا۔ بخیریت بنگلے میں واپس پہنچ رہا تھا۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ بنگلے میں پہنچتے ہی جیکی ہنٹر کے سر سے وہ کیل نکالے گی، جس کی وجہ سے وہ اس کے دماغ میں نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ اس نے جیکی کو ٹیلی پیتھی جاننے والے دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ کیل اس کے سر میں پیوست کرائی تھی۔ بُرے وقت میں وہ اس کے لیے بھی رکاوٹ بن گئی تھی۔ اگر وہ کیل نہ ہوتی تو وہ پلک جھپکتے ہی اس کے دماغ میں پہنچ کر اسے تلاش کر لیتی۔

کیل نکالنے کے بعد دشمنوں کی طرف سے اندیشہ رہتا لیکن اس مسئلے کا حل آسان تھا۔ وہ تنویمی عمل کے ذریعے جیکی کے دماغ کو لاک کر سکتی تھی۔

کچھ دیر پہلے وہ مایوس ہو رہی تھی۔ ٹرانسفارمر مشین تیار کرنے کی امید دم توڑ رہی تھی۔ اب اچانک کامیابی نے اس کے اندر بجلی بھر دی تھی۔ وہ بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ ایسے میں تو شامت آنی ہی تھی۔ اچانک ایک موڑ پر دوسری طرف سے آنے والے ٹرک سے کار ٹکرا گئی۔

کار پوری طرح ٹکرائی تو موت آئی مگر صرف شامت آئی تھی۔ کار ایک سائیڈ سے ٹکرائی تھی اور اچھل کر فٹ پاتھ پر پہنچ کر ایک بڑے شیلف کے شیشے توڑتی ہوئی اندر گھستی چلی گئی تھی۔

الپا کا چہرہ پہلے اسٹیئرنگ سے ٹکرایا تھا۔ پھر وہ کار دکان کی ایک دیوار سے ٹکرا کر ایک جھٹکے سے رکی تو وہ سیٹ پر سے اچھل کر ونڈ اسکرین کا شیشہ توڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے؟ دنیا میں ہے بھی یا نہیں؟

یہ مقدر کی ہیرا پھیری ہے۔ کبھی کچھ ہوتا ہے، کبھی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ انسان سوچتے سوچتے، عمل کرتے کرتے، دوسروں کو کچلتے کچلتے، خود کو اچھالتے اچھالتے اچانک گڑھے میں گر پڑتا ہے۔ وہ زخموں سے چور ہونے والی، بے ہوش ہو جانے والی کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے قیدی، اس کے غلام اور ماتحت ہوش میں رہیں گے اور وہ بے ہوش ہو کر اسپتال پہنچ جائے گی۔

بوبی ٹرانسفارمر مشین کے ماہر مکینک جیکی ہنٹر کو لے کر بنگلے میں پہنچا اور الپا کا انتظار کرنے لگا۔

پارس آہنی سلاخوں کے پیچھے قید تھا۔ وہ الپا کے حکم سے ایک ٹانگ پر ناچنا نہیں چاہتا تھا مگر اس نے ایک مالکن کی حیثیت سے اس کے دماغ پر قبضہ جما کر اسے ناچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ اس نے قسم کھائی کہ آئندہ اس کے حکم کی تعمیل نہیں کرے گا۔ اپنی قوت ارادی سے کام لے کر اس کی ہر بات سے انکار کر دے گا۔ ایسا مستحکم ارادہ کرنے کے بعد وہ انتظار کرنے لگا لیکن اسے اپنے دماغ میں الپا کی آواز سنائی نہیں دی۔ اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اچانک حادثے کا شکار ہو گئی ہے۔ اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ وہ کسی بہت ہی اہم معاملے کو نمٹانے کے لیے کچھ کہے سنے بغیر چلی گئی ہے۔

وہ قید خانے کے فرش پر بیٹھ کر پریشانی سے سوچنے لگا "میں بعض اوقات ناممکن کو بھی ممکن بنا چکا ہوں۔ لیکن اس تنویمی عمل کے اثر کو زائل کرنے یا کم کرنے میں ناکام ہو رہا ہوں۔ اس دشمن عورت نے میرے اندر ایسے زبردست زلزلے پیدا کیے تھے کہ اب تک ذہنی کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔"

وہ ذہنی کمزوری کے باعث خیال خوانی کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اگر اس قابل ہوتا تو فوراً سونیا اور ٹائی کو اپنے حالات سے مطلع کرتا۔ وہ حیران تھا کہ ایک دن گزر گیا۔ رات ہو گئی لیکن ہم میں سے کسی نے اس کی خبر نہیں لی۔ میں علی کے ساتھ چین میں تھا۔ میری فیملی کے دوسرے افراد اپنی اپنی جگہ مصروف تھے۔ ہم سب چوبیس گھنٹے میں ایک بار ایک دوسرے کے ذریعے سب ہی کی خیریت معلوم کر لیتے تھے یا بابا صاحب کے ادارے سے سب کی خیر خیریت معلوم کرتی تھی۔

آخری بار ٹائی نے پارس سے رابطہ کیا تھا۔ اس کے بعد ہی الپا نے اسے قیدی بنایا تھا۔ تب سے دس گھنٹے گزر چکے تھے۔ ٹائی اور ہم سب اس کے موجودہ حالات سے بے خبر تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس لیے پارس کی فکر نہیں تھی کہ ٹائی اس سے رابطہ کر چکی تھی۔ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں کسی وقت بھی اس سے رابطہ کرنے والے تھے۔

وہ فرش پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ آہنی سلاخوں کے باہر دو مسلح پہرے دار گونگے بنے ہوئے تھے۔ الپا نے انہیں سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ اس قید خانے میں پارس کے سامنے ایک ذرا سی آواز منہ سے نہ نکالیں۔ ایک لفظ بھی زبان سے ادا نہ کریں۔ ورنہ پارس ان کے دماغوں میں پہنچ کر فرار کا راستہ بنا لے گا۔

الپا نے وہاں چار پہرے داروں کی ڈیوٹی لگائی تھی۔ دو پہرے دار دن کے وقت تھے۔ وہ چلے گئے تھے۔ ان کی جگہ دوسرے دو پہرے دار آئے تھے۔ جب الپا نے پارس کے دماغ میں زلزلے پیدا کیے تھے اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا تب اس کے قریب کسی نے گونگا بننا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

وہ واقعی بے ہوش تھا لیکن قید خانے تک پہنچنے سے پہلے ہوش میں آ گیا تھا۔ دوسروں پر اس نے یہ ظاہر نہیں کیا۔ پہلے کی طرح بے ہوشی ظاہر کرتا رہا۔ وہ چاروں پہرے دار اسے اسٹریچر پر لٹا کر آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے تک آپس میں باتیں کرتے رہے تھے۔ الپا وہاں خیال خوانی کے ذریعے موجود نہیں تھی۔ وہ موجود ہوتی تو پہرے داروں کو باتیں کرنے کی سزا دیتی اور ان کی جگہ دوسرے گونگے پہرے داروں کی ڈیوٹی لگا دیتی۔

پارس نے ان کی گفتگو سنی تھی اور ان میں سے ایک کی آواز اور لہجے کو یاد رکھا تھا۔ وہ پہرے دار اس وقت آہنی سلاخوں کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی ڈیوٹی صبح ختم ہونے والی تھی۔ پارس اس کے دماغ میں پہنچ کر اسے اپنا آلہ کار بنا کر بڑی آسانی سے فرار ہو سکتا تھا مگر افسوس وہ ذہنی کمزوری کے باعث خیال خوانی کے قابل نہیں رہا تھا۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ سامنے رہائی کا راستہ کھلا ہوتا ہے مگر قیدی اس راستے پر چلنے کے قابل نہیں رہتا اور ایسا ہی اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

اور ایسا الپا کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اسے ٹرانسفارمر مشین بنانے والا مکینک واپس مل گیا تھا۔ پارس بھی ماہر مکینک تھا۔ وہ ان دونوں کے ذریعے چند ہفتوں میں ٹرانسفارمر مشین تیار کر سکتی تھی۔ بہت بڑی کامیابی کا دروازہ کھل گیا تھا لیکن تقدیر اسے اسپتال کے دروازے پر لے گئی تھی۔

پولیس والے حادثے کے بعد اسے اسپتال لے کر آئے تھے۔ اس کے سر اور جسم کے کئی حصوں پر گہری چوٹیں لگی تھیں۔ لہولہان ہو گئی تھی۔ پہچانی نہیں جا رہی تھی اگر اچھی حالت میں ہوتی تب بھی پولیس والے اسے پہچان نہ پاتے۔ اسرائیلی اکابرین بھی اسے پہچان نہیں سکتے تھے۔ وہ الپا جو برسوں سے یہودی قوم اور اپنے ملک کے لیے بے شمار کارنامے انجام دیتی آ رہی تھی، اسے صورت شکل سے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ چہرے کی پلاسٹک سرجری کرانے کے بعد روپوش رہ کر زندگی گزار رہی تھی۔ اسرائیلی اکابرین سے صرف خیال خوانی کے ذریعے رابطہ کرتی رہتی تھی۔

اس نے کار کے حادثے میں ایک بڑی دکان کا لاکھوں ڈالرز کا نقصان کیا تھا۔ وہ نقصان پورا کرانے کے لیے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ زخمی اور بے ہوش ہونے والی کون ہے؟

پولیس والے قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اس کا نام اور پتا معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے چہرے سے لہو صاف کرنے کے بعد اس کی مختلف تصویریں اتاری جا رہی تھیں۔ پولیس افسر کہہ رہا تھا "یہ تصویریں ٹی وی کے ذریعے نشر کی جائیں گی۔ صبح کے اخبارات میں شائع کرائی جائیں گی۔ تصویریں دیکھ کر اس کے ماں باپ، سرپرست اور عزیز و اقارب ضرور یہاں آئیں گے۔"

پولیس والوں کی کوششوں سے اسی رات ٹی وی کے ذریعے الپا کی تصویریں دکھائی گئیں۔ اعلان کیا گیا کہ اس عورت کے متعلق جو بھی معلومات فراہم کرنا چاہے۔ وہ کسی بھی پولیس اسٹیشن میں آ جائے۔

بوبی پریشان ہو رہا تھا۔ وہ جیکی ہنٹر کے ساتھ بنگلے میں الپا کا منتظر تھا۔ اس نے فون پر کہا تھا کہ ابھی آ رہی ہے لیکن دو گھنٹے گزرنے کے باوجود نہیں آئی تھی۔ اس نے اس کے موبائل فون پر رابطہ کیا تو پتا چلا وہ فون بند ہو چکا ہے۔

دراصل فون بند نہیں ہوا تھا۔ کار کے حادثے میں نوٹ کرنا کارہ ہو گیا تھا۔ بوبی نے اس کے خفیہ محل نما بنگلے میں بھی فون کیا۔ وہاں گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ وہ حیرانی اور پریشانی سے سوچ رہا تھا کہ الپا کہاں چلی گئی ہے؟ جہاں بھی گئی ہے، وہاں سے رابطہ کر سکتی ہے مگر اس نے فون کے ذریعے بھی رابطہ ختم کر دیا تھا۔

جیکی ہنٹر ڈرائنگ روم میں بیٹھا وہسکی پی رہا تھا اور ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا "بوبی! یہاں آؤ۔ دیکھو ٹی وی پر میڈم کی تصویر دکھائی جا رہی ہے۔"

بوبی دوڑتا ہوا آیا۔ ٹی وی اسکرین پر الپا دکھائی دے رہی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ زخمی نظر آ رہی تھی۔ بوبی توجہ سے اعلان سننے لگا پھر بولا "یہ کیا ہو گیا؟ الپا زخمی دکھائی دے رہی ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے؟ پولیس الپا کا نام اور پتا معلوم کرنا چاہتی ہے۔"

جیکی نے کہا "فوراً کسی قریبی پولیس اسٹیشن جاؤ۔ معلوم کرو کہ میڈم کس حال میں ہیں اور کہاں ہیں؟"

"جیکی! میں جا رہا ہوں۔ دروازے کھڑکیاں باہر سے بند کر دوں گا۔ میں اتنی بوتلیں خرید کر لے آیا ہوں کہ تم ایک ماہ تک بنگلے کے اندر بیٹھ کر پیتے رہو گے۔ مقفل دروازے کھول کر باہر نہیں جا سکو گے۔"

یہ کہہ کر اس نے کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کیا۔ باہر سے مقفل کیا پھر کار میں بیٹھ کر پولیس اسٹیشن کی طرف جانے لگا۔

اسپتال میں الپا کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ بڑا وقت لگ رہا تھا۔ سر، گردن اور شانوں میں کار کی ونڈ اسکرین کے شیشے کی کرچیاں چبھی ہوئی تھیں۔ شیشے کے ایک ایک ذرّے کو اس کے جسم اور چہرے سے نکالا جا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا "ارے، یہ کیا؟"

پولیس افسر نے پوچھا "کیا ہوا ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر نے کہا "آپ ادھر آئیں اور یہ دیکھیں۔"

افسر اس ڈاکٹر کے قریب آگیا۔ ڈاکٹر نے الپا کے سر کے پچھلے حصے سے بالوں کو ہٹاتے ہوئے کہا "یہ کیل اس عورت کے سر میں پیوست ہے۔"

اس نے ایک اوزار سے کیل کو پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ کیل سر سے نکل گئی۔ وہ ڈاکٹر اور افسر کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ غیر معمولی جادوئی کیل ہے۔ ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو الپا کے دماغ میں آنے سے روکتی ہے۔ ڈاکٹر نے وہ رکاوٹ دور کردی تھی۔ انجانے میں دوسروں کے لیے اس کے دماغ کا راستہ کھول دیا تھا۔

اسے یہ غرور تھا کہ اس نے تمام ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو اپنے سے دور بھگا دیا ہے۔ وہ بیمار ہوگی یا کسی وجہ سے دماغ کمزور ہوگا' تب بھی کوئی دشمن اس کے اندر نہیں آسکے گا۔

یہ غرور ٹوٹ گیا تھا۔ کیل نکلنے کے بعد وہ ایک معمولی عورت کی طرح اسپتال کے بیڈ پر پڑی تھی۔ دماغی کمزوری کے باعث خیال خوانی سے بھی محروم ہوگئی تھی۔ کوئی بھی دشمن وہاں پہنچ کر اسے ایک چٹکی میں مسل سکتا تھا۔

فی الحال صرف اس لیے دشمنوں سے محفوظ تھی کہ اسے الپا کی حیثیت سے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے بدترین حالات سے بے خبر تھی کیونکہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

ایک پولیس انسپکٹر بوبی کو لے کر پولیس کے افسر اوپر ڈاکٹر کے پاس آیا پھر بولا "سر! اس جوان کا نام بوبی اسمتھ ہے۔ یہ اس بے ہوش عورت کا شوہر ہے۔ یہ اس کا شناختی کارڈ اور یہ میرج سرٹیفکیٹ ہے۔"

افسر نے انسپکٹر سے کہا "تم خاموش رہو۔ مجھے بات کرنے دو۔"

افسر نے اسے گھور کر دیکھا پھر کہا "تم نے بیوی کو بے لگام چھوڑ دیا ہے۔ یہ ریس کا میدان سمجھ کر گاڑی چلاتی ہے۔ اس نے ایک بہت بڑی دکان کو تباہ کردیا ہے۔"

"میری وائف غیر ذمے دار نہیں ہے اور ابنارمل بھی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کسی کی دکان میں گاڑی گھسا دے گی۔ کسی کو بھی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ میری وائف کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔"

"بہت اسمارٹ بن کر بول رہے ہو۔ دکان کے مالک نے ہرجانے کے طور پر پچیس لاکھ ڈالرز کا مطالبہ کیا ہے۔ کیا تمہاری پچیس لاکھ کی حیثیت ہے؟"

"آفیسر! تم قانون کے ایک ذمے دار محافظ ہو۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ عام شہریوں سے طنزیہ انداز میں گفتگو نہ کرو۔"

"تم؟ تم مجھے سمجھا رہے ہو؟ تمہاری اوقات کیا ہے؟"

"اوقات یہ ہے کہ دکان کے مالک کو پچیس لاکھ ڈالرز ابھی دے سکتا ہوں اور ابھی کھڑے کھڑے تمہاری وردی اتار سکتا ہوں۔"

افسر کرسی سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ غصے سے بولا "تم میری وردی اتارو گے؟ اتنی بڑی بات کہہ رہے ہو تو اب میں تمہیں حوالات میں پہنچا کر تمہارے کپڑے اتاروں گا۔ وہاں ایسے ڈنڈے پڑیں گے کہ پولیس والوں کو چیلنج کرنا بھول جاؤ گے۔"

بوبی نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے دکھاتے ہوئے کہا "یہ ہے میری اصل آئیڈنٹٹی۔ میں انٹیلی جنس کا "اسپیشل آفیسر فار میڈم الپا" ہوں۔ ٹیلی پیتھی جاننے والی الپا کا خاص ماتحت ہوں۔ اب تم دیکھو گے کہ دن میں کس طرح تارے نظر آتے ہیں۔"

وہ موبائل فون آن کرکے نمبر پنچ کرنے لگا۔ پولیس افسر اپنا رعب اور دبدبہ بھول گیا تھا۔ اسے سلیوٹ کرکے عاجزی سے گڑگڑا رہا تھا۔ بوبی نے فون پر کہا "کیپٹن! میں بوبی اسمتھ بول رہا ہوں۔ اپنی ٹیم کے ساتھ پولیس اسپتال آؤ اور ایک پولیس افسر کو گرفتار کرکے لے جاؤ۔ اسے حراست میں رکھو۔ کل تک میڈم الپا اس کی وردی اتارنے کا حکم دیں گی۔"

اس نے فون بند کرکے افسر سے کہا "جو عام شہری کی عزت نہ کرے' اسے سپاہی کی وردی نہیں پہننا چاہیے۔ کمرے سے باہر جاؤ۔ گیٹ آؤٹ!"

وہ سر جھکا کر وہاں سے چلا گیا۔ بوبی نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "میری وائف کو ہوش آیا تھا؟"

"نہیں۔ یہ مسلسل بے ہوش پڑی ہیں۔ ویسے ہوش میں آجائیں گی۔ یہ بری طرح زخمی ہوگئی ہیں۔ زخم بھرنے میں بہت وقت لگے گا۔"

"میں اپنی وائف کے علاج کے لیے خاص توجہ چاہتا ہوں۔ ابھی اوپر سے احکامات موصول ہوں گے۔ تم ایک لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ دن رات میری وائف کو اٹینڈ کرو گے اور اس کی میڈیکل رپورٹ مجھے دیتے رہو گے۔"

"آپ کو رپورٹ ملتی رہے گی۔ ہاں یاد آیا۔ ان کے سر کے پچھلے حصے میں ایک کیل گھس گئی تھی۔"

"کیل....؟" بوبی نے چونک کر پوچھا "کہاں ہے' وہ کیل؟ وہ سر کے کس حصے میں تھی؟"

وہ انجان بن کر پوچھتا ہوا' الپا کے سرہانے آیا۔ ڈاکٹر نے اس کے بالوں کو ہٹاتے ہوئے کہا "یہاں وہ کیل پیوست ہوگئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا وہ کیل کس طرح سر میں گھس گئی تھی؟"

ڈاکٹر نے وہ کیل اسے دکھائی۔ بوبی نے اسے ہاتھ میں لے کر دیکھا اور سوچا "یہ الپا کے ساتھ بہت برا ہوا۔ اب اس کے دماغ کا دروازہ کھلا رہے گا۔ ابھی اس حال میں یہ کئی دنوں تک نہ خیال خوانی کر سکے گی اور نہ ہی سانس روک کر دشمنوں کو اپنے دماغ سے بھگا سکے گی۔"

وہ ڈاکٹر سے بولا "جہاں حادثہ ہوا تھا۔ وہاں کسی جگہ یہ کیل ہوگی۔ اور اس کے سر میں پیوست ہو گئی ہوگی۔ بہرحال میں یہ کیل اپنے پاس رکھ رہا ہوں۔ آپ کو اعتراض تو نہیں ہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ آپ اسے لے جا سکتے ہیں۔"

وہ کیل کو جیب میں رکھ کر موبائل کے ذریعے آرمی انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران سے رابطہ کرنے لگا۔ اس اسپتال میں الپا کے لیے وہ حفاظتی انتظامات لازمی تھے۔ یہ کسی پر ظاہر نہیں کرنا تھا کہ وہ الپا ہے۔ بوبی اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے پیش کر رہا تھا۔ وہ سرکاری طور پر الپا کا اسپیشل سیکیورٹی افسر تھا اور یہ بہت بڑا عہدہ تھا۔ اس کے احکامات کی تعمیل ایسے ہی ہوتی تھی جیسے وہ آرڈر الپا نے صادر کیے ہوں۔

اور وہ الپا کے لیے ہی حفاظتی انتظامات کر رہا تھا۔ وہ اپنے اعمال کے مطابق برے نتائج سے دوچار ہو رہی تھی۔ اسپتال میں ایک لاوارث کی طرح بے یار و مددگار پڑی ہوئی تھی۔ اگر بوبی اس کا وفادار نہ ہوتا تو بڑے کارنامے انجام دینے والی ناقابلِ شکست اور مشہور الپا کی زندگی کا اختتام اسی اسپتال میں ہو جاتا۔

وہ اتنا وفادار تھا کہ جب تک الپا ہوش میں نہ آتی، زخموں کی تکلیف کم نہ ہوتی اور سیکیورٹی کے تمام انتظامات مکمل نہ ہو جاتے، تب تک وہ اسے اسپتال میں تنہا چھوڑ کر نہ جاتا۔

وہ اسپتال میں رات گزارنے لگا اور وہی رات پارس قید خانے میں گزار رہا تھا۔ ایک قیدی بے بس اور مجبور ہوتا ہے مگر وہ حالات کے آگے بے بس ہونا اور سر جھکا کر بیٹھنا نہیں جانتا تھا۔ اس نے سوچا "میں ابھی صرف اس لیے بے بس اور مجبور ہوں کہ میرا دماغ کمزور ہے۔ اگر توانائی بحال ہو جائے تو میں خیال خوانی کے ذریعے اس قید خانے سے باہر جا سکتا ہوں۔"

جب غلطی یا کمزوری معلوم ہو جائے تو اسے اپنی عقل سے دور کیا جا سکتا ہے۔ پارس وہاں فرش پر بیٹھ کر یوگا کی مشقیں دہرانے لگا۔ اس طرح وہ خوامخواہ قیدی بن کر بیٹھنے کے بجائے توانائی حاصل کرنے کے طریقوں پر عمل کرنے لگا۔

آہنی سلاخوں کے دوسری طرف کھڑے ہوئے پہرے دار یوگا کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کو یوگا کی مشقیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پارس کو عجیب و غریب حرکتیں کرتے دیکھ کر مسکرانے لگے۔

وقت گزرنے لگا۔ رات کے دس بجے دونوں پہرے دار آہنی سلاخوں کے قریب آئے۔ ایک نے اشاروں سے پوچھا۔ "کھانا کھاؤ گے؟"

اس نے کہا "تکلیف نہ کرو۔ میں باہر آ کر کھاؤں گا۔"

وہ دونوں اپنے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگے۔ تاکہ ہنسی کی آواز منہ سے باہر نہ نکلے۔ الپا نے تاکید کی تھی کہ پارس کو اپنی آواز بھی نہ سنائی جائے۔ اس سلسلے میں دونوں محتاط تھے۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے تیسرا پہرے دار ان سب کے لیے کھانا لے کر آیا۔ وہ تینوں وہاں بیٹھ کر کھانے لگے۔ تیسرا پہرے دار پارس کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ یوگا کی مشقیں کرنے کے باعث پسینہ پسینہ ہو رہا تھا اور اب آنکھیں بند کیے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

پارس نے وہاں قید ہونے سے پہلے جس پہرے دار کی گفتگو سنی تھی، وہ روٹیاں کھا رہا تھا۔ وہ کھانا چھوڑ کر اپنے ساتھی کے قریب آ کر اس کے کان میں سرگوشیانہ انداز سے گونگے بنے ہوئے ہیں۔ کہیں سچ مچ گونگے نہ ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے کانوں میں بول سکتے ہیں اور سن سکتے ہیں۔"

دوسرے نے جواباً اس کے کان میں کہا "ڈر لگتا ہے۔ قیدی کے کان تیز ہوں گے تو ہمارے کانوں میں ہونے والی باتیں بھی سن لے گا۔"

پارس نے کہا "وہ تو میں سن رہا ہوں۔"

دوسرے پہرے دار نے تیسرے سے پوچھا "یار! میں تیرے کان میں بول رہا ہوں پھر میرے کان میں تیری آواز کیسے سنائی دے رہی ہے؟"

"گدھے! میں تیرے دماغ میں بول رہا ہوں۔"

"اس۔۔۔؟" اس نے سر گھما کر آہنی سلاخوں کے پیچھے پارس کو دیکھا۔ پارس آنکھیں بند کیے پالتھی مارے فرش پر بیٹھا تھا۔ پہرے دار نے سوچا "نہیں" یہ میرے دماغ میں نہیں ہے۔ اس کی تو آنکھیں بند ہیں۔ اس نے آواز بھی نہیں سنی ہے۔"

وہ کھانا چھوڑ کر کرسی سے اٹھ کر تیسرے پہرے دار کے پاس آیا پھر اس کے کان میں بولا "اگر کوئی کانا پھوسی کرے تو تم دور سے اس کی آواز سن سکتے ہو؟ کیا یہ قیدی میری آواز سن رہا ہوگا؟"

تیسرے نے جواباً اس کے کان میں پوچھا "یہ کیسا بے



تکا سوال کر رہے ہو؟ آدمی کے پاس خرگوش کے کان ہوں، تب بھی دور کی آواز نہیں سن سکے گا۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کے کان میں بول رہے تھے۔

تیسرے نے آہنی سلاخوں کے پاس آ کر اپنی گن پارس کی طرف پھینک دی۔ اس کے ساتھی نے حیرانی سے پوچھا "یہ تم نے کیا کیا؟"

پارس نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ دوسرے نے بھی اپنی گن اس کے سامنے پھینک دی۔ وہ تیسرے کے دماغ میں پہنچ گیا۔ تیسرے نے اپنی گن سے دونوں ساتھیوں کا نشانہ لے کر کہا "دروازہ کھولو اور قیدی کو باہر آنے دو۔"

ایک نے پریشان ہو کر پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم دونوں نے اپنی گنیں قیدی کے پاس پھینک دیں اور یہ ہمارا ساتھی ہو کر ہمیں گولی مارنے والا ہے۔"

"دروازہ فوراً نہیں کھولو گے تو گولی مار دوں گا۔"

ایک نے دروازہ کھول دیا۔ پارس دو دراتھلیں اٹھا کر تیسرے پہرے دار کے دونوں سے کہا "اندر چلو۔ جلدی کرو۔"

وہ دونوں آہنی سلاخوں کے پیچھے گئے۔ تیسرے نے کہا۔ "میرے اندر یہ قیدی سما ہوا ہے۔ یہ پہلے تم دونوں کے اندر تھا۔ اسی لیے تم نے اپنی رائفلیں اس کے سامنے پھینک دی تھیں۔ اب میں اپنی رائفل بھی اسے دے رہا ہوں۔"

وہ اپنی رائفل پارس کو دے کر اپنے دونوں ساتھیوں کے پاس آہنی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا۔ پارس نے دروازے کو مقفل کیا پھر تینوں رائفلوں کو دور پھینک کر کہا "یہاں صبح تک خاموش بیٹھے رہو یا سوتے رہو اور خدا کا شکر ادا کرتے رہو کہ تمہیں زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

وہ وہاں سے پلٹ کر ایک دروازہ کھول کر چلا گیا۔ اس نے پہرے داروں کے خیالات سے معلوم کیا تھا کہ وہ حیضہ کے ایک علاقے میں ہے۔ بابا صاحب کے ادارے کے سراغ رساں اسرائیل کے بڑے شہروں میں موجود رہتے تھے۔ اس نے ایک سراغ رساں کے دماغ میں پہنچ کر کہا "میں حیضہ کی فلٹھ اسٹریٹ کے موڑ پر ٹیسٹنل چیک کے سامنے انتظار کر رہا ہوں۔ فوراً گاڑی لے کر آؤ اور ایک ایسا انجکشن لے کر آؤ، جس کے ذریعے مجھے چند منٹ کے لیے دماغی طور پر مجھے کمزور بنا سکو۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا "سر! آپ کمزور ہونا چاہتے ہیں؟"

"ہاں، مصلحتاً ہونا چاہتا ہوں، صرف پندرہ بیس منٹ کے لیے۔"

"ٹھیک ہے سر! میں یہ انجکشن لاؤں گا۔ اس کی متضاد دوا بھی لاؤں گا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد توڑ کرنے کے لیے دوسرا انجکشن لگایا جائے گا تو کمزوری دور ہو جائے گی۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

پارس نے اس سے رابطہ کرنے کے بعد خیال خوانی کی پرواز کی۔ پھر ثانی کے پاس پہنچ کر کہا "ہائے جانم! کیا مجھے بھول چکی ہو؟ کئی گھنٹوں سے انتظار کر رہا ہوں۔"

"تم کیسے ہو۔" ثانی نے بے تابی سے پوچھا۔ "تمہیں تو الپا نے بری طرح ٹریپ کر لیا تھا پھر تم کس طرح مجھ سے رابطہ کر رہے ہو۔" جواب میں پارس نے ساری تفصیل اسے بتا دی۔

ثانی نے پوچھا "کیا واقعی الپا نے تمہیں اپنا معمول بنا لیا تھا؟ تم اس کے معمول بن چکے ہو تو اتنی آزادی سے اس کے خلاف کیسے بول رہے ہو؟"

"اس سلسلے میں کچھ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ الپا مجھے معمول بنا کر بڑے غرور سے مجھے ایک ٹانگ پر نچا رہی تھی پھر اچانک ہی اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ سات گھنٹے گزر چکے ہیں۔ وہ اب تک میرے اندر نہیں آئی ہے۔ میں اس کے مسلح پہرے داروں کو قیدی بنا کر وہاں سے آیا ہوں۔ آزادی سے سوچ رہا ہوں۔ تم سے گفتگو کر رہا ہوں لیکن وہ رکاوٹ نہیں بن رہی ہے۔"

ثانی نے کہا "الپا تمہیں جیت کر کبھی ہارنا نہیں چاہے گی۔ وہ بڑے اہم معاملات کو وقتی طور پر نظرانداز کر سکتی ہے لیکن تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی نظرانداز نہیں کرے گی۔"

"یہی میں سوچ رہا ہوں۔ وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ اسے میرے دماغ میں آنے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دماغی کمزوری میں مبتلا ہو گئی ہو۔ ویسے وہ جہاں بھی ہو۔ جس حال میں بھی ہو۔ ہمیں موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں تمہارے دماغ میں آ کر اس کے تخویفی عمل کا توڑ کروں گی۔"

"تم میرے اندر نہیں آ سکو گی۔ اس نے میرے دماغ کو لاکڈ کیا ہے۔"

"پھر تو تمہیں ایک ذرا کمزور بنا کر آؤں گی۔"

"اس کا انتظام میں نے کیا ہے۔ ایک سراغ رساں میرے لیے گاڑی لا رہا ہے۔ وہ ایسی دوا بھی لا رہا ہے، جسے انجکٹ کرنے سے میں کچھ دیر کے لیے کمزوری محسوس کروں گا۔ ایسے وقت تم میرے اندر آ کر الپا کے تخویفی عمل کو ختم کر سکو گی۔"

وہ سراغ رساں گاڑی لے کر آ گیا۔ پارس نے اس سے کہا "میں پچھلی سیٹ پر لیٹ رہا ہوں۔ وہ انجکشن لگا دو۔ جب

تک میں سوتا رہوں' مجھے نہ جگانا۔ میں گاڑی میں ہی نیند پوری کروں گا۔ دوا انجکٹ کرنے سے پہلے اپنی میڈم ٹائی کے پاس جاؤ۔"

اس نے خیال خوانی کے ذریعے ٹائی کو مخاطب کرکے کہا۔ "میڈم! میں مسٹر پارس کے لیے گاڑی لے آیا ہوں۔ یہ پچھلی سیٹ پر لیٹ کر انجکشن کے ذریعے کمزور ہونا اور پھر گہری نیند سونا چاہتے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ میں انہیں اپنے بنگلے میں لے جاؤں۔ وہاں یہ آرام سے سوتے رہیں گے۔"

"نہیں۔ تم تحمل ایبے جاؤ گے۔ اپنے بنگلے تک پہنچنے میں ایک گھنٹا لگے گا۔ الپا کسی وقت بھی آکر پارس کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ فوراً انجکشن لگاؤ اور گاڑی وہاں سے لے جاؤ۔ میں پارس کے اندر رہوں گی۔"

سراغ رساں نے ہدایات پر عمل کیا۔ پارس کو انجکشن لگا کر سامنے اسٹیئرنگ سیٹ پر آبیٹھا پھر گاڑی اسٹارٹ کرکے ڈرائیو کرنے لگا۔ ٹائی اپنے پارس کے دماغ میں پہنچ چکی تھی۔

○☆○

آندرے اور سائن کے باقی تین ٹیلی پیتھی جاننے والے ساتھیوں میں ایک کا نام بیکر برائٹ تھا۔ وہ ذہین تھا۔ ہمیشہ کسی نہ کسی معاملے میں مصروف رہتا تھا۔ جب کوئی مصروفیت نہیں ہوتی تھی کسی نہ کسی سے عشق کرنے لگتا تھا۔

ٹیلی پیتھی کی دنیا میں وہ پہلا ٹیلی پیتھی جاننے والا تھا' جو شاعر تھا۔ دشمنوں کی دنیا میں سخت عملی زندگی گزار رہا تھا۔ شاعری کرتا تھا۔ حسن پرست تھا۔ حسین خیالات اور نازک احساسات کا حامل تھا۔ اس کی یہ خوبی تھی کہ وہ ہوس پرست نہیں تھا۔ کسی حسین اور جوان عورت کو دیکھ کر ایک عیاش کی طرح للچاتا نہیں تھا۔ حسن کی قدر کرتا تھا۔

وہ قد آور' خوب رو اور صحت مند جوان تھا۔ حسین لڑکیاں اس سے متاثر ہوجاتی تھی۔ اس کی دوست بن جایا کرتی تھیں۔ وہ سب سے دوستی کرتا تھا۔ لیکن عیاشی سے پرہیز کرتا تھا۔ وہ حسن پر شاعری کرتا تھا۔ اسے میلا نہیں کرتا تھا۔

آندرے نے کہا "تمہاری زندگی میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی آتی ہے تم کسی سے شادی کیوں نہیں کرلیتے؟"

بیکر برائٹ نے کہا "میرے سامنے جو بھی حسن آتا ہے' وہ آنکھوں کو اچھا لگتا ہے۔ میں نے ایسا حسن نہیں دیکھا' جو دل میں اتر جائے۔"

سائن نے کہا "بے شک' دنیا میں بے شمار حسینائیں ہیں لیکن کوئی ایک حسینہ ایسی ہوتی ہے' جو ملکۂ حسن نہ ہونے کے باوجود دل میں سما جاتی ہے اور وہی شریک حیات بن جاتی ہے۔"

بیکر نے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ میری نظروں میں صرف وہی عورت حسین ہے' جو دل جیت لیتی ہے۔ ایسی عورت کے لیے ایک قدرتی کشش ہوتی ہے۔"

آندرے نے کہا "مجھے اندیشہ ہے' تمہاری گرل فرینڈز کی تعداد بڑھتی رہے گی تو تمہارے فرائض کی ادائیگی میں گڑبڑ ہوسکتی ہے۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ تمہیں کس بات کا اندیشہ ہے؟"

"دشمن ٹیلی پیتھی جاننے والے کسی نہ کسی لڑکی کے ذریعے معلوم کرلیں گے کہ تم یوگا کے ماہر ہو۔ ٹیلی پیتھی جانتے ہو۔"

"میں لڑکیوں کی موجودگی میں ٹیلی پیتھی کا مظاہرہ نہیں کرتا ہوں۔"

"اگر کسی لڑکی کے ذریعے کوئی تمہارے دماغ میں آئے گا تو تم سانس روک کر اسے بھگاؤ گے۔ تمہاری اسی حرکت سے دشمن سمجھ لیں گے کہ تم ٹیلی پیتھی جانتے ہو۔ تمہارے خلاف ایسے حالات پیدا کیے جائیں گے کہ تم مجبوراً ہو کر خیال خوانی کرنے لگو گے۔"

"دشمنوں کا خوف ایسا ہے تو ہمیں گھر سے نکلنا نہیں چاہیے۔ کیا پتا' ہم کسی دکان میں خریداری کے لیے جائیں' وہاں کسی سیلز گرل کے دماغ میں کوئی ہو اور ہمیں نہیں دیکھ لے۔"

"ایسا ہوگا تو ہم اسے ایک اتفاق کہیں گے۔ دانش مندی یہی ہے کہ لوگوں کی بھیڑ میں نہ جائیں۔ محفلوں میں اور تقریبات میں جانے سے پرہیز کریں۔ اگر کسی ضرورت سے جانا ہو تو خاموش رہیں۔ کم بولیں' اپنا مقصد پورا کریں اور وہاں سے چلے آئیں۔ جتنی احتیاط کی جائے گی' اتنے ہی خطرات کم ہوں گے۔"

"ٹیلی پیتھی کی دنیا میں جو واقعات پیش آتے رہتے ہیں' ان پر غور کرو تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اچھے خاصے تجربے کار ٹیلی پیتھی جاننے والے عورتوں کے چکر میں چکراتے رہے ہیں اور جیتی ہوئی بازیاں ہارتے رہے ہیں۔"

سائن نے کہا "ٹیلی پیتھی جاننے والے جے سامو کو میں نے بنی نام۔ کی ایک حسینہ کے ذریعے ٹریپ کیا تھا۔ میں نے اور آندرے نے صرف بنی کے ذریعے تمام امریکی اکابرین اور ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو اپنا محکوم بنالیا۔ ٹرانسفارمر مشین قبضہ جمالیا۔ صرف ایک عورت کے باعث تھری جے امریکا پر حکمرانی سے محروم ہوگئے ہیں۔"

آندرے نے کہا "شیوانی ہم سے چھپا رہی ہے کہ اس نے تھری جے کے دو ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو اپنا معمول بنالیا ہے مگر ہم اور تم سب ہی جانتے ہیں کہ وہ دو خیال خوانی کرنے والے بھی شیوانی جیسی عورت کے ذریعے ٹریپ کیے گئے ہیں۔"

بیکر نے کہا "تم دونوں ایسی ٹھوس مثالیں پیش کررہے ہو کہ مجھے ڈر جانا چاہیے حسینوں کی قدر نہیں کرنا چاہیے۔ قدر کرنے سے حسینوں کا میلہ لگ جاتا ہے اور اس تماشے میں دشمنوں کو چھپ کر آنے اور ٹریپ کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا "ہم یہ نہیں کہتے کہ حسن پرستی اور شاعری نہ کرو۔ اس کے لیے ایک حسینہ کافی ہے۔ کسی ایک سے شادی کرو۔ وہ اپنی ہوگی۔ اپنی رازدار ہوگی۔ دشمن اسے آلہ کار نہیں بنا سکیں گے۔ ہم سب اسے تحفظ دیں گے۔ وہ ہمارے لیے قابل اعتماد رہے گی۔"

دوسرے نے کہا "عورت جب تک پرائی رہتی ہے۔ تب تک اس کی طرف سے اندیشہ رہتا ہے مگر وہی عورت اپنی ہوجاتی ہے' ڈھال بن جاتی ہے۔"

بیکر نے کہا "میرے دل میں جتنی حسینائیں آتی ہیں۔ وہ مجھے شاعر بناتی ہیں۔ شعر بنانے والی اب تک کوئی نہیں آئی۔ میں کیا بتاؤں کہ کیسی چاہتا ہوں۔ میں خود نہیں جانتا۔ جب وہ آئے گی تو میں کہہ پاؤں گا۔"

پھر ایک دن بیکر کو نظر آگئی۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ نگاہوں کے سامنے مسکرا رہی تھی۔ فینسی ڈریس میں ہندوستان کی راج کماری لگ رہی تھی مگر افسوس وہ سامنے ہوتے ہوئے بھی سامنے نہیں تھی۔

کیونکہ وہ ایک میگزین کے سرورق پر تھی۔ سرورق پر اس کی تصویر کہہ رہی تھی کہ میں تصویر میں ایسی ہوں تو روبرو جیتی جاگتی کیسی لگوں گی؟

بیکر اس میگزین کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اندر کے چند صفحات میں مختلف زاویوں سے کئی اداؤں بھری تصویریں تھیں۔ ہر تصویر اس کا دل کھینچ رہی تھی۔ اسے دیوانہ بنا رہی تھی۔

وہ کون ہے؟ کیا واقعی ہندوستان کی راج کماری ہے؟

میگزین میں اس کا نام کرشمہ کماری لکھا ہوا تھا۔ باقی مضمون ہندوستانی ملبوسات اور زیورات وغیرہ کے بارے میں تھا۔ وہ اس کے متعلق جتنا زیادہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ میگزین سے معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ تصویر کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔

کرشمہ پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی رک رک کر سانس لینے لگی۔ بیکر پہلے خاموشی سے اس کے خیالات پڑھتا رہا پھر بولا "پلیز سانس نہ روکو۔ میں تمہارا دیوانہ ہوں۔ تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

لیکن کرشمہ نے سانس روک لی۔ بیکر اتنی دیر میں کرشمہ کے ساتھ رہنے والی پدمنی کی آواز اور لہجہ سن چکا تھا۔ وہ پدمنی کے دماغ میں پہنچ کر کرشمہ کے اور اس کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔

پھر وہ آندرے اور سائن کے پاس آکر وہ میگزین انہیں دیتے ہوئے بولا "یہ ہے میری آئیڈیل حسینہ' یہ میری لائف پارٹنر بن سکتی ہے۔"

انہوں نے کرشمہ کی تصویریں دیکھ کر اس کے انتخاب کی داد دی۔ سائن نے کہا "یار! یہ لاجواب ہے لیکن یہ اس سے رومانس کا موقع نہیں ہے۔ یہاں شیوانی اور اس کی ٹیم چین جارہی ہے۔ تم نے ابھی تک یہ معلوم نہیں کیا ہے کہ شیوانی نے جے کانو کے بعد جے فلو کو بھی ٹریپ کیا ہے یا نہیں؟"

بیکر نے کہا "میں اسکاٹ لینڈیارڈ جارہا ہوں۔ وہاں سے تمہیں مکمل معلومات فراہم کروں گا۔ تم بھی مجھ سے تعاون کرو۔"

"ہم سے کیا تعاون چاہتے ہو؟"

"میں تمہیں پدمنی نام کی ایک عورت کے اندر پہنچا رہا ہوں۔ کرشمہ تم دونوں کو اپنے دماغ میں زیادہ دیر رہنے نہیں دے گی۔ سانس روک لے گی۔ تم دونوں پدمنی کے خیالات پڑھ کر کرشمہ اور اس کے خاندان کے بارے میں اہم معلومات حاصل کرو۔ میں نے بہت کچھ معلوم کیا ہے۔ اس کی ماں اور اس کا بھائی کالا جادو جانتے ہیں۔ ہم انہیں اپنا معمول بنا کر ان سے بہت کام لے سکتے ہیں۔ میں اسکاٹ لینڈ جارہا ہوں۔ واپسی پر باتیں ہوں گی۔"

بیکر نے دونوں کو اپنے دماغ میں بلا کر انہیں پدمنی کے دماغ میں پہنچا دیا۔ پھر اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے اسکاٹ لینڈیارڈ چلا گیا۔

آندرے اور سائن نے پدمنی کے ذریعے کرشمہ اور جمنا کماری' بھیما اور کالا جادو سمیت بہت ساری معلومات حاصل کرلیں' انہیں علم ہوا کہ کرشمہ تعلیم یافتہ' ذہین اور اسمارٹ ہے۔ مارشل آرٹ جانتی ہے۔

آندرے اور سائن کے لیے کالا جادو اور آتما کے معاملات بڑے دلچسپ تھے۔ انہوں نے پدمنی کے ذریعے کلپنا کی آواز سنی پھر اس کے دماغ میں پہنچ گئے۔ وہاں بھیما' پدمنی سے باتیں کررہا تھا پھر جسونت نے آکر کلپنا سے کہا "تم اس آتما کی وجہ سے مجھے اپنی تمنائیوں میں نہیں آنے دے رہی ہو مگر میں تمہارے حسن و شباب سے ضرور کھیلوں گا۔ میری ماں آئے گی تو تمہارے اندر کی آتما ٹیلی پیتھی کو بھی

خاک میں ملادے گی۔"

جسونت کے اس چیلنج نے آندرے اور سائن کو چونکا دیا۔ آندرے نے کہا "پتا نہیں' یہ بھیما کون ہے؟ یہ تو ٹیلی پیتھی جانتا ہے۔"

سائن نے کہا "ہم نے پہلے یہ نام کبھی نہیں سنا۔ بھیما کے علاوہ اور پتا نہیں کتنے ہیں' جن سے ہم واقف نہیں ہے۔"

"اور اس لیے واقف نہیں ہیں کہ جانے انجانے ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے کتراتے رہتے ہیں۔ اپنی بہتری اور سلامتی کے لیے ان سے دور رہتے ہیں۔ اس طرح ہمیں پتا نہیں چلتا کہ ہماری دنیا میں کتنے ٹیلی پیتھی جاننے والے ہیں؟ وہ کہاں کہاں مصروف رہتے ہیں؟ ان میں سے کتنے مرتے ہیں اور کتنے نئے پیدا ہوجاتے ہیں۔"

سائن نے کہا "ایسی بے خبری ہمیں کسی وقت بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ہمیں اس پہلو پر غور کرنا چاہیے کہ بے خبر رہنا چاہیے یا نہیں؟"

"کوئی موثق عقل والا بھی کہے گا کہ بے خبری نقصان پہنچاتی ہے۔"

بیکر برائٹ اپنے فرائض ادا کرکے دوسرے دن واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ شیوانی نے جے کافو کے علاوہ جے فلو کو بھی اپنا معمول بنالیا ہے۔ وہ جے سامو کو ٹریپ کرنے میں ناکام رہی ہے اور کل صبح کی ایک فلائٹ سے اپنی ٹیم کے ساتھ چین جانے والی ہے۔"

پھر اس نے پوچھا "اب بتاؤ' تم دونوں نے میری کرشمہ کے بارے میں کیا کچھ معلوم کیا ہے؟"

سائن نے کہا "تشویش کی بات یہ ہے کہ کرشمہ کے خاندان میں جادوگروں کے علاوہ ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا بھی ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" وہ حیرانی سے بولا "وہاں کون ہے' جو ٹیلی پیتھی جانتا ہے؟"

"اس کا نام بھیما ہے۔ اس کی آتما کلپنا کے اندر سمائی ہوئی ہے۔"

"پھر تو وہ ٹیلی پیتھی جاننے والا ہمارے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔"

سائن نے کہا "وہ ایک ہے۔ ہم پانچ ہیں۔ ہم بڑی حکمت عملی سے اسے ٹریپ کرسکتے ہیں۔ اگر وہ قابو میں نہیں آئے گا تو اسے وہاں سے بھگانے کا ایک آسان راستہ ہے۔"

"اسے کیسے بھگایا جاسکے گا؟"

"ہم کلپنا کو مار ڈالیں گے۔ بھیما کی آتما اس کا مردہ جسم چھوڑ کر جانے پر مجبور ہوجائے گی۔"

"وہ اسی خاندان میں کوئی دوسرا جسم حاصل کرے گی۔"

"بھیما اسی دوسرے جسم میں چھپ کر نہیں رہ سکے گی۔ ہم اس دوسرے جسم کو بھی ختم کردیں گے۔ جب اسے پتا چلے گا کہ اس کے مقابلے میں ہم پانچ ٹیلی پیتھی جاننے والے ہیں تو پھر وہ اس خاندان کا رخ نہیں کرے گا۔"

بیکر نے خوش ہو کر کہا "اور یہ میرا فرض بھی ہے کہ میں اپنی محبوبہ کو بھیما جیسے ٹیلی پیتھی جاننے والے سے محفوظ رکھ سکوں۔"

"بیکر! ہمیں دوسرے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرتے رہنا چاہیے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ہم بھیما جیسے تمام ٹیلی پیتھی جاننے والے سے ٹکرائیں۔ بھیما ہمارے لیے خطرناک نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کا اپنا کوئی وجود' کوئی جسم نہیں ہے۔ اس کی آتما اسی دنیا میں رہنے کے لیے دوسرے جسموں کا سہارا لیتی رہے گی۔ ایسے عارضی سہارے کو ہم ختم کریں گے تو وہ ہم سے دور بھاگ جائے گا۔ وہ ہمارے لیے نہیں' ہم اس کے لیے خطرہ بن کر رہیں گے۔"

ان دوستوں نے یہ طے کرلیا کہ RISK یعنی خطرہ THERE IS NO GAME WITHOUT مول لیے بغیر کوئی کھیل کھیلا نہیں جاسکتا۔ بیکر کو احتیاط کرنا چاہیے۔ کرشمہ سیدھی طرح حاصل نہیں ہوگی۔ اس کو تنویمی عمل کرکے اسے حاصل کرنا چاہیے۔

بیکر نے کہا "دوستو! میں یہاں اپنے حصے کے فرائض ادا کرچکا ہوں۔ شیوانی اور اس کی ٹیم کے بارے میں مکمل رپورٹ دے چکا ہوں۔ اب میں ہندوستان جانے کی اجازت دو۔ جب کرشمہ میری طرف مائل ہورہے گی تو میں اس کے قریب رہنا چاہوں گا۔"

سائن نے کہا "ہاں بھئی! کرشمہ کے حسن کا شعلہ بھڑکے گا تو جلنے کے لیے پروانے کو وہاں جانا چاہیے۔ تم ضرور جاؤ۔"

اس رات اس نے کرشمہ پر تنویمی عمل کیا۔ اس عمل کے دوران میں آندرے اور سائن بھی موجود رہے' تاکہ کامیاب تنویمی عمل کا یقین کرسکیں۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ پورس بھی کرشمہ کے اندر چھپا ہوا ہے۔

پورس نے دانش مندی سے کام لیا۔ اس نے تنویمی عمل میں رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ پارس اور پورس وغیرہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب بابا صاحب کے ادارے کی جانب سے انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے تو اس کے اہم مقاصد ہوتے ہیں۔ وہ آزاد رہنے کے باوجود کسی ایسے دشمن سے ٹکرا جاتے ہیں یا کسی ایسے مسئلے میں الجھ جاتے ہیں' جس کا تعلق بابا صاحب کے کسی اہم معاملے سے ہوتا ہے۔

مثلاً پورس آزاد گھومتا ہوا کرشمہ تک پہنچا تھا۔ کرشمہ کے ذریعے ایک دشمن بھیما کا سراغ ملا تھا پھر کرشمہ کے ذریعے ان ٹیلی پیتھی جاننے والے بیکر آندرے اور سائن تک پہنچنے والا تھا' جو چین میں ٹرانسفارمر مشین کی تیاری کو روکنے کی کوشش کررہے تھے۔

اور اب پورس ان کے راستوں کی دیوار بننے والا تھا۔ اس طرح وہ آزاد اور بے لگام تفریح میں مشغولیت کے باوجود بابا صاحب کے ادارے کے ایک اہم معاملے میں ملوث تھا۔

فی الحال پورس کا ذکر چل رہا ہے۔ وہ بیکر کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن رہا تھا۔ اسے آزادی سے کرشمہ کو ہپناٹائز کرنے کا موقع دے رہا تھا۔ ایسا کرنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ رکاوٹ نہ بننے سے بیکر مطمئن رہے گا کہ کرشمہ کسی شک و شبے کے بغیر اس کی معمولہ اور اس کی محبوبہ بن گئی ہے۔ وہ کرشمہ کے دماغ کو لاک کرکے بھی مطمئن رہے گا کہ پورس اس کے اندر نہیں آسکے گا۔ جبکہ پورس اس کی مخصوص آواز اور لہجے کے مطابق جاسکے گا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ پورس نے کرشمہ کو تنویمی عمل کے ذریعے اپنی طرف مائل کیا تھا۔ یوں مائل کرنے یا ہونے سے محبت نہیں ہوجاتی۔ اس نے کرشمہ کو اپنے تنویمی عمل سے آزاد کردیا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات نقش کردی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے بھی وقتی طور پر آزاد رہے گی۔

پورس نے بیکر کے تنویمی عمل کے بعد یہ بات کرشمہ کے دماغ میں نقش کی تھی۔ اس کے مطابق کرشمہ' بیکر کی معمولہ ضرور رہتی لیکن بیکر یا کسی اور کی طرف مائل ہونے کے سلسلے میں اس کا ذہن آزاد رہتا۔

بیکر اور اس کے ساتھیوں کو پورس کے سلسلے میں اتنا معلوم ہوا تھا کہ کرشمہ کے گھر میں شہباز نامی ایک مہمان ہے۔ اس کی ماں اور بھائی اس مہمان کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

بہرحال بیکر مطمئن ہوگیا تھا اور اپنے دوستوں سے رخصت ہو کر ہندوستان پہنچنے والا تھا۔ آندرے سمیت پانچ ٹیلی پیتھی جاننے والوں نے طے کیا تھا کہ وہ بھیما کو ٹارگٹ بنائیں گے۔ اس کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔ اس کے بعد یا تو بھیما کو غلام بنائیں گے یا اسے ختم کردیں گے۔

○☆○

تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ محبت دونوں طرف سے ہوتی ہے۔ ایک طرف سے نہیں ہوتی۔ ایسا نہیں تھا کہ صرف ماریہ اپنی تمناؤں میں زبیری کو یاد کرتی تھی اور اس سے دوبارہ ملنے کے لیے بے چینی سے دن گزار رہی تھی۔

احمد زبیری کو بھی محبت کا روگ لگ گیا تھا۔ اگرچہ وہ چین میں دشمنوں کے درمیان رہتا تھا۔ چین کے انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ میں اعزازی افسر تھا۔ غیر ملکی سیکرٹ ایجنٹس' سراغ رساں اور ٹیلی پیتھی جاننے والے دشمنوں سے نمٹتا رہتا تھا۔ ایسے فرائض ادا کرنے کے لیے ہمیشہ حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے۔ محبت کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ خوابوں اور خیالوں میں محبوبہ کو دیکھو تو دشمن سر پر پہنچ جاتے ہیں۔

مگر جب دل کسی پر آجاتا ہے تو پھر سوتے جاگتے اس کی طرف دھیان جاتا رہتا ہے۔ زبیری اپنے فرائض اور ذمے داریوں کو حاضر دماغی سے ادا کیا کرتا تھا۔ صرف کھاتے وقت اور سوتے وقت ساری دنیا کو بھول کر ماریہ کی یادوں سے بہلنے لگتا تھا۔ خیال خوانی کے ذریعے اس کے دماغ میں پہنچ جایا کرتا تھا۔

اس نے اب تک ماریہ کو اپنی خیال خوانی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ وہ اس کی بے خبری اور لاعلمی میں اس کے احساسات اور جذبات کو پڑھتا تھا اور خوش ہوتا تھا کہ ماریہ اس سے ہزاروں میل دور جاکر بھی اسے دل و جان سے چاہتی ہے اور دن رات اسے یاد کرتی رہتی ہے۔

اس نے زبیری سے وعدہ کیا تھا کہ وہ چین اور مسلمانوں کے خلاف جاسوسی نہیں کرے گی اور اب وعدے کے مطابق وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ملازمت سے استعفیٰ دے چکی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ شیوانی نے اسے تنویمی عمل کی زنجیروں میں جکڑ لیا تھا۔ اسے اپنی معمولہ بنا کر اس کا چہرہ اور حلیہ بدل کر اپنے ساتھ چین لے جارہی تھی۔

شیوانی اپنا مشن پورا کرنے کے لیے بڑی کامیابی سے چالیں چلتی آرہی تھی۔ اس نے جے کافو اور جے فلو کو اپنا معمول بنا کر ٹیلی پیتھی کی قوت حاصل کرلی تھی۔ وہ خود غیر معمولی قوتوں کی حامل تھی پھر اس نے ماریہ کو اس لیے اپنا مہرہ بنایا تھا کہ چین پہنچ کر بابا صاحب کے ادارے کے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو تلاش کرنے میں وقت ضائع نہیں ہوگا۔ ماریہ پہنچتے ہی کرشمہ کو پہچان لے گی۔

ماریہ پر ہپناٹزم کے ذریعے یہ باتیں نقش کی گئی تھیں کہ وہ احمد زبیری کی محبت سے مجبور ہو کر بھیس بدل کر چین جارہی ہے۔ اسے خوش خبری سنائی گئی کہ اس نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ وہاں لندن میں اس کا انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے بھیس بدل کر آئی ہے۔

وہ لندن کے ایک مشہور اخبار کی رپورٹر اور صحافی کی حیثیت سے ایک طیارے میں سفر کررہی تھی۔ اس کے ذہن سے یہ فراموش کرادیا گیا تھا کہ اس پر تنویمی عمل کیا گیا ہے۔

اس عمل کے مطابق وہ تنہا سفر کررہی ہے جبکہ اس طیارے میں شیوانی' جے کانو' جے فلو اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے دو سراغرساں بھی سفر کررہے تھے۔ ماریہ ان سب کو بھول چکی تھی۔

شیوانی کی کامیابیوں میں کچھ ناکامیاں بھی چھپی ہوئی تھیں' جن سے وہ بے خبر تھی۔ مثلاً یہ کہ آندرے اور سائن اس کے دو سراغ رسانوں کے دماغوں میں جگہ بنا چکے تھے۔ دوسری بات یہ کہ جے سامو بھی اپنے دو ساتھیوں کے دماغوں میں با آسانی پہنچ سکتا تھا اور جب ماریہ کو ہپناٹائز کیا جارہا تھا۔ تب بھی جے سامو' ماریہ کے دماغ میں موجود تھا۔

اور یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ زبیری اپنی ماریہ کے دماغ میں خاموشی سے پہنچتا رہتا ہے۔ ایک بار جب وہ ماریہ کے اندر پہنچا تو پتا چلا اسے ہپناٹائز کیا جارہا ہے۔ وہ چپ چاپ ہپناٹائز کرنے والے کی باتیں سنتا رہا اور معلوم کرتا رہا کہ اسے شیوانی نام کی کسی عورت کی معمولہ بنایا جارہا ہے۔

پھر زبیری نے یہ بھی معلوم کیا کہ ماریہ کے ذریعے اس کے محبوب تک اور بابا صاحب کے ادارے کے دوسرے افراد تک پہنچنے کے لیے ماریہ کا چہرہ اور حلیہ بدلا جائے گا۔ یوں شیوانی کا یہ مقصد معلوم ہوگیا کہ وہ نژادِ نر مرمشین وہاں تیار نہیں ہونے دے گی۔

دیکھا جائے تو موجودہ حالات میں شیوانی سب سے زیادہ خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ ایک طرف آندرے اور سائن دوست بن کر اس سے دشمنی کررہے تھے۔ اس انتظار میں تھے کہ وہ چین میں جیسے ہی نژادِ نر مرمشین کا نقشہ حاصل کرے گی' وہ نقشہ اس سے چھین لیا جائے گا۔ ورنہ شیوانی وہ نقشہ لے جاکر اسکاٹ لینڈ یارڈ میں وہ مشین تیار کرسکتی تھی۔ آندرے اور سائن اسے یہ موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔

دوسری طرف جے سامو' شیوانی کی ٹیم میں سرنگ بنا کر جے کانو' جے فلو اور ماریہ کے دماغوں میں پہنچا ہوا تھا۔ وہ اپنے دونوں دوستوں کو شیوانی سے نجات دلانے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کررہا تھا۔

تیسری طرف احمد زبیری اچھی طرح شیوانی کے گیم کو سمجھ گیا تھا اور اب شیوانی کی توقع کے خلاف ایک نیا گیم کھیلنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے شیوانی کے بارے میں مجھے رپورٹ دی۔ میں اور علی چینی ماہرین کے ساتھ مشین تیار کرنے کے ابتدائی مراحل میں مصروف تھے۔ اس ماسٹر کوڈ فلم سے نقشے کو انلارج کرکے پرنٹ کیا گیا تھا پھر وہ ماسٹر کوڈ فلم فوج کے ایک اعلیٰ افسر کے حوالے کردی گئی تھی۔ وہ افسر یوگا کا ماہر تھا پھر ولیر آفریدی کو ہم نے ہدایت کی تھی کہ وہ آرمی ہیڈ کوارٹر میں رہ کر اس افسر پر کڑی نظر رکھا کرے۔

جناب عبداللہ واسطی نے ولیر آفریدی کو اپنے بنگلے میں بلایا تھا۔ اسے ایک دن اور ایک رات تک اپنے ساتھ عبادت کرنے کی ہدایت کی تھی پھر اس پر کچھ روحانی عمل کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں اس کا دماغ لاک ہوگیا تھا۔ اور اس کی چھٹی حس غیر معمولی طور پر تیز ہوگئی تھی۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ نژادِ نر مرمشین تیار ہوگی تو اسے ٹیلی پیتھی کا علم سکھایا جائے گا۔

انہوں نے خیال خوانی کے ذریعے مخاطب کرتے ہوئے کہا "فرہاد! نژادِ نر مرمشین کے سلسلے میں جو حالات اور واقعات پیش آرہے ہوں یا آنے والے ہوں' ان کی اطلاع مجھے دیا کرو۔"

میں نے کہا "میں آپ کو اطلاع دیتا رہتا ہوں اور آپ کے مشوروں پر عمل بھی کرتا ہوں۔ کیا مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے؟"

"تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ سے ایک ٹیم آرہی ہے۔"

"جناب! آنے والی ہے۔ میں اس کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنے والا تھا۔ ویسے آپ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ بھلا آپ سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔"

"جو بات ہمیں معلوم ہوتی ہے۔ اسے ہم ظاہر نہیں کرتے۔ تم اپنی زبان سے ظاہر کرو۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ سے آنے والی ٹیم کے بارے میں بتاؤ۔"

میں انہیں بتانے لگا۔ انہوں نے سننے کے بعد کہا "اس ٹیم کی لیڈر شیوانی بھاسکر ہے۔ احمد زبیری سے کہو' اسے یہاں آنے سے روکے اور تم یہاں کی وزارت داخلہ سے کہو' شیوانی یہاں آئے تو اسے رہنا چاہئے اور نہ ہی اس پر کسی طرح کا شبہ کیا جائے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "جناب! آپ کی ہدایات سمجھ میں نہیں آئیں۔ آپ احمد زبیری کے ذریعے شیوانی کو روکنا بھی چاہتے ہیں اور یہاں اس کے لیے امیگریشن کا مرحلہ آسان کررہے ہیں۔"

انہوں نے جواب دیا "ہوسکتا ہے کہ زبیری اسے یہاں آنے سے پہلے ہی روک دے۔ اگر وہ نہ روک سکا تو پھر ہمیں اسے یہاں رہنے سے نہیں روکنا چاہیے۔ وہ اپنے مشن کے مطابق یہاں ہمارے خلاف کارروائیاں کرے گی۔ تم بھی جواباً بہت کچھ کرو گے۔ اسے روکنا اور ناکام بنانا ہمارا فرض ہے لیکن ہمارے ادارے کے تمام افراد سے کہہ دو کہ وہ کسی بھی مرحلے میں شیوانی کو جانی نقصان نہ پہنچائیں۔ ہزار دشمنی کے باوجود اسے زندہ سلامت رکھا جائے گا۔"

انہوں نے ہدایات دیں' میں نے انہیں علی تیمور' ولیر آفریدی' احمد زبیری اور اپنے تمام سراغ رسانوں تک پہنچا دیا۔ جناب عبداللہ واسطی سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ شیوانی کو زندہ سلامت کیوں رکھنا چاہتے ہیں جبکہ وہ صرف ہم سے ہی ہمیں چین سے بھی دشمنی کرنے آرہی تھی۔

جناب علی اسد اللہ تمیرزی اور جناب عبداللہ واسطی جیسے بزرگانِ دین جب ایسی کوئی نہ سمجھ میں آنے والی ہدایات دیتے ہیں تو ان ہدایات کے پیچھے کوئی گہرا راز چھپا ہوتا ہے۔

بہت عرصہ پہلے جب الپا ماں بننے والی تھی اور دشمن ٹیلی پیتھی جاننے والے اس کی زچگی کے وقت اس کی دماغی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اسے اپنی معمولہ بنانا چاہتے تھے۔ ایسے وقت جناب علی اسد اللہ تمیرزی اس کے کمال بن گئے تھے۔ اس کے دماغ کو لاک کرکے اسے دشمن سے محفوظ رکھا تھا۔ اس وقت جناب تمیرزی کا یہ عمل کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اب انکشاف ہوا کہ الپا نے جس بیٹی کو جنم دیا ہے' اس کا نام پارس ہے۔ اسی لیے الپا جیسی دشمن عورت کو دشمنوں سے بچایا گیا تھا۔

اب جناب عبداللہ واسطی کی ہدایت تھی کہ شیوانی بھی دشمن عورت کو جانی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اسے ہر حال میں زندہ سلامت رکھا جائے۔ آئندہ کبھی انکشاف ہونے والا تھا کہ اس ہدایت کے پیچھے کون سا راز پوشیدہ رہا ہے۔

میں نے احمد زبیری کو ان کی ہدایات سنائیں۔ اس نے کہا "سر! اگر کبھی شیوانی ہم میں سے کسی پر قاتلانہ حملے کرے گی تو کیا ہم جواباً اس پر گولی نہیں چلائیں گے؟ کیا ایسے وقت بھی اسے چھوٹ دی جائے گی؟"

میں نے کہا "اس کیس کو ہاتھ میں لینے سے پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ جناب عبداللہ واسطی کی ہدایات ہیں۔ ہمیں شیوانی کے سلسلے میں جارحیت سے باز رہ کر ہمہ وقت اپنے دفاع کا خیال رکھنا ہوگا۔ اسے کسی بھی طرح یہاں آنے سے روکو۔ اگر یہاں آجائے تو کبھی اس کے روبرو نہ جاؤ اور اگر جاؤ تو پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ جاؤ۔"

زبیری نے کہا "سر! میں سمجھ گیا' مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں ہدایات کے مطابق عمل کروں گا۔"

زبیری نے فیصلہ کیا کہ وہ چین پہنچنے سے پہلے ہی شیوانی کو روکنے کی کوشش کرے گا۔ اگر وہ یہاں آگئی تو بھی نہ کبھی اس سے سامنا ہوگا اور ایسے وقت دونوں طرف سے حملے کیے جائیں گے۔ ان حملوں سے بچنے کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ شیوانی کو سفر کے دوران ہی راستے میں روک دیا جائے۔

اس نے اپنے دو ماتحت سراغ رسانوں سے کہا "میں تم دونوں کو ماریہ کے دماغ میں پہنچا رہا ہوں۔ اس طیارے میں شیوانی اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ سفر کررہی ہے۔ ان چاروں کے دماغ یقیناً لاکڈ ہوں گے۔ میں ان کے دماغوں میں پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ تم دونوں جہاز کے پائلٹ اور کو پائلٹ کے دماغوں میں جاؤ گے۔ وہ دونوں جس ملک کے بھی کنٹرول ٹاور سے رابطہ کریں۔ تم کنٹرول ٹاور کے ان بولنے والے افسران کے دماغوں میں پہنچ جایا کرو۔"

وہ طیارہ براہِ راست چین نہیں جارہا تھا۔ وہ لندن سے انقرہ' پھر دبلی' پھر بنکاک اور پھر ہانگ کانگ جانے والا تھا۔ شیوانی ہانگ کانگ سے دوسرے طیارے میں بیجنگ جانے والی تھی۔ یہ ایک بہت ہی طویل اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ پینے والوں کے لیے سفر کی طوالت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ مزے لے لے کر خوب پیتے تھے پھر مدہوش ہوکر سو جاتے تھے۔ بیدار ہونے پر پتا چلتا تھا کہ وہ ہزاروں کلو میٹر کا فاصلہ طے کرچکے ہیں۔

شیوانی' جے کانو' جے فلو اور دونوں سراغ رساں نہیں پیتے تھے۔ نارمل رہنے اور دشمن ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو اپنے دماغوں سے بھگانے کے لیے یوگا کی مہارت اور سانسوں کی بحالی لازمی تھی۔ اس کے باوجود جے سامو' آندرے اور سائن ان کے دماغوں میں پہنچے ہوئے تھے۔

جب ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا کسی یوگا کے ماہر کے دماغ میں کسی طرح پہنچ جائے تو وہ یوگا جاننے والا ایسے وقت دوسرے خیال خوانی کرنے والے کو محسوس نہیں کرتا۔ جے سامو بڑی خاموشی سے جے کانو کے اندر پہنچا ہوا تھا۔ اس کی اور شیوانی کی باتیں سن رہا تھا۔ ایسے وقت زبیری کسی نہ کسی کے دماغ میں پہنچنے کی کوششیں کررہا تھا۔ پہلے اس نے جے فلو کے اندر پہنچنا چاہا۔ اس نے سانس روک لی پھر وہ جے کانو کے دماغ میں آیا تو اس نے زبیری کو محسوس نہیں کیا کیونکہ اس کے اندر پہلے سے جے سامو موجود تھا۔

شیوانی کہہ رہی تھی "کانو! کیا تم ماریہ کے دماغ میں جاتے رہتے ہو؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے گیا تھا۔ یہ ماریہ بہت جذباتی لڑکی ہے۔ ہمیشہ زبیری کے بارے میں سوچتی رہتی ہے؟ ایسا لگتا ہے' اس کی زندگی میں سوچنے کے لیے اور کچھ نہیں ہے۔ صرف زبیری ہی تمام سوچوں کا مرکز ہے۔"

شیوانی نے کہا "وہ دیوانی ہے۔ عورت جب مرد کے پیار میں پاگل ہوتی ہے تو مرد اسے اپنے پیروں کی جوتی بنالیتا ہے۔ سمجھ دار عورت وہ ہے جو مردوں کا اپنا غلام اور دیوانہ بنا کر رکھتی ہے۔"

"میڈم! اس دیوانی ماریہ کے خیالات پڑھنے سے کچھ

حاصل نہیں ہوگا۔ وہ کام کی کوئی بات نہیں سوچ رہی ہے۔ چین میں اس نے زبیری سے صرف دو یا تین ملاقاتیں کی تھیں۔ ان مختصر ملاقاتوں میں وہ یہ بھی معلوم نہ کر سکی کہ زبیری ٹیلی پیتھی جانتا ہے یا نہیں؟"

"وہ تین مختصر ملاقاتوں میں اس کی دیوانی کیسی ہو گئی؟"

"یہ قدرتی معاملات ہیں۔ کوئی ایسا ہوتا ہے کہ پہلی ہی نظر میں دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ ویسے احمد زبیری نے وہاں اسے سزائے موت سے بچایا تھا۔ وہ اس کا یہ احسان بھی مانتی ہے۔ فیصلہ کر چکی ہے کہ یہ نئی زندگی اسی نے دی ہے' اسی کے ساتھ گزارے گی۔"

وہ بولی "چین پہنچ کر زندہ رہے گی تو اپنے یار کے ساتھ نئی زندگی گزارے گی۔"

احمد زبیری سوچنے لگا' شیوانی اپنا کام نکالتے ہی ماریہ کو مار ڈالے گی۔ ایسی ظالم عورت کو زندہ سلامت رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ کوئی بات نہیں اس کے ساتھیوں کو ختم کرنے سے منع نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی ٹیم کے افراد کو دماغی اور جسمانی نقصان پہنچایا جائے گا تو شیوانی کی کمر ٹوٹ جائے۔ وہ تنہا چین کا رخ نہیں کرے گی۔"

پھر وہ سوچنے لگا' شیوانی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ماریہ کی حفاظت کرنی ہوگی۔ اسے اس طیارے سے نکال کر شیوانی سے دور کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی اس کی سازش کے خلاف بہت کچھ کیا جا سکے گا۔

طیارہ دہلی پہنچ رہا تھا۔ وہ پائلٹ کے دماغ میں پہنچ گیا۔ دہلی ائرپورٹ کے کنٹرول ٹاور سے پائلٹ کو مخاطب کیا جا رہا تھا۔ اسے کسی رن وے پر اترنے کے سلسلے میں گائیڈ کیا جا رہا تھا۔ ایسے وقت پائلٹ نے زبیری کی مرضی کے مطابق کہا۔ "میں مسافروں کے ساتھ بخیریت لینڈ کروں گا لیکن پرواز کے دوران میں نے دشواری محسوس کی ہے۔ طیارے میں ٹیکنیکل فالٹ ہے۔ ماہرین سے کہا جائے کہ طیارے کو مکمل طور پر چیک کریں۔ خرابی دور کریں۔ میں اور میرا عملہ جب تک مطمئن نہیں ہوگا۔ تب تک ہم آگے پرواز نہیں کریں گے۔"

زبیری نے اپنے دونوں سراغ رسانوں سے کہا "تم میں سے ایک پائلٹ کے اندر مسلسل رہے گا اور اس کے ذریعے ماہرین طیارے کو چیک کرنے آئیں گے تو پھر تم دونوں ان کے دماغوں میں رہ کر طیارے میں عارضی خرابی پیدا کرو گے۔ تاکہ یہ چار چھ گھنٹے تک آگے پرواز نہ کر سکے۔"

زبیری پہلے کی طرح چپ چاپ ماریہ کے دماغ میں آگیا۔ وہ طیارہ اندرا گاندھی ائرپورٹ پر اتر گیا۔ اعلان ہونے لگا کہ ناگزیر وجوہات کی بنا پر طیارے کی اگلی پرواز دو گھنٹے کے لیے منسوخ کی جاتی ہے۔ مسافروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ائرپورٹ کے لاؤنج میں تشریف لے جائیں وہاں ان کے آرام اور ریفریشمنٹ کے انتظامات کیے گئے ہیں۔

تمام مسافر اپنا دستی سامان لے کر جہاز سے اترنے لگے۔ ماریہ بھی ان کے ساتھ ائرپورٹ کی عمارت کے اندر جانے لگی۔ شیوانی نے اپنے چاروں ساتھیوں سے کہا "ماریہ پر نظر رکھو۔ اس پر مجھے بھروسا نہیں ہے۔"

جے کا فو نے کہا "تمہیں ہپناٹزم پر بھروسا کرنا چاہیے۔"

وہ بولی "تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ دس بارہ گھنٹوں کے بعد تنویمی عمل کا اثر کم ہونے لگتا ہے۔ اور ماریہ کو ہپناٹائز کیے ہوئے پندرہ گھنٹے گزر چکے ہیں۔"

"میں مانتا ہوں۔ اتنا وقت گزرنے کے بعد اثر کم ہو رہا ہوگا مگر اثر ختم نہیں ہوگا۔ میں تمہارے اطمینان کے لیے اسے لاؤنج میں سلا کر اس پر دوبارہ عمل کروں گا۔"

جہاز کے تمام مسافروں کو لاؤنج تک محدود رہنے کا حکم تھا۔ لاؤنج سے باہر جانے والے دروازے پر مسلح پولیس افسر اور سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ زبیری نے ایک سراغ رساں سے کہا "ماریہ کے دماغ میں رہ کر اسے لاؤنج سے باہر لے چلو۔ ماریہ افسر سے بات کرے گی۔ میں اس افسر کو آلہ کار بنالوں گا۔"

اس سراغ رساں نے ماریہ کے دماغ پر قبضہ جما لیا۔ وہ لاؤنج میں پہنچتے ہی تیزی سے چلتی ہوئی باہر جانے والے دروازے پر گئی پھر پولیس افسر سے بولی "میں آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

افسر اسے دروازے کے باہر ایک طرف لے جا کر بولا "فرمائیے' آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

زبیری افسر کی یہ بات سنتے ہی اس کے دماغ میں پہنچ گیا پھر افسر کی زبان سے بولا "ماریہ! تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ساتھ چلی آؤ۔ کم آن۔"

اس نے ماتحت افسر سے کہا "تم یہاں ڈیوٹی سنبھالو۔ میں ابھی آرہا ہوں۔"

وہ شیوانی کو ساتھ لے کر وہاں سے جانے لگا۔ ائرپورٹ کے مختلف حصوں سے گزرتے وقت کسی نے اسے نہیں روکا کیونکہ وہ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ جا رہی تھی۔

اس افسر نے ائرپورٹ کی عمارت کے باہر آکر ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "سردار جی! یہ کڑی پہلی بار یہاں آئی ہے۔ جہاں جانا چاہتی ہے' اسے لے جاؤ۔"

ماریہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ٹیکسی وہاں سے چل پڑی۔ زبیری اس افسر کو واپس اس کی ڈیوٹی کی جگہ لے جانے لگا۔

لاؤنج میں تقریباً دو سو مسافر تھے۔ اس بھیڑ میں شیوانی نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا "کانو! ماریہ کہاں ہے؟ کہیں نظر نہیں آرہی ہے۔ اسے ڈھونڈو۔"

وہ سب لاؤنج میں دور دور تک نظریں دوڑانے لگے۔ جے کانو نے کہا "میں اس کے خیالات پڑھ رہا ہوں۔ وہ ایک ٹیکسی میں کہیں جارہی ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" شیوانی نے پریشان ہو کر پوچھا "وہ یہاں سے باہر کیسے گئی؟"

جے فلو نے کہا "کوئی ماریہ کے دماغ میں ہے۔ میں نے جیسے ہی اسے مخاطب کیا۔ اس نے سانس روک لی۔ جبکہ ہمارے لیے اسی کے دماغ کا دروازہ کھلا ہے۔"

جے کانو نے کہا "میں جاکر اسے کنٹرول کروں گا اور واپس لاؤں گا۔"

شیوانی دروازے پر آکر بولی "آفیسر! ہماری ایک ساتھی دروازے سے باہر گئی ہے۔ تم نے اسے جانے کیسے دیا؟"

زبیری اس افسر کے دماغ کو آزاد چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس افسر نے کہا "میں نہیں جانتا' یہاں سے کوئی باہر گئی ہے یا نہیں؟ مگر میرا ماتحت کہہ رہا ہے کہ میں کسی عورت کو یہاں سے باہر لے گیا تھا پھر تنہا واپس آیا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں کسی کو لے جاؤں اور مجھے معلوم نہ ہو؟ نہیں میں نہیں مانتا۔"

شیوانی نے پوچھا "کیسے نہیں مانو گے؟ میں کہہ رہی ہوں کہ میری ساتھی یہاں سے گئی ہے۔ تمہارے یہ ماتحت بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ مجھے بھی باہر جانے دو۔ میں اسے تلاش کروں گی۔"

اسے جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس طرح بات بڑھنے لگی۔ پولیس اور کسٹمز کے اعلیٰ افسران وہاں آگئے۔ جو افسر ماریہ کو باہر لے گیا تھا' اس کا محاسبہ کیا جانے لگا۔

اس کا محاسبہ کرنے سے شیوانی کا بھلا نہیں ہو سکتا تھا۔ جے کانو نے کہا "میں ماریہ کے اندر گیا تھا مگر کسی نے سختی سے اس پر قبضہ جما رکھا ہے۔ مجھے پہلی بار اس کے دماغ میں جگہ ملی پھر دوسری بار گیا تو اس نے مجھے محسوس کرتے ہی سانس روک لی۔ معلوم ہوتا ہے۔ میرے تنویمی عمل کا اثر ختم ہو چکا ہے۔"

شیوانی نے افسران سے کہا "اپنے افسر کا محاسبہ بعد میں کریں۔ پہلے ہماری ساتھی مس روزی کو تلاش کریں۔ ماریہ کا چہرہ بدلنے کے بعد نام بھی بدل دیا گیا تھا۔ اس کا نیا نام روزی رکھا گیا تھا۔ ایک اعلیٰ افسر نے کہا "آپ اطمینان رکھیں۔ اس شہر کی تمام پولیس کو الرٹ کیا جارہا ہے۔ مس روزی کو جلد ہی یہاں واپس لایا جائے گا۔"

شیوانی نے اپنے چاروں ساتھیوں سے کہا "بابا صاحب کے ادارے والوں کو میرے مشن کا علم ہو گیا ہے۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ احمد زبیری میری گرفت سے ماریہ کو نکال لے جارہا ہے۔"

جے فلو نے کہا "تم درست کہہ رہی ہو۔ زبیری یہ نہیں چاہے گا کہ ہم ماریہ کے ذریعے اسے اور بابا صاحب کے ادارے کے دوسرے لوگوں کو پہچان لیں۔"

ماریہ کے فرار ہونے سے وہاں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ جے سامو یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا "شاید میں اپنے ساتھیوں کو شیوانی سے نجات نہ دلا سکوں۔ مگر کسی نے ایسے وقت مسئلے پر مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ میں اس نے جے کانو سے کہا "میں تمہارے اندر جے سامو بول رہا ہوں۔ کیا تم شیوانی کے شکنجے سے نکلنا نہیں چاہو گے؟"

وہ بولا "سامو! میں شیوانی کے شکنجے میں نہیں ہوں۔ اس کا دوست ہوں تم سے کہا تھا کہ تم بھی شیوانی سے دوستی کرو۔ ہم ایک نئی مضبوط ٹیم بنائیں گے۔"

"میرے دوست! میں تمہاری بات سن رہا ہوں کہ تم ایک معمول کی زبان سے بول رہے ہو۔ تم نے ہمیں عہد کیا تھا کہ اپنی سلامتی اور سکون کی خاطر بھی فراد فورس کی فیملی کے افراد سے نہیں ٹکرائیں گے لیکن تم اور جے فلو اس کے معمول بن کر فرہاد اور بابا صاحب کے ادارے والوں سے خوامخواہ دشمنی مول لے رہے ہو۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ تمہاری وجہ سے امریکا میں جیتی ہوئی بازی ہار گئے۔ وہاں انٹیلی جنس سے اور ٹرانسفارمر مشین سے محروم ہو گئے۔ اس ہاری ہوئی بازی کو پھر سے جیتنے کے لیے ہمیں شیوانی کی ضرورت ہے۔ تم بھی اس سے دوستی کرو۔"

جے سامو نے کہا "میں سمجھ گیا۔ میں تمہیں سمجھاتا رہوں گا۔ تم مجھے سمجھاتے رہو گے۔ اب میں وہ کر رہا ہوں' جو کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

یہ کہتے ہی اس نے اچانک ہی اس کے دماغ میں زلزلہ پیدا کیا۔ وہ ایک دم سے چیخ مارتا ہوا اپنی جگہ سے اچھل کر فرش پر گر پڑا پھر کراہتے ہوئے تکلیف کی شدت سے تڑپنے لگا۔ شیوانی اور اس کے ساتھیوں کے علاوہ وہاں کے تمام لوگ اس کے قریب آنے لگے۔ شیوانی نے جے فلو کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا "زبیری میری ایک ایک طاقت کو توڑ رہا ہے۔ کانو کے اندر جاکر اسے سنبھالو۔ زبیری سے کہو' وہ مجھ سے باتیں کرے۔"

جے فلو خیال خوانی کے ذریعے جے کانو کے دماغ میں آکر بولا "یار! یہ تم پر کیسا عذاب نازل ہو رہا ہے۔ میں زبیری سے کہتا ہوں کہ ابھی ہم سے دشمنی نہ کرے۔ پہلے شیوانی سے باتیں کرے۔"

جے سامو نے اس کے دماغ میں بھی پہنچ کر زلزلہ پیدا کیا۔ وہ بھی چیخ مار کر جے کانو کے قریب فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ جے سامو نے کہا "میرے جان سے پیارے دوستو! مجھے معاف کرنا۔ تم دونوں کو تنویمی عمل سے نجات دلانے کا یہی ایک راستہ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے کس حد تک کامیابی ہوگی۔ لیکن میری ان حرکتوں سے تم دونوں اب تنویمی عمل سے رہائی پا چکے ہو۔"

جے کانو کی دماغی تکلیف کچھ کم ہو رہی تھی۔ وہ بولا "تم نے مجھ پر ظلم کیا مگر اچھا کیا۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں شیوانی کا معمول بنا ہوا تھا۔"

پولیس والے یہ پوچھ رہے تھے کہ دو آدمیوں پر ایک جیسا دورہ کیسی پڑا ہے۔ وہ دونوں مکاری کر رہے ہیں۔ ان کے لیے دو اسٹریچر لائے گئے پھر انہیں طبی معائنے کے لیے ایک قریبی اسپتال لے جانے لگے۔ شیوانی نے اعلیٰ افسران سے کہا "میں اپنی اصل شناخت پیش کرنا نہیں چاہتی تھی مگر اب مجبوری ہے۔ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ اسپتال جانے کے لیے یہ خفیہ کارڈ دکھا رہی ہوں۔"

اس نے اسکاٹ لینڈ یارڈ لینڈ کا خفیہ شناختی کارڈ دکھایا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ ایک مشہور زمانہ ادارے کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل ہے تو انہوں نے گرم جوشی سے اس کا مصافحہ کیا۔ باقی دو سراغ رسانوں نے بھی اپنے خصوصی کارڈ دکھائے۔ ان سب کو اسپتال جانے اور ماریہ کو تلاش کرنے کی خصوصی اجازت دے دی گئی۔ اس سلسلے میں ان کے لیے سہولتیں بھی فراہم کی جانے لگیں۔

جے کانو اور جے فلو کو اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ جے سامو ان دونوں کے اندر جاکر سمجھا رہا تھا "تم تنویمی عمل کے اثر سے نکل گئے ہو۔ اب شیوانی کے معمول نہیں رہے ہو لیکن دماغی توانائی حاصل ہونے تک معمول بن کر رہو۔ تم دونوں کو بھی ماریہ کی طرح شیوانی سے دور جانا ہے۔"

شیوانی نے اپنے دونوں سراغ رسانوں کے ساتھ اسپتال آکر ان کی خیریت پوچھی پھر کہا "دماغی توانائی حاصل ہونے تک یہاں آرام کرو۔ میں ماریہ کو تلاش کرنے جارہی ہوں۔"

جے کانو نے کہا "تم جاؤ۔ ہم تمہاری واپسی تک یہاں رہیں گے۔"

وہ بولی "جیسے ہی دماغی توانائی حاصل ہو۔ فوراً خیال خوانی کرو۔ اور ماریہ کے دماغ میں پہنچتے رہنے کی کوششیں کرتے رہو۔"

ماریہ کو تلاش کرنے کے لیے بھارتی پولیس کے افسران اور سپاہی شیوانی کی بھرپور مدد کر رہے تھے۔ شیوانی نے انہیں بتایا کہ وہ ایک بین الاقوامی مشن پر ہانگ کانگ جارہی ہے۔ چند دشمن ٹیلی پیتھی جاننے والے اس مشن کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے ان کی ایک جاسوسہ روزی کو اغوا کیا ہے۔

وہ ان کے سامنے اپنے مشن کے سلسلے میں باتیں بنا رہی تھی۔ پورے شہر میں ماریہ کو تلاش کر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت جے کانو اور جے فلو اس اسپتال سے فرار ہو گئے۔

○☆○

پورس نے سمجھ لیا کہ کرشمہ کے گھر سے اس کا دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔ اگر وہ اس گھر سے نہیں جائے گا تو جانے انجانے دشمن اس دنیا سے اس کا دانہ پانی اٹھا دیں گے۔ ایک تو جنا کھل کر دشمنی کر رہی تھی۔ جلد ہی اس پر کوئی بھیانک کالا جادو کرنے والی تھی۔ دوسری طرف بھیما سے دوستی کی توقع نہیں تھی۔

وہ جسونت کے جسم میں ابھی مصلحتاً خاموش تھا کیونکہ جسونت جسمانی اور دماغی طور پر کمزور تھا۔ اس کے اندر رہ کر وہ خیال خوانی نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے وہ دشمن تھا۔ کسی وقت بھی دشمنی کر سکتا تھا۔

تیسری طرف بیکر برائٹ نے کرشمہ کو اپنی معمولہ بنا لیا تھا۔ پورس ابھی نہیں جانتا تھا کہ کرشمہ کو معمولہ بنانے والا کون ہے۔ بس اتنا ہی سمجھ لینا کافی تھا کہ وہ دوست نہیں ہوگا۔ دشمن ہی ہوگا۔

پورس آئندہ کرشمہ کے دماغ میں رہ کر بیکر کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ لہٰذا وہ صبح ہونے سے پہلے ہی کرشمہ کی کوٹھی چھوڑ کر چلا آیا۔ وہ گوا میں تھا۔ ایک رکشا میں بیٹھ کر منڈواندی کے ساحل تک آیا۔ پھر ایک فیری بوٹ کے ذریعے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ دوسری طرف گوا کا ایک قصبہ ماپوسا تھا۔ اس نے سوچا' ماپوسا کے کسی ہوٹل یا کاٹیج میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ وہ وہاں کے ساحلی علاقے انجونا کے ایک کاٹیج میں آگیا۔

جب وہاں پہنچا تو صبح ہو رہی تھی اور صبح ہوتے ہی سمندر کا ساحل رنگین اور سنگین ہو گیا تھا۔ دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک بے شمار ساحلی علاقے ہیں۔ ان میں چند ایسے علاقے ہیں' جہاں عورتیں اور مرد بالکل بے لباس ہو کر سمندر کی لہروں سے کھیلتے' ہنستے بولتے

اور مستیاں کرتے ہوئے نہاتے رہتے ہیں۔ جنہوں نے ایسے ساحل سمندر نہیں دیکھے' ان کے لیے یہ عجیب سی ناقابلِ قبول بات ہوگی کہ ایک انسان ابنارمل ہو کر تو ننگا ہو سکتا ہے۔ سب کے سب کسی ساحل وغیرہ پر ننگا نہیں ہو سکتا مگر یہ حقیقت ہے۔ دنیا کے ایسے چند ساحلوں پر قانون اور تہذیب کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے بھارت کے ایک ساحل کا نام انجونا ہے۔

پورس نے ساحل کے ایک ویران حصے میں آ کر اپنے بیگ سے آئینہ اور ریڈی میڈ میک اپ کا سامان نکال کر اپنے چہرے کو تبدیل کیا پھر وہاں سے آبادی کی طرف آیا۔ وہاں ایک یا دو کمروں کے خوب صورت اور آرام دہ کاٹیج کرائے پر ملتے ہیں۔ ہر کاٹیج سے سمندر کی رنگینیوں کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ کاٹیج کے ساتھ دوربین بھی کرائے پر ملتی ہے۔ جو سمندر تک جانا نہیں چاہتے' وہ کاٹیج کے سائے میں آرام سے بیٹھ کر دوربین کے ذریعے عریاں حسینوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔

کاٹیجوں کے سائے میں بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ جوانی گزرنے کے بعد بڑھاپے میں ہوس رہ جاتی ہے۔ اس لیے وہ دور ہی دور سے دوربین کے ذریعے نظارہ کرتے اور سرد آہیں بھرتے رہتے ہیں۔ پورس پچھلی رات سے جاگ رہا تھا۔ اپنے کاٹیج میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کر کے سو گیا۔

کرشمہ سو رہی تھی۔ اس کی ماں جمنا اپنی عادت کے مطابق صبح پانچ بجے بیدار ہو گئی تھی۔ اشنان کرنے کے بعد کالی مائی کی پوجا کرتی رہی تھی۔ جب اچھی طرح دن نکل آیا تو وہ پوجا کے کمرے سے باہر آئی۔ ایک ملازم نے آ کر ہاتھ جوڑ کر کہا "آپ کا مہمان جو انیکسی میں تھا' وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس کا سامان بھی نہیں ہے۔"

جمنا نے سوچا "کرشمہ بے شرم ہو گئی ہے اس مسلمان کو اپنے کمرے میں سلایا ہوگا۔ وہ مجھے جلانے کے لیے ایسا کر رہی ہے۔"

اس نے کرشمہ کے دروازے پر آ کر دستک دی۔ وہ اندر گہری نیند میں تھی۔ جمنا نے دوسری دستک کے بعد دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ اس نے اندر سے چیخ کر پوچھا "یہ کیا بدتمیزی ہے؟ کون میری نیند خراب کر رہا ہے؟"

"میں ہوں تیری ماں! دروازہ کھول اپنے یار کو باہر نکال۔"

کرشمہ نے دروازہ کھول کر پوچھا "کیا بکواس کر رہی ہو؟ کس یار کی بات کر رہی ہو؟ کیا صبح صبح تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

جمنا نے کمرے میں آ کر چاروں طرف دیکھا پھر باتھ روم میں جھانک کر دیکھا۔ اسے پورس نظر نہیں آیا پھر اس نے پوچھا "وہ مسلمان کہاں ہے؟ انیکسی میں اس کا سامان بھی نہیں ہے۔ پانڈے کہہ رہا ہے کہ وہ ہماری کوٹھی کے اندر اور باہر کہیں نہیں ہے۔"

کرشمہ ایک کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگی "وہ شہباز! میں تو سونے کے بعد اسے بھول گئی تھی۔ وہ یہاں مہمان بن کر کیوں آیا تھا؟ میں بھی پاگل ہوں۔ پتا نہیں کل مجھے کیا ہو گیا تھا؟ میں اس کی حمایت کر رہی تھی اور اس کی خاطر اپنی ماں سے جھگڑا کر رہی تھی۔"

وہ پورس کے تنویمی عمل کے اثر سے نکل گئی تھی۔ اس لیے پہلے کی طرح اس سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "ماں! پتا نہیں' مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا ہے' اس نے مجھ پر جادو کیا تھا۔ میں اس کے لیے تم سے جھگڑا کر رہی تھی۔"

جمنا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "بیٹی! تم اپنی غلطی کو سمجھ رہی ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ اب اس مکار کی حمایت نہیں کر رہی ہو۔"

"مگر مجھے کیا ہو گیا تھا؟ کیا سچ مچ اس نے جادو کیا ہوگا؟"

"تم فکر نہ کرو۔ میں اپنے جادو سے اس کی حقیقت معلوم کروں گی۔ مجھے اس کے سر کا بال یا اس کا پہنا ہوا' اتارا ہوا کوئی لباس ملے گا تو ترب ترب کر مر جائے گا۔" آخری سرے پر بھی ہو گا تو ترب ترب کر مر جائے گا۔"

ماں بیٹی وہاں سے چلتی ہوئی کوٹھی کے باہر آ گئیں۔ پھر انیکسی کے اندر آئیں۔ بستر پر شکنیں نہیں تھیں۔ کرشمہ نے کہا "معلوم ہوتا ہے۔ اس نے رات نہیں گزاری ہے۔ آدھی رات سے پہلے ہی چلا گیا ہے۔"

جمنا پہلے آئینے کے پاس جا کر پھر باتھ روم میں جا کر بولی "یہاں کنگھی ہوتی تو اس میں اس کے سر کا ایک آدھ بال لگا ہوتا مگر وہ بہت مکار ہے۔ اپنے ساتھ کنگھی بھی لے گیا۔ اس کی کوئی اترن تو گیا' ایک رومال بھی نہیں ہے۔"

"کیا ان چیزوں کے بغیر اسے سزا نہیں دے سکو گی۔ وہ مجھ پر جادو کر کے مجھے کھلونا بنا کر گیا ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ میں اس کے نام کا ایک پتلا بنا کر اس میں سوئیاں چبھو کر اسے ایسی تکلیف میں مبتلا کرتی رہوں گی کہ وہ موت مانگتا رہے گا۔ مگر اسے تڑپتی ہوئی' سسکتی ہوئی زندگی ملتی رہے گی۔"

وہ دونوں انیکسی سے نکل کر کوٹھی میں جمنا کے پاس آئیں۔ وہ غسل کرنے کے بعد ناشتا کر رہا تھا۔ وہ گہرے زخموں کے باعث دماغی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ پورس کی سوچ کی لہروں کو نہ وہ محسوس کر رہا تھا اور نہ ہی بھیا یہ جانتا تھا کہ مہمان بن کر آنے والا شہباز (پورس) ٹیلی پیتھی جانتا تھا



"ہے بھگوان! میں تو بھول گئی تھی۔ وہ دشمن بن کر مجھ جیسی محبت کرنے والی ماں سے جھگڑا کر رہی تھی۔ میں غصے میں جا کر سو گئی تھی۔ میرا خیال ہے' اس ٹیلی پیتھی جاننے والے نے ابھی اسے کنیز نہیں بنایا ہے۔ ابھی تم نے دیکھا ہے' وہ پہلے جیسی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔"

ہم اس کی صورت دیکھ کر' اس کی باتیں سن کر اتنی جلدی سمجھ نہیں سکتے کہ کسی نے اسے بپنا ٹائز کیا ہے یا نہیں۔ بے شک وہ میری بہن ہے۔ تمہاری بیٹی ہے۔ مگر ہم اس سے محتاط رہیں گے۔ اس پر کڑی نظر رکھیں گے۔"

پورس' کرشمہ کے پاس آیا۔ وہاں بیکر پہنچا ہوا تھا۔ اس سے کہہ رہا تھا "کیا مجھے پہچان رہی ہو؟ مجھے یاد کر رہی ہو؟"

وہ سوچتی ہوئی بولی "ہاں۔ یاد آ رہا ہے۔ میں نے خواب میں تمہیں دیکھا ہے تمہاری صورت یاد نہیں ہے مگر تمہاری آواز' تمہارا لہجہ میرے دل و دماغ میں بسا ہوا ہے۔ میں تمہیں پہچان رہی ہوں۔ تم کہاں ہو؟"

"میں آ رہا ہوں۔ آج شام تک ممبئی پہنچوں گا۔ تمہارا دیس میرے لیے انجانا ہے۔ کیا میری رہنمائی کے لیے آؤ گی؟"

"تم پتا نہیں کہاں سے آ رہے ہو؟ کتنی دور سے آ رہے ہو؟ مگر میرے لیے آ رہے ہو۔ میں ضرور آؤں گی۔ ابھی یہاں سے روانہ ہو رہی ہوں۔"

وہ غسل کرنے کے بعد لباس پہن کر بن سنور رہی تھی۔ ممبئی جانے کے لیے ضروری سامان اپنے سفری بیگ میں رکھ رہی تھی پھر وہ اپنی ماں اور بھائی کے پاس آ کر بولی "میں ممبئی جا رہی ہوں۔ کل تک واپس آؤں گی۔"

جمنا نے پوچھا "یہ اچانک ممبئی کیوں جا رہی ہو؟"

"میرا ایک فرینڈ آ رہا ہے۔ اسے ریسیو کرنا ہے۔"

"کون ہے وہ فرینڈ؟ کہاں سے آ رہا ہے؟"

"اوماں! تم میری پرسنل لائف کے بارے میں اتنے سوالات نہ کرو۔ تمہارے لیے اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ جب میں لندن میں پڑھتی تھی۔ تب وہ میرا کلاس فیلو تھا۔ IS THAT CLEAR?"

جمنا نے کہا "ہم منع کریں گے۔ تم نہیں مانو گی۔ بہتر ہے جاؤ۔ مگر اپنے ساتھ پدمنی کو لے جاؤ۔"

"سوری بھیا! میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔ اتنی چھوٹی بھی نہیں ہوں کہ پدمنی کی انگلی پکڑ کر جاؤں۔ تم دونوں پریشان نہ ہو۔ اس کے بول کر جا رہی ہوں۔"

وہ پلٹ کر چلی گئی۔ جمنا نے پدمنی سے کہا "کچھ سمجھ میں آیا؟ اس کا یہ انداز بتا رہا ہے کہ وہ اجنبی اس کے دماغ میں آ چکا ہے۔"

اور وہ ابھی جمنا کے اندر موجود ہے۔

جمنا کی دماغی کمزوری کے باعث اس کے اندر رہنے والا بھیا خیال خوانی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جمنا کے اندر ہمیشہ رہنے اور آتما شکتی کے لیے تپسیا کرنا چاہتا تھا۔ جمنا اس سلسلے میں اس کی مدد کرنے کو تیار تھی لیکن اس نے سوچا تپسیا کرنے کے دوران میں جمنا پر یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا بیٹا نہیں ہے۔

عمل کرتے اور منتر پڑھتے وقت اسے معلوم ہو سکتا تھا کہ جسم بیٹے کا ہے اور آتما اسی دشمن کی ہے' جو پہلے کلپنا کے اندر سمایا ہوا تھا۔

اس کی عقل نے کہا "جمنا مجھ سے زیادہ جادوئی شکتی رکھے گی تو کسی وقت بھی مجھے نقصان پہنچانے سے باز نہیں آئے گی۔ بہتر یہ ہوگا کہ پہلے جمنا کو کمزور بنا کر اپنی معمولہ بنا لیا جائے۔"

اس نے صبح اٹھتے ہی اپنے فیصلے پر عمل کرنے کا انتظام کیا۔ اب اسے اپنی دماغی توانائی کے بحال ہونے کا انتظار تھا۔

پورس بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ جمنا کالے جادو کی قوتوں سے محروم ہو جائے یا دماغی اور جسمانی کمزوریوں میں مبتلا رہا کرے۔ جب بھیا نے کمزور بنا کر اس پر تنویمی عمل کرنا تو پورس بھی ایسے وقت اس کے اندر رہ کر آئندہ اس کے دماغ میں جانے آنے کا راستہ بنا سکتا تھا۔

جسونت نے جمنا کو دیکھ کر کہا "آؤ ماں! میرے ساتھ ناشتا کرو اور کرشمہ! تمہارا مزاج کیسا ہے؟ کیا اب بھی تم ماں سے جھگڑا کر رہی ہو؟"

وہ بولی "سوری بھیا! اس مکار شہباز نے مجھ پر جادو کیا تھا۔ کل رات ہی کو یہاں سے بھاگ گیا ہے۔"

جمنا نے کہا "مجھے بھی پورا یقین ہے کہ وہ جادو جانتا ہے۔ تم نے خود دیکھا ہے' اس نے کرشمہ کو ہم دونوں کی دشمن بنا دیا تھا۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ ضرور سزا دوں گی۔"

جسونت نے کہا "کرشمہ! تمہاری طرف سے میرا دل صاف ہو گیا ہے۔ آؤ ہمارے ساتھ ناشتا کرو۔"

"میں غسل کرنے جا رہی ہوں۔ بعد میں ناشتا کروں گی۔"

وہ چلی گئی۔ جسونت نے ماں سے پوچھا "کیا تم پچھلی رات جاگ رہی تھیں؟"

"نہیں سو گئی تھی۔ یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا کرشمہ کے دماغ میں آنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جب وہ نیند میں رہے گی تو وہ اسے اپنی کنیز بنا لے گا۔"

"ہاں اور وہ ممبئی آرہا ہے۔ کرشمہ اسے لے کر یہاں آئے گی۔ پہلے اس شہباز کو لائی تھی۔ اب وہ دوسری مصیبت لائے گی۔ میں زخمی ہوں۔ کیا کروں؟"

"بیٹے! یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ میرے جادو سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ تم فکر نہ کرو۔ اسے یہاں آنے دو۔ اس نے میری بیٹی کو معمولہ بنایا ہے میں اسے معمولہ بناؤں گی۔"

پورس، جسونت کے اندر ہنسنے لگا پھر اس کی زبان سے بولا "بڑھیا! میں وہی اجنبی ٹیلی پیتھی جاننے والا ہوں۔ اپنے ہونے والے داماد کو غلام بنانا چاہتی ہے؟ مجھ پر جادو کرنا چاہتی ہے؟ میں نادان نہیں ہوں۔ تیرے سامنے نہیں آؤں گا۔ تیری بیٹی کو بھی تیرے پاس آنے نہیں دوں گا۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

جمنا پریشان ہو کر یہ باتیں سن رہی تھی۔ جسونت نے کہا۔ "ماں! یہ میرے دماغ میں پہنچ گیا ہے۔ مجھے بچاؤ ماں!"

"ہاں میں تمہیں بچاؤں گی۔ اسے تمہارے اندر سے بھگاؤں گی۔"

پورس دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہو گیا۔ وہ ایک کانچ کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ تمام دشمنوں کے خیالوں اور ارادوں کو پڑھنے کے بعد اس نے دماغ کو ضروری ہدایات دی پھر تھوڑی ہی دیر میں گہری نیند سو گیا۔

سونے والوں کو پتا نہیں چلتا کہ کتنا وقت گزرتا جا رہا ہے۔ وہ صبح سات بجے دماغ کو ہدایات دے کر سو گیا تھا کہ دو پہر ایک بجے بیدار ہو جائے گا۔ نیند کے دوران میں کوئی غیر معمولی بات ہو گی یا کسی خطرے کے آثار ہوں گے تو اس کی آنکھ کھل جائے گی۔ ورنہ مقررہ وقت تک سوتا رہے گا۔

مقررہ وقت سے پہلے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دروازے اور کھڑکیوں کو دیکھا۔ وہ سب اندر سے بند تھے۔ گھڑی دیکھی بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ چالیس منٹ پہلے بیدار ہو گیا تھا۔

وہ بستر سے اترا اور دروازے کے پاس آکر، کان لگا کر آہٹ سننے کی کوشش کرنے لگا پھر اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اندر سے بند تھی۔ اس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ پھر بھی باہر دھوپ کی وجہ سے پردے پر ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا، وہاں آیا۔ پردہ ہل رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشے کے پار ایک عورت کی جھلک دکھائی دی پھر پردہ آڑے آگیا۔

اس نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ ایک جوان عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مسکرانے لگی پھر اس نے اپنے شانے سے ساڑی کا آنچل ڈھلکا دیا۔ تاکہ پورس اسے پسند کر سکے۔ اس کے انداز نے سمجھا دیا کہ وہ دھندے کے لیے آئی ہے۔

وہاں بار میں، کلبوں، ریستورانوں، ہوٹلوں اور کاٹیجوں میں ایسی عورتیں گھومتی رہتی اور چارہ ڈالتی رہتی تھیں، جنہیں کوئی پہلے سے ریزرو نہیں کرتا تھا۔ جنہیں امیر کبیر لوگ منہ نہیں لگاتے تھے۔ کیونکہ وہ شراب کی خالی بوتل بن چکی ہوتی ہیں۔ انہیں منہ لگانے سے نہ تو نشہ ہوتا ہے۔ نہ ان کا بدن ایسا نمائشی ہوتا ہے کہ وہ کھل کر سمندر کی لہروں سے اٹھکیلیاں کر سکیں۔ ایسی عورتیں دروازے دروازے بھٹکتی ہیں اور ہوس کے اندھوں کو بھانستی رہتی ہیں۔

پورس نے کھڑکی نہیں کھولی۔ ہاتھ کے اشاروں سے کہا "اسے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ آگے جاؤ۔" عورت کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

وہ ایک دم سے اداس ہو گئی۔ ہاتھ جوڑ کر اشارے سے کہنے لگی کہ اسے اندر آنے دیا جائے۔ پورس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا پھر کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ اس کے دماغ میں پہنچ کر معلوم کرنے لگا کہ تنہا ہے یا اسے آلہ کار بنا کر وہاں پہنچایا گیا ہے۔ کانچ کے اطراف کوئی نہیں تھا۔ وہ کسی کی آلہ کار بن کر نہیں آئی تھی۔ رحم حالات اسے وہاں لے آئے تھے۔

اس کے خیالات نے بتایا، دس برس پہلے وہ ایک سوسائٹی گرل تھی۔ صرف دن گزارنے کے دس ہزار اور رات گزارنے کے پچیس ہزار لیتی تھی۔ بڑے بڑے امیر کبیر لوگ اس کے لیے ترستے تھے کیونکہ سیزن شروع ہونے سے پہلے ہی اس کی ایک ایک رات کی بکنگ ہو چکی ہوتی تھی۔

سمندر کی لہریں جتنی تیزی سے ساحل پر آتی ہیں، اتنی ہی تیزی سے واپس چلی جاتی ہیں۔ کامنا کی جوانی بھی اتنی ہی تیزی سے آکر چلی گئی۔ پتا بھی نہ چلا کہ کس طرح گزر گیا۔ وہ اے کلاس سے بی کلاس اور پھر سی کلاس تک پہنچ کر عورت بنتی گئی۔

آگے کمائی کے لیے بیٹی پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن پہلے بیٹا ہوا۔ وہ اپنی جوانی واپس لانے کے لیے ڈاکٹروں سے رجوع کرتی رہی۔ مہنگے سے مہنگا علاج کراتی رہی۔ ہزاروں روپے پانی کی طرح بہاتی رہی لیکن گزرے ہوئے وقت کو واپس نہ لا سکی۔ اس نے حساب کیا تو پتا چلا۔ وہ صرف ایک برس تک اے کلاس رہی تھی پھر اسے پتا نہ چلا کہ کس طرح بھاؤ گرتا رہا اور پچھلی کمائی کھانے پینے اور حسن و شباب کو نمائش رکھنے میں خرچ ہوتی رہی۔

اب ایک ایک وقت کی روٹی کی محتاج ہو گئی تھی۔ چھ برس کا ایک بیٹا تھا۔ ایک برس کی بیٹی کو گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ اس بچی کے دودھ کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ وہ سوچ کر نکلی تھی کہ کسی نہ کسی کو پھانس کر روٹی اور دودھ کے لیے کچھ رقم حاصل کر لے گی۔



پورس نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ کھڑکی کے دوسری طرف کامنا اسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اپنے دماغ میں بھوکی بچی کے رونے کی آواز سن رہی تھی۔ وہ صبح سے اب تک کئی جگہ جا کر ناکام رہی تھی۔ کسی نے اسے چھوٹا تک قرارا نہیں کیا تھا۔

پورس نے سر جھکا کر سوچا۔ وہاں سے پلٹ کر اپنے سفری بیگ کے پاس آیا۔ اس نے اس میں سے ایک ہزار روپے نکالے پھر کھڑکی کھول کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ وہ خوشی سے روپے جھپٹ کر بولی "دروازہ کھولو۔ میں آتی ہوں۔"

وہ سخت لہجے میں بولا "نہیں۔ سیدھی گھر جاؤ۔ تمہاری ضرورت مجھے نہیں کسی اور کو ہے۔ اب ادھر نہ آنا۔"

وہ کھڑکی بند کر کے پردے کو برابر کیا پھر باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے اس کے خیالات پڑھے۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی بازار کی طرف جا رہی تھی۔ بیٹی کا فیڈر اور دودھ خریدنے کے لیے۔

سہ پہر تین بجے تک جمنا بڑی کامیابی سے منتر پڑھتی رہی تھی۔ جسونت رفتہ رفتہ دماغی اور جسمانی توانائی محسوس کرتا رہا پھر بھیما نے خیال خوانی کی پرواز کی اور پدمنی کے دماغ میں پہنچ کر خوش ہو گیا۔ اس نے پدمنی کو مخاطب نہیں کیا۔ چپ چاپ واپس آگیا۔ اپنے کمرے سے نکل کر پوجا گھر میں پہنچ کر جمنا سے بولا "ماں! دیکھو میں چل پھر سکتا ہوں۔ بلکہ دوڑ بھی سکتا ہوں۔"

جمنا خوش ہو کر پوجا گھر سے باہر آئی پھر اس کی پیشانی کو چوم کر بولی "تم کمرے میں جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"جسونت وہاں سے چلتا ہوا کچن میں آیا۔ بادرچی سے بولا "کیا پکا رہے ہو؟ کھانے کے لیے کچھ بچا ہے؟"

"جی چھوٹے مالک! بڑی مالکن کو دودھ چاول کی کھیر پسند ہے۔ وہ بنائی ہے۔ آپ کھائیں گے؟"

"لاؤ، ایک پیالے میں دو۔ جلدی کرو۔"

اس نے ایک پیالے میں کھیر نکال کر ایک چمچ کے ساتھ دیا۔ وہ اسے لے کر اپنے کمرے میں آیا۔ الماری میں وہ دوا رکھی ہوئی تھی۔ اس نے دوا نکال کر کھیر میں ملائی پھر اسے ایک میز پر رکھ کر ماں کا انتظار کرنے لگا۔

بھیما نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ہمیشہ جسونت کے جسم میں رہنے کے لیے جمنا کو اپنی معمولہ بنانا ہو گا یا اسے راستے سے ہٹا دینا ہو گا۔ ورنہ وہ کسی دن اسے جسونت کے جسم سے بھاگ جانے پر مجبور کرے گی۔ اسے پھر کسی دوسرے کے جسم میں جانا پڑے گا۔ اس طرح آتما شکتی اور کمزور ہو جائے گی۔

وہ ذرا دیر سے آئی۔ اس نے کھیر کا پیالہ اٹھاتے ہوئے کہا "ماں! تم کیا کر رہی تھیں؟ کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ یہ لو کھیر کھاؤ۔"

"نہیں بیٹا! اب میں مٹھا کم کھانے لگی ہوں۔"

"میں نے دماغی اور جسمانی شکتی حاصل کی ہے۔ اس خوشی میں ضرور کھانا ہو گا۔ میں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گا۔"

وہ اسے زبردستی کھلانے لگا۔ اسے بیٹے کی ضد اچھی لگی۔ وہ کھانے لگی۔ آدھا پیالہ کھا کر بولی "بس کرو۔"

"ماں! تم تو شوق سے کھیر کھاتی ہو۔"

"ہاں مگر اس کا مزہ کچھ عجیب سا ہے۔ تمہاری ضد سے اتنا کھا لیا ہے۔ اب مجھے دو۔ باقی میں تمہیں کھلاؤں گی۔"

وہ پیالے کو میز پر رکھ کر بولا "یہ کھیر تمہیں پسند نہیں آرہی ہے میں بھی نہیں کھاؤں گا۔"

"پتا نہیں کم بخت نے کیسی کھیر بنائی ہے۔ میں تمہارے لیے دوسری بناؤں گی۔"

"ابھی نہ بناؤ۔ یہاں بیٹھو اور مجھ سے باتیں کرو۔"

"وہ اپنے سینے پر ہاتھ کر کر بولی "کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

وہ کمزوری محسوس کرتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جسونت نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا "تمہیں آرام سے لیٹنا چاہیے۔"

اس نے اسے بیڈ پر پہنچا کر لٹا دیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ کمزوری محسوس کر رہی ہے۔ بھیما نے اس کے دماغ میں پہنچ کر تصدیق کی۔ وہ جان لیوا کالا جادو جاننے والی۔ پتھر کا دماغ رکھنے والی اس کی سوچ کی لہروں کو محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اچانک کمزوری کے باعث پریشان ہو رہی تھی۔ اس سے بولی "ڈاکٹر کو فون کرو۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آکر بولا۔ "ڈاکٹر گھر میں اور اسپتال میں نہیں ہے۔ میں نے پیغام چھوڑ دیا ہے۔ وہ جلد ہی آجائے گا۔"

"بیٹے! وہ کھیر کیسی تھی؟ اسے کھانے کے بعد میری یہ حالت ہو رہی ہے۔"

"ماں! کھیر کی نہیں، میری بات کرو۔ اگر تمہیں معلوم ہو کہ میں تمہارے سامنے زندہ رہ کر کبھی زندہ نہیں ہوں۔ مر چکا ہوں تو۔"

وہ بات کاٹ کر بولی "تمہارے دشمن مریں گے۔ ایسی بات زبان پر نہ لاؤ۔"

"میرا یہ سوال ضروری ہے۔ تم بیٹے کے جسم سے محبت کرتی ہو یا آتما سے؟"

"دونوں سے۔۔۔ مگر تم کیوں ایسی باتیں کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ تمہاری ممتا کے لیے بیٹے کا جسم رہ گیا ہے۔ یہ جسم اس آتما سے خالی ہے' جسے تم نے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا۔"

"نہیں بیٹا! ایسی نحوست والی باتیں نہ کرو۔ تم زندہ سلامت رہو گے۔ میں بھی تم پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔"

"آنچ آچکی ہے۔ بلکہ آگ لگ چکی ہے۔ تمہاری کوکھ سے پیدا ہونے والی آتما جل چکی ہے۔ تمہارا پیدا کیا ہوا صرف یہ جسم رہ گیا ہے۔"

وہ کمزوری کے باعث تھر تھراتی ہوئی اسے گھورتی ہوئی بولی "تم؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ تمہارا بیٹا جسونت مر چکا ہے۔ وہ اسی وقت مر چکا تھا جب شہباز سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے مرتے ہی کلپنا کے اندر سے آتما نکل کر اس جسم میں سما گئی ہے۔"

جسنا کے دماغ کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن کمزوری کے باعث پھر تکیے پر گر پڑی۔ وہ بولا "خود کو سنبھالو اور سوچو۔ پہلے تم نے بیٹے کی موت کا یقین کیا تھا پھر اس کی دھڑکنیں سن کر اسے زندہ دیکھ کر بھول گئیں کہ کلپنا اچانک کیوں مرگئی ہے؟ تم نے سوچا اس کی آتما کہیں چلی گئی ہے۔ یہ نہیں سوچا کہ بیٹے کے اس جسم میں سما گئی ہوگی۔"

جسنا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اٹھ نہیں سکتی تھی۔ بستر پر لیٹے ہی لیٹے کھسکنی ہوئی اس سے دور ہونے لگی۔ بھیما اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی "نہیں۔ یہ تو میرے سامنے سر سے پلوس تک میرا جسونت ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ یہ میرا بیٹا نہیں ہے؟"

بھیما نے کہا "میں اوپر سے تمہارا جسونت ہوں۔ اندر سے بھیما ہوں۔ وہی بھیما جسے تم اپنی جادوئی شکتی سے مار ڈالنا چاہتی تھیں۔ کیا اب مار سکو گی؟ مجھے مارو گی تو بیٹے کا جسم مرجائے گا۔ مرنے والوں کی تصویریں دیوار پر لٹکائی جاتی ہیں۔ تمہارے بیٹے کا یہ جسم چلتی پھرتی تصویر ہے۔ چاہو تو اسے چلتا پھرتا دیکھتی رہو۔ چاہو تو میری آتما کو بھگا کر اپنے پیدا کیے ہوئے جسم کو چتا میں جلا دو۔ اس کے بعد تصویر کو ہار پہنا کر دیوار پر لگا دو۔"

ماں کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ ابھی زندہ تھی۔ بے ہوش ہو گئی تھی۔

○☆○

جے کانو اور جے فلو اسپتال سے فرار ہو گئے۔

شیوانی ان کی طرف سے غافل تھی۔ وہ کبھی سوچ نہیں سکتی تھی کہ وہ دونوں اچانک تخویبی عمل کے اثرات سے نجات حاصل کرلیں گے اسے ان کی وفاداری کا یقین تھا۔ وہ مطمئن ہو کر ماریہ کی تلاش میں گئی تھی۔

وہ دونوں ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ائرپورٹ آئے۔ ایک طیارہ وہاں سے لندن جانے والا تھا۔ انہوں نے کاؤنٹر پر جا کر دو ٹکٹیں حاصل کیں۔ وہاں سے واپسی کا سفر کرنے کے سلسلے میں کئی قانونی رکاوٹیں تھیں۔ مگر وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے متعلقہ افسران کے دماغوں سے کھیلتے ہوئے طیارے میں سوار ہو گئے۔

جے سامو ان دونوں کے دماغوں میں رہ کر انہیں شیوانی سے دور کردینے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ تینوں دوست اپنے ارادوں میں کامیاب ہو رہے تھے۔ جے کانو اور جے فلو کسی بڑی رکاوٹ کے بغیر واپس لندن جا رہے تھے۔ ارادہ تھا کہ استنبول یا قاہرہ میں کہیں اتر جائیں گے۔

جے کانو نے کہا "سامو! تم واقعی ایک دوست کا فرض ادا کر رہے ہو۔ ہم کھلی فضاؤں میں آزادی سے پرواز کر رہے ہیں۔ شیوانی سے بہت دور جا رہے ہیں لیکن کتنا دور جا سکتے ہیں؟ کیا وہ ہمارا پیچھا چھوڑے گی؟"

جے سامو نے کہا "وہ ٹیلی پیتھی نہیں جانتی۔ یہ نہیں معلوم نہیں کر سکے گی کہ کہاں جا کر روپوش ہو گئے ہو۔"

"نہیں سامو! وہ خطرناک بلا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی غیر معمولی قوت ہے۔ جب وہ دیکھتی ہے تو ہماری پیشانی جلنے لگتی ہے اور ہم بے اختیار اپنے اندر کی سچی باتیں بولنے لگتے ہیں۔"

"تم دونوں دور جا رہے ہو۔ وہ تمہاری پیشانی کو دیکھے گی تو تم بے بس ہو کر کچھ بول گے۔"

"ہم دنیا کے آخری سرے پر چلے جائیں' تب بھی وہ تصور میں اپنے مطلوبہ شخص کی پیشانی کو دیکھتی ہے تو اس کی پیشانی جلنے لگتی ہے۔ میں لندن میں اس سے دور جا کر آزاد ہو گیا ہوں۔ وہ میرے سامنے نہیں تھی۔ وہ ایک ہوٹل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں لندن کی ایک اسٹریٹ میں تھا۔ جب میری پیشانی گرم ہونے لگی تو میں بے اختیار ایک ٹیلی فون بوتھ میں جا کر اسے بتانے لگا کہ اس کے خوف سے وہ شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مگر جانے میں ناکام رہا تھا۔"

جے فلو نے کہا "ابھی وہ ماریہ کو تلاش کرنے میں مصروف ہے۔ جب اسپتال آئے گی اور ہمیں نہیں پائے گی تو دشمن بن جائے گی۔ اس کی آنکھوں کی شیطانی قوت ہماری پیشانیوں تک پہنچے گی اور ہم بے اختیار بتانے لگیں گے کہ تم نے ہمیں اس کے تخویبی عمل سے نجات دلائی ہے اور ہم



استنبول یا قاہرہ جا رہے ہیں۔"

سامو نے کہا "تم دونوں کے پاس موبائل فون نہیں ہے۔ فون کے ذریعے اس سے رابطہ نہیں ہوگا۔ تم اپنے بارے میں اسے کچھ نہیں بتا سکو گے۔ ایسے وقت میں اس سے فون پر باتیں کروں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ میں نے تم دونوں کو اغوا کیا ہے اور تم دونوں پر تخویبی عمل کر کے اس کو چھڑا کر لے گیا ہوں۔ آئندہ تم دونوں کو کبھی فون پر باتیں کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔"

پھر اس نے کہا "میں نے شیوانی کی ایک کمزوری معلوم کی ہے۔"

جے کانو نے پوچھا "کیسی کمزوری؟"

"جب میں۔۔۔ روم میں تھا تو شیوانی نے مجھے بھی ٹریپ کیا تھا۔ میں نے اپنی پیشانی میں حرارت محسوس کرتے ہی بہت سی سچ باتیں اگل دی تھیں۔"

جے کانو نے کہا "پھر تو وہ تمہیں بھی ٹریپ کر سکتی ہے۔"

"اس نے ایک بار میری پیشانی کو نگاہوں سے گرمانے کے بعد پھر کوششیں کی ہیں لیکن وہ ناکام رہی ہوگی۔ میں نے اب تک اس کی شیطانی آنکھوں کی حرارت کو محسوس نہیں کیا ہے۔"

دونوں ساتھیوں کے حیرانی سے پوچھا "یہ کیسے ممکن ہے؟ ہم اس کے سامنے نہ رہیں۔ تب بھی اس کی نظریں پیشانیوں تک پہنچ جاتی ہیں۔"

سامو نے کہا "میں نے انجانے میں اپنے تحفظ کا راستہ پا لیا ہے۔ جب مجھے پتا چلا کہ اسکاٹ لینڈ کی ایک جاسوسہ لارا مجھے ٹریپ کر رہی ہے تو میں نے اس سے دور رہنے اور روپوش رہنے کے لیے ماسک میک اپ کیا۔ لارا کو تنہا وہاں سے لندن جانے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد سے اب تک میں دیکھ رہا ہوں کہ شیوانی کا جادو مجھ پر نہیں چل رہا ہے اور میری سمجھ میں یہی آرہا ہے کہ میری پیشانی پر ماسک چڑھا ہوا ہے اور اس کی شیطانی آنکھیں ماسک سے گزر کر میری پیشانی تک نہیں پہنچ پاتی ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو ہم بھی ماسک میک اپ کے ذریعے اس سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔"

"دیلی سے فرار ہوتے وقت تم دونوں کو میک اپ کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ موقع ملتا تو میں تمہیں وہاں ماسک میک اپ کا مشورہ دیتا۔"

جے کانو نے کہا "سامو! تمہارا یہ ماسک میک اپ والا تجربہ کامیاب رہا ہے۔ حالانکہ تم نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ انجانے میں تقدیر نے ہمیں بچاؤ کا راستہ دکھا دیا ہے۔"

"دوستو! اسی کے کہتا ہوں۔ فکر نہ کرو۔ دل اور دماغ سے شیوانی کا خوف نکال دو۔ اس طیارے کا پہلا اسٹاپ استنبول ہے۔ وہاں اترتے ہی ماسک میک اپ کا سامان خریدو اور چہرے تبدیل کرو۔ ہم تھری جے پھر آزادی کی سانسیں لینے لگیں گے۔"

وہ تینوں آزادی کے لیے اور پہلے جیسی کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے تدابیر سوچ رہے تھے اور ان پر عمل کرنے والے تھے۔

ماریا ائرپورٹ کی عمارت سے باہر آکر ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ احمد زبیری نے ایک پولیس افسر کے دماغ پر قبضہ جما کر ماریہ کو اس ٹیکسی میں بٹھایا تھا اور ڈرائیور سے کہا تھا کہ وہ جہاں جانا چاہتی ہے' اسے لے جائے۔ اس کے بعد وہ افسر بھول گیا تھا کہ اس نے اسے کسی ٹیکسی میں بٹھایا تھا یا کسی پرائیویٹ کار میں؟

ماریہ سوچ رہی تھی "مجھے ائرپورٹ سے نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں اس انجانے شہر میں کہاں جاؤں گی؟"

زبیری اس کے اندر تھا۔ اس نے کہا "تم نہیں جانتیں۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل شیوانی نے تمہیں پینا ٹائز کرایا ہے۔ تم اپنی مرضی سے چین نہیں جا رہی ہو۔ تمہارے دماغ میں چین جانے والی بات نقش کی گئی ہے۔ وہ تمہارے ذریعے زبیری کو نقصان پہنچائے گی۔"

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی "نہیں' میں زبیری کو نقصان نہیں پہنچنے دوں گی۔ میں چین نہیں جاؤں گی۔"

سکھ ڈرائیور نے پوچھا "بہن جی! کتھے جانا ہے؟"

وہ بولی "چلتے رہو۔ مجھے یہ شہر دکھاتے رہو۔ یہ ہزار روپے لو اور گاڑی کی ٹنکی فل کرتے رہو۔"

زبیری اسے تفصیل سے سمجھانے لگا کہ اس کے استعفیٰ دینے کے باعث اس پر شبہ کیا گیا تھا۔ ایک ٹیلی پیتھی جاننے والے (جے کانو) نے اس کے خیالات پڑھ کر شیوانی کو اس کی اور زبیری کی محبت کے بارے میں بتایا تھا اور یہ رپورٹ دی تھی کہ وہ چین کے اور بابا صاحب کے ادارے کے خلاف جاسوسی نہیں کرے گی اس لیے استعفیٰ دے رہی ہے۔ اب شیوانی اسے پینا ٹائز کرانے کے بعد اس کا چہرہ اور نام بدل کر اسے چین لے جا رہی ہے۔

وہ سکھ ٹیکسی ڈرائیور کرتا ہوا کہہ رہا تھا "بہن جی! پرانی دلی دیکھو گی یا نئی دلی۔ ابھی ہم کناٹ پیلس کی طرف جا رہے ہیں۔"

"نئی پرانی سب دکھاؤ۔ چلتے رہو اور کم سے کم بولو۔"

"کم کیسے بولوں؟ اچھی اچھی جگہ گزر جائے گی۔ میں آپ کو ان کے نام نہیں بتاؤں گا تو آپ کو کیسے معلوم ہوگا کہ آپ دلی شہر میں کیا دیکھ رہی ہیں۔"

زہیری نے کہا "شیوانی تمہیں تلاش کررہی ہوگی۔ تمہارے بیگ میں میک اپ کا سامان ہے۔ آئینہ نکالو اور چہرہ تبدیل کرو۔"

"تم کون ہو؟ شیوانی سے نجات دلانے کے لیے میری مدد کیوں کررہے ہو؟ تمہاری آواز بالکل زہیری جیسی ہے۔"

"میری جان! میں زہیری ہوں۔ میں نے ٹیلی پیتھی کا علم تم سے چھپایا تھا۔ وقت ضائع نہ کرو۔ میک اپ کرو۔"

وہ خوش ہو کر بیگ سے میک اپ کا سامان نکالتی ہوئی بولی "تم؟ تم ٹیلی پیتھی جانتے ہو۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ اچھا اگر جانتے تھے تو پہلے کیوں میرے پاس نہیں آتے تھے؟"

"میں چپ چاپ آکر تمہارے خیالات پڑھتا تھا اور خوش ہوتا تھا کہ تم مجھے یاد کرتی رہتی ہو۔ تمہارے پاس آتے جاتے معلوم ہوا کہ شیوانی اسی طرح تمہیں ٹریپ کررہی ہے۔"

اس نے پوچھا "زہیری! میرے چہرے پر ماسک ہے۔ کیا ماسک اتار کر اصل چہرے کو تبدیل کروں؟"

"ماسک اسی طرح رہنے دو۔ اوپر سے ریڈی میڈ میک اپ کرو۔"

"یہ ڈرائیور مجھے کسی دوسرے روپ میں دیکھے گا تو دشمن کی جاسوسہ سمجھ کر پولیس اسٹیشن پہنچادے گا۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ اسکاٹ لینڈیارڈ میں کئی ممالک کی زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ تم ہندی جانتی ہو؟"

"تھوڑی تھوڑی جانتی ہوں۔ یہاں کی ساڑھی اور شلوار کرتا پہن سکتی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میرا ایک ساتھی ڈرائیور کے دماغ پر قبضہ جمائے رکھے گا۔ تم میک اپ کرتے ہی کسی مارکیٹ میں ٹیکسی سے اتر جاؤ۔ وہاں سے ہندوستانی لباس خرید کر پہن لو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ ایک پولیس افسر کے دماغ میں آکر شیوانی کے بارے میں معلوم کرنے لگا۔ پتا چلا' سرکاری طور پر شیوانی کو پولیس ٹیم اور گاڑیاں فراہم کی گئی ہیں۔ پورے شہر کی ناکہ بندی کی جارہی ہے۔ ٹیکسیوں اور کاروں کی تلاشی لی جارہی ہے۔ زہیری نے اپنے سراغ رساں سے کہا "اس ٹیکسی کو کسی بازار میں روکو۔"

پھر وہ ماریہ سے بولا "کیا میک اپ ہوچکا ہے۔"

"ہاں۔ ریڈی میڈ میک اپ میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟ میں آئینہ دیکھ رہی ہوں۔ یقین سے کہتی ہوں۔ شیوانی مجھے پہچان نہیں سکے گی۔"

ٹیکسی ایک جگہ رک گئی۔ وہ بولا "ڈرائیور کو ہزار روپے دے چکی ہو۔ باہر نکلو اور شاپنگ کے لیے جاؤ۔"

وہ ٹیکسی سے اتر گئی۔ ڈرائیور کو معلوم نہ ہوسکا۔ زہیری کا سراغ رساں اس کے دماغ پر مسلط تھا۔ وہ ٹیکسی ڈرائیو کرتا ہوا دور چلا گیا' پھر سراغ رساں اس کے دماغ کو آزاد چھوڑ کر زہیری کے پاس آگیا۔

ماریہ شاپنگ کررہی تھی۔ پہلے اس نے ایک خوب صورت سی ساڑھی خریدی ایک چھوٹے سے کیبن میں جاکر اسے پہنا۔ اس کی رقم ادا کی پھر ایک جیولری کی دکان میں آکر زیورات خریدے۔ ہیروں کا نیکلس' ہیروں کے ٹاپس اور انگوٹھی' اور سونے کی چوڑیاں ایک آئینے کے سامنے پہنی۔ بالکل ہندوستانی عورت دکھائی دینے لگی۔ ان زیورات کا بل ادا کرکے وہ ایک دکان میں آئی۔ وہاں سے بندیا خرید کر ماتھے پر سجائی۔ زہیری نے کہا "تم واقعی اسکاٹ لینڈیارڈ کی تربیت یافتہ جاسوسہ ہو۔ وہاں کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل شیوانی بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گی۔"

اور شیوانی اسے تلاش کرنے کے دوران میں سوچ رہی تھی کہ اس نے ماریہ کو دیکھا تھا۔ وہ اپنی نظروں کی غیر معمولی قوت سے اس کی پیشانی کو گرما سکتی ہے۔ اسے سچ بولنے پر مجبور کرسکتی ہے۔ وہ کہیں سے ٹیلی فون کے ذریعے بتادے گی کہ کہاں چھپی ہوئی ہے؟

لیکن وہ نظریں اس کی پیشانی تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ شیوانی سوچ رہی تھی' اس سے پہلے وہ بے ساموتی اپنی نظروں کی قوت سے ٹریپ کرنا چاہتی تھی لیکن ناکام رہی تھی۔ اس کے ذہن میں بات آئی کہ ماریہ نے میک اپ کیا ہے۔ اس کے چہرے پر' پیشانی پر ماسک چڑھا ہوا ہے۔ کیا وہ ماسک اس کی نظروں کی نادیدہ حرارت کو اس کی پیشانی تک پہنچنے سے روک رہا ہے؟

اس نے سوچا "ہاں' یہی بات ہے۔ ماریہ کی طرح بے ساموتی بھی ماسک میک اپ میں ہے۔ اگر لے میرے شکنجے میں نہیں آرہا ہے۔ اب ماریہ جہاں بھی ملے گی۔ میں سب سے پہلے اس کے چہرے سے ماسک نوچ لوں گی۔"

وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے بڑے اطمینان سے چین جارہی تھی مگر اب اس کا چین ختم ہوگیا تھا۔ آدھے راستے میں ہی رکاوٹیں پیدا ہورہی تھیں۔ ماریہ کے فرار ہونے سے یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ بابا صاحب کے ادارے والوں کو اس کے مشن کے بارے میں معلوم ہوچکا ہے۔ چونکہ ماریہ چین اور بابا صاحب کے ادارے کی حمایت میں استعفیٰ دے چکی تھی۔ مسلمانوں کی ہوچکی تھی۔ اس لیے اسے مشن سے الگ کردیا گیا ہے۔

ان حالات میں شیوانی سوچ رہی تھی "کیا میں چین جاؤں گی تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو پہچان لیا جائے گا؟ کیا اب مجھے دوسرے جیس میں دوسرے پاسپورٹ اور ویزا کے


LEUCODERMA-VITILIGO
سفید داغ قابل علاج مرض ہے
STEROIDS FREE
MOST PROGRESSIVE TREATMENT
پتہ بھی
اجمل زیدی ماہر برص کے دورۂ پاکستان کا مستقل پروگرام

| | | | |
|---|---|---|---|
| پشاور | یکم فروری تا 10 فروری<br>یکم جون تا 10 جون<br>یکم اکتوبر تا 10 اکتوبر | قیام | ہوٹل امین<br>جی ٹی روڈ نزد میونسپل کارپوریشن پشاور شہر<br>فون 19-218215 (091) فیکس نمبر 214772 (091) |
| لاہور | 14 فروری تا 25 فروری<br>14 جون تا 25 جون<br>14 اکتوبر تا 25 اکتوبر | قیام | عامر ہوٹل<br>لوئر مال نزد سیشن کورٹ' لاہور<br>فون 19-7115015 (042) فیکس نمبر 7115013 (042) |
| کوئٹہ | یکم مارچ تا 11 مارچ<br>یکم جولائی تا 11 جولائی<br>یکم نومبر تا 11 نومبر | قیام | ہوٹل شیٹ<br>جناح روڈ بالمقابل ہول ہسپتال کوئٹہ<br>فون 823015-823141 (081) |
| کراچی | 13 مارچ تا 27 مارچ<br>13 جولائی تا 27 جولائی<br>13 نومبر تا 27 نومبر | قیام | ہوٹل مہران<br>شاہراہ فیصل کراچی<br>فون 9-5660851 (021) فیکس نمبر 5677019 (021) |
| ملتان | 28 مارچ تا 6 اپریل<br>28 جولائی تا 6 اگست<br>28 نومبر تا 7 دسمبر | قیام | کوٹھی نمبر 3607<br>ریلوے روڈ (سدّ دھام روڈ) بالمقابل ڈی ایس آفس ملتان<br>فون 512374-72374 (061) فیکس 528063 (061) |
| اسلام آباد | 8 اپریل تا 30 مئی<br>8 اگست تا 30 ستمبر<br>9 دسمبر تا 30 جنوری | مستقل پتہ | مکان نمبر 62 اسٹریٹ نمبر 20<br>سیکٹر G-8/1-1 سرا چوک (تعلیمی چوک) اسلام آباد<br>فون: 2261636 -2854595 (051)<br>موبائل: 7770595 (0303) فیکس: 2261636 |

ساتھ جانا ہوگا؟"

اس کے لیے بڑے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ ویسے اس کے لیے بھیس بدلنا' دوسرا پاسپورٹ اور ویزا حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ابھی صرف ماریہ مسئلہ بن گئی تھی۔

ایک انڈین افسر نے گاڑی روک کر شیوانی سے کہا۔ "میڈم! یہ لکشمی نارائن مندر ہے۔ میں دیوی کے درشن کرنے جا رہا ہوں۔ آپ ادھر مارکیٹ میں مس روزی (ماریہ) کو تلاش کریں۔"

آگے پیچھے والی گاڑیوں سے سپاہی باہر آ گئے۔ افسر مندر کی طرف چلا گیا شیوانی نے اپنے دونوں سرا غرسانوں سے کہا "سپاہیوں کے ساتھ مارکیٹ میں جاؤ۔ یہاں غیر ملکی عورتیں اور مرد نظر آ رہے ہیں۔ وہ یہاں مل سکتی ہے۔"

وہ سب اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے اِدھر اُدھر جانے لگے۔ ایسے وقت ماریہ ایک دکان سے باہر آ رہی تھی۔ وہ شیوانی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ زبیری نے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ بولی "سڑک کے کنارے کئی گاڑیاں ہیں۔ پولیس والے ہیں ایک عورت کار کے پاس کھڑی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ شیوانی ہے۔"

"اپنے قریب سے گزرنے والی کسی بھی شخص کو مخاطب کرو۔ میں اس کے ذریعے اس عورت کے بارے میں معلوم کروں گا۔"

ایک عورت قریب سے گزر رہی تھی۔ اس نے خود ماریہ کو مخاطب کیا "کیا تم بتا سکتی ہو کہ ہیوٹی پارلر کہاں ہے؟"

ماریہ نے کہا "سوری۔ میں نہیں جانتی۔"

زبیری نے کہا "بس ماریہ! اور کسی کو مخاطب نہ کرو۔ سامنے والے مندر میں جاؤ۔ شیوانی تمہارے بارے میں یہ نہیں سوچے گی کہ تم مندر کے اندر جاؤ گی۔ تمہارے بدن پر ساڑی ہے۔ ماتھے پر بندیا ہے۔ یہ سب کچھ اسے دھوکا دینے کے لیے کافی ہے۔"

وہ مندر کی طرف جانے لگی۔ زبیری اس عورت کے دماغ میں پہنچ کر اسے شیوانی کی طرف لے گیا۔ اس عورت نے زبیری کی مرضی کے مطابق شیوانی سے پوچھا "ایکسکیوزمی۔ ہیوٹی پارلر کہاں ہے؟"

وہ بولی "سوری۔ میں یہاں پہلی بار آئی ہوں۔"

"ہاں۔ تم کپڑوں سے باہر والی لگتی ہو۔ سینے پر دوپٹا نہ سہی اسکارف تو ہونا ہی چاہیے۔ بے شرمی سے سینہ تان کر کھڑی ہوئی ہو۔"

"یو شٹ اپ۔ یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔"

"یہ بکواس نہیں ہے۔ تمہاری طرح ایک اور انگریز لڑکی یہاں سینہ تان کر چل رہی تھی۔ ایک جوان نے اسے چھیڑا تو وہ بولی "خبردار! مجھے چھیڑنے سے پہلے یہ سن لو کہ میرا نام روزی ہے۔ میں لندن کے بہت بڑے اخبار کی رپورٹر ہوں۔ پولیس والے تمہیں۔"

شیوانی نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے پوچھا۔ "روزی؟ لندن اخبار کی رپورٹر؟ تم نے اسے کہاں دیکھا ہے؟"

عورت نے ایک طرف انگلی اٹھا کر کہا "ادھر مارکیٹ میں ہے۔"

شیوانی تیزی سے دوڑتی ہوئی ادھر جانے لگی۔ زبیری نے ماریہ کے پاس آ کر کہا "تمہارا شبہ درست نکلا' وہ شیوانی ہے۔"

"وہ مجھے پہچان لے گی۔"

"تم مکمل ہندوستانی عورت بن چکی ہو۔ شیوانی کا باپ بھی تمہیں نہیں پہچان سکے گا۔"

مندر میں مرد' عورتیں' بوڑھے اور بچے سب ہی تھے۔ ماریہ عورتوں کی بھیڑ میں تھی۔ یوں تو وہاں کئی خوب صورت عورتیں اور لڑکیاں تھیں لیکن ماریہ ان میں نمایاں تھی۔ اس کی وجہ ہیروں سے جڑے ہوئے زیورات تھے' جو جگمگا رہے تھے اور ماریہ کے حسن کو چار چاند لگا رہے تھے۔

وہاں سب ہی اسے قریب سے اور دور سے دیکھ رہے تھے۔ کتنے ہی پوجا کرنے والے لکشمی دیوی کو چھوڑ کے سر جھکا رہے تھے مگر ان میں سے کسی کا دھیان مارتیہ کے مجسمے کی طرف تھا اور کوئی چمکتے دمکتے ہیروں کے لیے للچا رہا تھا۔ دوسرے تمام لوگ اس لیے اسے دیکھ رہے تھے کہ پہلے کبھی کسی عورت کو ایسے قیمتی زیورات پہن کر مندر آتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ عورتوں کی قطار میں کھڑی ہو گئی تھی اور پوجا کے لیے دھیرے دھیرے لکشمی دیوی کی بڑی سی مورتی کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ بار بار سر جھکا کر دور تک دیکھ رہی تھی کہ شیوانی پولیس کے ساتھ ادھر آ رہی ہے یا نہیں۔

زبیری نے کہا "تمہیں اتنے قیمتی زیورات نہیں پہننا چاہیے تھا۔ کیا مرد' کیا عورتیں' سب ہی تمہیں دیکھ رہے ہیں۔"

وہ بولی "مجھے ہیرے جواہرات کا بہت شوق ہے۔ میرے پاس دو لاکھ انڈین کرنسی تھی۔ میں نے ایک لاکھ بیس ہزار میں خرید لیے۔"

"بڑی عقل مندی کی۔ تم اس طرح ان سب کے علاوہ دشمنوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرو گی۔"

"مجھ سے غلطی ہو گئی۔ فکر نہ کرو۔ میں ان زیورات سے ابھی نجات حاصل کر لوں گی۔"

"ٹھیک ہے مگر اس طرح بار بار ادھر اُدھر نہ دیکھو۔ تمہاری پریشانی صاف ظاہر ہو رہی ہے۔ میں شیوانی اور



سپاہیوں کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ ابھی مارکیٹ میں بھٹک رہے ہیں۔ میں انہیں سنبھال لوں گا۔ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ بولی "یہ بات سب ہی کو کھٹکے گی کہ میں اتنے قیمتی زیورات کے ساتھ تنہا ہوں۔ مجھے یہاں کسی عورت سے دوستی کرنا چاہیے۔"

"یہ بہتر ہوگا۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

قطار میں اس کے آگے کھڑی ہوئی ایک ادھیڑ عمر کی عورت کبھی کبھی سر گھما کر اسے دیکھتی تھی پھر نظریں ملنے پر جھینپ کر مسکراتی تھی۔ ماریہ نے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کی "مجھے جی بھر کے دیکھو۔ میں بھی تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔ کیا میں تمہیں دیدی کہہ سکتی ہوں؟"

وہ خوش ہو کر بولی "تم مجھے دیدی نہیں' ماں کہہ سکتی ہو۔"

"آپ اتنی جوان ہیں۔ میری بہن لگتی ہیں۔ میں ماں کیسے کہوں؟"

وہ اور خوش ہو گئی۔ کہنے لگی "میں مندر آ رہی تھی' اس بے وقوف نے کیا کیا۔ میک اپ کرتی تو اور جوان لگتی۔ تم کہاں رہتی ہو؟"

"میں لندن سے آئی ہوں۔ یہاں کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ کسی ہوٹل میں رہوں گی۔"

"ہوٹل میں کیوں؟ میرے گھر چلو۔ بہت آرام ملے گا۔ جب مجھے بہن کہا ہے تو میں تمہیں ہوٹل میں نہیں رہنے دوں گی۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام شانتی ہے۔ آپ اکیلی آئی ہیں؟"

"میرے پتی ادھر مردوں کی لائن میں ہیں۔ وہ دیکھو پجاری جی انہیں پوجا کرا رہے ہیں۔"

ایک بوڑھا شخص پوجا کے بعد واپس آ رہا تھا۔ اس عورت نے اسے آواز دی "راجو کے ڈیڈی! ادھر آؤ۔ بات سنو۔"

وہ ان کے قریب آ کر بولا "کیا ہے بملا؟ عورتوں میں کیوں بلا رہی ہو؟ ہم مندر کے باہر ہاتھ کر سکتے ہیں۔"

وہ بولی "میری بہن سے ملو۔ اس کا نام شانتی ہے۔"

ماریہ نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا۔ راجو کے باپ نے کہا۔ "نمستے' میرا نام درگا پرساد ہے۔ میں تمہیں دور سے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ تمہیں اتنے قیمتی زیورات پہن کر گھومنا پھرنا نہیں چاہیے۔ شاید تم اکیلی ہو۔"

بملا نے کہا "بالکل اکیلی ہے۔ مگر اب ہم سب اسے کہیں گے کہ میری بہن ہے کیونکہ یہ اب ہمارے ساتھ رہے گی۔"

درگا پرساد نے کہا "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہم غریب ہیں۔ ہمارا گھر چھوٹا ہے مگر دل بڑا ہے۔ ہم تمہیں آرام پہنچانے کی کوشش کریں گے۔"

بملا کی پوجا کی باری آ گئی۔ اس نے پھولوں اور پرساد کی تھالی پجاری کو دی پھر دیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ زبیری اس کے خیالات پڑھنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں لکشمی دیوی سے کہہ رہی تھی "دیوی ماں! تو دھن دولت کی دیوی ہے۔ میں تیرے چرنوں میں جھکتے آئی ہوں تو ایک دھن دولت والی خوبی میری پاس چلی آئی ہے۔ یہ تیرا چمتکار ہے۔ اب ہمیں ہزاروں تو کیا لاکھوں روپے مل جائیں گے۔"

پجاری نے کچھ پڑھتے رہنے کے بعد کہا "تمہاری پوجا ہو گئی۔ دوسری کو آنے دو۔"

بملا سر جھکا کر لکشمی دیوی کے سامنے الٹے قدموں چلتی ہوئی اپنے پتی کے پاس آئی۔ پجاری نے ماریہ سے کہا "تم پھول اور پرساد نہیں لائی ہو۔ خالی ہاتھ آئی ہو۔ کچھ دان دکھشنا تو لے کر آنا چاہیے۔"

ماریہ نے اپنے زیورات اتارتے ہوئے کہا "میں یہ سب کچھ دیوی کے قدموں میں رکھنے آئی ہوں۔"

وہاں کھڑی ہوئی عورتیں اور مرد سب حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ بملا اور درگا پرساد تو شدید حیرانی کے باعث چند ساعتوں تک سانس لینا بھول گئے۔ بملا نے جلدی سے آگے بڑھ کر ماریہ کے ہاتھوں سے زیورات لے کر کہا "شانتی! یہ کیا کر رہی ہو؟ لکشمی دیوی ہم سب کو دیتی ہیں۔ تم انہیں کیا دو گی؟ ایسا کرو' ہزار دو ہزار مندر کے لیے دان کر دو۔"

پجاری نے بملا سے کہا "تم اسے کیوں روک رہی ہو۔ اس لڑکی کے من میں دیوی کے لیے شردھا ہے۔ یہ جو چاہتی ہے' اسے کرنے دو۔"

ماریہ نے بملا کے ہاتھوں سے زیورات لے کر کہا۔ "دیدی! اسے دیوی کے قدموں میں رکھ کر جاؤں گی تو مندر کے باہر میرا بھلا ہوگا۔ زیورات کی پروانہ کرو۔ دیوی کی مہربانی سے ہمارے پاس کمی نہیں ہے۔"

اس نے زیورات دیوی کے قدموں میں رکھ دیے۔ پجاری خوش ہو کر اسے دعائیں دینے لگا۔ مردوں کی قطار میں ایک شخص ماریہ کو بہت دیر سے تک رہا تھا۔ وہ اپنے لباس سے ایک رئیس زادہ لگ رہا تھا۔ ماریہ' بملا اور درگا پرساد کے ساتھ جانے لگی۔ وہ پوجا کا خیال چھوڑ کر قطار سے الگ ہو کر اس کے سامنے آیا۔ وہ تینوں رک گئے۔ اس نے بڑی شائستگی سے کہا "شاید چاہتا ہوں۔ میرا نام کنور بلراج راٹھور ہے۔ ہزاروں ایکڑ زمینوں کا مالک ہوں۔ دہلی' بمبئی اور کلکتہ کے ریس کے میدانوں میں میرے گھوڑے دوڑتے ہیں۔ میں دھن دولت کو پانی کی طرح بہاتا ہوں لیکن آپ نے ہیروں کا سیٹ جس انداز میں دان کیا ہے' اس سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔"

زبیری اس وقت درگا پرساد کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "پہلے شانتی جیسی دھنوان لڑکی ملی۔ اب یہ مالدار کنور ہم سے مل رہا ہے۔ لکشمی دیوی سچ مچ دولت دینے والی دیوی ہے۔ آج مندر آتے ہی دولت والے ہمارے پاس چلے آرہے ہیں۔ دولت بھی ملے گی تو بات بنے گی۔"

ماریہ نے کہا "مسٹر راٹھور! آپ نے اپنا لمبا چوڑا تعارف کرایا ہے۔ میں نے مندر کو دان دیا۔ آپ کو بہت پسند آیا۔ آپ بھی کوئی ایسا کام کریں جو ہم سب کو پسند آئے بلکہ ساری دنیا کو پسند آئے۔"

"آپ حکم کریں۔ جو کہیں گی، وہ کروں گا۔ بس، آپ سے ایک ملاقات چاہتا ہوں۔"

درگا پرساد نے فوراً ہی کہا "ہاں ہاں، ملاقات ہو جائے گی۔ شانتی ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارا مکان بڑے پوسٹ آفس کے سامنے ہے۔ مکان پر میری نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ میرا نام درگا پرساد ہے۔"

ماریہ نے مسکرا کر کنور بلراج راٹھور سے کہا "یہ میری ڈیڈی اور یہ میرے بھائی ہیں۔ ملاقات کے سلسلے میں مجھے کچھ کہنا چاہیے لیکن مجھ سے پہلے ہی بھائی نے آپ کی مشکل آسان کر دی۔"

وہ سب باتیں کرتے ہوئے مندر کے باہر جانے لگے۔ کنور نے پوچھا "تو پھر کیا خیال ہے؟"

ماریہ نے کہا "ابھی تو میں گھر جا کر آرام کرنا چاہتی ہوں۔ شام کو آسکتے ہو۔"

شیوانی سپاہیوں کے ساتھ مندر کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی آرہی تھی۔ اپنے آس پاس سے گزرنے والی عورتوں کو بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ زبیری نے کہا "ماریہ! شیوانی کو دیکھ کر ذرا بھی پریشان نہ ہونا۔ ڈھیٹ بن جاؤ۔"

وہ بلا، درگا پرساد اور کنور بلراج راٹھور کے ساتھ سیڑھیاں اُترتی آرہی تھی۔ شیوانی اسے غور سے دیکھنے لگی پھر اس کے قریب سے بولی "جسٹ اے منٹ!"

ماریہ کے ساتھ وہ تینوں رک گئے۔ زبیری نے درگا پرساد کے ذریعے پوچھا "کیا بات ہے؟"

شیوانی نے ماریہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ کون ہے؟"

درگا پرساد نے کہا "یہ میری سالی ہے۔"

"یہ کچھ کچھ یورپین لگتی ہے۔"

"یہ پیرس میں پیدا ہوئی۔ پیرس میں جوان ہوئی۔ یورپین لگے گی اب یہاں آکر رہنے لگی ہے۔ ہم اسے آدھا ہندوستانی بنا چکے ہیں۔ پورا بھی بنا دیں گے۔"

"کیا یہ گونگی ہے؟ جواب کیوں نہیں دے رہی ہے؟"

زبیری اس کے دماغ میں آگیا۔ تاکہ وہ مقامی زبان بول سکے۔ وہ بولی "شریمتی جی! میں گونگی نہیں ہوں۔ کیا میری آواز میں مٹھاس ہے؟"

شیوانی سوچنے لگی "یہ ہندی بول رہی ہے مگر یورپین ہے۔ اس لیے مجھے شبہ ہو رہا ہے۔ ابھی میں بے کانفو اور جے فلو سے کہوں گی۔ وہ دونوں اس کے دماغ میں آکر اس کی اصلیت معلوم کریں گے۔"

اس نے موبائل فون آن کر کے انڈین افسر سے اسپتال کے نمبر پوچھے پھر وہ نمبر پنچ کرتی ہوئی ماریہ سے بولی "ویٹ اے منٹ۔ آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ پولیس سے تعاون کریں۔ ہمیں ایک برٹش گرل کی تلاش ہے۔"

اس نے فون انڈین افسر اس طرف بڑھا کر اس سے کہا۔ "اسپتال والوں سے کہو کہ میرے دونوں آدمیوں سے باتیں کرائیں۔"

افسر نے فون پر اسپتال کے کاؤنٹر مین سے بات کی۔ اسے بتایا کہ چار گھنٹے پہلے پولیس والوں نے دو غیر ملکیوں کو وہاں داخل کرایا تھا۔ دوسری طرف سے ان کے نام اور کمرا نمبر پوچھے گئے۔ افسر نے انہیں جے کانفو اور جے فلو کے نام بتائے اور کمرا نمبر بھی بتایا۔ دوسری طرف سے جواب دیا گیا "سوری! آپ کے یہاں سے جاتے ہی وہ دونوں بھاگ گئے ہیں۔ ہمارے وارڈ بوائز نے انہیں اسپتال کے باہر تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہیں آئے۔"

افسر نے فون بند کر کے کہا "میڈم! وہ دونوں اسپتال سے بھاگ گئے ہیں۔"

وہ چونک کر پریشان ہو کر بولی "بھاگ گئے؟ نہیں، وہ تو میرے معمول ہیں۔ وہ کیسے بھاگ سکتے ہیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ٹائٹ میں ہوں گے بابا ہرہا فیصل۔"

"میڈم! اسپتال والے انہیں باہر تلاش کر چکے ہیں۔ جب ہم اسپتال سے باہر نکلے تب ہی وہ دونوں کہیں چلے گئے۔"

کنور بلراج راٹھور نے سخت لہجے میں افسر سے پوچھا "ہمارا راستہ کیوں روکا جا رہا ہے؟ کیا مندر میں گھسنا اور پوجا کرنا جرم ہے؟ میرا نام کنور بلراج راٹھور ہے۔ میری پہنچ راشٹرپتی اور پردھان منتری تک ہے۔ ہمیں جانے دو۔ ورنہ میں تمہاری وردی اتروا دوں گا۔"

افسر نے کہا "میڈم! بہتر ہے، انہیں نہ روکا جائے۔"

شیوانی کی توقع کے خلاف ٹیلی پیتھی جاننے والے جے کانفو اور جے فلو اس کی گرفت سے نکل گئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا پھر کہا "انہیں جانے دو۔"

ٹیلی پیتھی کے فوجداد کارفرہاد علی تیمور کی اس مقبول عام سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں پڑھیے



**ڈیوڈ ہاک** چھریرے جسم کا ایک دراز قد آدمی تھا جو بیالیس سال کا ہونے کے باوجود بیالیس سال کا لگتا نہیں تھا لیکن اس کا زیادہ دارومدار اس بات پر تھا کہ جائزہ لینے والا کون تھا؟ اس کے بچوں کا خیال تھا کہ وہ کافی بوڑھا ہو چکا تھا' اس کی ہڈیوں کے جوڑ کڑکڑانے لگے تھے اور شاید جلد ہی وہ سٹھیانے والا تھا۔

اس کی بیوی سوزن اس کے چھدرے ہوئے بالوں اور عادت واطوار میں شامل ہونے والی کاہلی کو نظرانداز کرنے پر تیار رہتی تھی اور اب بھی اس کے ساتھ اسی طرح پیش آنے کی کوشش کرتی تھی جس طرح نوجوانی میں آیا کرتی تھی۔ ڈیوڈ کے باس مسٹر گاربر اسے "پھرتیلے نوجوان" کہہ کر مخاطب کرتے تھے جہاں تک ڈیوڈ کا اپنا خیال تھا تو وہ اپنے آپ کو ان تینوں درجہ بندیوں کے بیچ بیچ میں کہیں محسوس کرتا تھا۔

موسم خزاں کی اس شام ڈیوڈ دفتر سے گھر آیا اور اس نے کار اپنے ڈرائیوے میں روک کر انجن کی چابی گھمائی اور انجن واقعی بند ہو گیا تو اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ روزانہ جب کار میں اس کا سفر بہ خیر وعافیت پورا ہو جاتا تھا اور کار بالکل اسی طرح چلتی اور رکتی تھی جس طرح وہ چاہتا تھا تو وہ ہمیشہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کرتا تھا۔

ڈیوڈ ایک لائق بزنس مین ایگزیکٹیو تھا۔ اپنے دفتری کام اور کاروباری معاملات میں وہ خوب ماہر تھا لیکن مشینی معاملات میں اس کی معلومات اتنی ہی تھیں جتنی زمانہ قدیم کے کسی چینی کسان کی ہو سکتی تھیں۔ وہ کسی بھی کمپنی کی بیلنس شیٹ پر ایک نظر ڈال کر یہ تو بتا سکتا تھا کہ اس کے شیئرز کب خریدنے اور کب بیچنے چاہئیں لیکن کون سی مشین کس طرح چلتی تھی اور کن بنیادی اصولوں پر کام کرتی تھی' اس قسم کے معاملات کا اسے ذرا بھی علم نہیں تھا اور نہ ہی اس نے کبھی جاننے کی کوشش کی تھی۔

کار کے بارے میں بھی اسے یہ تو معلوم تھا کہ اگنیشن میں چابی گھمانے سے وہ اسٹارٹ ہو جاتی ہے' بریک لگانے سے رک جاتی ہے' اس میں بار بار پیٹرول بھی ڈلوانا پڑتا ہے جو پراسرار انداز میں خرچ ہوتا رہتا ہے' نوجوانی سے ہی ڈیوڈ کار ڈرائیو بھی کر رہا تھا لیکن یہی بات کبھی تھی کہ وہ اب بھی اس کے لیے ایک پراسرار سی چیز کی حیثیت ہی رکھتی تھی۔ انجن کے بارے میں اسے اتنا ہی قطعاً کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس کے نزدیک وہ سب کچھ ٹیڑھے میڑھے اور پراسرار سے کل

**اُس باپ کی کہانی جسے بیٹے کی صلاحیتوں پر شک تھا**

**دل** باپ بیٹوں کی عجیب کتھا۔ بیٹے کے جسم میں دو روحیں والا خون تو باپ کا تھا مگر روح پر اس کا کوئی اشنہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے متضاد تھے مقابلہ خوب تھا اور پھر جب مقابلہ ڈھر ہی جائے تو نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا ہے۔

پرزوں کا مجموعہ تھا۔

اس نے زندگی میں ایک آدھ مرتبہ ہی بونٹ اٹھا کر انجن کو دیکھا اور گھبرا کر فوراً بند کر دیا تھا۔ اس کے پاس مسٹر گاربر کو اس کی اس نااہلی سے نہ جانے کیوں چڑ تھی۔ اگر ڈیوڈ مشینی معاملات میں صفر تھا تو اس سے اس کے دفتری معاملات یا پیشہ ورانہ قابلیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے باوجود موقع آنے پر اس کی سینیارٹی کے باوجود اسے کمپنی میں سیکنڈ وائس پریذیڈنٹ نہیں بنایا گیا تھا۔

مسٹر گاربر کے خیال میں کمپنی کے خاص خاص عہدوں پر کام کرنے والوں کو فٹ بال، گاڑیوں، گولف، فارن پالیسی، بین الاقوامی سیاست، مچھلی کے شکار اور سبزیوں کے بھاؤ وغیرہ کے بارے میں خاطر خواہ معلومات ہونی چاہئیں تھیں۔ دوپہر کے کھانے کے دوران میں مسٹر گاربر کو اگر ان کے علاوہ بھی کچھ چیزیں یاد آجاتی تھیں تو وہ انہیں بھی اس فہرست میں شامل کر دیتے تھے۔

سیکنڈ وائس پریذیڈنٹ بننے کے لالچ میں ڈیوڈ نے کاروں کے بارے میں اپنی معلومات بڑھانے کے لیے کئی کتابیں بھی خریدی تھیں جن میں انجنوں کی ساخت وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا تھا لیکن انہیں پڑھ کر ڈیوڈ کا ذہن پہلے سے بھی زیادہ الجھ گیا تھا اور اس نے اس کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔

دل ہی دل میں اس نے مسٹر گاربر کی ناانصافی پر انہیں کوسا بھی تھا۔ ان کی فرم کا لکڑی کی فروخت کا ہول سیل کا کاروبار تھا۔ ڈیوڈ نے کئی بار جل کر سوچا تھا کہ آخر اس کاروبار کا انجنوں سے کیا تعلق تھا؟ مگر مسٹر گاربر کو کسی سے بھی دل کی خلش کم نہیں ہوئی تھی۔ کبھی کبھی ڈیوڈ کو خود پر بھی غصہ آتا تھا کہ آخر اس کے ذہن میں ایسی کون سی خامی تھی کہ جب چار پہیوں پر چلنے والی کسی چیز کے اجزائے ترکیبی کی بات آتی تھی تو اس کی ساری قابلیت، ذہانت حتیٰ کہ سیکھنے کی صلاحیت بھی جواب دے جاتی تھی۔

کام سے اتر کر ڈیوڈ اندر پہنچا۔ اس کی بیوی سوزن کچن میں تھی اور گرانڈر میں کچھ پیس رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر ڈیوڈ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر "ہیلو" کہا۔ سوزن کے بال سیاہ تھے اور اس کا شمار خوب صورت عورتوں میں کیا جاسکتا تھا۔

"ہیلو، دن کیسے گزرا؟" ڈیوڈ نے رسماً پوچھا۔

"وہی گھر کے کام کاج کرتے۔" سوزن نے طویل سانس لے کر جواب دیا۔

"میں اپنے اور تمہارے لیے مارٹینی تیار کرتا ہوں۔" ڈیوڈ نے اس کے لہجے میں تھکن کی جھلک محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"آج واشنگ مشین خراب ہوگئی تھی۔ جبی اسے ٹھیک کر رہا ہے۔ اگر تہ خانے کی طرف سے عجیب عجیب سی آوازیں سنائی دیں تو پریشان نہ ہونا۔" سوزن نے گویا اسے خبردار کیا۔

جبی ان کے سولہ سالہ بیٹے کا نام تھا اور قدرت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ باپ مشینوں کو سمجھنے یا ان کے نقائص دور کرنے کے معاملے میں جتنا نااہل تھا، بیٹا اتنا ہی ماہر تھا۔ وہ اس معاملے میں گویا پیدائشی طور پر ہی خصوصی ذہانت لے کر پیدا ہوا تھا۔

ابھی جبی کا نام ہی لیا گیا تھا کہ وہ تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا۔ وہ ایک خاصا بڑا ٹول باکس اٹھائے ہوئے تھا۔ باپ کو ہیلو کہنے کے بعد وہ ماں سے مخاطب ہوا "ممی! میں نے مشین بالکل ٹھیک کر دی ہے۔"

"ٹھیک کر دی ہے؟" ڈیوڈ نے رشک آمیز لہجے میں دہرایا پھر پوچھا "اس میں خرابی کیا تھی؟"

جبی نے جواباً اسے تکنیکی زبان میں بتایا کہ خرابی کیا تھی۔ ڈیوڈ کو کچھ یوں لگا جیسے وہ کسی اور سیارے کی زبان بول رہا تھا۔ وہ ہونقوں کی طرح آنکھیں پھیلائے بیٹے کو تکتا کر رہ گیا۔ کبھی کبھی وہ کچھ عجیب شکی سی نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھتا تھا۔ اسے شبہ ہوتا تھا کہ پیدائش کے وقت سے ہی اس کی اپنی روح کے علاوہ بھی کوئی روح اس لڑکے میں گھسی ہوئی ہے۔ وہ روح یا بدروح شاید اپنے وقت کے کسی نابغہ روزگار قسم کے انجینئر کی رہی ہو۔"

جبی جب پانچ سال کا تھا تو اس نے گھر کی تمام گھڑیوں اور کلاکوں کا پرزہ پرزہ الگ کرنا اور پھر انہیں جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں اس نے ریڈیو بنا لیا تھا جو چلتا بھی تھا۔ بارہ سال کی عمر میں اس نے ایک لانچ کا سکیل ماڈل انجن کباڑی سے حاصل کر کے اسے جہاز کے انجن میں تبدیل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے دوستوں کے ساتھ مل کر تختے جوڑ کر ایک جہاز بھی بنا لیا تھا۔ اس میں انجن فٹ کر کے وہ اسے اڑانے کی فکر میں تھا۔

ڈیوڈ نے اس تجربے میں خطرہ محسوس کرتے ہوئے بادل ناخواستہ کافی سختی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ منصوبہ رکوا دیا تھا تاہم چودہ سال کی عمر میں اس نے ایک دوست کے ساتھ مل کر کباڑ خانے سے ایک ناکارہ موٹر سائیکل لے کر اسے ٹھیک کر لیا تھا۔ یہ موٹر سائیکل پہلے ہی سفر کے دوران میں انہوں نے ایک درخت پر دے ماری تھی۔ موٹر سائیکل تو بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی لیکن غنیمت تھا کہ لڑکے خود بچ گئے تھے۔ جبی کا صرف کندھا اور اس کے دوست کے گھٹنے چھلے تھے۔



اس کے بعد ڈیوڈ نے اپنے گیارہ نمبر کے جوتے سمیت پاؤں زمین پر پٹختے ہوئے نہایت سختی سے اعلان کر دیا تھا کہ آئندہ جبی کوئی ایسی چیز چلانے کی کوشش نہیں کرے گا جو سائیکل سے تیز چلتی ہو۔ اس ضمن میں اس نے جبی کو قانونی پہلوؤں سے بھی ڈرانے کی کوشش کی تھی کہ اگر حادثے میں کسی دوسرے کو نقصان پہنچ جائے تو بہت بھاری ہرجانہ، جرمانہ وغیرہ بھی عائد ہو سکتا ہے۔ بغیر لائسنس اس قسم کی چیزیں چلانا مزید سنگین جرم تھا۔ سزا بھی ہو سکتی تھی۔

اس ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ ڈیوڈ نے گویا بیٹے کی دلجوئی اور اشک شوئی کے لیے یہ بھی کہہ دیا تھا "جب تم سولہ سال کے ہو جاؤ گے تو تمہیں ڈرائیونگ لائسنس مل جائے گا۔ تب ہم تمہیں کوئی کار بھی دلا دیں گے۔ اس کے ساتھ تم جو جی چاہے کرتے رہنا۔"

اس وقت ڈیوڈ کے ذہن میں یہی تھا کہ وہ جبی کے سولہ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اگر اسے کوئی کار دلائے گا بھی تو کوئی سیکنڈ ہینڈ کار دلائے گا جو اس نے خود اپنے لڑکپن میں چلائی تھی۔ اسے "ماڈل ٹی" کہا جاتا تھا اور وہ چالیس میل سے زیادہ کی رفتار سے چلتی ہی نہیں تھی۔ اس کی حد رفتار یہی تھی۔ اس سے زیادہ تیز چلنے کی اس کے انجن میں طاقت ہی نہیں تھی۔

چند دن بعد ڈیوڈ اس بات کو بھول ہی گیا تھا۔

جبی اپنا ٹول باکس گیراج میں رکھنے چلا گیا۔ ڈیوڈ مارٹینی کے دو گلاس تیار کر چکا تھا۔ اسی دوران میں اس کی اٹھارہ سالہ بیٹی مولی بھی کچن میں آگئی۔ اس کے بال بھی ماں کی طرح سیاہ تھے اور اس کی خوب صورتی کبھی کبھی ڈیوڈ کو تشویش میں مبتلا کر دیتی تھی۔

"ممی! کیا آپ نے ڈیڈی کو اس بھیانک چیز کے بارے میں بتا دیا ہے؟" مولی نے پوچھا۔

ڈیوڈ نے پوری کوشش کی کہ وہ اس "بھیانک" چیز کے بارے میں متجسس نظر نہ آئے۔ اسے معلوم تھا کہ مولی کسی بھی چیز کا تذکرہ اسی طرح اچانک ڈرامائی انداز میں کرتی تھی "بھیانک چیز" سے اس کی مراد کوئی نئی پرفیوم بھی ہو سکتی تھی، گھر میں نظر آنے والا کوئی کیڑا مکوڑا بھی ہو سکتا تھا اور اس کی بات کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کا کوئی کپڑا پرانا ہو کر اس کی نظر میں بھیانک شکل اختیار کر گیا ہے۔

"نہیں، ابھی میں نے نہیں بتایا۔ ابھی مجھے موقع ہی

حسین سے حسین تر بننے کیلئے
چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے
ہر سمار بس کے تجربے اور تحقیق کے بعد ۲۰ قیمتی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور عرقیات سے تیار کردہ دیرپا فوائد و جوہر، مہاسوں کو بھی صاف کر کے چہرے کی رنگت نکھارتی ہے۔
گلیسی
بلوناٹی کریم
DER
استاکسٹ:
خواجہ انور الیکٹرک اینڈ پارکیٹ صدر کراچی
صدر سیکل اسٹور الیکٹرک اینڈ پارکیٹ صدر کراچی
مسلم جنرل اسٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
ہر ایم ٹی لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
قریشی ایڈورٹائزرز لیاقت مارکیٹ صدر کراچی
قریشی جنرل اسٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
پاکستان جنرل اسٹور، گھر کی ڈاک کیلئے ملیر کراچی
ظہیر بک ایجنسی بندر روڈ کراچی
الحمید بک ایجنسی بندر روڈ کراچی
ہاشمی بک ایجنسی بندر روڈ کراچی
ہاشمی بک ایجنسی بندر روڈ کراچی
ہاشمی

نہیں ملا۔" سوزن نے جواب دیا۔

اسی اثنا میں جمی بھی گیراج سے لوٹ آیا۔ اس نے بھی متجسس انداز میں کچھ اسی قسم کا سوال کیا "ممی! آپ نے بات کی؟"

"نہیں۔ میں بعد میں بات کروں گی۔" سوزن نے جواب دیا۔

ڈیوڈ کو بھی معلوم تھا کہ "بعد میں" بات کرنے سے سوزن کی مراد یہ ہوتی تھی کہ جب ڈیوڈ کھانا کھا چکا ہوگا' تب بات چھیڑی جائے گی تاکہ پیٹ بھرا ہونے کی وجہ سے اسے کم غصہ آئے۔ بھوکے پیٹ انسان کو زیادہ غصہ آتا ہے۔

مولی اس کے باوجود بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میں اٹھارہ سال کی ہوں جب کہ جمی صرف سولہ سال کا ہے۔ میرے حقوق اس سے زیادہ ہیں۔ میں باقاعدہ ڈرائیونگ سیکھ چکی ہوں۔ میرے پاس لائسنس بھی ہے۔ اس لیے اگر کوئی چیز خریدی جائے تو اس میں میری رائے بھی شامل ہونی چاہیے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہماری مرضی کے بغیر بھی جا کر وہ ناکارہ "فرٹیلیا" کیسے خرید کر لا سکتا ہے جو اسٹارٹ بھی نہیں ہوتی۔ چلنا تو دور کی بات ہے۔"

"کوڑھ مغز لڑکی! تمہیں معلوم بھی ہے کہ "فرٹیلیا" کار کیا ہوتی ہے؟" جمی غصے سے بولا۔

"کیا۔۔۔ تم نے مجھے کوڑھ مغز کہا؟" مولی چلا اٹھی "تم اگر دماغ کی جگہ ٹول باکس اٹھائے پھر رہے ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم دوسروں کو کوڑھ مغز کہو۔"

جمی دھمکی آمیز انداز میں انگلی اٹھا کر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ڈیوڈ چلا اٹھا "بند کرو یہ لڑائی۔۔۔" اس نے اعصاب پر قابو رکھنے کے لیے مارٹینی کا بڑا سا گھونٹ بھرا اور حتی الامکان پرسکون لہجے میں بولا "یہ باتیں کس سلسلے میں ہو رہی ہیں؟ فرٹیلیا کس چیز کا نام ہے؟"

اس کا اندازہ یہی تھا کہ فرٹیلیا شاید کسی نئی قسم کی کھاد کا نام ہوگا۔

"خدا کی پناہ ڈیڈی!" جمی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر باپ کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ کو واقعی معلوم نہیں کہ فرٹیلیا کسے کہتے ہیں؟"

اس کے کہنے کے انداز سے صاف طور پر ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہا تھا۔ اس کا خیال یقیناً یہی تھا کہ جس شخص کو یہ معلوم نہیں تھا کہ فرٹیلیا کس چیز کا نام تھا اس کے پاس دماغ نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔

"ہیں' مجھے واقعی معلوم نہیں کہ فرٹیلیا کسے کہتے ہیں۔" ڈیوڈ نے پروقار انداز میں اعتراف کیا "مگر مجھے دوسری بہت سی باتیں معلوم ہیں۔"

جمی نے گویا کسی کمسن اور ذہنی طور پر پسماندہ بچے کو سمجھانا شروع کیا "ڈیڈی! فرٹیلیا اپنے وقت کی سب سے مہنگی اور سب سے اچھی کار ہے۔ ۱۹۳۷ء میں اس کمپنی نے یہ کار بنانا بند کر دی تھی۔ چار سال پہلے پھر بنانا شروع کی ہے لیکن اب وہ بس سنے زمانے کی دوسری کاروں ہی جیسی ہے اور قیمت بھی پچاس ہزار ڈالر ہے جب کہ یہ ۱۹۳۷ء ماڈل کی فرٹیلیا جس کا ذکر ہو رہا ہے' ایک بڑی بی کے باڑے میں کھڑی ہے۔ وہ صرف جگہ خالی کرنے کے لیے اسے بیچنا چاہ رہی ہیں۔ باڑے میں ان کا داماد اپنے رہنے کے لیے کمرا بنانا چاہتا ہے۔ بڑی بی اس کار کے صرف آٹھ سو ڈالر مانگ رہی ہیں۔ میرے پاس جتنے پیسے تھے وہ میں بیعانے کے طور پر انہیں دے آیا ہوں۔ میرے پاس ساڑھے بارہ ڈالر تھے۔ میں نے اس لیے فوراً دے دیئے کہ کہیں کوئی اور اس کار کو نہ لے جائے۔"

"اس گاڑی کے ٹائر بھی نہیں ہیں۔۔۔ کھڑے کھڑے گل چکے ہیں۔" مولی نے گویا باپ کو خبردار کیا۔

"ٹائر کون سی ایسی اہم چیز ہیں۔۔۔" جمی بڑبڑایا۔ "دیکھنے کی چیز تو انجن ہوتا ہے اور اس کا سسپنشن سسٹم۔ ٹینک بنائی جانے والی کاروں میں سب سے انوکھا ہے۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

"اس کی چھت گلی ہوئی ہے۔" مولی نے لقمہ دیا۔

اس بار جمی سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بولا "اس کے بریکوں کے ڈرم بھی سب کاروں سے الگ ہیں۔"

"کیا واقعی فرٹیلیا کار کا نام ہے؟" ڈیوڈ کو گویا اب تک یقین نہیں آ رہا تھا اور وہ دم بہ خود بیٹھا تھا۔

"صرف جمی کے خیال میں وہ کار ہے۔" مولی طنزیہ لہجے میں بولی "جس فرٹیلیا کا یہ ذکر کر رہا ہے' میرے خیال میں تو وہ بس زنگ آلود لوہے کا ایک ڈھیر ہے۔ اگر ہم گھر میں دوسری کار لانے ہی لگے ہیں تو ایسی کار لینی چاہیے جو کم از کم چلتی تو ہو۔"

"دوسری کار۔۔۔؟" ڈیوڈ کا منہ حیرت سے کچھ اور کھل گیا "کس نے کہا کہ ہم گھر میں دوسری کار لا رہے ہیں؟"

"تم نے کہا تھا۔" سوزن بولی۔

"میں نے۔۔۔؟" ڈیوڈ گویا حیرت سے گرتے گرتے بچا "میں نے کب کہا تھا؟"

"دو سال پہلے۔" جمی نے جواب دیا "جب میں نے موٹر



سائیکل درخت میں ماردی تھی تو آپ نے کہا تھا کہ جب میں دو سال کا ہو جاؤں گا تو آپ مجھے کوئی کار لے دیں گے اور اس کے ساتھ میرا جو جی چاہے گا کروں گا۔ کیا آپ بھول گئے ڈیڈی؟"

ڈیوڈ کو یاد آگیا کہ اس نے یہ بات کہی تھی۔ اب وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بے چارگی کے سے انداز میں اثبات میں سر ہلایا "ہاں۔۔۔ کہا تو تھا۔"

جمی نے فاتحانہ نعرہ بلند کیا پھر بولا "میں نے تو اسی لیے سستی ترین سیکنڈ ہینڈ کار ڈھونڈی ہے کہ آپ پر کم سے کم بوجھ پڑے اور پھر بھی ہم فائدے میں رہیں گے۔ یوں سمجھیں ہم نے بھاؤ میں سونا خرید رہے ہیں۔ میرے دوست فریڈی نے کہا ہے کہ وہ اسے گھر میں لانے میں میری مدد کرے گا۔"

"ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ۔۔۔ اتنا زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہے۔۔۔ میں نے تمہیں کار دلانے کا وعدہ کیا تھا لیکن تم کوئی ماڈل ٹی کیوں نہیں لے لیتے؟"

"ماڈل ٹی۔۔۔؟" جمی کے بجائے مولی نے کہا "یہ کیا چیز ہوتی ہے؟"

"یہ بھی کار کا نام ہے۔" ڈیوڈ قدرے خفگی سے بولا "اب میں نوجوان تھا۔"

جمی اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا "ڈیڈی! ماڈل ٹی کا گیئر اور آئل سسٹم آج کے دور میں ناکام ہو چکا ہے اور اس نام کی کار اب اچھی حالت میں ملے گی بھی نہیں۔ یہ وہ تو اپنے عروج کے زمانے میں بھی ایک کھٹارا اور بے کار کار تھی۔"

ڈیوڈ کو شرمندگی ہونے لگی کہ اس نے کیوں ماڈل ٹی کا نام لیا۔ مولی بولی "بہرحال کار ایسی ہونی چاہیے جسے میں بھی چلا سکوں۔ گلی کے کونے والے گھر میں بیٹے کے لیے ایک کار کھڑی ہے جو چلتی بھی ہے۔ وہ لوگ اس کے صرف ساڑھے سات سو ڈالر مانگ رہے ہیں۔"

"تم صرف اس کے چلنے کو بہت بڑی خوبی سمجھ رہی ہو۔" جمی ناک سکیڑ کر بولا "جس دن فرٹیلیا چلے گی' اس دن اس کی چیزوں کو اپنے ساتھ اڑا کر لے جائے گی۔"

"اچھا' اچھا ٹھیک ہے۔" ڈیوڈ نے گویا ان دونوں کی بحث ختم کرانے کے لیے ہاتھ اٹھا کر کہا "تم دونوں اب اوپر اپنے اپنے کمروں میں جاؤ۔ میں اور تمہاری ماں کار کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔"

دونوں بہن بھائی اوپر جا چکے تو سوزن شوہر سے مخاطب ہوئی "جمی پر یہ تمہاری ہی تعلیمات کا اثر ہے۔"

"میری تعلیمات کا؟" ڈیوڈ نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں۔۔۔ تم ہی اسے اس کے بچپن سے سمجھاتے آئے ہو کہ جب بھی چیز خریدو' بہترین خریدو ورنہ مت خریدو۔ اچھی چیز کے لیے پیسے جمع کرو۔ پیسے کم ہوں تو سستی چیز مت خریدو۔ اچھی چیز کے لیے وسائل جمع کرنے کی کوشش میں لگے رہو۔ طویل عرصے بعد جا کر معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں اچھی چیز سستی پڑتی ہے۔"

"یہ تو میں جوتوں' جرابوں' ٹائپ رائٹروں اور کھیل کود کی چیزوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا کرتا تھا۔" ڈیوڈ بولا۔

"بہرحال اس نے تو سب چیزوں کے بارے میں یہ فارمولا بنا لیا ہے۔ کاروں کے بارے میں وہ اتنا کچھ جانتا ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اگر اس کا دل اس فرٹیلیا پر آ چکا ہے تو تم اسے وہ لینے دو۔ کم از کم وہ اس میں الجھ کر مصروف تو رہے گا۔۔۔ شکر کرو کہ اس کی نظر اتنی پرانی کار پر پڑی ہے جو اتنی سستی مل رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈیوڈ سر ہلاتے ہوئے بولا "لیکن میرے باس کی بیوی جو ڈھیر سے اس بات کا ذکر نہ کرو بتا کہ میں نے بیٹے کو آٹھ سو ڈالر میں ایسی کار دلا دی ہے جو اسٹارٹ بھی نہیں ہوتی۔ اگر یہ بات بیوی کے ذریعے گاڑیوں تک پہنچ گئی تو وہ میرا بہت مذاق اڑائے گا۔ وہ پہلے ہی مشینری کے بارے میں میری کم علمی پر سب کے سامنے مجھے مذاق کا نشانہ بناتا رہتا ہے۔"

○☆○

دوسرے روز ڈیوڈ نے دفتر سے واپسی پر گاڑی اپنے گھر کے ڈرائیوے میں موڑی اور گیراج میں لے جانے ہی لگا تھا کہ گیراج کے دروازے پر اسے اچانک بریک لگانا پڑی۔ گیراج کافی کشادہ تھا لیکن اس وقت وہ "کھچا کھچ" بھرا ہوا لگ رہا تھا۔ نیلی ڈانگریوں والے تین لڑکے دروازے کی طرف پشت کیے کھڑے تھے۔ ان کی ڈانگریوں پر' پشت پر "آٹو نیگیشن" کے الفاظ نمایاں طور پر کڑھے ہوئے تھے۔

چھت کی بیم میں موٹی زنجیر کے ذریعے بڑی سی کوئی سیاہ چیز لٹکی ہوئی تھی جس کے بارے میں چند سیکنڈ کے غور و خوض کے بعد ڈیوڈ اسی نتیجے پر پہنچا کہ وہ کسی کار کا انجن تھا۔ ڈانگریوں والے تینوں لڑکے اس پر کچھ کام کر رہے تھے اور جمی گویا ان کی نگرانی کر رہا تھا اور انہیں ہدایات دے رہا تھا۔

باقی کار بھی "تقسیم شدہ" حالت میں آس پاس موجود تھی۔ کٹے پھٹے اور گلے ہوئے ٹائر ایک کونے میں کھڑے تھے۔ کار اپنے تاروں والے اور نمایت زنگ خوردہ پہیوں

کے ساتھ لکڑی کے بلاکوں پر کھڑی تھی۔ اس کی باڈی کا اوپری حصہ الگ کر کے ایک طرف رکھ دیا گیا تھا۔ وہ حصہ زنگ سے گلا ہوا تھا اور چپکے ہوئے ایک چھوٹے سے خیمے سے مشابہ نظر آرہا تھا۔ سیٹوں اور کار کی دیواروں پر چڑھا ہوا چمڑا جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور اس میں سے اسپرنگ، تاریں وغیرہ جھانک رہی تھیں۔ ڈیوڈ چند لمحے تو کار میں ہی ساکت بیٹھا ان سب چیزوں کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔ یہ درحقیقت اس کے آٹھ سو ڈالر تھے جو اس طرح گاڑی کے انجر پنجر کی صورت میں بکھرے ہوئے تھے۔

اچانک جمی کی نظر اس پر پڑی اور وہ ہاتھ ہلا کر بامچیں کھلاتے ہوئے بہ آواز بلند بولا "ہائے ڈیڈی۔ یہ ہے وہ کار۔ خوب صورت ہے نا؟"

اس کار کے لیے "خوب صورت" کا لفظ سن کر ڈیوڈ بھونچکا رہ گیا۔ اس کے ذہن میں اس کے برعکس کئی دوسرے الفاظ آئے تھے۔ جن میں سے بعض قدرے غیر مہذبانہ بھی تھے۔ اس نے بہ مشکل انہیں زبان پر آنے سے روکا۔ ڈانگریوں والے تینوں لڑکوں کو وہ اس سے پہلے عام کپڑوں میں گھر کے آس پاس دیکھ چکا تھا۔ وہ یقیناً پاس پڑوس ہی کے لڑکے تھے لیکن اس وقت وہ انجن کے مختلف حصوں پر طبع آزمائی کرتے ہوئے کچھ ایسی اصطلاحوں میں بات کر رہے تھے کہ ڈیوڈ کو وہ خلائی مخلوق لگ رہے تھے۔ ان کی کوئی بات ڈیوڈ کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ان کی سنجیدگی اور انہماک بھی قابل دید تھا۔ شاید ایسی لیبارٹری میں سائنس دان بھی ایسی سنجیدگی اور انہماک سے کام نہیں کرتے ہوں گے۔ ان کے ہاتھ گریس سے سیاہ تھے۔ چہروں پر بھی تیل اور گریس کے دھبے لگے ہوئے تھے۔

ڈیوڈ کو اندازہ ہو گیا کہ اب وہ اپنی کار کچھ عرصے تک گیراج میں کھڑی نہیں کر سکے گا چنانچہ وہ اسے باہر ہی چھوڑ کر اتر آیا۔ صابرانہ اور شاکرانہ انداز میں ٹھنڈی سانس لے کر وہ بولا "خدا کرے اس میں واقعی کسی معجزے کے تحت تھوڑی بہت خوب صورتی آجائے۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے گھر میں داخل ہو گیا۔ سوزن کچن میں سلاد بنا رہی تھی۔ اس کے ہیلو کے جواب میں ڈیوڈ گیراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تقریباً رو دینے والی آواز میں بولا "میں اپنے آٹھ سو ڈالر کا انجام دیکھ کر آرہا ہوں۔ وہ چیز جسے جمی "خوب صورت" کار کہنے پر بضد ہے مجھے امید نہیں ہے کہ اسے کبھی سڑک پہ چلانا نصیب ہو گا۔"

"یہ تو مجھے بھی توقع نہیں تھی کہ کار اس حالت میں ہو گی۔" سوزن نے اعتراف کیا "لیکن مجھے جمی کی بات پر یقین ہے کہ وہ اسے اس رفتار سے چلانے کے قابل بنا لے گا کہ وہ آس پاس کی چیزوں کو بھی اڑا کر لے جایا کرے گی۔"

اسی اثنا میں مولی بھی کچن میں آگئی اور منہ بناتے ہوئے بولی "ڈیڈی! آپ نے وہ چیز دیکھی جسے جمی کار کہہ رہا ہے؟"

"ہاں۔" ڈیوڈ کراہنے کے سے انداز میں بولا۔

"جمی کی تو جو حالت ہے سو ہے، وہ ہیر الڈ وہائٹ بھی اس کاٹھ کباڑ کو دیکھ کر یوں خوشی سے اچھل رہا تھا جیسے اسے خزانہ مل گیا ہو۔" مولی قدرے غصے سے بولی۔

"یہ ہیر الڈ وہائٹ کون ہے؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"جو اس وقت وہائٹ کے بجائے کالا نظر آرہا ہے یعنی جس کے ہاتھوں اور منہ پر سب سے زیادہ گریس لگا ہوا ہے۔" مولی نے بتایا۔ "گریس میں لتھڑا کردہ سب سمجھ رہے ہیں کہ اس وقت وہ دنیا کے سب سے عقل مند انسان ہو گئے ہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے کچن سے باہر چلی گئی۔

ڈیوڈ خود کلامی کے سے انداز میں بولا "میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ لڑکے گاڑی کو دوبارہ جوڑیں گے بھی؟ گاڑی تو الگ الگ ٹکڑوں کی صورت میں گیراج میں بکھری پڑی ہے بلکہ یوں سمجھو کہ میرے آٹھ سو ڈالر بکھرے پڑے ہیں۔"

اس نے افسوس زدہ سے انداز میں سر ہلایا اور اپنے کمرے میں جا کر شام کا اخبار دیکھنے لگا۔ جب سوزن نے اسے کو رات کے کھانے کے لیے بلایا اور جمی بھی میز پر آیا تو حیرت انگیز طور پر اس کے ہاتھ صاف ہو چکے تھے اور انسانی ہاتھ ہی دکھائی دے رہے تھے۔

"اف میرے خدا!" وہ بے ساختہ مسرت آمیز بلند آواز نکالتے ہوئے بولا "اس گاڑی کا انجن تو گھڑی کی مشین کی طرح بنا ہوا ہے۔" اس کے بعد اس نے پرزوں کے نام لے کر ان کی تعریفیں کرنا شروع کیں۔ وہ سب کے نام ڈیوڈ کے لیے ناقابل فہم تھے۔

آخر میں وہ بولا "اور اس کے پہیے! واہ۔۔۔ کیا زبردست ہیں!"

"ان پر زنگ بھی بڑا زبردست لگا ہوا ہے۔" مولی نے لقمہ دیا۔

"کوڑھ مغز! تمہیں تو زنگ کے علاوہ کچھ نظر آ ہی نہیں سکتا۔ جب وہ زنگ اترے گا اور پہیوں پر دوبارہ کروم کی تہ چڑھے گی پھر دیکھنا۔ وہ بورونی کمپنی کے وہیل ہیں جو اب ملتے بھی نہیں ہیں۔ بورونی کے وہیل دنیا کے بہترین وہیل ہوتے ہیں۔"



"ہمیں تو فی الحال صرف یہ معلوم ہے کہ وہ گاڑی چلتی نہیں ہے۔" مولی منہ بنا کر بولی۔

"چند دن ٹھہر جاؤ۔ پھر تم اس میں سیر کرنے کے لیے منت کرتی پھرو گی۔" جمی بولا۔

"خدا نہ کرے کہ مجھ پر ایسا دن آئے۔" مولی بولی۔

کھانے کے بعد جمی دوبارہ گیراج میں چلا گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ واپس آیا۔ ڈیوڈ اور سوزن اس وقت تاش کھیل رہے تھے۔ جمی بولا "ممی! آپ کا وہ بڑی چیزیں نکلنے والا فرائنگ پین کہاں ہے؟"

"چولھے کے دائیں طرف والی کیبنٹ میں۔" سوزن نے بے دھیانی سے جواب دیا۔ اس کا دھیان کھیل میں تھا۔

کچھ دیر بعد دونوں میاں بیوی کافی بنانے کے ارادے سے کچن میں گئے تو یہ دیکھ کر انہیں حیرت کا جھٹکا لگا کہ بڑا فرائنگ پین نائشے کی میز پر رکھا تھا۔ اس میں سیاہ رنگ جیسا کوئی مادہ موجود تھا اور اس سیال میں عجیب عجیب سے کچھ پرزے بھیگ رہے تھے۔ بعض پرزے تو اچھی خاصی ڈراؤنی سی ساخت کے تھے۔

"ڈیوڈ نے پچھلے دروازے پر جا کر زور سے پکارا "جمی!"

جمی دوڑا دوڑا آیا۔ ڈیوڈ نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ تم نے ناشتے کی میز پر کیا کاٹھ کباڑ رکھ دیا ہے؟"

"یہ کاٹھ کباڑ نہیں ہے ڈیڈی! کاربوریٹر وغیرہ ہیں۔ انہیں میں نے صفائی کے خاص آئل میں ڈالا ہوا ہے۔ گیراج میں ٹھنڈ زیادہ اور روشنی کم ہے جب کہ یہ ذرا نازک چیزیں ہیں۔ میں نے سوچا تھا ان کی صفائی یہاں کچن میں آرام سے بیٹھ کے بعد میں کروں گا۔"

"اور۔۔۔ اور تم نے انہیں میرے بڑے فرائنگ پین میں ڈال دیا!" سوزن گویا صدمے سے بے حال ہوتے ہوئے بولی۔

"اس کام کے لیے ہمیں کوئی بڑا ہی برتن چاہیے تھا ممی!" جمی نے معقولیت سے کہا۔

○☆○

آنے والے دنوں میں گویا "آپریشن فرٹیلیا" نے پورے گھر کو لپیٹ میں لے لیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر کاربوریٹر وغیرہ کا مستقل ڈیرا تھا۔ رولر بیئرنگ اور بہت سے نٹ بولٹ وغیرہ جمی کے کمرے میں تھے۔ جوڑنے والی راڈز، رسٹ پن، رنگ کلپسٹن، سیلنڈر ہیڈ، گیس کٹ وغیرہ پورے تہ خانے میں پھیل چکی تھیں۔ وہیں والوز دیوار کے سہارے نہایت احتیاط سے کھڑے تھے اور ان کے اوپر دیوار پر ہدایات بھی کاغذ پر لکھ کر چسپاں کی گئی تھیں، براہِ مہربانی انہیں ہاتھ نہ لگائیں۔" "پرزوں کو اگر کسی فرد کی غلطی سے کوئی نقصان پہنچا تو اسے اس کی پوری ذمے داری قبول کرنا پڑے گی۔" وغیرہ وغیرہ۔

ایک روز سوزن نے اوون کا نچلا خانہ کھولا تو اسے اس میں بھی کچھ پرزے رکھے ہوئے ملے۔ وہ حیران رہ گئی۔

"یہ جنریٹر اور اسٹارٹر ہیں۔ یہاں خنک ہونے کے لیے رکھے ہیں۔" جمی نے وضاحت کی۔

اس دوران میں موسم خزاں کی بارشیں بھی شروع ہو گئی تھیں جو خزاں کے رخصت ہونے کے علامت تھیں۔ گھر کی اصل کار بارش میں بھی گیراج سے باہر کھڑی رہتی تھی۔ اسے گیراج میں داخل کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ڈیوڈ کئی بار چلایا "میری آٹھ ہزار ڈالر کی کار بارش میں کھڑی رہتی ہے اور وہ آٹھ سو ڈالر کا کاٹھ کباڑ گیراج میں رکھا ہوا ہے۔" مگر لڑکوں کے کان پر جوں نہ رینگی۔ اس دوران میں گیراج سے کار کی باڈی کا بالائی حصہ غائب ہو چکا تھا۔

جمی نے اپنے ایک دوست کا نام لیتے ہوئے بتایا "آرٹی کے والد کی چھوٹی سی فاؤنڈری ہے۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ باڈی کے اس ٹاپ کو بالکل نئے جیسا بنا دیں گے اور ہم سے صرف لاگت کے پیسے لیں گے۔ محنت کا کوئی معاوضہ وغیرہ نہیں لیں گے۔"

پھر کار کے پہیے غائب ہو گئے۔ ان کے بارے میں جمی نے اطلاع دی "میرے ایک دوست کے چچا کا کروم اور پالش وغیرہ کے کام کا کارخانہ ہے۔ ہم نے پہیے انہیں کروم کی تہ چڑھانے کے لیے دیے ہیں۔"

یوں کار کی مختلف چیزیں کہیں نہ کہیں مرمت کے لیے جا رہی تھیں اور ہر جگہ کسی نہ کسی حوالے سے لڑکوں کی واقفیت نکل آتی تھی۔ ان دنوں میں ڈیوڈ کے گھر میں کھانے کا خرچ کافی بڑھ گیا تھا کیونکہ لڑکے دوپہر اور رات کے کھانے کے وقت بھی اکثر وہیں موجود رہتے تھے تاکہ وقت ضائع نہ ہو اور کام تسلسل سے جاری رہ سکے۔

ایک روز چند انجن لڑکے ایک پک اپ ٹرک لے کر آن پہنچے اور فرٹیلیا کی بچی کھچی باڈی اٹھا کر لے گئے۔

"یہ لوگ باڈی کی ڈینٹنگ پینٹنگ اور اندر کا کام کرتے ہیں۔" جمی نے بتایا "یہ میرے دوست بیوی کے ڈیڈی کا کاروبار ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ سارا کام کر دیں گے اور صرف میٹیریل کا خرچ لیں گے۔"

ایک روز ایک کوریئر سروس والا بڑا سا پارسل لے کر

آن پہنچا۔ اس کا سامنا ڈیوڈ سے ہوا۔

"آپ ڈیوڈ ہاک ہیں؟" اس نے تصدیق چاہی۔

ڈیوڈ نے خوشی خوشی اثبات میں سرہلایا کہ شاید اس کے نام کسی بھولے بسرے دوست نے کوئی تحفہ بھیجا تھا۔ کوریئر سروس والے نے اس سے رسید پر دستخط کرانے کے بعد کہا "دو سو چوبیس ڈالر عنایت فرمادیجیے۔"

"کیا؟" ڈیوڈ کی آنکھیں پھیل گئیں اور پیکٹ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

"یہ اٹلی سے آیا ہے اور اس شرط پر منگایا گیا ہے کہ یہاں اس کی وصولی کے وقت ادائیگی کردی جائے گی۔" کوریئر نے وضاحت کی۔

"اسے واپس لے جاؤ۔" ڈیوڈ نے پارسل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"واپس تو یہ نہیں جاسکتا۔" کوریئر نے اسے چھوئے بغیر کہا "ویسے بھی آپ اسے وصول کرچکے ہیں۔"

اسی اثنا میں جمی دوڑتا ہوا گیراج سے باہر آیا اور کوریئر والے کو دیکھ کر گیراج کی طرف منہ کرکے مسرت بھرے انداز میں چلایا "دوستو! اٹلی سے پارسل آگیا۔"

اس کے چاروں باوردی ساتھی بھی دوڑتے ہوئے گیراج سے نکل آئے اور ان سب نے ڈیوڈ اور کوریئر کو گھیرلیا۔ جمی نے پارسل ڈیوڈ کے ہاتھ سے لے کر فوراً ہی پیکنگ پھاڑ کر اسے کھول بھی ڈالا۔

"اس میں ہے کیا؟" ڈیوڈ نے درد بھری آواز میں پوچھا۔

"پسٹن ہیں... فرٹیلیا کے پسٹن یہاں نہیں مل رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اٹلی کے ایک ڈیلر کا ایڈریس تلاش کرکے اس سے منگوائے ہیں۔" جمی نے فخریہ انداز میں بتایا۔

"خدا کی پناہ! حد ہوگئی۔ یعنی تم نے مجھ سے پوچھے بغیر دو سو چوبیس ڈالر کے پرزوں کا آرڈر دے دیا۔ میں ہرگز اس رقم کی ادائیگی نہیں کروں گا۔" ڈیوڈ غصے سے پاؤں پٹخ کر بولا۔

"رقم ہمارے پاس ہے۔" جمی نے کہا اور گیراج میں چلا گیا۔ چند لمحے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چند گریس زدہ نوٹ تھے۔ کوریئر نے رقم لے کر بقایا اسے دیا اور متاسفانہ سے انداز میں باری باری سب کی طرف دیکھ کر رخصت ہوگیا۔

"جمی! میرے ساتھ ذرا اندر چلو۔" ڈیوڈ نے سر کے اشارے کے ساتھ ذرا گمبھیر لہجے میں کہا اور عقبی دروازے سے کچن کی طرف چل دیا۔ جمی سعادت مندی سے اس کے پیچھے آگیا۔

"تمہارے پاس دو سو چوبیس ڈالر کہاں سے آئے؟" ڈیوڈ نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" جمی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"میرے پاس بہت وقت ہے۔" ڈیوڈ بدستور گرمی سنجیدگی سے بولا۔

"آپ ہی نے تو ایک مرتبہ مجھے کاروبار کا اصول سکھایا تھا کہ جب کسی شخص کے پاس کوئی اچھا منصوبہ ہوتا ہے لیکن اس پر عمل درآمد کے لیے پوری رقم نہیں ہوتی تو وہ لیڈ کمپنی بنادیتا ہے۔ اس کے شیئرز فروخت کرکے وہ رقم حاصل کرتا ہے۔ کچھ لوگ اس کمپنی کی ملکیت اور منافع میں شریک ہوجاتے ہیں۔ جب اس کے پاس زیادہ رقم آجاتی ہے تو وہ اپنے شیئرز مارکیٹ سے واپس خرید کر رفتہ رفتہ دوسرے شیئرز ہولڈرز کو بے دخل کرسکتا ہے اور خود پورے کاروبار کا مالک بن سکتا ہے۔"

"اچھا؟ یہ بات میں نے تمہیں بتائی تھی؟" ڈیوڈ نے قدرے حیرت سے کہا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے کب اس قسم کا عالمانہ معاشی لیکچر دیا تھا۔ اسے فضول سی لگتی تھی لیکن جمی نے اسے یاد رکھا تھا۔

"جی ہاں' چنانچہ میں نے ایک لیڈ کمپنی بنائی اور پچاس ڈالر فی شیئر کے حساب سے اپنے چاروں "آٹو نیکٹیرز" ساتھیوں کو ایک ایک شیئر بیچ دیا۔ کچھ رقم کا بندوبست میں نے خود اپنی پاکٹ منی سے کیا۔ پسٹن تو آخر حاصل کرنے ہی تھے نا۔"

"اور ان لڑکوں کو شیئرز کے بدلے کیا ملے گا؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"ایک تو وہ فرٹیلیا جیسی کار پر کام کرنے کا تجربہ حاصل کررہے ہیں۔ آپ ہی نے کہا تھا کہ جس کمپنی میں لوگ کام کررہے ہوں اگر اس میں ان کے شیئرز بھی ہوں تو وہ زیادہ محنت سے کام کرتے ہیں چنانچہ میں نے ان "کارکنوں" کو شیئر ہولڈر بنالیا ہے۔ جب کار تیار ہوجائے گی تو خاص خاص موقعوں... مثلاً اسکول کی سالانہ ڈانس پارٹی... کسی تقریب... یا اپنی کسی دوست سے ملاقات کے وقت یہ لوگ باری باری یہ کار لے جاسکیں گے۔ سمجھ گئے آپ؟" جمی نے مربیانہ سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں... میرا خیال ہے سمجھ ہی گیا ہوں۔" ڈیوڈ نے بے یقینی سے سرہلایا "اور تم اپنے یہ دو سو ڈالر کے شیئرز واپس



کیسے خریدو گے؟"

"اس سلسلے میں' میں نے پہلے ہی بینک کے منیجر مسٹر ہارٹن سے بات کرلی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب کار تیار ہوجائے گی تو اسے رہن رکھ کر وہ مجھے آسانی سے دو سو ڈالر قرض دے دیں گے جو میں صرف پندرہ ڈالر ماہانہ کی صورت میں واپس کرسکتا ہوں۔ بینک کا منافع کل رقم پر صرف پندرہ فیصد ہوگا۔ بس قرضہ حاصل کرنے کے لیے فارم پر آپ کو میرے ضامن کے طور پر دستخط کرنے ہوں گے۔"

"تمہارے خیال میں تم اپنی پاکٹ منی میں سے پندرہ ڈالر ماہوار قسط دے سکو گے؟" ڈیوڈ نے دریافت کیا۔

"جب کار تیار ہوجائے گی تو میں صبح دریا کے پار والے گھروں میں اخبار ڈالنے کا کام پکڑلوں گا۔ میں نے اخبار کے ڈیلر مسٹر کارٹر سے بات کرلی ہے۔ انہیں وہاں بہت سے گھروں میں اخبار پہنچوانے کے لیے آدمی کی سخت ضرورت ہے۔ وہ بڑا معقول کمیشن دیں گے جس سے میری اضافی آمدنی شروع ہوجائے گی۔ میں نے سب حساب لگالیا ہے ڈیڈی!"

"اچھا؟" ڈیوڈ بہت سے صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"ایک اور خوش خبری یہ ہے کہ جن جن جگہوں پر گاڑی کے مختلف حصوں کا کام ہونے گیا ہے' وہ ہمارے کام رعایتی داموں پر تو کررہی رہے تھے لیکن اب نہیں وہ رعایتی پیسے بھی نہیں دینے پڑیں گے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ڈیوڈ نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت اسے کار کے چند پرزوں کے نام یاد تھے جو اس نے جمی کی زبانی سنے تھے۔ گو کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ پرزے کیا تھے اور ان کا کام کیا تھا لیکن اس نے جمی سے سنی ہوئی باتیں نہایت متانت سے دہراتے ہوئے کہا "وہ چھ سیلنڈروں والی کار ہے۔ اس میں ڈبل اوور ہیڈ کیم شافٹ ہے۔ ٹوورژن بار سسپنشن سسٹم ہے جو اس کے معیار کا کبھی کسی گاڑی میں نہیں بنایا گیا۔ بریکوں کے ڈرم ایسی ساخت کے ہیں کہ بریک لگتے ہی کاریں رکتی ہے جیسے پتھر کی دیوار سے ٹکرا گئی ہے۔ پورٹی وہیل لگے ہوئے ہیں اس میں ... اور بارہ وولٹ کا الٹی نیشن سسٹم ہے۔ جب وہ چلے گی تو اس پاس کی چیزوں کو اڑاتی ہوئی لے جائے گی۔"

یہ کہہ کر ڈیوڈ اپنی جگہ سے اٹھا اور پروقار انداز میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "اچھا... اب میں چلتا ہوں۔ مجھے کچھ کام کرنا ہے۔"

مسٹر گاربر حیرت سے منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے

## ثبوت

"میرے شوہر بہت وفادار ہیں۔ میرے سوا وہ کسی عورت کے چکر میں نہیں رہتے۔"

"یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"جب میں انہیں بتاتی ہوں کہ وہ نیند میں باتیں کرتے ہیں تو یہ سن کر وہ بالکل پریشان نہیں ہوتے۔"

ہے آٹھ سو ڈالر میں تم نے ایک سفید ہاتھی خریدا ہے جسے کسی کی کار سے باندھ کر تمہارے گیراج تک لانا پڑا تھا؟" یہ کہتے ہوئے انہوں نے دو سروں کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔

ڈیوڈ کو اپنے کانوں کی لویں تپتی محسوس ہوئیں۔

"میرے خیال میں اسے سفید ہاتھی کہنا تو مناسب نہیں۔" اس نے اپنے انداز سے بے پروائی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

"میں نے سنا ہے وہ چیز جو تم نے کار سمجھ کرلی ہے اس میں ٹائر بھی نہیں ہیں۔ ڈیوڈ! تمہیں معلوم ہے ٹائر کیا ہوتے ہیں؟ گول گول سی... ربڑ کی ایک چیز ہوتی ہے۔ اسے ٹائر کہتے ہیں۔ کار میں ٹائروں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ٹائر پہیوں پر چڑھتے ہوتے ہیں۔" مسٹر گاربر بظاہر نہایت معصومیت سے ڈیوڈ کو سمجھا رہے تھے لیکن درحقیقت وہ اس کا مذاق اڑا کر بے لطف انداز ہو رہے تھے۔

"مجھے معلوم ہے۔" ڈیوڈ نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت اسے کار کے چند پرزوں کے نام یاد تھے جو اس نے جمی کی زبانی سنے تھے۔ گو کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ پرزے کیا تھے اور ان کا کام کیا تھا لیکن اس نے جمی سے سنی ہوئی باتیں نہایت متانت سے دہراتے ہوئے کہا "وہ چھ سیلنڈروں والی کار ہے۔ اس میں ڈبل اوور ہیڈ کیم شافٹ ہے۔ ٹوورژن بار سسپنشن سسٹم ہے جو اس کے معیار کا کبھی کسی گاڑی میں نہیں بنایا گیا۔ بریکوں کے ڈرم ایسی ساخت کے ہیں کہ بریک لگتے ہی کاریں رکتی ہے جیسے پتھر کی دیوار سے ٹکرا گئی ہے۔ پورٹی وہیل لگے ہوئے ہیں اس میں ... اور بارہ وولٹ کا الٹی نیشن سسٹم ہے۔ جب وہ چلے گی تو اس پاس کی چیزوں کو اڑاتی ہوئی لے جائے گی۔"

ڈیوڈ جس بات سے ڈر رہا تھا وہ ہوکر رہی۔ کار کی خبر اس کے باس مسٹر گاربر تک پہنچ گئی۔ اس روز جب کہ چند خاص خاص عہدیدار دوپہر کا کھانا مسٹر گاربر کے ساتھ کھا رہے تھے تو انہوں نے ڈیوڈ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا "سنا

اسے جاتے دیکھتے رہے پھر دوسروں کی طرف دیکھ کر بولے "مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا۔ کیا اس شخص میں کسی اور کی روح حلول کرگئی ہے؟"

○☆○

چند دن بعد ڈیوڈ کے گھر کے مختلف حصوں میں برتوں میں یا ویسے ہی رکھے ہوئے پرزے یکے بعد دیگرے واپس گیراج میں پہنچنے لگے۔ گیراج میں رات کو دیر تک لاٹھ آن رہتی اور لڑکوں کی دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دیتیں۔ جمی غائب دماغی کے سے عالم میں کھانا کھاتا۔ اس کی حالت اس سائنس دان کی سی تھی جو کسی بہت اہم قومی پراجیکٹ پر کام کررہا تھا۔

"آخر مسئلہ کیا ہے؟" ڈیوڈ ایک روز اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"مسئلہ؟" جمی نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "مسئلہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم لوگ آج کل انجن فٹ کررہے ہیں۔"

"انداز تو تم لوگوں کا اس خاتون جیسا ہے جس کے ہاں کسی ننھے مہمان کی آمد ہورہی ہو۔" سوزن بولی "گیراج کا دروازہ بھی اندر سے بند رکھتے ہو۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اندر کیا ہورہا ہے۔ کھانا بھی دروازے پر دستک دے کر باہر سے ہی تھمایا جاتا ہے جیسے قیدیوں کو دیا جارہا ہو۔"

"تم نے ذرا اس کا اس ہفتے کا اسکول کا رپورٹ کارڈ دیکھا؟" ڈیوڈ نے ناگواری سے سوزن سے پوچھا۔

"ہاں' دیکھا تو ہے۔" سوزن بے پروائی سے بولی "ویسے میں اتفاق سے تمہارے بھی اسکول کے زمانے کا کارڈ دیکھ چکی ہوں۔" بیٹے پر خود بھی تنقید کرتے کرتے وہ یک دم ہی اس کے دفاع پر بھی اتر آئی تھی۔ ڈیوڈ کو معلوم تھا کہ یہ ماؤں کا مخصوص انداز ہوتا تھا۔ اس وقت جمی گیراج میں جا چکا تھا۔

ڈیوڈ ذرا کھسیانا ہو کر بولا "بہرحال' تم اس سے کہو کہ جلد از جلد اس منحوس گاڑی پر کام ختم کرے اور اسکول کے کام پر توجہ دے۔"

اچانک گیراج کی طرف سے "پھٹ پھٹ" کی سی آوازیں سنائی دیں۔ وہ تینوں خاموش ہو کر کان لگا کر سننے لگے۔ ایسی چند آوازوں کے بعد انجن گرجا پھر اس کی آواز مدھم ہوتے ہوتے محض ہلی کی غراہٹ معلوم ہونے لگی۔

"فرٹیلیا تو واقعی اسٹارٹ ہوگئی۔" مولی بے یقینی سے بولی۔

آدھے گھنٹے بعد جمی گھر میں آیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔

"واؤ۔" اس نے نعرہ لگایا "کیا زبردست گاڑی بنی ہے۔ میرے دوست ایڈی نے اس کے بونٹ پر پانی سے بھرا ہوا گلاس رکھ کر دیکھا۔ اس وقت اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ کئی منٹ میں بھی گلاس نہ تو اپنی جگہ سے کھسکا اور نہ اس میں سے پانی چھلکا۔ یہ خوبی صرف رولز رائس میں دیکھنے میں آتی ہے۔"

"اس عظیم کار کی رونمائی کب ہورہی ہے؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"سنیچر کی شام۔" جمی نے سنجیدگی سے... جواب دیا "بس ہم ذرا باڈی پالش فٹ کرلیں۔"

سنیچر کی شام ڈیوڈ دفتر سے آیا اور گاڑی گیراج کے سامنے روک کر اس سے اترنے لگا تو گاڑی سے گرتے گرتے بچا۔ دراصل اس کی نظر گیراج میں کھڑی ایک کار پر پڑ گئی تھی اور اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا کہ اس قسم کی کار وہاں کہاں سے آگئی تھی؟ وہ ایک عجیب چمکتی دمکتی اور شاہانہ قسم کی کار تھی۔ اس پر ایک نظر ڈالنا ہی انسان کو مبہوت کردینے کے لیے کافی تھا۔ اس پر کہیں کوئی داغ دھبا یا زنگ کا نشان تک نہیں تھا۔

ڈیوڈ سحرزدہ سی حالت میں گیراج میں چلا گیا۔ جمی سمیت چھ لڑکے کار کے آس پاس کھڑے تھے۔ سوزن بھی وہیں موجود تھی اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے۔ مولی اس لڑکے کے کندھے سے کندھا جوڑے کھڑی تھی جو ہمیشہ گریس میں سب سے زیادہ لفٹ نہ دیتا نظر آتا تھا اور جس کا نام ہیرالڈ وہائٹ تھا۔ اس وقت وہ صاف ستھرا اور واقعی "وہائٹ" نظر آرہا تھا۔

ڈیوڈ نے چاروں طرف گھوم کر کار کو دیکھا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "میرے خدا!"

بے شک اسے کاروں کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا لیکن وہ کم از کم اتنا ضرور محسوس کرسکتا تھا کہ وہ واقعی کوئی بہت شاندار اور پرشکوہ کار تھی اور وہ شاید کبھی اس قسم کی کار خرید کر گھر میں کھڑی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ زنگ خوردہ لوہے کا وہی انبار تھا جسے ایک دوسری گاڑی کے ساتھ زنجیر سے باندھ کر کھینچتے ہوئے اس گھر میں لایا گیا تھا۔ جمی نے اس کا دروازہ کھول دیا تاکہ وہ اندر سے بھی دیکھ سکے۔ اس کی سیٹوں اور چھت وغیرہ کی پوشش سرخ چمڑے سے کی گئی تھی۔ ڈیوڈ نے خواب کے



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سے عالم میں اس چمڑے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ وہ مخمل کی طرح نرم تھا۔ اس کا انجن اسٹارٹ تھا مگر بلی کی خرخراہٹ جیسی صرف مدھم سی ایک آواز سنائی دے رہی تھی۔

"جب اس کی رنگ پوری ہوجائے گی تو یہ نہایت آسانی سے ایک سو بیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑے گی اور یہ کسی ریلوے انجن کی طرح مضبوط ہے۔" جمی نے ڈیوڈ کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔

ڈیوڈ خاموشی سے گیراج سے نکلا اور گھر میں داخل ہوگیا۔ سوزن اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ وہ کچن کی الماری سے بوتل نکال کر دو گلاس تیار کررہا تھا۔

"کیا ہوا ڈیوڈ؟ تم ایک دم چپ کیوں ہوگئے؟" سوزن نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

ڈیوڈ اس کی طرف مڑا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ایک گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "ہمیں فرٹیلیا کی کامیاب تکمیل پر چھوٹا سا جشن تو منانا چاہیے۔ میں تو ان لڑکوں کو نکما اور بے وقوف سمجھ کر ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا تھا۔ انہوں نے تو کمال کردکھایا۔"

"ہاں' اس میں تو کوئی شک نہیں۔" سوزن مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر بولی "لیکن تم اپنی آنکھیں پونچھ لو۔ جمی اس گاڑی میں سواری کرانے کے لیے سب سے پہلے تمہیں لے جانا چاہتا ہے۔"

پندرہ منٹ بعد جمی باپ کو گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہوا۔ گاڑی کے چلتے وقت بھی انجن کی آواز خرخراہٹ سے ذرا سی زیادہ محسوس ہورہی تھی لیکن اس آواز کے زیروبم کے ساتھ بھی انجن گویا اپنی بے پناہ طاقت کا احساس دلاتا تھا۔

"آپ کہاں جانا پسند کریں گے ڈیڈی؟" جمی نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے گھر سے نکل کر پوچھا۔

"ریور ڈرائیو کی طرف چلو۔" ڈیوڈ نے علاقے کا نام بتایا۔ اس کے باس مسٹر گاربر' ریور ڈرائیو میں رہتے تھے۔

وہ ریور ڈرائیو پہنچے تو ڈیوڈ نے دیکھا' مسٹر گاربر اپنے گھر کے باہر لان میں پودوں کو پانی دے رہے تھے۔ انہوں نے فرٹیلیا کو اپنے گھر کے سامنے رکتے دیکھا تو ذرا چونک کر سیدھے ہوئے۔ ان کے چہرے پر کچھ ایسے ہی تاثرات تھے جیسے انہوں نے اڑن طشتری کو گھر کے سامنے اترتے دیکھ لیا ہو۔ وہ پانی کا پائپ چھوڑ کر کار تک آئے۔ چاروں طرف گھوم کر اسے دیکھا' پھر ڈیوڈ کو دیکھا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولے۔

"فرٹیلیا؟ اور وہ بھی تمہارے پاس؟"

"یہ وہی کاٹھ کباڑ... وہی سفید ہاتھی ہے جو میں نے آٹھ سو ڈالر میں خریدا تھا۔" ڈیوڈ نے پچھتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

لیکن مسٹر گاربر کو تو گویا اس وقت طنز کی چبھن محسوس کرنے کا ہوش نہیں تھا۔ وہ اسی سحرزدہ سے انداز میں بولے "یہ تمہیں ملی کہاں سے؟ میں تو خود پچھلے دس سال سے اس ماڈل کی فرٹیلیا ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"یہ ہمیں ایک باڑے میں کھڑی ملی تھی۔" جمی نے بتایا۔

"ہمیں اس پر ٹائر بھی چڑھانے پڑے ہیں۔" ڈیوڈ نے لقمہ دیا پھر نہایت ملائمت سے بولا "آپ کو معلوم ہے ٹائر کسے کہتے ہیں مسٹر گاربر؟ ربڑ کی ایک گول گول سی چیز ہوتی ہے جو پہیے پر چڑھائی جاتی ہے۔"

اس وقت یہ جملہ بھی گویا مسٹر گاربر کے سر سے گزر گیا۔ وہ تو بس ایک ٹک فرٹیلیا کو تکے جارہے تھے اور ان کی باچھوں سے گویا رال بہنے کو تھی۔ انہوں نے امید بھرے لہجے میں پوچھا "تمہارا اسے بیچنے کا ارادہ تو نہیں ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" ڈیوڈ کے بجائے جمی بول اٹھا "میں نے ـــ میرے دوستوں نے ـــ اور میرے ڈیڈی نے اس کار کو اس حالت میں لانے میں بہت محنت کی ہے۔"

"اچھا ـــ؟" مسٹر گاربر نے آنکھیں سکیڑ کر ڈیوڈ کو گھورا "مجھے تو تم یہ تاثر دے کر ہمیشہ بے وقوف بناتے رہے کہ تمہیں تو کاروں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ میں تم پر کوئی جرمانہ عائد کروں گا۔"

ڈیوڈ اب خود اعتمادی سے مسکراتے ہوئے بولا "اگر آپ مجھ پر جرمانہ عائد کریں گے تو پھر ہم آپ کو اس کار میں سیر نہیں کرائیں گے۔"

"اچھا ـــ بلیک میل کررہے ہو!" مسٹر گاربر نے سر ہلایا "لیکن اگر میں تمہیں کمپنی میں سیکنڈ وائس پریذیڈنٹ بنادوں تو امید ہے کہ تم مجھے یہ کار ڈرائیو کرنے کا موقع بھی دے دو گے۔"

"ہم اس بارے میں سوچیں گے۔" ڈیوڈ نے بے نیازی سے کہا پھر بیٹے سے مخاطب ہوا "چلو جمی! گھر چلیں۔"

جب گاڑی آگے روانہ ہوئی تو ڈیوڈ کو امید تھی کہ اس کے ڈبل سائیلنسر سے نکلنے والا بے رنگ دھواں مسٹر گاربر کے منہ تک ضرور پہنچا ہوگا۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

# آوازِ دل

نجمہ مودی

ایک گل اندام سیمیں بدن کے شعلہ بدامان پلنے کا لگاؤ نفسانہ۔ ایک حادثہ اسے نہ صرف تہی دامن کر گیا بلکہ ایک ایسا انتظار بھی دے گیا جو زیست پہ محیط تھا۔ قطرہ قطرہ زندگی جو اس نے کرہنا کیوں میں گزاری پھر وہ انتظار تمام ہوا مگر ایک نئے زخم کے ساتھ۔

غزالہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تیر رہی تھی اور انہی کی دھندلاہٹ کی وجہ سے وہ گردوپیش کی چیزوں کو صاف طور پر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ کی تپائی پر اس کی دوست اور رشتے دار لڑکیوں کے لائے ہوئے پھل اور گلدستے رکھے تھے جن کی خوشبو اس کے حواس پر چھائی ہوئی تھی، معطر ہونے کے باوجود غزالہ کا ذہن بوجھل تھا۔ اس کے احساسات کی دنیا میں دھند سی پھیل چکی تھی اور اس دھند کے چھٹنے کی اسے کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔

اس کے بائیں ہاتھ کی تپائی پر دیگر چیزوں کے ساتھ وہ چھ کارڈ بھی اوپر تلے رکھے تھے... جو شکیل نے لندن سے بھیجے تھے۔ ہر کارڈ ایک دوسرے سے بڑھ کر خوب صورت تھا اور شاعرانہ الفاظ میں اس کی صحت یابی کی دعا درج تھی۔

شکیل کو جب لندن میں یہ اطلاع پہنچی تھی کہ غزالہ حادثے کا شکار ہوگئی ہے اور اسپتال میں داخل ہے، وہ ہر روز ایکسپریس ایئر میل سے صحت یابی کی دعا کا ایک نیا کارڈ ارسال کررہا تھا اور ساتھ ہی خود بھی پاکستان آنے کے لیے بھاگ دوڑ کررہا تھا۔

شکیل وہاں تعلیم حاصل کررہا تھا اور اس کا فوری طور پر آنا آسان نہیں تھا۔ اس میں کوئی قانونی دشواریاں حائل تھیں اور وہ انہیں دور کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کررہا تھا، دوڑ دھوپ کررہا تھا۔ اوپر سے اس کے امتحانات بھی سر پر تھے تاہم اب اطلاع آئی تھی کہ وہ ایک دو روز میں پہنچنے والا تھا۔

جب سے غزالہ اسپتال میں داخل ہوئی تھی، غزالہ کے گھر پر شکیل کے کئی فون آچکے تھے۔ اس نے تو ایک مرتبہ اسپتال فون کرکے غزالہ سے بھی بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن لائن نہ ملنے کی وجہ سے بات نہیں ہوسکی تھی۔ تاہم غزالہ کو اپنے گھر سے، اپنی بہن افروز کے ذریعے ایک ایک بات کا علم ہوتا رہتا تھا۔ شکیل نے کیا کہا، اس کے بارے میں کیا پوچھا، اس کی صحت یابی کے لیے کیا کیا دعائیں کیں، کیا کیا منتیں مانیں، اور وہ کتنا پریشان تھا، واپس آنے کے لیے وہ کیا کیا جتن کررہا تھا اور اسے کیا کیا دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ یہ سب غزالہ کو معلوم ہوتا رہتا تھا۔

اس کی دوست اور ہم عمر رشتے دار لڑکیاں اس پر رشک کرتی تھیں کہ منگیتر ہو تو ایسا ہو جو ہزاروں میل دور بیٹھ کر لندن کی رنگینیوں میں بھی اپنی منگیتر کو چاہت کی ان شدتوں کے ساتھ یاد رکھے، اس کی تکلیف پر یوں تڑپے، اس کے بارے میں بری خبر سن کر یوں بے قرار ہو اور جلد از جلد اس کے پاس آن پہنچنے کے لیے یوں بے تاب ہو۔

وہ ان کی باتیں سنتی اور پٹیوں کی اوٹ میں غیر محسوس طور پر مسکرا دیتی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ سب اسے دلاسا دے رہی ہیں۔ اس کا دل بڑھا رہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شکیل اسے بے پناہ چاہتا تھا۔ یہ چاہت برسوں پر محیط تھی اور ان برسوں کا ہر دن غزالہ کی زندگی کا انمول سرمایہ تھا۔ انہوں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اپنے آپ کو ایک دوسرے کی چاہت میں گرفتار پایا تھا۔

بچپنے کی معصومیت میں یہ چاہت خود ان کے لیے بھی ناقابلِ فہم تھی لیکن اتنا اس وقت بھی انہیں معلوم تھا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر کھیل بھی نہیں سکتے۔ زیادہ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس زمانے میں ان کے گھر بھی قریب قریب تھے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک زیادہ دیر تک کھیلنے کودنے کے لیے باہر نہ نکلتا تو دوسرا فوراً اس کے گھر کی طرف دوڑ جاتا۔

ادھر عمر میں پختگی آتی گئی اور ادھر اس چاہت میں شدت آتی گئی۔ اس وقت غزالہ ایم ایس سی کے آخری سال میں تھی اور شکیل ایم بی اے کرنے کے لیے باہر جانے کی تیاری کررہا تھا، جب شکیل کی امی نے غزالہ کو شکیل کے لیے مانگ لیا۔ بزرگ آخر بزرگ ہی تھے۔ انہیں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ غزالہ اور شکیل ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ شکیل کو اپنے والدین سے کچھ نہیں کہنا پڑا تھا۔ انہوں نے خود ہی مناسب وقت دیکھ کر غزالہ کو اس کے والدین سے مانگ لیا تھا۔

یوں ان کی زندگی ایک دوسرے سے منسوب ہوگئی تھی۔ محبت کی یہ کہانی بالکل سیدھی سادی، ہموار اور معصوم تھی۔ اس میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہوئی تھی۔ کوئی ظالم سماج ان کے درمیان نہیں آیا تھا۔ کوئی جوڑ توڑ نہیں ہوئے تھے۔ کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے رشتے دار تھے۔ اس نئے رشتے نے پرانے رشتوں کو اور بھی مستحکم کردیا۔

وہ دونوں پڑھے لکھے اور کشادہ ذہن والدین کی اولاد تھے۔ تعلیم اور زمانے نے انہیں سب کچھ سکھایا تھا۔ انہیں شادی کی کوئی زیادہ عجلت نہیں تھی۔ شادی سے پہلے وہ مستقبل پر اپنی گرفت مضبوط کرلینا چاہتے تھے۔ دونوں ہی خوش حال اور خود اعتمادی کے طلب گار تھے۔ شادی سے پہلے انہیں جو بے فکری اور گھر والوں کی طرف سے ہر قسم کی مدد حاصل تھی، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنے خوابوں میں زیادہ سے زیادہ رنگ بھر لینا چاہتے تھے۔ بہتر سے بہتر زندگی کی بنیادیں استوار کرلینا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ شادی کے بعد ذمے داریاں انسان کو بہت تیزی سے گھیر لیتی ہیں۔ چنانچہ شکیل اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ روانہ ہوگیا تھا اور غزالہ نے ایم ایس سی کے بعد دواؤں کی ایک کمپنی میں ملازمت کرلی تھی۔ اسے شکیل کی واپسی کا انتظار تھا۔ مگر اب سب کچھ بدل گیا تھا۔

شکیل اس کی مزاج پرسی کے لیے، عیادت کے لیے، اس سے ملنے کے لیے، اسے دیکھنے کے لیے آرہا تھا اور وہ جو اس کے انتظار میں گن گن کر گھڑیاں گزارا کرتی تھی، اب اس تصور ہی سے اس کا دل ڈوبا جارہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شکیل آکر اس کی صورت دیکھے۔ اب وہ چہرہ دکھانے کے قابل رہا بھی کہاں تھا؟

اسپتال میں اسے ابھی تک آئینہ نہیں دکھایا گیا تھا اور جب سے اس کے چہرے کی پٹیاں کھلی تھیں، وہ کہیں بھی اپنی صورت، اپنا عکس نہیں دیکھ سکی تھی مگر اسے کافی حد تک اندازہ تھا کہ وہاں کیا تغیر آچکا ہے۔

زخموں کے نشانات تو اس کے جسم کے بیشتر حصوں پر بھی تھے لیکن انہیں تو بہرحال لباس میں چھپایا جاسکتا تھا، کچھ پردہ

پوشی کی جاسکتی تھی مگر چہرہ؟ چہرہ تو سب کے لیے کھلی کتاب تھا ۔۔ اور یہ کتاب ایک ایسی ڈراؤنی کہانی بن گئی تھی کہ اس کے والدین تک لرز کر رہ گئے تھے۔ غزالہ کو یاد تھا کہ جس روز اس کے چہرے کی پٹیاں کھلی تھیں، اس کی ممی اور پاپا کی آنکھیں کس طرح پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں، امی ہڑبڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی تھیں اور پاپا کسی اور سمت میں دیکھنے لگے تھے۔

یہ وہی والدین تھے جنہوں نے نہ جانے کس کس حال میں، بچپن سے اب تک اس کے چہرے کو کتنی بار چوما ہوگا۔ غزالہ کے ہر مسام جاں میں ان کے مشفق بوسوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ ان سے زیادہ محبت غزالہ سے کون کرسکتا تھا؟ اور اگر وہی اس کا چہرہ دیکھ کر دہشت زدہ ہوگئے تھے، نظریں چرا رہے تھے تو دوسروں کے بارے میں اندازہ کرنا زیادہ دشوار نہیں تھا۔

چہرے کی پٹیاں کھلنے کے بعد سے وہ دو متضاد کیفیات سے دوچار تھی۔ وہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کے تصور سے بھی خوف زدہ تھی اور اس کے لیے بے چین بھی تھی۔ شاید لاشعور میں اب بھی ایک موہوم سی امید جاگزیں تھی کہ شاید چہرہ اتنا نہ بگڑا ہو جتنا وہ سمجھ رہی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس خیال سے بھی دل لرز جاتا تھا کہ اگر یہ موہوم سی امید بھی جھوٹی ثابت ہوئی تو پھر۔۔؟

اس لیے وہ نرس کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔ "سسٹر! پلیز مجھے کوئی آئینہ لادو۔ خدا کے لیے کوئی ٹوٹا پھوٹا سا آئینہ ہی لادو۔"

نرس نے گویا اس کی التجا سنی ہی نہیں اور خاموشی سے اس کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگی۔ اس وقت کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔

"سسٹر! میں تمہاری منت کرتی ہوں۔" غزالہ ایک بار پھر اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے گڑگڑائی "مجھے ایک آئینہ لادو، آخر مجھے آئینہ کیوں نہیں دیا جارہا؟ باتھ روم سے بھی آئینہ ہٹادیا گیا ہے۔ آخر مجھ سے میرا ہی چہرہ کب تک چھپایا جائے گا؟"

نرس اب بھی خاموش رہی اور بلڈ پریشر اس کے چارٹ پر نوٹ کرنے لگی۔ غزالہ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولی "دیکھو سسٹر! آج کل میں میرا منگیتر آنے والا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کی نظر میرے چہرے پر پڑے، مجھے معلوم تو ہونا چاہیے کہ میں اب کیسی نظر آتی ہوں؟ دیکھو میں ایک پڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکی ہوں۔ میرا دل کمزور بھی نہیں ہے، مجھے پہلے ہی معلوم ہے کہ میرا چہرہ بگڑ چکا ہے۔ میں آئینہ دیکھ کر کوئی آسمان تو سر پر اٹھانے سے رہی، مجھے معلوم ہے کہ جو ہونا ہے، وہ ہوچکا۔ اب کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ رونا دھونا، شور مچانا سب بے کار ہے اور میں بھی بے کار حرکت نہیں کروں گی۔ تم مطمئن رہو۔۔۔ مجھے آئینہ دکھانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ اگر مجھ پر قیامت گزرے گی تب بھی میں خاموش ہی رہوں گی۔ اگر آنسو امڈے بھی تو میں خاموشی سے پی جاؤں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔"

نرس پر شاید اس کی آہ وزاری اثر کرہی گئی۔ بلڈ پریشر نوٹ کرکے سیدھی ہوتے ہوئے اس نے ترحم آمیز انداز میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولی "مجھے میٹرن سے اجازت لینا پڑے گی۔ اس کے بعد ہی میں تمہیں آئینہ دے سکوں گی۔"

میٹرن اس دوران میں شاید دروازے پر ہی کھڑی تھی اور ان کی گفتگو سن چکی تھی۔ اندر آتے ہوئے اس نے بغور غزالہ کی طرف دیکھا اور ملائمت سے بولی "آج تو آئینہ دیکھنے کے لیے تم زیادہ ہی بے قرار ہورہی ہو۔ تین دن تو تم نے بڑے صبر وسکون اور خاموشی سے گزار دیے۔"

"میرا خیال تھا کہ تم لوگ خود ہی مجھے [illegible] گے۔" غزالہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "آخر تم لوگ کب تک مجھے اس سے باز رکھ سکو گے؟ یہ محض بچکانہ پن نہیں ہے؟"

"ہمارے خیال میں تو تمہیں فی الحال آئینہ نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔"

میٹرن گہری سنجیدگی سے بولی "لیکن مجھے معلوم ہے کہ اب تم بے تاب ہوچکی ہو اور آئینہ دیکھے بغیر نہیں رہو گی اس لیے تمہاری خواہش پوری کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

یہ کہہ کر میٹرن نے نرس کو اشارہ کیا اور وہ لپک کر اٹیچ کمرے سے باہر چلی گئی۔ چند لمحے بعد وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں میک اپ مرر تھا۔ آئینہ اس کے ہاتھ میں تھا مگر اس کے قریب ہی کھڑی رہی۔ میٹرن دوسری طرف تھی۔

غزالہ نے آہستگی سے آئینہ اپنے چہرے کے سامنے بلند کیا اور دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ نرس اور میٹرن کے سامنے اس نے بڑی بڑی باتیں کی تھیں اور حقیقت میں بھی اسے توقع تھی کہ جب آئینہ دیکھے گی تو اس کا ردِعمل کچھ خوش گوار نہیں ہوگا اور اس نے اپنے آپ کو ہر صورت حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی تھی مگر ہر بد صورت اور تلخ حقیقت بہرحال انسان کو ایک دھچکا ضرور پہنچاتی ہے۔ اس دھچکے سے سنبھلنا کیسا صبر آزما کام ہوتا ہے۔ یہ اندازہ غزالہ کو اس گھڑی ہوا۔ آئینہ اس کے ہاتھوں میں لرز کر رہ گیا۔

"اف میرے خدا۔۔۔!" وہ بے چارگی سے رو دی۔

اس کی وہ ستواں ناک جو اس کے چہرے کی سرزمین پر گویا فخر سے سر اٹھائے کھڑی رہتی تھی، کچھ چوڑی ہوگئی تھی اور اس پر ایک زخم کا نشان پھیلا ہوا تھا۔ ناک کا بانسہ کچھ اس طرح ٹوٹا تھا کہ نازک ہڈیاں دوبارہ صحیح طور پر بٹھائی نہیں جاسکی تھیں۔ کشادہ پیشانی، جو زلفوں کی گھٹاؤں میں چاند کی طرح چمکتی تھی، زخموں کے دو لمبے لمبے نشانوں سے داغ دار ہوچکی تھی اور ان زخموں کے کنارے آرپی کے دندانوں جیسے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی پیشانی پر دو کنکھجورے آڑے ترچھے کہیں سے آن بیٹھے ہوں۔

بائیں رخسار سے خاصا گوشت غائب ہوچکا تھا اور آپریشن میں جس طرح وہاں ٹانکے لگائے گئے تھے، اس سے [illegible] ہوگیا تھا اور جو بد نما دائرہ اور گڑھا بن گیا تھا، اس پر زیادہ دیر نظر جماتے ہوئے بھی جھرجھری سی آتی تھی۔

دونوں ہونٹ درمیان سے کٹ گئے تھے اور ان کی ساخت ہی بدل گئی تھی۔ یہی وہ لب و رخسار تھے جو کبھی دنیا جہاں کی خوب صورتی کو شرماتے تھے۔ چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں، پنکھڑی سے لب، کنول سا چہرہ، معصوم صورت، یہ ساری تشبیہات اور استعارے اس کی صورت کے سامنے خلیل کو بیچ نظر آتے تھے۔

جب ان کی منگنی بھی نہیں ہوئی تھی، تب بھی خلیل یونیورسٹی میں اپنے کسی ہم جماعت لڑکے یا لڑکی سے اس کا تعارف کراتا تو کہتا "یہ غزالہ ہے۔ میری کزن۔ دنیا کی خوب صورت ترین لڑکی اور یہ محض شاعرانہ تعلّی نہیں ہے۔ غزالہ واقعی دنیا کی خوب صورت ترین لڑکی ہے۔ کسی کو کوئی اعتراض ہے تو بیان کرے، میں اس کا اعتراض غلط ثابت کروں گا۔"

جس سے تعارف کرایا جاتا وہ عموماً یہی کہتا "ہمیں تم سے اتفاق ہے خلیل۔" اور غزالہ سرجھکا کر، شرما کر رہ جاتی۔ اس کی ساری تیزی، طراری جواب دے جاتی۔ رخسار دہک جاتے اور کانوں کی لویں نچنے لگتیں۔

آج وہ دنیا کی اسی "خوب صورت ترین لڑکی" کو آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی تھیں پھر یک لخت ہی جیسے اس پر دیوانگی کا دورہ سا پڑا۔ آئینہ اس نے ایک طرف پھینک دیا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں چیخی "یہ میں نہیں ہوں، یہ میں نہیں ہوں۔۔ خدایا۔۔۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ میں نے کیا گناہ کیا تھا جو تو نے مجھے زندہ درگور کرنے کا سامان کردیا ہے؟"

وہ گھٹنوں میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے جسم کو جیسے کسی نامعلوم اذیت کے باعث جھٹکے سے لگ رہے تھے۔

نرس اور میٹرن نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور اسے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگیں۔ صبر کرو غزالہ! خدا کی رضا پر ہر حال میں شاکر رہنا چاہیے۔ یہ حادثہ اس سے بدتر بھی ہوسکتا تھا۔ تمہاری جان بھی جاسکتی تھی۔ تم اندھی بھی ہوسکتی تھیں، خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری خوب صورت آنکھیں محفوظ رہیں۔ تم معذور نہیں ہو۔ یہ کیا کم ہے کہ تم اب بھی اس دنیا کو دیکھ سکتی ہو، چل پھر سکتی ہو۔"

"کیا کروں گی میں اس دنیا کو دیکھ کر؟ جب لوگ مجھے دیکھ کر خوف کھائیں گے تو میں ان کے تاثرات دیکھا کروں گی۔ بس یہی کام ہوگا میرا۔۔ ہے نا؟" وہ تقریباً چلّا اٹھی۔

"تم تو ناحق اتنا زیادہ پریشان ہورہی ہو۔" میٹرن ملائمت سے بولی "وقت کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے بدنما زخم


جسم کو موٹا اور خوبصورت بنانے کی دوا

فربینا

فربینا جسم کو موٹا اور خوبصورت بنانے کی یونانی دوا ہے جو قدرتی طور پر ایک ماہ کے قلیل عرصہ میں بازو، کمر، کولہے، گردن، اندھے اور چہرے کے گالوں پر گوشت میں اضافہ کر کے جسم بھرا بھرا، خوبصورت، موٹا و تندرست بنا دیتی ہے۔

فربینا شروع کرنے سے پہلے اپنا وزن نوٹ کرلیں اور ایک ماہ تک فربینا کی خوراکیں کھاتے رہیں ایک ماہ بعد اپنا وزن دوبارہ چیک کریں تو آپ کو فرق صاف نظر آجائے گا۔ مکمل طور پر قدرتی اجزا سے تیار کردہ قطعی بے ضرر یونانی مرکب قیمت -/350 روپے وزن ایک کلو جو تین ماہ کی مکمل خوراک ہے۔ ایک خط لکھ کر بذریعہ V.P منگوائیں۔

حکیم ارشد لیبارٹریز پوسٹ بکس 2608 اسلام آباد

بھی بھر جاتے ہیں۔ زخموں کے نشان مدھم پڑ جاتے ہیں۔ لوگوں کی ان پر نظر کم ہی پڑتی ہے۔ بے شمار لوشن، کریمیں اور دوائیں ہیں جن کا طویل عرصے تک استعمال جاری رکھا جائے تو زخموں کے نشانات نہ ہونے کے برابر رہ جاتے ہیں۔"

"زخموں کے نشان اگر مدھم پڑ بھی گئے تو کیا فرق پڑ جائے گا؟" وہ تلخی سے بولی "یہ جو گوشت غائب ہو گیا ہے۔۔۔ یہ جو کھال کھنچ کر رہ گئی ہے۔ یہ جو نقوش بگڑ کر رہ گئے ہیں، ان کا تو کوئی علاج نہیں ہو سکے گا نا؟" اس نے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

"میں ممکن ہے یورپی ملک کے کسی کلینک میں کاسمیٹک سرجری کے ذریعے رفتہ رفتہ ان سب چیزوں کا علاج ہو جائے۔۔۔ یہ بگڑے ہوئے نقوش درست ہو جائیں۔" میٹرن ہچکچاتے ہوئے بولی "لیکن اس کا لجہ بتا رہا تھا کہ اسے خود بھی اپنی بات کا پوری طرح یقین نہیں ہے۔

"میٹرن!" وہ بدستور تلخ لہجے میں بولی "پہلی بات تو یہ کہ ہم قدرے آسودہ حال ضرور ہیں مگر اتنے زیادہ بھی نہیں کہ کاسمیٹک سرجری وغیرہ جیسے نخروں کے متحمل ہو سکیں اور اگر برسوں میں کہیں جا کر یہ کسی طرح ممکن ہو بھی گیا، تب تک حالات جانے کیا سے کیا ہو جائیں۔ یہاں تو آن کی آن میں لوگوں کی کائنات بدل جاتی ہے پل بھر میں چہرے بدل جاتے ہیں۔ لمحوں میں دل بدل جاتے ہیں۔"

روتے روتے وہ جیسے اپنے آپ پر ہنس دی۔ اس کی آنکھیں ہی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی نہیں تھیں، یہ ہنسی بھی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

"کاش میں مر ہی گئی ہوتی۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی "اتنے خوف ناک حادثے میں کیوں کر بچ گئی؟"

پھر اس نے شکوہ بھری نظروں سی نرس اور میٹرن کی طرف دیکھا۔ "اگر میرا یہ حال ہو چکا تھا تو تمہی لوگوں نے مجھے زہر کا انجکشن لگا دیا ہوتا۔ یہ مجھ پر تم لوگوں کا ظلم نہیں، اظہاری ہمدردی ہوتا۔"

"زندگی لینے اور دینے والی تو خدا کی ذات ہے۔" اوبیڑ عمر میٹرن بوجھل لہجے میں بولی "ہمارا کام تو صرف زندگی بچانے کے لیے اپنی سی جدوجہد کرنا ہے۔ سو ہم نے اپنا فرض ادا کیا۔" اس نے نرس کو اشارہ کیا اور وہ دونوں جانے کے لیے مڑ گئیں۔ نرس نے جاتے جاتے بستر کی پائنتی پر پڑا ہوا آئینہ اٹھا لیا۔

وہ ایک بار پھر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور محسوسات پر جیسے یادوں کی برف باری جاری تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں تو شل تھے ہی لیکن ذہن بھی سن ہوا جا رہا تھا۔ اسے اپنا بچپن یاد آ رہا تھا۔

وہ تین بہنیں تھیں۔ غزالہ سب سے چھوٹی تھی۔ اس تصور سے اسے آج بھی خوشی اور فخر محسوس ہوتا تھا کہ اس کے والدین کبھی اس بنا پر نہ تو احساس کمتری میں مبتلا ہوئے تھے اور نہ ہی ان کی پیشانی پر بل آیا تھا کہ ان کے ہاں اولاد نرینہ نہیں تھی۔ وہ اپنی تینوں بچیوں پر اسی طرح فخر کرتے تھے جس طرح کوئی تین بیٹوں، خوب صورت اور صحت مند بیٹوں پر کر سکتا ہے۔

گھر میں ان کا کوئی دوست پہلی بار آتا تو وہ اسے اپنی تینوں بچیوں کے بارے میں ضرور بتاتے اور ان کا لہجہ ایک عجیب سی مسرت سے سرشار ہوتا تھا "بھئی زبیر! دیکھو یہ میری سب سے بڑی بیٹی ہے فہمیدہ! تم دیکھ رہے ہو؟ نو سال کی عمر میں ہی اس کی ناک پر عینک ٹک گئی ہے۔ یہ اتنی ذہین اور پڑھاکو ہے کہ مجھے پورا یقین ہے یہ بڑی ہو کر زبردست قسم کی فلاسفر، دانش وریا بہت بڑی معلمہ بنے گی۔ زیادہ امکان مجھے یہی نظر آتا ہے کہ یہ ٹیچنگ کی لائن میں بڑا نام پیدا کرے گی۔ ابھی سے یہ اپنے سے بڑی عمر کے بچوں کو پڑھاتی ہے۔"

پھر وہ منجھلی بیٹی کو سینے سے لگاتے ہوئے کہتے "یہ انیقہ ہے۔ اتنی سی عمر میں فر فر زبان چلتی ہے اس کی۔ کیسی زبردست بحث کرتی ہے اور دلیلیں دیتی ہے کہ مجھے لگتا ہے بڑی ہو کر یہ وکیل بنے گی۔ ویسے اس کا کچھ کچھ رجحان گلوکاری کی طرف بھی ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں بڑی اونچی تانیں لگاتی ہے اور اچھے بھلے کلاسیکل گانے کا بھی بڑے شوق سے سنتی ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ کچھ لڑکی ہوتے ہی یہ گلوکاری کے میدان میں قدم رکھ دے۔ ویسے مجھے تو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں ایک براڈ مائنڈڈ آدمی ہوں۔ اگر میری بیٹی گلوکارہ بننا چاہے تب بھی میں اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ میرا نظریہ تو یہ ہے کہ انسان خواہ کسی بھی فیلڈ میں جائے، کوئی سا بھی کام اپنائے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ نام ضرور پیدا کرے۔ جو بھی ہنر اختیار کرے، اس میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کرے۔"

پھر وہ غزالہ کو گود میں اٹھا کر چومتے ہوئے کہتے "اور میری یہ بیٹی ابھی اتنی چھوٹی ہے کہ ہمیں ابھی تک صحیح طور پر اس کے رجحانات کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ یہ بڑی شرمیلی اور کم گو سی ہے۔ پڑھنے میں یہ بھی خیر ابھی سے خاصی ذہین ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا سب سے بڑا اثاثہ اس کی



خوب صورتی ہوگی۔ یہ ہمارے خاندان کی خوب صورت ترین لڑکی ہے۔ سچ بتاؤ زبیر یار! تم نے اس سے پہلے اتنی حسین بچی دیکھی ہے؟"

بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی تک وہ یہی سنتی اور دیکھتی آئی تھی۔ کوئی بھی اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جسے کچھ کہنے کا موقع نہیں ملتا وہ ویسے ہی مبہوت ہو کر رہ جاتا تھا۔

کبھی کبھی تو اسے اس بات پر خفیف سی شرم بھی محسوس ہوتی تھی کہ لوگ محض اس کی خوب صورتی کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ آخر فہمیدہ بھی تو تھی جو اسکول کے زمانے سے ہر امتحان میں ٹاپ کرتی آ رہی تھی۔ خاندان بھر میں اس کی ذہانت کے چرچے تھے بلکہ خاندان سے باہر بھی اس کی مثالیں دی جاتی تھیں۔

پھر افروز تھی۔ پڑھنے لکھنے میں اس کی فہمیدہ جیسی دلچسپی تو نہیں تھی لیکن بہرحال وہ کوئی ایسی گئی گزری بھی نہیں۔ پوزیشن نہیں لاتی تھی تو کم از کم پاس تو امتیازی نمبروں سے ہوتی تھی اور پھر والد صاحب کی پیش گوئی کے مطابق اس کی آواز واقعی بہت سریلی ثابت ہوئی تھی۔ شادی بیاہوں میں اسے کھینچ کھینچ کر گیت وغیرہ گانے کے لیے بلایا جاتا۔ جہاں جہاں گانے کی فرمائشیں شروع ہو جاتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے عام سی شکل وصورت کی وہ لڑکی جان محفل بن جاتی اور غزالہ۔۔۔؟

اس کے معاملے میں بھی ڈیڈی کی پیش گوئی درست ہی ثابت ہو رہی تھی۔ اس کا واحد سرمایہ بس اس کی ایک خوب صورتی ہی تھی۔ پڑھائی میں وہ بس عام سی لڑکی تھی۔ کوئی اور ہنر بھی اسے نہیں آتا تھا۔ سیکھنے کی کوشش بھی کرتی تو کوئی خاص کام سیکھ نہ پاتی۔ پڑھائی میں زیادہ سے زیادہ دل لگانے کی کوشش کرتی مگر کوئی پوزیشن لانے میں کامیاب نہ ہوتی۔

اور آج اس کا واحد اثاثہ بھی لٹ گیا تھا۔ اس کا حسن بلاخیز بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ خوب صورتی کی دولت بھی اس کے پاس نہ رہی تھی۔

"اب تو شاید مجھے عمر بھر چہرے پر نقاب ہی رکھنا پڑے۔" وہ اندر ہی اندر روتے ہوئے سوچ رہی تھی "ورنہ لوگ مجھے دیکھ کر ڈر جایا کریں گے۔"

پھر اسے شکیل کا خیال آیا "اس کا ردعمل کیا ہوگا؟" دل کہتا تھا "شکیل نہیں بدل سکتا۔ اس کی محبت ان دنیاوی اور ظاہری تغیرات سے بالاتر ہے۔ اس کی محبت کی جڑیں اس کی روح تک میں پیوست ہیں۔ کیسے نکال پھینکے گا وہ انہیں؟"

مگر دماغ کہتا تھا "بھولی نہ بنو۔ کیا تم ایسی نادان اور خوش فہم لڑکی ہو؟ شکیل کوئی فرشتہ تو نہیں ہے۔ اسی عام سی دنیا کا عام سا آدمی ہے۔ بدصورتی کا ساتھ کون دے سکتا ہے؟ سب کی آنکھوں کو صرف خوب صورتی کی تلاش رہتی ہے اور پھر بدصورتی کی بھی کوئی حد تو ہو۔ اس کی بدصورتی اب نظروں کے لیے قابل برداشت بھی تو نہیں رہی تھی۔"

ادھر لوگ اس کے آئینہ دیکھنے سے بھی پہلے دن رات سمجھاتے رہے تھے "حوصلہ بلند رکھو لڑکی! زندگی بہرحال ایک نعمت ہے۔ اس سے نفرت کر کے کفران نعمت کی مرتکب مت بنو۔"

اسے آئینہ دیکھنے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اب زندگی بھر کے لیے چیچک رونما اس کا مقدر ہو گیا تھا۔ وہ اس دن کو کوستی تھی جس دن اس نے گویا از خود اس حادثے کو دعوت دی تھی، اسے خوش آمدید کہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے لگتی کہ اسے بھلا کیا معلوم تھا کہ کیا ہو جائے گا۔ اگر ہر انسان ہی اتنا پیش بین ہو جائے تو وہ ہر حادثے سے نہ بچ جائے پھر اس دنیا میں اتنی آہ بکا کہاں رہ جائے؟

اس روز وہ فیکٹری سے نکلی تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ فیکٹری کی بس کچھ لوگوں کو چھوڑنے گئی ہوئی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ غزالہ کی شفٹ کے بیشتر ساتھی کسی نہ کسی طرح روانہ ہو چکے تھے۔ کوئی کسی عام بس میں، اور کوئی کسی سے لفٹ لے کر۔۔۔ اور کوئی اپنے کسی کار کن ساتھی کے ہمراہ اس کی سواری پر۔

وہ تنہا اس شیڈ کے نیچے کھڑی تھی جہاں وہ اور اس کے چند ساتھی عام حالات میں فیکٹری کی بس کا انتظار کرتے تھے۔ اسی دوران میں اوبیڑ عمر کیمیکل انجینئر ہمایوں صاحب اپنی پرانی سی کار میں فیکٹری کے گیٹ سے نکلے۔ غزالہ کو شیڈ کے نیچے کھڑے دیکھ کر انہوں نے کار روک دی۔

"ارے غزالہ! تم نے بتایا کیوں نہیں کہ تمہیں ٹرانسپورٹ کا پرابلم ہے۔ میں اندر ہی سے تمہیں ساتھ لے لیتا یا کوئی اور انتظام کر کے تمہیں بھجوا دیتا۔" ہمایوں صاحب مشفقانہ سے انداز میں ڈانٹتے ہوئے بولے "ایک تو تم بہت زیادہ تکلف میں رہتی ہو اسی لیے تکلیف اٹھاتی ہو۔ چلو آؤ۔ میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں گا۔"

انہوں نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اس وقت غزالہ کو ان کی لفٹ کی پیش کش امداد غیبی ہی محسوس ہوئی

تھی۔ وہ بلاچوں چرا ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ فضا میں دھند سی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ فیکٹری ایریا کی حدود ہی میں تھے جب بارش کی بوچھاڑ میں ایک موڑ سے اچانک ہی ایک پک اپ لہراتے ہوئے ان کے سامنے آگئی۔ جس میں خالی ڈرم لدے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں اس کا ڈرائیور اناڑی تھا یا بارش سے بوکھلایا ہوا تھا یا پھر پک اپ میں وزن اس کی گنجائش سے زیادہ لدا ہوا تھا جو وہ کچھ لہراتی ہوئی سی نظر آرہی تھی۔

مزید ستم یہ کہ اس کے پیچھے اسپورٹس موٹر سائیکلوں پر دو لڑکے بارش میں بھیگتے' ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے' گلا پھاڑتے اور پک اپ سے بھی زیادہ لہراتے ہوئے چلے آرہے تھے۔

ہمایوں صاحب نے اب تک سڑک سنسان دیکھ کر رفتار خاصی تیز کر رکھی تھی۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ اس افتاد کو اچانک سامنے دیکھ کر انہوں نے پہلے تو گاڑی کو لہرا کر پک اپ کے قریب سے گزارنا چاہا پھر گھبرا کر بریک لگا دیے لیکن کار پہلے پک اپ کی سائڈ سے ٹکرائی' پھر پھسلتے ہوئے شیب میں لڑھکتی چلی گئی اور وہاں ایک بہت بڑے پتھر سے ٹکرا کر رک گئی۔

غزالہ کو صرف اتنا احساس تھا کہ اس نے شیشہ ٹوٹنے کے متعدد چھناکے اور ایک دھماکا سنا تھا۔ وہ جیسے تحت الثریٰ میں اترتی جارہی تھی پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ ہوش میں آنے پر اس نے خود کو اسپتال میں بستر پر پٹیوں میں جکڑا ہوا پایا تھا۔ بہت بعد میں اسے معلوم ہوا تھا کہ ہمایوں صاحب اس حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے۔

اور اب جب سے اس نے آئینہ دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر موت آنا ہی تھی تو اسے آجاتی' ہمایوں صاحب بچ جاتے۔ آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھیں لیے وہ یہی سوچے جارہی تھی کہ اس چہرے کے ساتھ وہ کیسے زندگی گزارے گی؟"

وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ فہمیدہ اور افروز آن پہنچیں۔ وہ غزالہ کے سامنے اپنے آنسو چھپائے رکھنے اور زندہ دل نظر آنے کی پوری کوشش کرتی تھیں۔

"تم پھر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہو۔" فہمیدہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "ہم نے کتنی بار کہا ہے کہ اس طرح مت بیٹھا کرو۔ آخر ایسا کون سا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے تم پر؟" اس نے غزالہ کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر کیا۔

غزالہ نے مجروح سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے بہ زبان خموشی پوچھ رہی ہو "باجی! کیا مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹنے میں کوئی کسر رہ گئی ہے؟"

فہمیدہ نے نظر چرائی اور افروز گویا بات بدلنے کو بولی "کل شکیل آرہا ہے۔ اس وقت تمہیں اپنے چہرے پر خوشی کے کچھ رنگ تو بکھیرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ زخموں کے نشانات سے کٹا پھٹا چہرہ اتنا بدصورت نظر نہیں آتا' جتنا بدنما وہ چہرہ لگتا ہے جس پر کبھی مسکراہٹ نہ ابھرے ہمیشہ سڑا سا نظر آئے جس پر ہمیشہ دنیا جہان کی افسردگی بکھری رہے۔ تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ ایک بھرپور مسکراہٹ چہرے کی ہر بدنمائی کو چھپا لیتی ہے؟ بے وقوف لڑکی! اتنی بڑی ہوگئی ہو' اب تو کچھ سیکھنے کی کوشش کرو۔"

"میں نہیں چاہتی کہ شکیل مجھ سے ملنے۔ مجھے دیکھنے آئے۔" وہ اس کی ساری تقریر کو نظر انداز کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

"کیوں نہ آئے؟ آخر وہ تمہارا منگیتر ہے۔" فہمیدہ بولی۔

"میں۔۔۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اب [illegible]۔"

غزالہ پہلے سے بھی زیادہ دھیمی آواز میں بولی۔ [illegible] آنسوؤں کے سمندر سے ابھری تھی "میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھ سے شادی کرے۔ مجھے معلوم ہے کہ اول تو وہ خود ہی مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہے گا اور اگر وہ خاندان کے شرم ولحاظ یا اپنے وعدے کی پاس داری میں اس ارادے پر قائم بھی رہا تو اس کی یہ میں صرف رحم کا جذبہ ہوگا۔ وہ مجھ پر ترس کھا کر مجھ سے شادی کرے گا اور میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھ پر ترس کھائے۔ میں عام زندگی کے [illegible] چھوٹے معاملات میں بھی کسی کو اپنے اوپر ترس کھاتے دیکھنا نہیں چاہتی' چہ جائیکہ شادی کا معاملہ۔ وہ شادی بجائے خود کتنا رحم طلب ہوگی جس کی بنیادیں ہی جذبہ ترحم پر استوار ہوں۔ میں بچی نہیں ہوں باجی! جو ایسے رنگ برنگے کھلونوں سے بہل جاؤں جو اندر سے مٹی کے ہوں۔"

فہمیدہ شادی شدہ تھی اور افروز غیر شادی شدہ مگر غزالہ کی بات سمجھنا دونوں ہی کے لیے مشکل نہیں تھا۔ بڑی سیدھی' سچی اور آسان سی بات تھی۔ دونوں ہی لاجواب سی ہوکر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

پھر فہمیدہ گویا ہمت کرتے ہوئے بولی "تمہارا خیال ہے کہ شکیل تم سے صرف اس لیے پیار کرتا رہا ہے کہ تم خوب صورت تھیں؟"



"ماضی کیا تھا اور کیا نہیں' میں اس بحث میں نہیں پڑ رہی۔" وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی "اور نہ ہی میں محبت کے فلسفوں کی گہرائیوں میں جارہی ہوں۔ ایک لمحے کے حادثے نے میری زندگی کی کتاب پلٹ دی ہے۔ سارے ورق الٹ پلٹ ہوگئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے شکیل مجھ سے محبت کرتا ہے اور ممکن ہے آئندہ بھی کرتا رہے لیکن کسی کی محبت کو دل میں بسائے رکھنا اور بات ہے اور اسے گھر میں بسائے رکھنا اور بات۔ زندگی کا سفر بہت طویل ہوتا ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ ایک بدصورت کے شانہ بشانہ شاہراہ حیات پر سر اٹھا کر چل سکے گا۔"

پھر وہ فہمیدہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں بولی "تم اتنی ذہین ہو باجی! سب گھر والے ہمیشہ پیچیدہ معاملات میں تم سے مشورہ کرتے رہے ہیں۔ کوئی طریقہ سوچو کہ شکیل مجھ سے ملنے نہ آئے۔ مجھے نہ دیکھے۔ منگنی کا بندھن باعزت طریقے سے ہم لوگوں کی طرف سے ہی ٹوٹ جائے۔ مجھے یقین ہے محفل دل ہی دل میں ہمارا شکر گزار ہوگا ورنہ بظاہر شاید وہ خاموش ہی رہے۔ بے چارہ وضع دار سا آدمی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کی وضع داری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شادی اس پر مسلط کرلی جائے۔"

"اسے تم بدظن کرکے تم سے ملنے سے روکا جاسکتا ہے۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔" فہمیدہ شریر لہجے میں بولی "تم کہہ دیں گے کہ اسپتال کا سرجن تم پر مرمٹا ہے یا پھر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تم خود اس نیلی آنکھوں والے ڈاکٹر پر مرمٹی ہو جو صبح شام تمہیں دیکھنے آتا ہے۔"

پھر وہ ذرا سی ناک سکیڑ کر بولی "وہ ڈاکٹر شکل سے ذرا بے وقوف سا ہے لیکن بہرحال ہے ہینڈسم۔ ہماری بات کا فوراً یقین کرلیا جائے گا۔"

غزالہ نے مجروح سی نظروں سے بہن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی کی دھندلاہٹ پھیلنے لگی تھی۔ فہمیدہ خود ہی اپنے مذاق پر شرمندہ سی ہوگئی۔ وہ یک دم کچھ کھسیانی اور کچھ سنجیدہ سی ہوکر بولی "پاگل لڑکی! منگیتر وہ تمہارا ہے لیکن تم کو سمجھانا ہمیں پڑ رہا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہاری مکمل ذات سے! تمہارے چہرے سے نہیں۔ وہ کوئی عام سا جذباتی نوجوان نہیں ہے۔ ایک پختہ العمر باشعور شخص ہے۔ دنیا دیکھی ہے اس نے۔ اسے معلوم ہے کہ کون سی چیزیں عارضی اور ناپائیدار ہیں اور کون سی چیزیں زندگی بھر ساتھ چلتی ہیں۔"

فہمیدہ اور افروز اسے سمجھاتی رہیں۔ اس کے لیے خوب صورت لفظوں کے تاج محل تعمیر کرتی رہیں مگر کوئی لفظ' کوئی بات اس کے دل مجروح کو تشفی نہ دے سکی۔ وہ جو اندر ہی اندر ایک ہول' ایک دکھ' ایک غم اسے کھائے جارہا تھا اس کا مداوا کسی طرح بھی نہ ہوسکا۔

اس رات اس کی تکلیف کچھ بڑھ گئی۔ بظاہر وہ اعصابی کھنچاؤ اور سردرد تھا لیکن درحقیقت یہ وہی روح کے درد کی لہر تھی جو اب اکثر ہی جسم کے ساحل تک چھلک آتی تھی۔ ڈاکٹر کے کہنے پر نرس نے اسے خواب آور اور مسکن دوا کا انجکشن دیا۔ اس کے باوجود اسے نہیں رات گئے جاکر نیند آئی۔

دوسرے روز آخر کار وہ لمحہ آن پہنچا جس سے وہ خوف زدہ اور گریزاں تھی۔ شکیل آن پہنچا۔ وہ ائرپورٹ سے سیدھا اسپتال ہی آیا تھا پھر بھی اس کا سوٹ بے شکن تھا اور اس کے ہاتھ میں بڑا سا اور تروتازہ گلدستہ بھی تھا۔ بڑے بڑے سرخ گلاب' زندگی کی مہک سے بھرپور۔

فہمیدہ' اس کا میاں' افروز' اس کے والدین شکیل کے والدین اور دو ایک دوسرے رشتے دار بھی شکیل کے ہمراہ تھے۔

"ارے واہ!" شکیل نے اسے دیکھتے ہی دروازے سے نعرہ لگایا "تم تو یہاں بالکل بھلی چنگی بیٹھی ہو۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں ابھی تک تم زخمی حالت میں ہی پٹیاں وغیرہ لپیٹے ہوئے نہ بیٹھی ہو۔ چلو میرے تاخیر سے آنے کا یہ فائدہ تو ہوا کہ میں تمہیں بالکل تندرست اور ٹھیک ٹھاک دیکھ رہا ہوں۔ ارے معاف کرنا۔ آنے کی خوشی اور گھبراہٹ میں میں سلام کرنا تو بھول ہی گیا۔ اسلام علیکم محترمہ غزالہ صاحبہ!"

اس نے آداب بجالانے کے سے انداز میں باقاعدہ جھک کر شوخ لہجے میں سلام کیا۔ سب لوگ کمرے میں آگئے۔ شکیل نے آگے بڑھ کر گلدستہ اس کے قریب تکیے پر رکھ دیا۔

غزالہ نے محض اچٹتی سی نظر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں وفور اشتیاق سے چمک رہی تھیں اور چہرے پر مسرت کا پرتو تھا۔ اس کے تاثرات سے ذرا بھی شبہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ غزالہ میں کوئی تبدیلی دیکھ رہا ہے۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے سب کچھ پہلے ہی کی طرح ہو۔ حالات بھی اور غزالہ بھی۔ غزالہ کے چہرے کی تبدیلیاں جیسے اسے نظر ہی نہیں آرہی تھیں۔

وہ واقعی ایسا محسوس کررہا تھا یا اداکاری کررہا تھا؟ غزالہ

نے اپنے آپ سے پوچھا۔ پھر اسے یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ اداکاری نہیں کر رہا تھا۔ اتنے برسوں کے ساتھ میں وہ یہ تو جان ہی چکی تھی کہ شکیل کو اداکاری کرنی ہی نہیں آتی تھی۔ وہ یقیناً صرف اسی خیال سے خوش تھا کہ غزالہ کی جان تو بچ گئی۔ وہ صحت یاب تو ہو گئی۔ شاید وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح اسے صرف دل کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جیسا کہ وہ دعویٰ کیا کرتا تھا۔

اس کی روح میں ٹھنڈک کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس کا رواں رواں جیسے سرشار سا ہو گیا۔ اس کے باوجود لاشعوری طور پر اپنی بدصورتی کے احساس سے اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

ارے واہ!" شکیل ایک بار پھر بلند آواز میں بولا "یہ اچھا طریقہ ہے، استقبال کرنے کا۔ نہ ہماری بات کا کوئی جواب۔ نہ سلام کا کوئی جواب۔ بھئی ہم ہزاروں میل دور سے اس لیے تو نہیں آئے تھے بھئی اگر تمہیں ہمارا خیال نہیں تو کم از کم ان بزرگوں اور غیر بزرگ خواتین اور حضرات ہی کا کچھ خیال کرو جو ہمارے ساتھ تشریف لائے ہیں۔ انہیں ہم اسی لیے ساتھ لائے ہیں کہ اگر تم بداخلاقی کا مظاہرہ کرو تو پہلے تو ہم ان سے سفارش کرائیں کہ تمہیں اپنے اخلاق کا پہلا سا معیار برقرار رکھنا چاہیے اور اگر تم یہ بات نہ مانو تو پھر ہم تمہیں ان سے سزا دلوائیں۔"

یہ کہہ کر وہ باقی سب لوگوں کی طرف مڑا "کیوں جناب! نوجوان، جوان اور بزرگ خواتین و حضرات! آپ لوگ اس نادان لڑکی کے لیے کیا سزا تجویز کرتے ہیں؟"

"یہی کہ آج ہی اس کا نام اسپتال سے کٹوا لیا جائے۔" شکیل کی امی مسکراتے ہوئے بولیں۔ وہ ایک پڑھی لکھی، شائستہ خاتون تھیں۔ ایک کالج میں نفسیات کی لیکچرر رہ چکی تھیں۔ کئی برس پہلے طویل عرصے کے لیے بیمار پڑ گئی تھیں، جس کے دوران میں انہیں ملازمت چھوڑنی پڑی۔ صحت یابی کے بعد دوبارہ نوکری کرنے کو ان کا دل ہی نہیں چاہا۔

"کیسی صحیح سزا تجویز کی ہے آپ نے ممی!" شکیل محبت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اسپتال والے اس مجرمہ کو چند دن اور رکھنا چاہتے ہیں لیکن ہم کوشش کریں تو اپنی اس مجرمہ کو آج ہی رہا کرا کے لے جا سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں دنیا کی اس حسین ترین لڑکی کے اعزاز میں، اس کی صحت یابی کی خوشی میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا جائے۔"

"طنز کر رہے ہو؟" غزالہ تڑپ کر بولی۔

"طنز!" شکیل گویا بھونچکا رہ گیا۔ بڑے بھولپن اور سادگی سے اس نے یکے بعد دیگرے سب کی طرف دیکھا۔ گویا نظروں ہی نظروں میں پوچھ رہا ہو کہ اسے کیا ہوا؟

پھر وہ غزالہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی تم پر طنز کیا ہے؟ میں اس سے پہلے بھی ہمیشہ چھوٹوں، بڑوں، اپنے والدین اور تمہارے والدین غرض یہ کہ سب کے سامنے تمہیں دنیا کی حسین ترین لڑکی کہتا رہا ہوں۔ دی موسٹ بیوٹی فل گرل ان دی ورلڈ۔ میں نے ہمیشہ یہی الفاظ استعمال کیے ہیں اور مجھے اس بات کی بھی کبھی پروا نہیں رہی کہ میری اس بے تکلفی کو کوئی اچھا محسوس کرتا ہے یا برا۔ میں جو محسوس کرتا ہوں وہ کہتا رہتا ہوں اور یہی میں آج بھی محسوس کر رہا ہوں، اس لیے کہہ رہا ہوں۔"

پھر وہ زور سے ہنسا "یہ تم نے یک بہ یک ہی احساس کمتری کو اپنے اوپر کیوں مسلط کر لیا ہے؟ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تم نے احساس کمتری کو اپنے اوپر لحاف کی طرح اوڑھ لیا ہے۔ محض اس لیے کہ حادثے میں تمہیں کچھ چوٹیں آ گئیں اور ان کے نشانات تمہارے چہرے پر رہ گئے؟ ارے بے وقوف! لوگ اس سے کہیں زیادہ بڑی بھیانک بدصورتی کے ساتھ اس دنیا میں بڑے اطمینان کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ دوسروں کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ آپ کو عقل کل سمجھتے ہیں۔ اپنے اختیارات سے ناجائز فائدے اٹھاتے ہیں۔ بدزبان ہوتے ہیں، جاہل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب خوف ناک قسم کی بدصورتی ہی کی مختلف قسمیں ہیں۔ لوگ ایسی ایسی بدصورتی کے ساتھ بھی سینہ تان کر دنیا میں زندگی گزارتے ہیں اور تم محض چند زخموں کے نشانات سے گھبرا رہی ہو؟ بھئی واقعی تمہارے انداز دوں سے کہیں زیادہ احمق ہو۔"

غزالہ کے حواس پر جمی ہوئی برف سی پگھلنے لگی۔ ان لفظوں میں اتنا ہی گداز، اتنا ہی خلوص اور اتنی ہی حرارت تھی۔ غزالہ کا دل ہولے ہولے لرزنے لگا۔ اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے ہی رکھا اور بلک بلک کر رونے لگی لیکن ان آنکھوں سے گویا دل کا غبار چھٹتا جا رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کا وجود ہلکا ہوتا جا رہا تھا۔

سب لوگ اس کے اردگرد بیٹھ گئے اور باری باری اسے سینے سے لگا کر تسلیاں دینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ ان سب کے درمیان بیٹھی ہنس بول رہی تھی۔ بالکل نارمل انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ شام تک وہ سب اس کے ساتھ رہے اور اس دوران میں اسے اسپتال سے ڈسچارج کرانے



کی کارروائی بھی مکمل کروالی۔ شام کو وہ سب اسے ساتھ لے کر ہی گھر گئے۔

دو دن بعد اس کی صحت یابی کی خوشی میں واقعی ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ ضیافت غزالہ کے گھر پر ہی تھی لیکن اس کے انتظامات میں شکیل کے گھر والے پیش پیش تھے۔ سب ہی خاندان والے اور سب ہی کے احباب شریک ہوئے۔ بڑا لطف رہا۔

جتنے دن شکیل پاکستان میں رہا، غزالہ کے لیے زندگی بڑی ہنگامہ خیز رہی۔ ہر وقت رگ و پے میں ایک ہیجان سا رہتا۔ آخر کار وہ واپس چلا گیا اسے جانا ہی تھا۔

اس کے جانے پر غزالہ اداس نہیں تھی۔ وہ اس کی زندگی کی رونقیں واپس دے گیا تھا۔ اس کے ذہن سے ادائی، احساس کمتری، اندیشے اور وسوسے سب کچھ کھرچ کر پھینک گیا تھا۔ اس کی زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ یہ کوئی پیشہ ورانہ مشن نہیں تھی۔ شکیل کو یا اسے اس مشن پر تھا اور یہ کوئی غیر اہم مشن نہیں تھا۔

ایک زندگی جو شاید ظرف آنسوؤں کے سمندر میں غرق ہو جاتی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے واپس خوشیوں اور امیدوں کے ساحل پر پہنچا گیا تھا۔ غزالہ نے دوبارہ ڈیوٹی پر بھی جانا شروع کر دیا تھا۔ اپنی والوں کا رویہ اس کے ساتھ اب روانہ رہا تھا۔ انہوں نے نہ صرف طویل رخصت کے دوران میں اس کی تنخواہ باقاعدگی سے ادا کی تھی بلکہ اس کے طبی علاج معالجے کے اخراجات بھی برداشت کیے تھے۔

جب وہ ڈیوٹی پر واپس پہنچی تو سب ہی کا رویہ حسب سابق رہا۔ کسی نے بھی اپنے طرز عمل سے اسے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ اس کی ذات میں کوئی تبدیلی آ چکی ہے، ماسوائے اس کی شخصیت کا حصہ بن چکی ہے یا وہ اب لوگوں کی مرکز نگاہ بننے کی خصوصیات سے محروم ہو چکی ہے۔ سب نے اس حادثے پر اظہار ہمدردی کیا اور بس! تھوڑی دیر بعد ہی سب نے یوں کام شروع کر دیا اور اسے بھی یوں کام میں لگا دیا گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

بس ایک چھوٹی سی تبدیلی آئی تھی اور وہ یہ کہ اس نے برقع پہننا شروع کر دیا تھا۔ دفتر میں کام کے دوران میں، دوسرے لوگوں کے پاس آتے جاتے۔ بات چیت کرتے ہوئے غرض یہ کہ ہر وقت اس کے چہرے پر اس طرح نقاب رہتی کہ صرف آنکھیں نظر آتیں۔

ابتدا میں دو ایک دفتری ساتھیوں نے دبی دبی زبان میں اور ہمدردانہ لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ محض زخموں کے نشانات وغیرہ کو چھپانے کے لیے برقع کا سہارا لینے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ پہلے وہ برقع نہیں لیتی تھی لیکن حادثے کے بعد لینا شروع کر دیا ہے۔ اگر وہ پہلے ہی سے لے رہی ہوتی تو پھر تو اچھا تھا لیکن غزالہ نے سب کو ہنس کر ٹال دیا تھا۔

"بھئی میں نہیں چاہتی کہ آپ لوگ گھر جا کر راتوں کو خواب میں بھی ڈرتے رہیں۔" غزالہ نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے کہا تھا "مانا کہ میں پہلے پردہ دار خاتون نہیں تھی اور اب بھی مجھے صحیح معنوں میں پردہ داری کی صف میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ میں محض اپنی غرض کے لیے برقع لینے لگی ہوں لیکن اس غرض میں آپ سب کا بھی فائدہ ہے۔"

ہلکا سا قہقہہ لگا کر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "یہ کوئی اچھی بات تو نہیں نا کہ آپ لوگ رات کو اچھے بھلے سوئیں لیکن رات کے کسی پہر چیخیں مارتی ہوئے اٹھ کھڑے ہوں اور بیویوں کے پوچھنے پر آپ کو بتانا پڑے کہ آپ نے دفتر کی ایک لڑکی کو خواب میں دیکھ لیا ہے۔ وہ آپ کی وضاحت تو بعد میں سنیں گی کہ اس لڑکی کی صورت کیسی ہے؟ پہلے وہ تفتیش کریں گی کہ آپ نے دفتر کی ایک لڑکی کو خوابوں میں دیکھنا کیوں شروع کر دیا ہے۔"

غزالہ نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ سب نے اس قہقہے میں اس کا ساتھ دیا لیکن پھر سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ تاہم اس نے اپنا معمول جاری رکھا۔ برقع اس کی ذات کا جز بن گیا۔

شکیل کے خطوط آتے رہے۔ زندگی آمیز اور زندگی آموز خطوط۔ وہ تحریریں جنہیں پڑھ کر زندہ رہنے کا حوصلہ ملتا تھا۔

"پھر رفتہ رفتہ خطوط کے درمیان وقفہ بڑھنے لگا پھر دھیرے دھیرے ان سے خلوص کی مہک کم ہونے لگی۔ ہوتے ہوتے وہ محض کاغذ کے حقیر ٹکڑے رہ گئے جن پر چند آڑے ترچھے اور رسمی سے لفظوں پر مشتمل چند سطریں موجود ہوتی تھیں۔ خلوص، محبت اور وابستگی سے عاری الفاظ۔ کھوکھلے الفاظ۔ محض خانہ پری کی سی باتیں۔ جیسے کوئی محض وضع داری نبھانے کے لیے کوئی بات نہ سوجھنے پر موسم کی باتیں کیے جا رہا ہو۔

کاغذ کے سینے پر بکھرے ہوئے یہ الفاظ اب اسے سنپولیوں سے زیادہ برے لگتے تھے۔ اپنے چہرے کے نشانات سے زیادہ بدنما نظر آتے تھے۔ وہ بادل ناخواستہ ان خطوط کے جواب دیتی رہی۔

پھر رفتہ رفتہ ان کھلے خطوط کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ اسے پہلے ہی اندیشہ تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ایسا ہونے والا ہے..... مگر زندگی گزارنے کے لیے طفل تسلیاں بہت ضروری ہیں۔ وہ بھی اپنے آپ کو ایک عرصے تک طفل تسلیوں سے بہلاتی رہی۔

بالآخر انتظار بھی ختم ہوگیا۔ زندگی کے ساحل پر گہرا سکوت چھا گیا۔ غزالہ کو معلوم تھا کہ شکیل کا کورس ختم ہوئے دو سال ہونے کو آرہے تھے مگر وہ واپس نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی اس کی واپسی کے کوئی آثار نظر آرہے تھے بلکہ اس کے متعلق تو واضح طور پر کوئی اطلاع ہی نہیں ملتی تھی۔

شکیل کے گھر والوں کا غزالہ کے گھر آنا جانا تقریباً ختم ہوگیا تھا۔ غزالہ کے گھر والے البتہ اب بھی ان کے ہاں جاتے رہتے تھے۔ غزالہ کو اپنی بہنوں سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ وہ لوگ اگر شکیل کے گھر والوں سے شکیل کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے تو عموماً وہ کچھ چپ سے ہوجاتے تھے یا پھر کمزور سے لہجے میں یہی کہتے تھے کہ انہیں تو خود اس کے بارے میں صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں۔ وہ بس کبھی کبھار رسمی سا خط لکھتا ہے اور صرف اپنی خیریت کی اطلاع دیتا ہے۔ اپنے مستقبل کے ارادوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھتا۔

ان کے رویے میں بھی رکھائی آتی جارہی تھی۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی تھا کہ غزالہ کے گھر والوں کا بھی ان کے ہاں آنا جانا برائے نام رہ گیا۔ غزالہ کی بہنیں کبھی کبھار بھڑک اٹھتیں اور اپنی امی پر زور دیتیں کہ وہ شکیل کے گھر والوں سے بات کریں کہ آخر ان کے اور شکیل کے ارادے کیا ہیں مگر اس بات کی بھنک غزالہ کو بھی پڑ جاتی اور وہ آنسوؤں میں بھیگی آواز میں صرف اتنا کہتی "امی مجھے خود کشی پر مجبور نہ کریں۔ اگر وہ لوگ سکوت اختیار کیے رکھنا چاہتے ہیں تو آپ ان پر زور کیوں دیتی ہیں؟"

"لیکن ہمیں اس طرح ہونٹ سیے رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟" غزالہ کی کوئی بہن کہتی "آخر شکیل سے تمہاری باقاعدہ منگنی ہوئی ہے۔ تم منگیتر ہو اس کی۔ ہمیں ان سے جواب لینے کا پورا حق حاصل ہے کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟"

"خاموشی بہت سے سوالوں کا جواب ہوتی ہے۔" غزالہ نوٹے ہوئے لہجے میں کہتی۔ اس کی بہنیں عمر میں اس سے بڑی تھیں مگر اس لمحے وہ دونوں اسے بہت چھوٹی لگیں۔

"شادی بیاہ اور رشتے داریوں کے معاملوں میں فلسفے نہیں چلتے۔" اس کی کوئی بہن کہتی۔

غزالہ تقریباً سسک کر کہتی "میں نہیں چاہتی کہ تم ان لوگوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ان سے جواب مانگو۔ آخر انا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اور جب انسان میں گزو بھر یاں آتی ہیں تو اس کی انا بھی زیادہ حساس ہوجاتی ہے۔ آپ لوگوں نے میری بہتری سوچ کر رشتہ کیا تھا۔ اب میری ہی بہتری سمجھتے ہوئے خاموش رہیے۔ میں کوئی بے جان چیز نہیں ہوں۔ خواہ کسی کو میری طلب ہو یا نہ ہو مگر آپ مجھے اس کی جھولی میں ڈال دیں ... میں گوشت پوست کی انسان ہوں، میرے سینے میں دل دھڑکتا ہے، میں سوچ سکتی ہوں، محسوس کرسکتی ہوں بلکہ میری حسیات پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی ہیں۔ پہلے شاید میں صرف وہ باتیں سمجھتی تھی جو کی جاتی تھیں اب میں وہ باتیں بھی سمجھتی ہوں، جو نہیں کی جاتیں اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر زیادہ کریدنے پر بھی اندر سے انکار کا عفریت ہی برآمد ہوا تو پھر امید ہی ساتھ چھوڑ جائے گی۔ اب کم از کم ایک موہوم سی امید تو ہے۔ مجھے میری امید پر چھوڑ دیجیے۔ میں اس موہوم سی امید کے سہارے ہی جی لوں گی۔"

وہ اپنے کمرے میں بند ہوجاتی اور اس وقت تک نہ نکلتی جب تک اس کی امی اور بہنیں اس سے دوبارہ کریدنے کے اس موضوع کو اب کوئی بھی نہیں چھیڑے گا۔ شکیل کا ذکر نہیں جائے گا۔

وقت گزرتا رہا۔ غزالہ کو تنہائیوں کی اذیت برداشت کرنے کا ہنر آگیا تھا۔ وہ پتھر بن گئی تھی۔ بس اس پتھر کے سینے میں ایک چنگاری سی باقی۔ شاید یہی دل تھا۔ جو کبھی شعلہ رقصاں، کبھی برق تپاں ہوا کرتا تھا۔ سمیٹتے سمیٹتے محض چنگاری رہ گیا تھا۔ یہ چنگاری کبھی کبھی دھیرے دھیرے سرد پڑتی جارہی تھی۔ شاید چند برسوں کی بات اور تھی کہ سینے میں محض راکھ رہ جاتی۔ ایک مشت خاک۔

یہ وہ رہ گزر تھی جس سے کوئی قافلہ نہیں گزرا تھا مگر غبار نہ جانے کیوں اب تک اڑ رہا تھا۔ آہٹوں کی بازگشت جانے کیوں اب تک باقی تھی۔ چھ برس گزر گئے تھے۔ چھ صدیوں سے بھی زیادہ طویل چھ برس!

شکیل کے گھر والے کرائے کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ ایک سال پہلے ان کا ڈیفنس میں مکان بن گیا تھا اور وہ وہاں چلے گئے تھے۔ دونوں خاندانوں کا میل جول، ربط ضبط تو بہت پہلے ہی ختم ہوچکا تھا۔ اب تو نظروں کا رابطہ بھی نہیں رہا تھا۔

یہ کچھ ایسا ترکِ تعلق تھا جس کے لیے کسی نے کسی کو طعنہ نہیں دیا تھا۔ کسی نے صفائی پیش نہیں کی تھی۔ کسی نے



کسی کو برا بھلا نہیں کہا تھا۔ کسی نے معذرت طلب نہیں کی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ بس خود بہ خود ہی ایک خلیج سی درمیان میں آگئی تھی جو دن بہ دن پھیلتی گئی۔ ادھر انا کی صلیب تھی اور ادھر شاید احساسِ جرم کا سکوت۔ اور یوں گویا بات ہی ختم ہوگئی۔

شکیل باہر ہی سیٹل ہوگیا تھا۔ غزالہ نے اس کے بارے میں اُڑتی اُڑتی سنی تھی کہ اس نے کسی انگریز لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ جس کی وجہ سے اسے انگلینڈ کی سٹیزن شپ مل گئی تھی۔ صحیح طور پر کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ بات کتنی سچائی تھی اور اس میں کتنی حقیقت تھی؟"

غزالہ کی زندگی ایک لگے بندھے معمول کے ساتھ گزر رہی تھی۔ ہر دن گویا ایک ہی سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ صبح وہ خاموشی سے ملازمت پر چلی جاتی، جہاں اب اس کا گریڈ بڑھ گیا تھا۔ وہ ایگزیکٹیوز میں آگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ گھر واپس پہنچتے پہنچتے اسے خاصی تھکن ہوجاتی۔ وہ تھوڑی دیر آرام کرتی اور اس دوران میں علاقے کے گھریلو نوکر اور دیگر غریب لوگوں کے بچے اس کے پاس پڑھنے کے لیے پہنچ جاتے۔ اس نے غریب لوگوں کے بچوں کو مفت پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ پندرہ بیس بچے بڑی باقاعدگی سے اس کے پاس پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ ان میں سے بعض کو وہ کتابیں بھی اپنے پیسوں سے لے کر دیتی تھی۔

اس کام سے رات تک کی مصروفیت بھی مل گئی تھی اور سکونِ قلب کا بھی سامان ہوگیا تھا۔ ان غریب بچوں کے والدین جب اسے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ان گنت دعائیں دیتے تھے تو اس کے دل کے صحرا میں جیسے پھواریں سی پڑنے لگتی تھیں۔

اس ساری مصروفیت کے باوجود اسے رات گئے تک نیند نہ آتی۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی گھنٹوں چھت کو تکتی رہتی لیکن کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی رات تک جاگتی رہتی ہے اور یہ اسے خود بھی معلوم نہیں کہ وہ کیا سوچتی رہتی ہے؟ شاید وہ کچھ بھی نہیں سوچتی تھی۔ شاید دل میں سناٹا اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس سکوت کی زیادتی سے ہی نیند اُڑ گئی تھی۔ تاہم یہ اس کی نظر میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی نظر میں تو کوئی بھی مسئلہ 'مسئلہ' نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی گہری جھیل بن گئی تھی جس کی تہ میں پڑے ہوئے سنگریزے کسی کو نظر نہیں آتے تھے۔

اس روز چھٹی تھی۔ وہ دن چڑھے گھر سے نکلی۔ ایک گھریلو مارکیٹ سے اسے اپنی ضروریات کی کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ شاپنگ میں اسے خاصی دیر لگ گئی۔ اس وقت وہ ایک ہاتھ میں شاپنگ بیگ لٹکائے اور دوسرے میں پھل کتابیں تھامے ایک جنرل اسٹور میں شوکیس پر جھکی ہوئی تھی جب ایک آواز سن کر گویا اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"غزالہ!" کہنے کو تو صرف ایک لفظ تھا۔ اس کا نام تھا۔ اس نام سے دن میں بیسیوں افراد بیسیوں مرتبہ اسے پکارتے تھے مگر وہ ہرگز نہیں چونکتی تھی۔ وہ تو کسی بھی بات پر نہیں چونکتی تھی لیکن اس آواز کی بات ہی اور تھی۔ برسوں گزر گئے تھے مگر وقت اس کے ذہن کی سوچ سے اس آواز کو کھرچ پھینکنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ یہ آواز، یہ لہجہ اسی طرح سماعت میں جاگزیں تھا جس طرح آج سے چھ برس پہلے۔

اس لیے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یہ آواز بھلا وہ اس وقت اور یہاں کیونکر سن سکتی تھی؟ یقیناً اسے مغالطہ ہوا تھا مگر یہ مغالطہ بہت ہی خوف ناک تھا۔ اس کے اعصاب کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ کرسکی۔

تب اسے پکارنے والا اس کے برابر آن کھڑا ہوا۔ غزالہ نے دھیرے دھیرے نظر اٹھائی... شکیل واقعی اس کے پاس کھڑا تھا۔ وہی دراز قد، وجیہہ اور خوش لباس شکیل۔ جس کی آمد سے کبھی اس کے خیالوں کی راہ گزر پر جلترنگ سے بج اٹھتے تھے۔

مگر آج وہ اچانک اسے یوں، اتنے قریب دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی۔ سہم گئی جیسے اس نے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو۔ وہ لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور اگر اس نے مضبوطی سے شوکیس کو نہ تھام لیا ہوتا تو شاید وہ گر ہی جاتی۔ شکیل گویا اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ وہ بڑے بڑے شیشوں والا دھوپ کا چشمہ لگائے ہوئے تھا۔

## مختصر مختصر

تین دن پہلے اقبال صاحب کی بیوی نے ان سے بات چیت بند کردی تھی۔ اب وہ بہت پریشان ہیں۔ انہیں یاد نہیں آرہا کہ وہ کون سی بات تھی جسے سن کر ان کی بیوی نے بات چیت بند کی تھی۔

باس اتنے غائب دماغ تھے کہ ایک روز بیوی کو ڈنر پر لے گئے اور سیکریٹری کو فون کردیا کہ آج وہ دیر تک دفتر میں مصروف رہیں گے۔

اس فکر میں ان کی بہت سی راتیں جاگتے ہوئے گزری ہیں کہ ان کے ہاں بچے کیوں نہیں ہیں۔

"کیسا سرپرائز دیا میں نے تمہیں؟" وہ خوش گوار لہجے میں بولا۔ وہ ذرا بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی شگفتگی، وہی زندہ دلی۔

غزالہ کچھ بھی نہ بولی۔ اس سے بولا ہی نہیں گیا۔

"تم نے میری نظر کی داد نہیں دی۔ میں نے برقعے میں بھی تمہیں پہچان لیا اور وہ بھی چھ سال بعد۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

وہ اب بھی خاموش رہی مگر شکیل کو جیسے جواب کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں کل رات ہی لندن سے گھر آیا ہوں۔ آج خالہ نے بتایا کہ تم اس مارکیٹ میں شاپنگ کے لیے گئی ہو۔ کافی دیر میں گھر پر ہی بیٹھا تمہاری واپسی کا انتظار کرتا رہا اور جب تاب انتظار نہ رہی تو میں نے سوچا کہ خود جاکر دیکھ لیتا ہوں۔ گلی، کوچے، عمارتیں اور بازار سب کچھ آج بھی میرے لیے اسی طرح شناسا اور مانوس ہیں جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔

اس دوران میں ایک سیلز مین ان کے قریب آگیا۔ شکیل دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "آؤ غزالہ چلیں۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔ آؤ۔"

وہ تحویل انداز میں دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ شکیل اس کے شانہ بشانہ چل رہا تھا۔ باہر آکر وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "ادھر چلو۔ بھائی جان کی گاڑی مانگ کرلایا ہوں۔ ادھر کھڑی ہوئی ہے۔ چل کر کہیں بیٹھتے ہیں۔ کافی یا چائے پیتے ہیں۔"

وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتے ہوئے گاڑی میں آبیٹھی۔ اس کے اعصاب میں اندر ہی اندر اب بھی ایک لرزش سی باقی تھی مگر وہ حتی الامکان پرسکون نظر آنے کی کوشش کررہی تھی۔

مین روڈ پر آنے کے بعد گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ وہی شناسا سڑکیں تھیں۔ وہی شناسا عمارتیں۔ اور وہی شناسا ہم سفر مگر درمیان میں جو صدیوں کی خلیج حائل تھی۔ کیا اسے کوئی پاٹ سکتا تھا؟ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ۔ شاید اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اندھیروں میں تاک ٹوئیاں مار رہے تھے۔

ان کا فیورٹ ریسٹوران زیادہ دور نہیں تھا جہاں وہ کسی زمانے میں اکثر ویشتر بیٹھا کرتے تھے۔ وہاں کا ماحول کچھ بدل گیا تھا۔ چیزیں کچھ پرانی پرانی اور میلی سی لگنے لگی تھیں۔ وہی مدھم اور خنک سی روشنی، وہی لوگوں کی سرگوشیوں میں گفتگو۔

وہ فیملیز والے حصے میں ایک بوتھ میں جاکر بیٹھ گئے۔

شکیل نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آنے تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ غزالہ کو اپنی خیر سردست کچھ کہنا ہی نہیں تھا مگر وہ جو ضروری بات کرنے آیا تھا، اسے بھی شاید موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے بے حس و حرکت بیٹھا غزالہ کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ جس کا آدھا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ بس یونہی کبھی کبھی مسکرا دیتا۔ بے مقصد اور کچھ کھسیانی سی مسکراہٹ۔

چائے آچکی تو شکیل نے خود ہی بنائی اور پیالا گھونٹ لینے کے بعد گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا "مجھے معلوم ہے، تم مجھ سے ناراض ہوگی۔ سب ناراض ہیں۔ اور بجا ناراض ہیں لیکن میں اب واپس آگیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں، مجھے معاف کردیا جائے۔ کم از کم تم تو مجھے معاف کردو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں تمام کوتاہیوں کی تلافی کردوں گا۔ وقت اور حالات میری سوچوں پر اثر انداز ہوگئے تھے۔ میں اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ میری وعدہ شکنی تم سے نہیں درحقیقت اپنے آپ سے ہی تھی۔ میں اپنے آپ کو فریب دے رہا تھا کہ میں تمہارے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں لیکن رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوگیا کہ میں نے غلط سوچا تھا۔ میں اپنے مستقبل کا راستہ پر لوٹ آیا ہوں اور صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے نا!"

"تم نے کسی انگریز لڑکی سے شادی بھی تو کی تھی نا؟" غزالہ نے سرگوشی نما لہجے میں پوچھا۔ اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی سی لگی "میں نے سنا تھا۔"

"ہاں۔ تم نے صحیح سنا تھا۔ لیکن ہمارے درمیان طلاق ہوچکی ہے۔" وہ بلا تامل بولا "تم نے کہا نا کہ میں بھٹک گیا تھا۔ میں اپنی اصلیت کی دنیا میں لوٹ آیا ہوں۔"

اس کے لہجے میں اضطراب تھا۔ شاید اس کی آنکھوں میں نمی بھی آگئی تھی۔ اس نے اپنا بڑے بڑے شیشوں والا چشمہ اتار دیا۔۔۔ اور تب غزالہ کو حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ شکیل کی آنکھوں کے نیچے کی کھال پر گلابی سے نشان تھے اور وہ کچھ عجیب سے انداز میں سکڑی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے دونوں آنکھیں بالکل ترچھی ہوگئی تھیں اور محض ان آنکھوں کی وجہ سے یکایک اس کا پورا چہرہ ہی ڈراؤنا سا لگنے لگا تھا۔ بڑے بڑے تاریک شیشوں کی عینک اترتے ہی گویا غزالہ کی آنکھوں کے سامنے منظر ہی بدل گیا۔

شکیل نے رومال سے آنکھوں کو تھپکا اور انہیں دوبارہ عینک کے پیچھے چھپالیا پھر عجیب سے انداز میں مسکراتے



ہوئے غزالہ کی طرف دیکھا۔ گویا منتظر ہو کہ غزالہ اس سلسلے میں کچھ پوچھے۔

غزالہ حیرت کے جھٹکے سے بہ مشکل سنبھلی "یہ۔۔۔ یہ کیا ہوا تمہاری آنکھوں کو؟" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اس نے ایک طویل سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹکالیا اور دھیمی آواز میں بولا "لندن میں پچھلے سال ایشیائیوں کے خلاف نفرت کا جو سیلاب امڈا تھا اور جس کی لپیٹ ابھی تک وہاں پھیل ہوئی ہیں، اس کے دوران چند گنجے انگریز فنڈوں نے میرے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ یہ پورا چہرہ کافی بگڑ گیا تھا۔ باقی حصہ تو کاسمیٹک سرجری سے ٹھیک ہوگیا لیکن آنکھوں کے اس حصے کو ڈاکٹروں نے چھیڑنے سے انکار کردیا۔ اندر کچھ نسیں وغیرہ اس طرح متاثر ہوگئی تھیں کہ کسی بھی قسم کی جراحی سے بینائی جانے کا شدید خطرہ تھا۔ انہوں نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔ اگر میں اجازت دے دیتا تو وہ اس حصے کی بھی کاسمیٹک سرجری کی کوشش کرتے۔ اس صورت میں بینائی ضائع ہونے کا ذمے دار میں خود ہوتا لیکن میں نے یہ خطرہ مول نہیں لیا۔ ہر وقت بڑے بڑے تاریک شیشوں والی یہ عینک لگا کر جیا جاسکتا ہے لیکن اندھے ہو کر جینا بہت مشکل ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ غزالہ اس کی طرف خاموش، بت بنی بیٹھی دیکھتی رہی۔ شکیل اس دوران میں دوبارہ چائے کا آرڈر دے چکا تھا کیونکہ پہلی چائے ٹھنڈی ہوگئی تھی۔

دوسری چائے آنے پر وہ ایک گھونٹ بھرنے کے بعد سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "رنگین میں سمجھتا ہوں کہ یہ حادثہ میرے حق میں اچھا رہا ہے کیونکہ یہ مجھے اپنی دنیا میں واپس لانے کا سبب بنا ہے۔ اس حادثے سے مجھے بہت سی باتیں سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جب تمہیں حادثہ پیش آیا، اس وقت اور اس کے بعد تمہارے احساسات کیا رہے ہوں گے۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ چہرہ۔۔۔ جسم۔۔۔ ملبوسات، یہ سب بے معنی چیزیں ہیں۔۔۔ اصل اہمیت تو صرف اس انسان کی ہے جو اس جسم کے اندر مقید ہے۔ میں نے اندر کے انسان کو دریافت کرلیا ہے۔"

وہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے متوقع سی نظروں سے غزالہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غزالہ اسی طرح بت بنی بیٹھی تھی۔ چائے کا دوسرا کپ بھی اس کے سامنے اسی طرح بھرا رکھا تھا۔ اس نے اسے بھی چھوا تک نہیں تھا۔

"تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟" ایک طویل سکوت کے بعد آخر کار شکیل بولا۔

بہت دیر سے غزالہ کے دل میں جیسے قطرہ قطرہ زہر جمع ہورہا تھا یا شاید یہ بھولی بسری آرزوؤں کا لہو تھا جو بوند بوند اس کے دل کے آنگن میں ٹپک رہا تھا۔

وہ بولی تو اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی لیکن لہجے میں خنجر کی سی کاٹ تھی "مجھے یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں کہ پچھلے چھ برس مجھ پر صدیوں کی طرح بیتے ہیں۔ جانے کتنی راتیں میں نے جاگ کر گزاری ہیں۔ جانے کس طرح میں نے اپنی آرزوؤں، اپنے ارمانوں اور اپنی امنگوں کو مصری ممیوں کی طرح حنوط کرکے دل کے اہرام میں سلایا ہے۔۔۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ابھی میری عمر صرف تیس سال ہے۔ ابھی جانے کتنی پہاڑ سی عمر آگے پڑی ہے جو مجھے بتانی ہے۔ ابھی جانے کس طرح آنے والے ماہ و سال کا ہر ہر لمحہ بھانس بن کر میری رگ رگ میں اترے گا۔ ابھی شب و روز مجھ سے جانے کس کس طرح انتقام لیں گے لیکن اس کے باوجود مجھے نہیں چاہیے تمہارا سہارا۔ مجھے معلوم ہے تمہارا چہرہ بگڑنے کے بعد۔۔۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تم سے دل بھر جانے کے بعد، تمہاری انگریز بیوی نے تمہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہوگا۔ طلاق تم نے نہیں دی ہوگی۔۔۔ اس نے لے لی ہوگی تم سے۔ چنانچہ اب تم لوٹ آئے ہو اس لڑکی کی طرح جو تمہارے خیال میں اب بھی تمہارا انتظار کررہی ہوگی یا جو تمہارے خیال میں جس کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ تم مردوں کی یہی فطرت ہوتی ہے۔ جب تم کہیں سے دھتکارے جاتے ہو۔۔۔ ٹوٹ پھوٹ جاتے ہو تو پھر ان لڑکیوں، ان عورتوں کی طرف لوٹ آتے ہو جن کے بارے میں تمہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ تمہیں بے چوں و چرا قبول کرلیں گی۔۔۔ سب کچھ بھلا دیں گی۔ تمہیں فوراً اپنا لیں گی۔۔۔ میں صرف تمہاری یہ خوش فہمی رفع کرنے کے لیے تمہارے ساتھ آئی تھی۔ اچھی طرح سن لو شکیل! تمہیں کوئی ضرورت نہیں مجھ سے ملنے کی، میرے گھر آنے یا میرے لیے کوئی پیغام بھیجنے کی۔ نہیں چاہیے مجھے تمہاری رفاقت۔ نہیں کرنا چاہتی میں تمہارے ساتھ شادی۔۔۔ نہیں چاہیے مجھے کسی کا ٹھکرایا ہوا مرد!"

اس کی آواز رندھنے لگی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے یوں اٹھی کہ میز الٹتے الٹتے بچی۔ شکیل پر ایک حقارت بھری نظر ڈال کر وہ تیزی کے ساتھ بوتھ سے نکلی اور کھٹ کھٹ کرتی دروازے کی طرف چل دی۔

(طبع زاد)

مرزا امجد بیگ کی ڈائری سے ہمارے معاشرے میں ہونے والے ایک واقع کا عبرت انگیز احوال

# صیدوصیاد

مرزا امجد بیگ

**انسانی حرص وہوس کی داستان۔ ان کی کہانی جن کی نظر انسانی حیات کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور جن کے آگے معمولی سی خواہش کے عوض بھینٹ چڑھایا جاسکتا ہے، مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ برائی کا بدلہ اچھائی سے نہیں مل سکتا اور جو کچھ وہ بوئیں گے وہی انہیں کاٹنا ہوگا۔**

"میرے نزدیک بہترین وکیل وہ نہیں جو قاتل کو پھانسی کے پھندے سے بچالیتا ہے بلکہ میں ایک اچھا اور معتبر وکیل اسے سمجھتا ہوں جو اپنے موکل کو انصاف مہیا کرتا ہے۔" میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دو ٹوک الفاظ میں بتایا "ایک بات کان کھول کر سن لیں فرقان صاحب میں ان وکیلوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنی فیس کھری کرنے کے لیے حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں۔ آپ جب تک کھل کر اپنے حالات مجھے نہیں بتائیں گے، میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے موکل کے ساتھ ساتھ اپنے پیشے سے بھی انصاف کرنے کا قائل ہوں۔"

فرقان صدیقی نامی وہ شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

وہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی عدالتی کاموں سے نمٹ کر اپنے دفتر پہنچا تھا۔ آج عدالت میں میری کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی اس لیے عام دنوں کی بہ نسبت میں بہت جلدی دفتر آگیا تھا۔ میرے دفتر پہنچتے ہی فرقان صدیقی مجھ سے ملنے آن پہنچا تھا۔ فرقان کو میرے چیمبر میں بھیجنے سے قبل میری سیکریٹری نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گذشتہ ایک گھنٹے میں تین مرتبہ دفتر کے چکر لگا چکا تھا۔

جب فرقان صدیقی میرے چیمبر میں داخل ہوا تو اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوچکا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے حد درجہ پریشانی ظاہر ہورہی تھی اور وہ زیر لب کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی اور اپنے رکھ رکھاؤ سے وہ مجھے کسی کھاتے پیتے گھرانے کا فرد معلوم ہوتا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد جب میں نے اس کی آمد کی غرض و غایت دریافت کی تو اس نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے اضطراری لہجے میں بتایا تھا۔

"وکیل صاحب! میں ایک عجیب و غریب پچویشن میں پھنس گیا ہوں۔"

"اس پچویشن کی کچھ وضاحت کریں؟"

وہ بولا "گذشتہ رات میں اس شہر میں موجود نہیں تھا۔"

ایک لمحے کو رک کر اس نے تشویش ناک نظر سے چیمبر کے داخلی دروازے کو دیکھا پھر مطمئن ہونے کے بعد کہنے لگا "میری غیر موجودگی میں کسی نے میری گاڑی چوری کی۔ اس گاڑی میں ایک شخص کو قتل کیا پھر لاش اور گاڑی کو ایک سنسان سڑک پر چھوڑ کر فرار ہوگیا۔"

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے سوال کیا "آپ کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟"

"یہ دیکھیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تہ شدہ اخبار میرے سامنے میز پر پھیلا دیا اور بولا "میں نے یہ ساری باتیں اسی اخبار میں پڑھی ہیں۔"

اخبار کا وہ حصہ جہاں یہ خبر چھپی ہوئی تھی وہاں مذکورہ گاڑی کی تصویر بھی نظر آرہی تھی۔ فرقان صدیقی کے مطابق یہ اس کی گرے کلر ٹویوٹا گاڑی تھی۔ خبر [illegible] مقتول کا نام ساجد حسن تھا۔ اس کی عمر کم و بیش تیس سال [illegible] تھی۔ مقتول کی پیشانی میں گولی اتار کر اسے موت کے [illegible] دھکیلا گیا تھا۔ پولیس پوری سرگرمی سے گرے ٹویوٹا کے مالک فرقان صدیقی کو تلاش کررہی تھی۔ گاڑی میں موجود کاغذات سے فرقان صدیقی کا سراغ لگانا مشکل نہیں تھا لیکن وہ اپنی رہائش گاہ پر نہیں پایا گیا تھا۔

اس خبر کا سرسری جائزہ لینے کے بعد میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے فرقان صدیقی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "فرقان صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ گذشتہ رات آپ کراچی میں موجود نہیں تھے اور آپ کی عدم موجودگی میں کسی نے آپ کی گاڑی چرا کر یہ واردات کی ہے۔"

وہ جلدی سے بولا "جی ہاں، بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔"

میں نے استفسار کیا "گذشتہ رات آپ کراچی سے باہر کہاں گئے ہوئے تھے۔"

"نواب شاہ۔"

"آپ کی رہائش کہاں پر ہے۔" میں نے پوچھا "میرا مطلب ہے، کراچی میں آپ کہاں رہتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "بہادر آباد میں۔"

"مذکورہ گاڑی آپ کی رہائش گاہ سے چوری ہوئی ہے؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "جج..... جی ہاں۔"

مجھے اس کا لہجہ کھوکھلا اور بات بے وزن سی محسوس ہوئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "آپ کے پاس اس بات کا ثبوت تو ہوگا کہ آپ گذشتہ رات واقعی نواب شاہ میں تھے؟"

اس کی آنکھوں میں خوف کی ایک پرچھائیں سی لہرائی، بات بدلتے ہوئے بولا "آپ یقین کریں وکیل صاحب۔ میں آج صبح ہی نواب شاہ سے واپس آیا ہوں۔ آپ پہلے میرے لیے ضمانت قبل از گرفتاری کا کچھ بندوبست کریں پھر میں

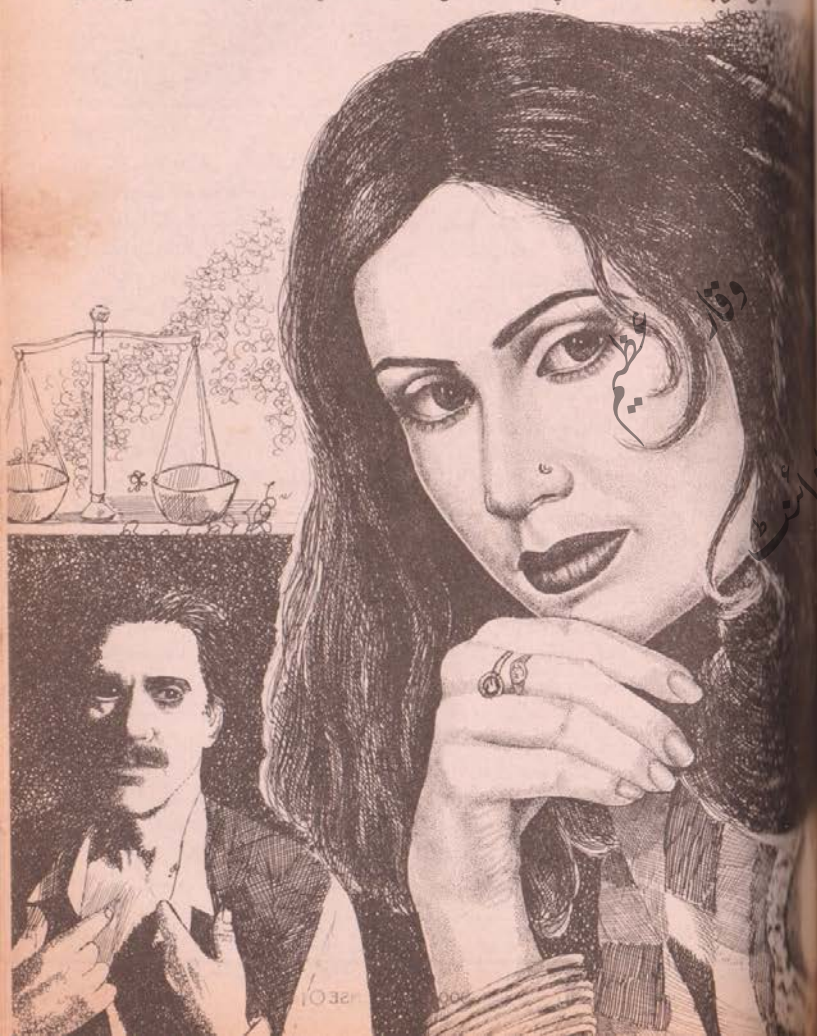

آپ کو تفصیلاً سب کچھ بتادوں گا۔"

اس کے انداز نے مجھے شک میں مبتلا کردیا۔ میں نے قدرے خشک لہجے میں کہا "فرقان صاحب! آپ کے حالات خاصے الجھے ہوئے اور پیچیدہ معلوم ہورہے ہیں جب تک آپ میرے سوالات کے واضح جواب نہیں دیں گے' میں نہ تو آپ کے معاملات کو سمجھ سکوں گا اور نہ ہی اس سلسلے میں آپ کی کوئی قانونی مدد کرسکوں گا۔"

"آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا "میں نے گذشتہ رات نواب شاہ میں آپ کی موجودگی کا ثبوت مانگا تھا۔ آپ مجھے بتائیں' کیا آپ وہاں کسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے یا کسی عزیز رشتے دار' دوست وغیرہ کے پاس رات گزاری تھی؟"

"کیا اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے؟"

"بے حد ضروری۔" میں نے قطعیت سے کہا "جب تک نواب شاہ میں آپ کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملے گا' کراچی میں آپ کی غیر موجودگی ثابت نہیں کی جاسکے گی۔"

وہ قدرے تامل کرتے ہوئے بولا "ٹھہرا تو میں ہوٹل میں ہی تھا۔"

"کس ہوٹل میں؟"

وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ مجھے شک ہوا کہ یا تو وہ ہوٹل میں ٹھہرا ہی نہیں تھا یا پھر کسی خاص وجہ سے ہوٹل کا نام بتانے میں متردد تھا۔ میں نے کہا "آپ کی فراہم کردہ تمام معلومات میرے پاس محفوظ رہیں گی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں واقعی آپ کی کوئی مدد کروں تو مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ ڈاکٹر سے مرض اور وکیل سے جرم چھپانے میں اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا وکیل صاحب۔" وہ جلدی سے بولا "آپ یقین کریں' ساجد حسن کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ کسی نے سوچی سمجھی سازش کے تحت مجھے پھانسنے کی کوشش کی ہے۔"

"اور آپ میرے پاس اس لیے آئے ہیں کہ میں آپ کو اس سوچی سمجھی سازش سے نکالنے کی کوشش کروں۔"

"بالکل ایسی ہی بات ہے۔"

"اس کے باوجود آپ مجھ سے حقائق چھپانے کی کوشش کررہے ہیں۔"

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا "ٹھہرا تو میں ہوٹل میں ہی تھا لیکن اس وقت پریشانی کے باعث مجھے ہوٹل کا نام یاد نہیں آرہا۔"

میں نے پوچھا "آپ نواب شاہ کس ذریعے سے گئے تھے؟"

"میں وہاں ہائی ٹرین گیا تھا۔"

"اور واپسی کیسے ہوئی؟"

"واپسی بھی ٹرین ہی سے ہوئی ہے۔"

"آپ کے پاس آنے اور جانے کا ریلوے ٹکٹ تو ہوگا؟"

وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا "افسوس' میں وہ ٹکٹ سنبھال کر نہیں رکھ سکا۔" قدرے توقف سے وہ چونک کر بولا "ہاں' یاد آیا۔ وکیل صاحب۔ آنے اور جانے کے ریلوے ٹکٹ تو اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے ٹکٹ چیکر نے مجھ سے لے لیے تھے۔"

اس کی بات میں وزن تھا۔ میں نے پوچھا "جس ہوٹل کا آپ کو نام یاد نہیں آرہا' وہاں رات گزاری کی کوئی رسید وغیرہ تو ہوگی انہوں نے آپ کو۔ میرا مطلب ہے کرائے وغیرہ کی رسید؟"

"رسید دی تو تھی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "مگر میں نے غیر ضروری سمجھ کر ضائع کردی۔"

"فرقان صاحب!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "بعض اوقات غیر ضروری چیزیں بہت ضروری ہوجاتی ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ عدالت بغیر ثبوت کے کوئی بات سچ تسلیم نہیں کرتی۔ جو کچھ آپ بتارہے ہیں وہ مبہم اور معاف کیجئے گا' خاصا مشکوک ہے۔ اگر گذشتہ رات آپ کی کراچی میں غیر موجودگی ثابت نہ ہوئی تو آپ بہت بڑی مصیبت میں بھی گرفتار ہوسکتے ہیں۔"

"میں اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہونے سے پہلے ہی آپ میری حفاظت کا کوئی انتظام کردیں۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا "یہ خبر پڑھنے کے بعد تو میں اپنے گھر بھی نہیں گیا۔ پولیس والوں سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ پھر میرے ایک مخلص دوست نے مشورہ دیا کہ پولیس سے چھپنے کے بجائے مجھے ضمانت قبل از گرفتاری کا بندوبست کرنا چاہیے چنانچہ میں آپ کے پاس چلا آیا ہوں لیکن آپ تو مجھے بہت مایوس کررہے ہیں۔"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا "کراچی میں آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں ایک نیکسٹائل مل میں منیجر ہوں۔" اس نے بتایا "مذکورہ مل کا نام فائن نیکسٹائل مل ہے۔ شاید آپ نے اس کا



نام نہ سنا ہو۔ بہت چھوٹی سی مل ہے۔"

"واقعی میں نے اس مل کا نام نہیں سنا۔" میں نے کہا پھر سوال کیا "فرقان صاحب! گذشتہ روز آپ مل کے کسی کام سے نواب شاہ گئے تھے یا ذاتی کام سے؟" میں نے ایک خاص مقصد کے تحت یہ سوال کیا تھا۔

وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا "وکیل صاحب!۔ اگر نواب شاہ کا ذکر مناسب نہ ہو تو کوئی اور بات سوچ لیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے' آپ تو قانون داں ہیں۔ آپ کے پاس ایک سو ایک حل ہوں گے میرے مسئلے کے۔"

"میں معافی چاہوں گا فرقان صاحب۔" میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھاتے ہوئے کہا "میں ابھی تک آپ کا مسئلہ ہی نہیں سمجھ سکا ہوں۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ مجھے آدھی ادھوری معلومات بہم پہنچا رہے ہیں آپ کی باتیں آپ کی ذات کو مشکوک بنا رہی ہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں' میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔ آپ اپنا اور میرا وقت ضائع کررہے ہیں۔"

اس کا منہ لٹک گیا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا "وکیل صاحب میرا خیال ہے' عدالت کا وقت ختم ہونے ہی والا ہے۔ آپ پہلے میری ضمانت قبل از گرفتاری منظور کروالیں پھر میں آپ کو پوری تفصیل سے سب کچھ بتادوں گا۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ میں گذشتہ رات کراچی میں ہی تھا۔ میں نے یہ رات اپنے ایک دوست کے گھر میں گزاری ہے۔ وہیں سے میری گاڑی چوری ہوئی ہے۔ پہلے میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ گاڑی میری رہائش گاہ واقع بہادر آباد سے چرائی گئی ہے۔ دراصل' میں اپنے دوست کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے مجھے دروغ گوئی کا سہارا لینا پڑا۔"

"آپ کا مذکورہ دوست کہاں رہتا ہے؟"

"طارق روڈ پر۔"

میں نے پوچھا "کیا ضرورت پڑنے پر آپ کا دوست عدالت میں گواہی دے سکتا ہے کہ گذشتہ رات آپ اس کے گھر میں تھے؟"

"وہ میری خاطر یہ سچ بولنے عدالت تک جاسکتا ہے۔"

"آپ کے دوست کا نام اور پتا کیا ہے؟"

"سب کچھ بتادوں گا' آپ سمجھ جائیں نا۔" فرقان صدیقی نے انگشت شہادت سے اپنے دائیں نتھنے کو دباتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا پھر آنکھ مارتے ہوئے بولا "عدالت کا وقت نکلا جارہا ہے وکیل صاحب۔ تفصیلی باتیں واپسی پر آپ کے دفتر میں ہوں گی۔"

میں اس کا اشارہ واضح طور پر سمجھ گیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ ذہین قارئین فرقان صدیقی کے مذکورہ دوست کا جغرافیہ باآسانی جان گئے ہوں گے۔

میں نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ فرقان صدیقی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اس کا "دوست" گذشتہ رات اپنے گھر میں اس کی موجودگی کو ثابت کرسکتا ہے لہٰذا میں نے مطمئن ہوکر اس کی درخواست ضمانت ٹائپ کروائی اور اسے ساتھ لے کر عدالت میں پہنچ گیا۔

میں سیدھا پیش کار کے پاس پہنچا اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ پیش کار نے وہ درخواست میرے ہاتھ سے لے کر مجسٹریٹ کی میز پر رکھ دی پھر بآواز بلند پوچھا "بیگ صاحب! درخواست دہندہ کدھر ہے؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی ایک سادہ لباس شخص کمرے میں داخل ہوا اور پیش کار سے پوچھا "یہ کس قسم کی درخواست ہے؟"

پیش کار نے جواب دیا "درخواست ضمانت قبل از گرفتاری۔"

"درخواست دہندہ کہاں ہے؟" سادہ لباس والے نے پوچھا۔

میں سمجھ گیا کہ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ سادہ لباس والا یقیناً پولیس کا آدمی تھا۔ سادہ لباس پولیس اہلکار کے سوال پر پیش کار نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"میرا موکل شاید کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔" اس کے ساتھ ہی میں نے فرقان صدیقی کو اشارہ بھی کیا۔

وہ میرا اشارہ سمجھ نہیں سکا۔ مزید حماقت کا ثبوت یہ دیا کہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے اونچی آواز میں بولا "بیگ صاحب! میں ادھر کھڑا ہوں۔"

سادہ لباس پولیس اہلکار نے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے گردن مخصوص اشارہ کیا۔ اس دوران میں پیش کار اس پولیس والے کو بتا چکا تھا "جناب یہ فرقان صدیقی ولد عرفان صدیقی کی درخواست ضمانت قبل از گرفتاری ہے اور درخواست دہندہ کو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔"

میرا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ اگر فرقان میرا اشارہ سمجھ کر فوراً کمرے سے باہر نکل جاتا تو اس کی بچت ہوسکتی تھی

مگر اب تو اس کے حق میں کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ سادہ لباس پولیس اہلکار کے مخصوص اشارے پر پلک جھپکتے میں دو وردی پوش پولیس اہلکار وہاں نمودار ہوگئے تھے اور انہوں نے دائیں بائیں دونوں بازوؤں سے فرقان صدیقی کو پکڑ لیا تھا۔

سادہ لباس پولیس والے نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "ہم صبح سے یہاں بیٹھے آپ کے موکل کا انتظار کر رہے تھے۔ اب آپ اس کے لیے ایک درخواست ضمانت بعد از گرفتاری تیار کریں۔"

دیکھتے ہی دیکھتے فرقان صدیقی کو ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ اس نے اپنے طور پر پولیس والوں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ ڈھکے چھپے انداز میں مک مکا کا اشارہ بھی دیا مگر وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھے۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "آپ فکر نہ کریں فرقان صاحب! یہ لوگ ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے آپ کو کل عدالت میں پیش کریں گے۔ میں یہاں موجود ہوں گا اور انشاء اللہ آپ کی ضمانت ہو جائے گی۔"

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا ہوں۔ اپنے دفتر سے نکلنے سے پہلے میں نے فرقان صدیقی سے وکالت نامہ سائن کروالیا تھا اور فیس کے معاملات بھی طے کر لیے تھے۔ اب وہ باقاعدہ میرا موکل تھا۔

فرقان صدیقی نے پولیس والوں کے ساتھ جانے سے پہلے مجھے اپنے "دوست" کا پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھوا دیا اور درخواست کی کہ میں اسے اس کی گرفتاری کی اطلاع دے دوں۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔

دفتر پہنچنے کے بعد میں نے حسب وعدہ اپنے موکل کے "دوست" سے ٹیلی فونک رابطہ کیا۔ اس دوست کا نام ستارہ تھا۔ تیسری گھنٹی پر دوسری جانب سے فون ریسیو کر لیا گیا۔

میں نے یہ تصدیق کرنے کے بعد کہ دوسری طرف میرا مطلوبہ فرد ہی ہے، اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا "میرا نام مرزا امجد بیگ۔ ایڈووکیٹ ہے۔ میں فرقان صاحب کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ۔۔۔"

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں بولی "فرقان صاحب خیریت سے تو ہیں نا۔ کیا آپ نے ان کی ضمانت قبل از گرفتاری منظور کروالی ہے؟"

"مجھے افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہو سکا۔" میں نے کہا "فرقان صاحب کی ایک بے موقع غلطی نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ پولیس نے انہیں عدالت میں گرفتار کرلیا ہے لیکن آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں انشاء اللہ کل صبح ان کی ضمانت کروالوں گا۔"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔ فرقان صاحب بہت نائس انسان ہیں۔"

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "فرقان صاحب کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ وقوعہ کی رات یعنی آٹھ اگست کی رات فرقان صاحب آپ کے پاس آپ کے گھر پر تھے۔"

ستارہ نے تصدیق کی "ہاں، فرقان صاحب پوری رات میرے پاس رہے تھے۔ دوسرے دن اخبار میں اپنی گاڑی سے متعلق خبر پڑھ کر وہ پریشان ہو گئے تھے۔ یہ مشورہ میں نے ہی انہیں دیا تھا کہ وہ فکر مند ہونے کے بجائے کسی تجربے کار وکیل سے مل کر اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کا انتظام کریں مگر افسوس کہ اس میں انہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔"

میں نے کہا "ستارہ صاحبہ! آپ کی گواہی نہایت ہی اہم ہے۔ کیا آپ عدالت کے روبرو یہ بات کہہ سکتی ہیں کہ وقوعہ کی رات ملزم فرقان صدیقی آپ کے گھر میں رہا تھا؟"

وہ اداس سے لہجے میں بولی "وکیل صاحب! میں عدالت میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ جو سچ تھا وہ میں آپ کو بتا دیا ہے۔ اب آپ اس سچ کی روشنی میں اپنی قانونی آزمائیں اور فرقان صاحب کو جلد از جلد ضمانت پر رہا کروانے کی کوشش کریں۔ میں نہیں چاہتی کہ فرقان صاحب کی خاندانی شرافت پر کوئی حرف آئے اس لیے آپ مجھے عدالت میں نہ ہی گھسیٹیں تو اچھا ہے۔"

میں نے معنی خیز لہجے میں اس سے کہا "میرے یہ کہہ دینے سے کہ وقوعہ کی رات ملزم آپ کے گھر میں تھا، عدالت میری بات کو تسلیم نہیں کرے گی۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے آپ کو باقاعدہ عدالت میں آکر گواہی دینا ہوگی اور اگر عدالت نے اس ضمن میں کوئی ثبوت مانگا تو وہ بھی مہیا کرنا ہوگا۔"

وہ سپاٹ لہجے میں بولی "وکیل صاحب! ہمیں اپنے دوستوں کی عزت کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے کیونکہ وہ ساری دنیا سے چھپ کر ہمارے پاس آتے ہیں۔ میں عدالت میں حاضر ہو کر اس راز کو عیاں نہیں کرنا چاہتی۔ آپ کوشش کریں کہ مجھ سے تعلق ظاہر کیے بغیر آپ کسی طرح فرقان صاحب کی ضمانت کروالیں۔"

وہ خاصی صاف گو لڑکی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے، وہ کوئی عورت ہو، تاہم اس کی آواز اور گفتگو سے میں نے اندازہ



قائم کیا تھا کہ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کے قریب ہوگی۔ قارئین بخوبی سمجھ گئے ہوں گے، ستارہ کا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے تھا جو اپنے دوستوں کو آسودگی بخش تفریح مہیا کرتے ہیں۔

میں نے کہا "ستارہ صاحبہ! آٹھ اگست کی شام فرقان صاحب کتنے بجے آپ کے گھر پہنچے تھے؟"

"تقریباً سات بجے۔"

"اور دوسری صبح کتنے بجے رخصت ہوئے تھے؟"

"کم و بیش دس بجے۔"

"آپ غالباً کسی فلیٹ میں رہتی ہیں؟"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔"

میں نے پوچھا "ستارہ صاحبہ! کیا فرقان صاحب نے اپنی گاڑی گلی میں کھڑی کر رکھی تھی؟"

ایک لمحے کے تامل کے بعد اس نے جواب دیا "فرقان صاحب کافی محتاط آدمی ہیں۔ وہ جب بھی میرے پاس آتے ہیں تو اپنی گاڑی کو ہمارے فلیٹ میں نہیں لاتے بلکہ ایک گلی پیچھے ہی پارک کر دیتے ہیں۔"

فرقان صدیقی مجھے بتا چکا تھا کہ اسے اخبار کے ذریعے اپنی گاڑی کی چوری کے بارے میں معلوم ہوا تھا تاہم میں نے یہی سوال ستارہ سے پوچھا "ستارہ صاحبہ! آج صبح فرقان صاحب کو کیسے پتا چلا تھا کہ ان کی گاڑی کسی قتل کی واردات میں استعمال کی گئی ہے؟"

"یہ بات انہیں اخبار پڑھنے کے بعد معلوم ہوئی تھی۔" ستارہ نے جواب دیا "پوری خبر پڑھنے کے بعد بھی جب انہیں یقین نہیں آیا تو وہ دوڑتے ہوئے اس گلی میں پہنچے جہاں رات کو اپنی گاڑی پارک کی تھی لیکن اس وقت وہاں گاڑی کو غیر موجود پا کر وہ بوکھلا گئے اور میرے پاس واپس آکر مجھے صورت حال سے آگاہ کیا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلی فرصت میں انہیں اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کا انتظام کرنا چاہیے۔ میرے سمجھانے بجھانے پر وہ ٹیکسی پکڑ کر آپ کے پاس پہنچے تھے۔"

میں نے معتدل لہجے میں کہا "ستارہ صاحبہ! مجھے آپ کی صاف گوئی بہت پسند آئی ہے۔ آپ کے بیان میں مجھے کوئی جھوٹ نظر نہیں آرہا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے دوست کے حق میں ضرور گواہی دیں گی۔ میں کل عدالت کے کمرے میں آپ کا انتظار کروں گا۔" پھر میں نے اسے متعلقہ عدالت کا نام بتا دیا۔

وہ بولی "آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ میرا سامنے آنا فرقان صاحب کی شرافت کو داغ دار کر دے گا۔ آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

میں اس کی بات کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا "فرقان صاحب کی شرافت ان کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہے۔"

وہ بولی "ہاں، ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ کبھی ان کی زندگی پر بن آئی تو میں بے دھڑک گواہی دینے عدالت میں پہنچ جاؤں گی۔ فی الحال تو صرف ان کی ضمانت کا معاملہ ہے جو میرا خیال ہے آپ اپنی قابلیت اور تجربے ہی سے نمٹا لیں گے۔ میں نے آپ کا نام پہلے بھی سن رکھا ہے۔ آپ بہت چوٹی کے وکیل ہیں، ضمانت وغیرہ تو آپ کے لیے چٹکیوں کا کھیل ہے۔"

"میں کل فرقان صاحب کی ضمانت کروانے کی اپنی سی کوشش کروں گا۔" میں نے اس کے عدم تعاون کا گلہ کیے بغیر کہا "اور آئندہ کسی نازک مرحلے پر اگر آپ کی ضرورت پیش آئی تو مجھے امید ہے، آپ حق دوستی ضرور نبھائیں گی۔"

"اگر کوئی ایسا سنگین موقع آیا تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔"

میں اس کی مجبوری کو سمجھ رہا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا "اگر گاڑی چوری ہو گئی تھی تو اس کی چابیاں کہاں گئیں؟"

ستارہ نے ایک لمحے کے توقف کے بعد بتایا "گاڑی کی چابیاں اس وقت میرے پاس ہیں۔ فرقان صاحب گھبراہٹ میں صبح چابیاں میری ڈریسنگ پر ہی چھوڑ گئے تھے۔"

"کیا آپ وہ چابیاں آج میرے دفتر میں پہنچا سکتی ہیں؟"

اس نے پوچھا "آپ کب تک دفتر میں ہوتے ہیں؟"

"عموماً میں آٹھ بجے تک اپنے دفتر میں ہوتا ہوں۔" میں نے بتایا "اگر آپ آرہی ہیں تو میں تھوڑا انتظار بھی کر لوں گا۔"

وہ بولی "آپ کو انتظار کی زحمت نہیں دوں گی۔ میں پانچ بجے سے پہلے آپ کے دفتر میں چابیاں پہنچوا دوں گی۔"

"ایک بات کا خیال رہے، یہ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ آپ نے گاڑی کی چابیاں مجھے دی ہیں۔"

"آپ بالکل بے فکر رہیں۔" وہ تشفی آمیز لہجے میں بولی "ہم راز کو راز رکھنا بخوبی جانتے ہیں۔"

دو چار باتوں کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

ٹھیک پانچ بجے ایک اونچا لمبا شخص میرے دفتر میں داخل ہوا اور ایک لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا "یہ

باجی نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔"

میں نے کوئی سوال کیے بغیر وہ لفافہ لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اس شخص کو میرے چیمبر میں بھیجنے سے پہلے میری سیکرٹری مجھے اس کے بارے میں بتا چکی تھی کہ ستارہ صاحبہ کا بھیجا ہوا ایک شخص مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ شخص سلام کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

اس شخص کے جانے کے بعد میں نے وہ لفافہ کھول کر دیکھا۔ لفافے کے اندر ٹویوٹا گاڑی کی چابیوں کا گچھا موجود تھا۔ میں نے مذکورہ چابیوں کا گچھا اپنی میز کی دراز میں ڈال دیا۔ اس گچھے سے مجھے آگے چل کر کس طرح کام لینا تھا اس کے بارے میں، میں نے اچھی طرح سوچ لیا تھا۔

اگلے روز تقریباً دس بجے پولیس فرقان صدیقی کا ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے اسے عدالت میں لے کر آئی۔ میں نے فوراً اس کی ضمانت کی درخواست دائر کر دی لیکن جب میں نے ایف آئی آر کا مطالعہ کیا تو ایک لمحے کے لیے پریشانی نے مجھے آن گھیرا۔ پولیس نے میرے موکل پر قتلِ عمد کا الزام عائد کیا تھا۔ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ قتل کا محرک محبت اور رقابت تھی۔ مقتول ساجد حسن کی پیشانی میں اعشاریہ تین دو کے ریوالور سے گولی ماری گئی تھی جو اس کی موت کا سبب بنی تھی۔ آلہ قتل ملزم فرقان علی کی ملکیت ثابت ہونا ہی اس کے لیے کسی مصیبت کے پیش خیمے سے کم نہیں تھا۔ پوسٹ مارٹم کی تفصیلی رپورٹ ابھی نہیں ملی تھی تاہم ابتدائی رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت آٹھ اگست کی رات ساڑھے دس اور ساڑھے گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔

یہ صورت حال خاصی سنگین تھی۔ عدالت نے دونوں طرف کے دلائل سننے کے بعد میرے موکل کی درخواست ضمانت مسترد کر دی۔ میں اپنی پوری کوشش کے باوصف بھی فرقان صدیقی کی ضمانت نہ کروا سکا۔ ویسے بھی قتل کے مقدمے کی ضمانت اتنی آسانی سے نہیں ہوتی۔ تاہم اگر ستارہ اس موقع پر گواہی کے لیے عدالت میں حاضر ہو جاتی تو صورت حال مختلف ہو سکتی تھی پھر فرقان صدیقی نے گاڑی چوری ہونے کا جو موقف اختیار کیا تھا وہ خاصا کمزور تھا۔ وہ اس لیے کہ اس نے نہ تو اس چوری کی کہیں رپورٹ درج کروائی تھی اور نہ ہی اس ضمن میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش کر سکا تھا۔

قصہ مختصر عدالت نے ملزم کا سات روز کا پولیس ریمانڈ دے دیا۔

پولیس اور عدالت کی ابتدائی کارروائی نہایت ہی خشک اور ناقابلِ برداشت حد تک بور اور طویل ہوتی ہے۔ ضابطے کی پیچیدہ کارروائیوں سے فائلیں بھر جاتی ہیں۔ ان طولانی اور الجھن آمیز کارروائیوں کو پڑھنا، سننا اور ہضم کرنا انتہائی دل گردے کا کام ہے۔ اس لیے میں آپ کی دردِ سری کا خیال کرتے ہوئے اس ذکر کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ تاہم باقاعدہ عدالتی کارروائی شروع ہونے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس کیس کے پس منظر سے مختصراً آگاہ کر دوں تاکہ عدالتی سرگرمیوں کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے کڑی در کڑی بیان کر رہا ہوں۔ یہ ساری معلومات حاصل کرنے کے لیے میں کئی بار اپنے موکل فرقان صدیقی سے جا کر ملا تھا۔ ازیں علاوہ میں نے مقتول ساجد کی بیوہ ماں سے بھی ملاقات کی تھی اور اس کیس کے سب سے اہم کردار شاہدہ کریمی کے دیدار کے لیے اس کے دولت کدے کا بھی ایک چکر لگایا تھا۔

○☆○

مقتول ساجد حسن نے امریکا سے ایم بی اے کیا تھا۔ اس کی اعلیٰ تعلیم کے پیشِ نظر امریکا میں اس کی ترقی کے بہت اور زیادہ مواقع موجود تھے اور وہاں اسے تنخواہ بھی زیادہ مل سکتی تھی لیکن وہ اپنے وطن کی خدمت کرنا چاہتا تھا اس لیے پاکستان واپس لوٹ آیا اور گزشتہ کئی سال سے اسٹاک ایکسچینج میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اس کی رہائش گلشن اقبال میں تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور اپنی بیوہ ماں کے ساتھ گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔

حالات نے اس وقت پلٹا کھایا جب ایک تقریب میں ساجد نے شاہدہ کریمی نامی ایک لڑکی کو دیکھ لیا۔ شاہدہ نہ صرف حسین اور پرکشش تھی بلکہ وہ خوش گفتار بھی تھی۔ اچھی گفتگو سے وہ ذہین بھی لگتی تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں ساجد کے دل میں اتر گئی۔ شاہدہ کی جس بات نے ساجد کو متاثر کیا وہ یہ کہ شاہدہ میں تکبر نام کو نہیں تھا۔ اس معاملے میں ساجد کی ماں قمر النساء بیگم کی رائے مختلف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاہدہ چونکہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس لیے وہ ساجد کو پھانسنے میں مصلحت کوشی سے کام لے رہی تھی۔ ساجد حسن کی تنخواہ دس ہزار کے قریب تھی اور شاہدہ اتنے روشن مستقبل والے شخص کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ شاہدہ کا باپ یوسف کریمی کسی پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھا اور بارہ سو



روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ شاہدہ کا چھوٹا بھائی عارف صدر میں ہوٹلوں کی ایک دکان پر سیلز مین تھا جہاں سے اسے ایک ہزار روپے ملتے تھے۔ شاہدہ خود فائن ٹیکسٹائل مل میں کام کرتی تھی اس کی تنخواہ پندرہ سو روپے ماہوار تھی۔ شاہدہ اپنے خاندان کے ساتھ یوپی موڑ پر رہتی تھی۔

قمر النساء بیگم کو بیٹے کی پسند پسند نہیں تھی لیکن ساجد حسن کی ضد اور جوش و خروش کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ساجد حسن نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کی شادی شاہدہ کریمی سے نہ ہوئی تو وہ اپنی جان دے دے گا۔ قمر النساء اپنے اکلوتے بیٹے کی اس دھمکی کے سامنے سرنگوں ہو گئی تھی۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد شاہدہ اور ساجد حسن کی منگنی ہو گئی۔

اصل مصیبت اس منگنی کے بعد شروع ہوئی تھی۔ قمر النساء کو زبانی مجھے معلوم ہوا کہ منگنی کے ایک ہفتے بعد شاہدہ کے بہنوئی کامران نے انہیں دھمکانا شروع کر دیا تھا کہ وہ یہ منگنی توڑ دیں۔ شاہدہ کے بہنوئی کا نام کاشف محمود تھا۔

کاشف فائن ٹیکسٹائل مل میں سپروائزر تھا اور مذکورہ مل میں شاہدہ کو کاشف ہی کی سفارش پر نوکری ملی تھی۔ ابھی تک کاشف انہیں ٹیلی فون پر ہی دھمکیاں دیتا آیا تھا۔ وہ اس کی شکل و صورت سے واقف نہیں تھے پھر ایک روز کاشف ان کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے اپنا تعارف شاہدہ کے ایک رشتے دار کے طور پر کرایا چنانچہ انہوں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

رسمی کلمات کے بعد جب کاشف محمود نے اپنا تعارف کروایا تو دونوں ماں بیٹا چونک اٹھے۔ ساجد حسن حقیقت حال معلوم ہونے کے بعد غصے سے بولا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔"

"کیا سمجھانا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ تم شاہدہ سے منگنی توڑ دو۔"

ساجد حسن نے بھڑکیلے لہجے میں کہا "اگر تمہیں اس منگنی پر کوئی اعتراض ہے تو جا کر اس کے والدین سے بات کرو۔ ہم سے تمہارا کیا واسطہ ہے؟"

"واسطہ ہے، اسی لیے تو یہاں آیا ہوں۔" کاشف نے معنی خیز لہجے میں کہا "میں تمہیں یہ باور کروانے آیا ہوں کہ شاہدہ کوئی اچھی لڑکی نہیں ہے۔ تم اس سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔"

"اس مشورے کا شکریہ۔" ساجد حسن نے نفرت آمیز نظر سے اسے گھورا "بس اتنی سی بات ہے یا کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا "ایک بات کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لو کہ شاہدہ سے شادی کر کے تم بری طرح پچھتاؤ گے۔ وہ پہلے بھی بہت سے لوگوں کو فریب دے چکی ہے۔ تم کوئی پہلے نہیں ہو۔ اور نہ ہی آخری ہو۔"

ساجد کو کاشف کی باتوں سے غصہ آ رہا تھا، وہ تیز لہجے میں بولا "میں اپنا اچھا برا بخوبی سمجھتا ہوں۔ تمہیں میری فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میرا کام سمجھانا تھا سو میں نے تمہیں سمجھا دیا۔"

کاشف نے زہریلے لہجے میں کہا "اپنے سود و زیاں کے اب تم خود ذمے دار ہو گے۔"

"شاہدہ سے شادی قطعاً میرا ذاتی معاملہ ہے۔" ساجد نے دو ٹوک لہجے میں کہا "اگر بعد میں مجھے اس فیصلے پر پچھتانا پڑا تو تم بے فکر رہو، میں تمہارے پاس فریاد لے کر نہیں آؤں گا۔ تم خوامخواہ اس شادی میں رکاوٹ بننے کی کوشش نہ کرو۔ شاہدہ اچھی ہے یا بری، میں سوچ سمجھ کر اسے اپنا رہا ہوں، ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

کاشف محمود اٹھ کر کھڑا ہو گیا "ٹھیک ہے، میں جا رہا ہوں۔ اس وقت تم پر شاہدہ کے عشق کا بھوت سوار ہے اس لیے تمہاری سمجھ میں میری بات نہیں آئے گی لیکن وقت میرے الفاظ کی سچائی کو ثابت کر دے گا۔"

ساجدہ کی والدہ قمر النساء نے پوچھا "بیٹا! کیا تم شاہدہ سے شادی کے خواہش مند ہو؟"

"اونہہ۔" کاشف نے برا سا منہ بنایا "شاہدہ کسی بھی شریف آدمی کے لائق نہیں ہے۔ اگرچہ وہ مجھے پسند کرتی ہے لیکن میں کسی بھی صورت اس سے شادی نہیں کروں گا۔"

"عجیب آدمی ہو تم بھی۔" ساجد حسن نے کہا "تم شاہدہ سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتے اور اس کی شادی میں رکاوٹ بھی بن رہے ہو۔ تمہارا رویہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"اصل بات یہ ہے کہ میں بھی شاہدہ کو پسند کرتا ہوں۔"

"تمہارا فلسفہ بالکل ٹیڑھا ہے۔" ساجد حسن نے ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا "تم شاہدہ کو پسند بھی کرتے ہو اور اسے برا بھی کہہ رہے ہو۔ اس سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتے اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ اس کی شادی کہیں ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو بھئی؟"

"میں صرف شاہدہ کو چاہتا ہوں۔" کاشف نے عجیب سے لہجے میں کہا "اور یہ چاہتا ہوں کہ کوئی اور اسے نہ

چاہیے۔"

پھر وہ ان کے گھر سے رخصت ہو گیا۔

وقوعہ والے روز مقتول ساجد حسن' شام کے وقت اپنی موٹر سائیکل ہنڈا ون ٹو فائیو پر گھر سے اکیلا ہی نکلا تھا۔ شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ اس روز اسے دو جگہ ضروری کام سے جانا تھا۔ ایک تو درزی کی دکان پر سوٹ کی ٹرائی دینا تھی' دوسرے یہ۔ پی موڑ اپنی ہونے والی سسرال جانا تھا یعنی شاہدہ کریمی کے گھر۔ خریداری کے سلسلے میں کچھ معاملات طے کرنا تھے۔ خلاف معمول اور خلاف توقع جب رات بارہ بجے تک بھی ساجد واپس نہیں لوٹا تو قمر النساء کو تشویش ہوئی۔ اس نے یوسف کریمی کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ ساجد رات دس بجے وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ قمر النساء کو بتایا گیا کہ ساجد وہاں سے ٹیکسی پر روانہ ہوا تھا کیونکہ اس کی موٹر سائیکل میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی اس لیے موٹر سائیکل کو اس نے وہیں شاہدہ کے گھر میں کھڑا کر دیا تھا پھر آدھی رات کو سہراب گوٹھ کے نزدیک ایک ویران سڑک پر ساجد کی لاش گرے کلر کی ٹویوٹا گاڑی میں پڑی ہوئی ملی تھی جو میرے موکل فرقان صدیقی کی ملکیت تھی۔ لاش کے قریب سے آلہ قتل بھی پایا گیا تھا۔ اعشاریہ تین دو کیلی بر کا یہ ریوالور بھی میرے موکل ہی کی ملکیت تھا۔

پولیس نے ایف آئی آر میں گاڑی اور ریوالور کے علاوہ قتل کا محرک محبت اور رقابت کو بیان کیا تھا جس کی تفصیل یہ تھی کہ میرا موکل فرقان صدیقی بھی شاہدہ سے محبت کرتا تھا بلکہ شاہدہ نے اس سے شادی کا وعدہ بھی کر رکھا تھا پھر جب اسے پتا چلا کہ شاہدہ کی شادی ساجد حسن سے ہونے والی ہے تو اس نے ساجد حسن... اپنے رقیب روسیاہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ازاں بعد بوکھلاہٹ میں وہ ساجد کی لاش کو گاڑی سمیت ایک ویران سڑک پر چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ یہ وہ تھیوری تھی جو پولیس نے اس واردات کے سلسلے میں بیان کی تھی۔

میں نے جب اپنے موکل سے اس بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا "بیگ صاحب! یہ حقیقت ہے کہ میں شاہدہ سے شادی کے بارے میں سنجیدہ تھا۔ میں ستارہ جیسے "دوستوں" کی "سنگت" میں زندگی گزارتے گزارتے اکتا گیا تھا اور واقعی اپنا گھر بسانا چاہتا تھا۔ شاہدہ تقریباً چھ ماہ سے ہماری مل میں کام کر رہی تھی۔ میں نے اسے سپروائزر کاشف محمود کی سفارش پر رکھا تھا تاہم شاہدہ کی زبانی اس کے گھریلو حالات سن کر مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت اپنی محرومیوں کی دردناک کہانیاں مجھے سناتی رہتی تھی۔ میں ہر مشکل وقت میں اس کی مالی مدد کرتا رہا۔ میں یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ شاہدہ کی معصوم اور من موہنی صورت میرے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ پھر جب اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تو میں خوشی سے نہال ہو گیا۔ میری آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب مجھے معلوم ہوا کہ عن قریب کسی ساجد حسن سے اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اس وقت تک میں مختلف مدوں میں شاہدہ پر ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا۔ میں چاہتا تو فی الفور اسے نوکری سے نکال سکتا تھا لیکن میں نے کسی قسم کی انتقامی کارروائی نہیں کی بلکہ شاہدہ کے معاملے سے بالکل لاتعلق ہو گیا۔ میں نے عورت کی بے وفائی کے بارے میں اس سے قبل بہت کچھ سن رکھا تھا جب خود پر بیتی تو یقین آ گیا۔ میں طبعاً ایک بزدل انسان ہوں اس لیے... شاہدہ سے بدلہ لینے کا خیال میرے دل میں آیا بھی تو میں اس پر عمل درآمد نہ کر سکا بلکہ واپس اپنی دنیا میں لوٹ گیا... ستارہ کی دنیا... الماس کی دنیا اور فیروزہ کی دنیا؟"

اس کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے کہا "فرقان میاں! جس ریوالور سے ساجد حسن کو قتل کیا گیا ہے' وہ آپ کی ملکیت ثابت ہو چکا ہے۔ کیا وقوعہ کے روز وہ ریوالور بھی آپ کی ٹویوٹا گاڑی ہی میں موجود تھا؟"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا "وقوعہ سے چند روز قبل میں نے وہ ریوالور شاہدہ کو دیا تھا۔"

"شاہدہ کو دیا تھا۔" میں چونک اٹھا "آپ نے اپنا ریوالور اسے کیوں دیا تھا جبکہ اس کی بے وفائی آپ پر عیاں ہو چکی تھی۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "شاہدہ کی منگنی کے بارے میں مجھے وقوعہ سے دو روز قبل معلوم ہوا تھا۔ جب میں نے اسے ریوالور دیا تو ہمارے درمیان تعلقات بڑے خوش گوار انداز میں چل رہے تھے۔"

"آپ نے کس مقصد کی خاطر شاہدہ کو اپنا ریوالور دیا تھا؟"

"ایک روز اسے مل سے دیر ہو گئی تھی۔" فرقان نے بتایا "اس کے علاقے میں بس سے اتر کر گھر جاتے ہوئے ایک سنسان میدان سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے جب بھی اسے دیر ہوتی تو میں اپنی گاڑی میں اسے گھر کے نزدیک چھوڑ دیتا تھا تاہم کچھ عرصے سے اس نے میری گاڑی میں بیٹھنا ترک کر دیا تھا جس کی وجہ اس نے یہی بتائی تھی کہ لوگ خواہ مخواہ باتیں

بناتے ہیں لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ساجد حسن سے منگنی کے بعد سے اس نے مجھ سے کترانا شروع کر دیا تھا۔"

ایک لمحے کو وہ سانس لینے کو رکا پھر بولا "تو میں بتا رہا تھا کہ اس روز جب مل سے نکلتے ہوئے اسے خاصی دیر ہو گئی تو وہ گھر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ میں نے اسے گھر تک چھوڑنے کی پیش کش کی تو اس نے کہا "آپ مجھے اپنا ریوالور دے دیں۔ میں اسے پرس میں رکھ لوں گی۔"

"کیا تمہیں اس سے حوصلہ ملے گا۔" میں نے پوچھا۔

"بہت حوصلہ ملے گا۔" اس نے جواب دیا "اگر میں نے کوئی خطرہ محسوس کیا تو ایک دو ہوائی فائر کر دوں گی۔"

اس وقت نہ جانے میری عقل کہاں گھاس چرنے گئی ہوئی تھی کہ میں نے راضی خوشی اپنا ریوالور اس کے حوالے کر دیا۔"

میرا ذہن اس کیس کے تانے بانے بن رہا تھا۔ میں نے پوچھا "دوسرے روز آپ نے شاہدہ سے اپنا ریوالور واپس نہیں لیا تھا؟؟"

"میں نے اس سے اپنا ریوالور واپس مانگا تھا۔" فرقان صدیقی نے بتایا "لیکن اس نے بتایا کہ وہ ریوالور گھر بھول آئی ہے۔ کل لا دے گی۔ پھر آئندہ چند روز میں مصروفیت کی بنا پر اس سے ریوالور کے بارے میں پوچھنا بھول گیا۔ خود اس نے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اس کے بعد ہمارے تعلقات کشیدہ ہو گئے پھر وہ واقعہ پیش آگیا جس کے طفیل میں آج حوالات میں پڑا ہوا ہوں۔"

میں نے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے فرقان صاحب! ساجد حسن کے قتل میں شاہدہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ملوث ہو سکتی ہے؟"

"میں اس بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا۔" وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا "شاہدہ کے بارے میں سوچتے ہوئے میں ہمیشہ ڈبل مائنڈڈ ہو جاتا ہوں۔ کبھی تو وہ مجھے انتہائی معصوم' سیدھی سادی' بھولی بھالی اور بے قصور نظر آنے لگتی ہے اور کبھی وہ میرے تصور کی آنکھ کے سامنے ایک ڈائن کا روپ دھار لیتی ہے۔ کیا کہوں' دماغ اسے بے قصور ماننے کو تیار نہیں اور دل اسے قصوروار ٹھہرانے کا روادار نہیں۔ آپ میری بے بسی کو تاپ نہیں سکتے۔"

"مجھے آپ کی بے بسی کا بخوبی اندازہ ہے۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "آپ واقعی شاہدہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ آپ کے دل میں جاگزیں ہو چکی ہے۔ دل جس کو اپنا مان لیتا ہے پھر اس کی تمام خامیاں بھی خوبیاں بن جاتی ہیں۔"

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے چہرے کو نہیں بلکہ تصور کی آنکھ سے شاہدہ کی صورت کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قدرے بلند آواز میں کہا۔

"شاہدہ کریمی کی میں اتنی تعریفیں سن چکا ہوں کہ اسے ایک نظر دیکھنے کو دل چاہنے لگا ہے۔ میں نے سنا ہے' محلے کے کئی لڑکے بھی اس پر مرتے ہیں خاص طور پر ندیم خان اور مراد علی تو اس کے شیدائی ہیں۔"

"وہ چیز ہی ایسی ہے بیگ صاحب کہ جو دیکھے اس کا دیوانہ ہو جائے۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "اگرچہ میرا دماغ اس کو ہرجائی اور بے وفا تسلیم کر چکا ہے لیکن دل کسی بھی طور اسے غلط سمجھنے کو تیار نہیں۔"

میں نے کہا "فرقان صاحب! آپ نے شاہدہ سے ملاقات کے شوق کو بھڑکا دیا ہے۔ کیا آپ مجھے اس کا ایڈریس دیں گے؟"

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔" وہ جلدی سے بولا پھر قدرے تصیلاً مجھے شاہدہ کا ایڈریس سمجھانے لگا۔

میرا شاہدہ سے ملنے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اس سے گفتگو کے دوران میں مجھے کئی مفید باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔ ازیں علاوہ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں ہے جس نے اتنے سارے مردوں کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ میں اگلے روز شام کو پونے پانچ بجے اس کی گلی میں پہنچ گیا۔

وہ ساٹھ گز پر بنا ہوا دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس وقت گلی کے نکڑ پر دو تین لڑکے کھڑے تھے۔ میں نے اپنی گاڑی وہیں نکڑ پر کھڑی کر دی تھی' انہی لڑکوں سے یوسف کریمی کے گھر کا پتا بھی پوچھا تھا۔ انہوں نے پہلے تو معنی خیز انداز میں مجھے سر سے پیروں تک گھورا تھا پھر ایک دروازے کی جانب اشارہ کر کے کہا تھا "وہاں چلے جائیں پیارے صاحب۔"

مجھے ان لڑکوں کا انداز انتہائی ناگوار گزرا تھا تاہم میں ان سے الجھنے کے بجائے اپنے مطلوبہ دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ میری دستک کے جواب میں فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک بڑی چہرو نازنین تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس گھر میں شاہدہ' یوسف کریمی اور شاہدہ کے چھوٹے بھائی عارف کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ شاہدہ کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس خوب رو لڑکی کو دیکھ کر یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ شاہدہ ہی ہو سکتی ہے۔



اس کی عمر کا اندازہ میں نے چوبیس اور پچیس کے درمیان لگایا جو ازاں بعد درست ثابت ہوا۔ اس کے سیاہ گھنے بال شانوں پر کٹے ہوئے تھے۔ اس وقت اس نے لون کا پھول دار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ آنکھیں گہری سیاہ اور جسم مائل بہ فربہی تھا۔ قد بوٹا اور اعضا متناسب۔ وہ مجموعی طور پر ایک حسین اور پرکشش لڑکی تھی تاہم اس کے حسن میں سادگی اور معصومیت کے بجائے ایک چٹختی پائی جاتی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس نے دروازہ کھول دیا پھر باہر جھانک کر دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ گلی کے نکڑ پر کھڑے آوارہ لڑکوں میں سے ایک نے لوفرانہ نظر سے ہماری طرف دیکھا اور دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

"جانے دوس استاد' ڈبل اے۔"

دوسرے نے آوازہ کسا "سانوں دی لے چل نال"

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ شاہدہ کی شہرت محلے میں اچھی نہیں ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ لہجے میں کہا "کیا آپ شاہدہ کریمی۔۔۔"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولی "آپ بالکل ٹھیک دروازے پر آئے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے وہ شرارت آمیز انداز میں مسکرائی اور کہا "میں ہی شاہدہ کریمی ہوں۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"میں تمہارے ساتھ چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے گلی کے نکڑ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "اور یہ باتیں دروازے پر کھڑے کھڑے نہیں ہو سکتیں۔ کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے؟"

اس نے ایک بے تکلف قہقہہ لگایا پھر چپکی "جگہ گھر میں نہیں انسان کے دل میں ہونا چاہیے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے دل میں خوب صورت انسانوں کے لیے ناقابل پیمائش جگہ موجود ہے۔ ویسے ابھی تک آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔"

"تعریف کا شکریہ۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "مجھے مرزا امجد بیگ کہتے ہیں۔"

"آپ کی طرح آپ کا نام بھی خاصا کیوٹ ہے۔" وہ میرے چہرے پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

میں نے سر کو ہلکا خم دے کر ایک مرتبہ پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور مزید بتایا "میں ساجد حسن مرڈر کیس میں وکیل صفائی ہوں۔"

"اوہ! تو آپ وکیل صاحب ہیں۔" وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی "آیئے' آیئے۔ تشریف لایئے۔ وکیل صفائی ہیں تو کیا ہوا۔ میرے دل میں خوب صورت چہروں کے لیے بڑی گنجائش ہے۔ چاہے وہ چہرہ دشمن کا ہو یا دوست کا۔" پھر وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی اور اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

میں شاہدہ کی راہنمائی میں گھر کے ڈرائنگ روم نما کمرے میں آگیا۔ اس کی گفتگو اور رویے سے قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ چند روز قبل اس کے منگیتر کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ یقیناً اسے ساجد حسن کے قتل سے ذرہ برابر بھی دلی صدمہ نہیں ہوا ہو گا یا پھر وہ اپنے تاثرات کو چھپانے میں ماہر تھی۔

اپنی بات چیت سے شاہدہ خاصی بے تکلف معلوم ہوتی تھی۔ لڑکی اگر حسین و جمیل ہو اور ساتھ ہی بے تکلف بھی ہو تو اس کے چاہنے والوں کی قطار و شمار کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

شاہدہ کے گھر کا ڈرائنگ روم ان لوگوں کی حیثیت سے کہیں زیادہ سجا ہوا تھا۔ فرش پر نیا دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ صوفہ سیٹ بھی خاصا قیمتی تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں شلف پر اکائی کا ڈیک دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے کونے میں ایک عالی شان ٹی وی ٹرالی پر سونی کا بیس انچ کا ٹی وی موجود تھا۔ ٹرالی کے زیریں خانے میں کیسٹوں کا دبی سی آر بھی نظر آرہا تھا۔ ازیں علاوہ آرائش کی کئی چیزیں مختلف جگہوں پر سجی ہوئی تھیں۔

ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ گھر میں شاہدہ اس وقت اکیلی ہی تھی۔ میں نے پوچھا "تمہارے والد صاحب کہاں ہیں؟"

اس نے جواب دیا "تھوڑی دیر پہلے ڈیوٹی سے آئے تھے۔ ابھی ابھی مسجد گئے ہیں۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد ہی واپس آئیں گے۔"

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ مغرب کی نماز ختم ہونے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ میں نے استفسار کیا "اور تمہارا چھوٹا بھائی عارف؟"

"وہ آٹھ بجے تک آتا ہے۔" اس نے جواب دیا پھر اچانک پوچھا "آپ ہم تینوں میں سے کس سے ملنے آئے ہیں؟"

میں نے کہا "میں تم سے اور تمہارے والد یوسف کریمی سے ملنے آیا ہوں۔ تم دونوں کا نام گواہوں کی فہرست میں موجود ہے۔ میں نے سوچا' تم لوگوں سے تھوڑی بات چیت

ہو جائے۔"

وہ قدرے محتاط انداز میں بولی "بیگ صاحب! آپ میرے مگیتر کے قاتل کو باعزت رہا کروانے پر مامور ہیں۔ اصولی طور پر تو ہمیں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہیے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ہم اس کیس میں پارٹی نہیں ہیں۔ اگر فرقان صدیقی قاتل ہے تو اسے ضرور پھانسی چڑھنا چاہیے اور اگر وہ بے گناہ ہے تو اسے ضرور چھوٹ جانا چاہیے۔"

اس کے انداز سے مجھے محسوس ہوا' یا تو وہ واقعی نیوٹرل تھی یا پھر بہت اچھی اداکاری کر رہی تھی۔ میں نے تھکیلے لہجے میں دریافت کیا "میرا بھی یہی اصول ہے کہ مجرم کو سزا ملنا چاہیے اور بے قصور کو رہائی ملنا چاہیے۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے' ساجد حسن کو فرقان صدیقی ہی نے قتل کیا ہوگا؟"

"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" وہ روکھے پھیکے لہجے میں بولی "میں خواہ مخواہ کسی پر الزام کیوں لگاؤں۔ ہاں' میں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ فرقان صاحب' ساجد حسن کو پسند نہیں کرتے تھے۔"

"اس ناپسندیدگی کی وجہ؟"

"انہیں ساجد حسن سے میرا شادی کا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔"

"مگر یہ فیصلہ تو تمہارا تھا۔" میں نے شاہدہ کو یاد دلایا "ساجد حسن کو ناپسند کرنے کی وجوہات کیا تھیں؟"

وہ بولی "فرقان صاحب ساجد کو اپنا رقیب سمجھنے لگے تھے۔"

میں نے ذرا مختلف انداز میں سوال کیا "وقوعہ کی رات مقتول ساجد حسن آپ کے گھر آیا تھا۔ تمہارے والد نے پولیس کو جو بیان دیا ہے' اس کے مطابق جب ساجد حسن گھر میں داخل ہوا تو اس وقت فرقان صدیقی بھی وہاں موجود تھا؟"

میرے موکل نے مجھے بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز وہ ہرگز ہرگز شاہدہ کے گھر نہیں گیا تھا تاہم دونوں باپ بیٹی نے پولیس کو بیان دیا تھا کہ اس روز فرقان صدیقی لگ بھگ آٹھ بجے ان کے گھر آیا تھا پھر جب نو بجے ساجد حسن وہاں پہنچا تو ان دونوں میں تلخ کلامی ہوگئی چنانچہ فرقان ناراض ہو کر غصے میں وہاں سے چلا گیا تھا۔ ان بیانات سے ظاہر ہوتا تھا کہ باپ بیٹی فرقان کو ساجد حسن کے قتل میں ملوث کرنے کا پورا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔

شاہدہ نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا "ہاں فرقان صاحب اس وقت گھر میں موجود تھے لیکن ساجد کی آمد کے فوراً بعد ہی وہ رخصت ہو گئے تھے۔"

"شاید ان دونوں میں کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی تھی؟"

"اچھی خاصی گرما گرمی ہوئی تھی۔"

"ان دونوں کے علاوہ اس روز تمہارے گھر میں اور کون موجود تھا؟"

"بیگ صاحب! میں ایک مرتبہ پھر کہوں گی کہ وکیل صفائی ہونے کے ناتے ہمیں آپ سے بہت دور رہنا چاہیے لیکن ہم پر امن اور صلح جو انسان ہیں۔ ہماری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے اس لیے میں آپ کے سوال کے جواب میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ ان دونوں کے علاوہ اس روز ہمارے گھر میں باہر کا کوئی آدمی نہیں تھا۔"

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے کسی سوال پر بدک جائے اس لیے میں نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا "تمہارے ڈرائنگ روم کا قالین بہت خوب صورت ہے۔ یہ کتنے میں خریدا ہے؟"

"پورے بارہ ہزار میں۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔

میں نے اس میں ہوا بھرتے ہوئے کہا "مجھے یہ تم نے اپنی پسند سے خریدا ہوگا۔ بہت خوب صورت ذوق ہے تمہارا۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔ ایسی چوائس کوئی کر سکتی ہو۔"

وہ خوشی آمیز حیرانی سے بولی "آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" پھر پوچھا "آپ نے کس بنا پر یہ اندازہ قائم کیا تھا؟"

میں نے کہا "دیکھو بھئی' سیدھی سی بات ہے۔ تمہارے والد سیدھے سادے مذہبی ٹائپ کے آدمی ہیں۔ وہ اتنی قیمتی اور شان دار چیزوں کو فضول خرچی میں شمار کرتے ہوں گے۔ اس قسم کی مہنگی چیزیں تمہارے جیسی باذوق لڑکی ہی خرید سکتی ہے۔ اس عمدہ قالین کی طرح صوفہ سیٹ' ٹی وی' وی سی آر اور ڈیک وغیرہ بھی تمہاری ہی کوششوں کا نتیجہ نظر آ رہا ہے مجھے۔"

اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے انداز میں ایک فخار' ایک غرور جھلکتا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں غیر محسوس طور پر شاہدہ کے مالی حالات کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جیسا کہ شروع میں' میں نے بیان کیا ہے' نیکسٹائل مل سے شاہدہ کو پندرہ سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ وہ ایک فیشن ایبل لڑکی تھی اس لیے اپنی آدھی سے زیادہ تنخواہ وہ لباس اور اشیائے منگھار پر خرچ



کر دیتی ہوگی۔ چھوٹا بھائی ایک ہزار تنخواہ پاتا تھا جس میں سے کبھی وہ چار سو اور کبھی پانچ سو گھر میں دیتا تھا۔ یوسف کریمی کو ٹیکسٹائل کمپنی سے بارہ سو روپے ملتے تھے۔ اس نے گھر کی تعمیر کے لیے ہاؤس بلڈنگ فائنس کارپوریشن سے قرضہ لے رکھا تھا جس کی وہ چھ سو روپے ماہوار قسط ادا کرتا تھا۔ اس حساب سے ہر ماہ گھر میں اٹھارہ سو پچاس روپے کی رقم آتی تھی ایسی صورت میں گھر کے اخراجات کو نکال کر یہ ممکن نہیں تھا کہ بیس انچ کا کلر ٹی وی' وی سی آر' ڈیک اور قیمتی قالین و صوفہ سیٹ خریدے جا سکتے۔ اس سامانِ تعیش کی خریداری کے لیے پیسے کہاں سے آتے تھے۔ یہ بات اس گھر کا ہر فرد جانتا تھا۔ یہ سراسر یقیناً شاہدہ کے سسرال بند ہستا جو مخالف صاحب ثروت لوگوں کو شادی کا آسرا دے کر ان سے لمبی لمبی رقمیں اینٹھتی رہتی تھی۔ میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے پوچھا۔

شاہدہ! تم نے جو قیمتی اور عالی شان سامان گھر میں بھر رکھا ہے اس کی قسط کتنی جاتی ہے؟"

وہ چونکی اور برا سا منہ بناتے ہوئے بولی "قسط؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں قسط۔"

"جناب' میں قسطوں کے چکر میں نہیں پڑتی۔" وہ تبسم ریز لہجے میں بولی "یہ سارا سامان میں نے نقد خریدا ہے۔"

میں نے اس کی دور اندیشی کو سراہا اور بڑی ہوشیاری سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اس نے کون سی چیز کس دکان سے اور کتنی قیمت پر خریدی تھی۔

وہ بولی "انسان چاہے تو زندگی میں دنیا کی ہر آسائش اسے میسر آ سکتی ہے۔ بس ذرا کوشش کرنا پڑتی ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے تائیدی لہجے میں کہا "میں تمہاری بات سے صد فی صد اتفاق کرتا ہوں۔"

اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی پھر اس سے پہلے کہ شاہدہ جا کر دروازہ کھولتی' ایک دراز قامت نوجوان ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور شاہدہ کو دیکھتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے بولا۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی؟"

"آؤ کاشف۔" شاہدہ نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "ان سے ملو۔ یہ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہیں۔ ساجد حسن مرڈر کیس انہی کے پاس ہے۔"

"اوہ' وکیل صاحب۔" کاشف نے مصافحے کے لیے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "اتفاق سے اس کیس کے سلسلے میں ابھی تک میرا عدالت جانا نہیں ہو سکا ویسے گواہوں کی فہرست میں میرا نام موجود ہے۔ آپ وکیل استغاثہ ہیں نا۔ اور سنائیں' فرقان صدیقی کو کب پھانسی پر لٹکوا رہے ہیں؟"

شاہدہ جلدی سے بولی "بیگ صاحب! یہ میرے کزن کاشف محمود ہیں۔ یہ فائن ٹیکسٹائل مل میں سپروائزر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔" پھر وہ کاشف کی طرف مڑی "کاشف! بیگ صاحب اس کیس میں وکیل صفائی ہیں۔"

"وکیل صفائی۔" کاشف یوں اچھلا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو "وکیل صفائی یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

پھر وہ شک آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ خاصا محتاط اور چالاک دکھائی دیتا تھا۔ مقتول کی والدہ کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ کاشف انہیں خاصی دھمکیاں دیتا رہا تھا۔ یہ وہی کاشف تھا جو شاہدہ کو پسند کرتا تھا۔ وہ نہ تو اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی یہ چاہتا تھا کہ کہیں اور اس کی شادی ہو۔ اس حوالے سے میری نظر میں وہ خاصا خطرناک آدمی تھا۔

شاہدہ نے مسکراتے ہوئے کہا "کیوں کاشف! وکیل صفائی ہمارے گھر میں کیوں نہیں آ سکتے۔ بیگ صاحب کو تم کوئی ایسا ویسا وکیل نہ سمجھو۔ یہ بہت اچھے انسان ہیں۔ تم ان سے بات چیت کرو گے تو میری بات کے قائل ہو جاؤ گے۔"

"نہ بابا نہ۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "میں بات چیت کے بغیر ہی ٹھیک ہوں۔ میں اتنا نادان نہیں ہوں کہ وکیل مخالف سے گفتگو شروع کر دوں پہلے ہی پولیس والوں نے خواہ مخواہ میرا نام استغاثہ کے گواہوں میں ڈال دیا ہے۔ پتا نہیں' عدالتوں میں کہاں کہاں دھکے کھانے پڑیں گے۔ میں تو اس گھڑی کو پچھتا رہا ہوں جب وقوعہ کے روز یہاں چلا آیا تھا۔ نہ میں ان دونوں کی تلخ باتیں سنتا اور نہ ہی خواہ مخواہ گواہی کے سلسلے میں مجھے گھسیٹا جاتا۔"

وہ روداد میں ایک اہم انکشاف کر گیا تھا۔ یعنی وقوعہ کے روز وہ بھی شاہدہ کے گھر میں موجود تھا۔ میرے لیے یہ بات بہت اہم تھی۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کاشف میاں! وقوعہ کے روز ان دونوں میں کس بات پر تلخ کلامی ہوئی تھی؟"

یہ سوال میں نے محض کاشف کو گھیرنے کے لیے کیا تھا حالانکہ مجھے یقین تھا کہ میرا موکل مذکورہ روز وہاں موجود ہی نہیں تھا۔

کاشف نے قدرے سخت لہجے میں جواب دیا "میں نے

کہا نا' میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ آپ کو جو کچھ پوچھنا ہو' عدالت کے کمرے میں پوچھیے گا۔"

وہ شاہدہ کی بہ نسبت زیادہ ہوشیار' سمجھدار اور چالاک معلوم ہوتا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا "ٹھیک ہے برخوردار! اب تم سے عدالت میں ہی ملاقات ہوگی۔"

شاہدہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر تشویش ناک لہجے میں بولی "بیگ صاحب' آپ ناراض ہو کر یہاں سے جا رہے ہیں۔ کاشف کی باتوں کو سنجیدگی سے نہ لیں۔ اس کی تو مذاق کی عادت ہے۔"

میں نے کہا "شاہدہ بی بی' میں نے کاشف کی باتوں کو واقعی سنجیدگی سے نہیں لیا۔"

"آپ کھڑے کیوں ہو گئے؟" وہ اپنائیت سے بولی "ابھی تو میں آپ کی کوئی خاطر تواضع بھی نہیں کر پائی اور آپ چل دیے۔" پھر اس نے گھور کر کاشف کی جانب دیکھا "تمہیں بھی اسی وقت آنا تھا؟"

"میرا آنا ایسا ہی ناگوار گزرا ہے تو چلا جاتا ہوں بھئی۔" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا "مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اس وقت وکیل صفائی کے ساتھ مصروف ہو۔"

"بھئی' تم آپس میں یہ لڑائی جھگڑا بند کرو۔" میں نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا "میں جا رہا ہوں' اللہ حافظ۔"

پھر اس سے پہلے کہ شاہدہ مجھے روکنے کی کوئی اور کوشش کرتی' میں اس کے گھر سے باہر آ گیا۔

دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی ایک ادھیڑ عمر بڑے میاں سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ گلی میں کوئی روشنی کا معقول انتظام نہیں تھا تاہم بعض گھروں کی روشن بتیاں تھوڑا بہت گلی میں بھی اجالا کر رہی تھیں۔

ادھیڑ عمر شخص نے سر سے پاؤں تک بغور میرا جائزہ لیا پھر شاہدہ کے دروازے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا "آپ ابھی اسی دروازے سے نکلے ہیں؟"

"جی ہاں' میں اسی دروازے سے برآمد ہوا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ میں اس کے تیوروں سے سمجھ گیا تھا کہ وہ شاہدہ کا باپ یوسف کریمی تھا۔ میں نے کہا "غالباً آپ یوسف کریمی ہیں؟"

"ہاں' آپ کا اندازہ درست ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "کیا آپ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں نے پہلے کبھی آپ کو دیکھا نہیں۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ ڈالے تھے۔

میں نے کہا "میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ میں آپ ہی سے ملنے آیا تھا۔ ساجد حسن مرڈر کیس میں' میں وکیل صفائی ہوں۔"

وہ ایک دم چوکنا ہو گیا "آپ وکیل صفائی ہیں تو یہاں کیوں آئے ہیں۔ آپ تو ایک قاتل کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔ ہم اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

میں نے سرسری سے لہجے میں کہا "آپ تو سیدھے سیدھے فرقان صدیقی کو پھانسی چڑھانے میں مدد دے سکتے ہیں۔"

"جی' کیا کہا آپ نے؟"

میں نے بات بدل دی "قبلہ' میں ابھی ابھی آپ کی صاحب زادی شاہدہ اور آپ کے بھتیجے سے بھرپور ملاقات کر کے آ رہا ہوں۔ ان سے مجھے بڑی مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں۔"

اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ چونکے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا "آپ کس بھتیجے کا ذکر کر رہے ہیں؟"

میں یہ بات معلوم کر چکا تھا کہ کاشف سے شاہدہ کی کوئی رشتے داری نہیں تھی۔ وہ محض دنیا داری اور بہت سے معاملات کی پردہ پوشی کے لیے اسے اپنا کزن بتاتی تھی۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہی میں نے یوسف کریمی کے سامنے اس کے بھتیجے کا حوالہ دیا تھا اور اس کے الجھنے سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ کاشف ان کا کچھ بھی لگتا لگاتا نہیں تھا۔

میں نے یوسف کے سوال کے جواب میں بتایا "بزرگوار! میں آپ کے بھتیجے کاشف محمود کی بات کر رہا ہوں جو لیاقت آباد میں رہتا ہے۔ وہ اس وقت آپ کے گھر میں موجود ہے۔ میری ابھی اس سے بات ہوئی ہے۔"

"کیا بات ہوئی ہے؟" وہ خاصا ہراساں نظر آنے لگا۔

میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا "ان دونوں کا خیال ہے کہ فرقان صدیقی ہی نے ساجد حسن کو قتل کیا ہے۔"

وہ بھاری لہجے میں بولا "اس میں شک کی کیا گنجائش ہے۔ مجھے تو فرقان صدیقی ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ خواہ مخواہ میری بیٹی کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ خیر' آپ تو اس کے وکیل ہیں۔ آپ ہمارے دکھ کو کیا سمجھیں گے؟"

میں نے اس کے خیال پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے اپنی گاڑی کا رخ کیا جو گلی کے نکڑ پر کھڑی تھی۔ میں دروازہ کھول کر اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگا تو اچانک اندھیرے میں سے

ایک شخص نکل کر میرے سامنے آگیا "السلام علیکم!"

میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اس نے معنی خیز لہجے میں دریافت کیا "یوسف کریمی سے ملاقات ہوگئی جناب کی؟"

"آپ کون ہیں اور یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"آپ غالباً پہلی مرتبہ اس علاقے میں آئے ہیں۔" وہ شخص محتاط انداز میں بولا "پہلے کبھی آپ کو آتے جاتے دیکھا نہیں ہے۔"

اس کے انداز میں کوئی خاص بات تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا' جیسے وہ مجھے کسی خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہو لیکن پوری طرح کھل کربات بھی نہ کررہا ہو۔ میں نے اس کی جھجک دور کرنے کی خاطر کہا۔

"جناب اس علاقے میں تو پہلی مرتبہ نہیں آیا البتہ یوسف کریمی کے گھر پہلی بار آتا ہوا ہے۔"

وہ ذو معنی انداز میں بولا "خیر' اب تو آتا جاتا لگا رہے گا۔" پھر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے نیچی آواز میں کہنے لگا "آپ جانتے ہیں کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں؟"

میں نے کہا "میری تو آج پہلی ملاقات تھی۔ آپ یہیں کے رہنے والے ہیں۔ آپ ہی ان کے بارے میں بتادیں۔"

اس کے لیے اتنی حوصلہ افزائی کافی تھی۔ جلدی سے بولا "صاحب! کیا بتائیں' بے حیائی اور بے شرمی کی انتہا ہوچکی ہے۔ یوسف کریمی کا گھر کیا ہے' فاشی کا اڈا بنا ہوا ہے۔ ایک کار والا آتا ہے' ایک جاتا ہے۔ یوسف کریمی کی بیٹی جانے کہاں کہاں سے مرنے پھانس کر لاتی ہے۔ آپ بھی شاید رشتے کے چکر میں آئے ہیں۔ آپ شکل سے مجھے شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ شاہدہ کے چکر میں نہ پھنسیں۔ اس نے تو جانے کتنوں سے شادی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں ساجد نامی ایک شخص کا یہاں بہت آنا جانا ہوگیا تھا۔ میں نے اسے بھی منع کیا تھا مگر اس نے کہا کہ شاہدہ اس کی منگیتر ہے۔ میں ان لوگوں کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ مال دار اسامیوں سے اسی طرح مال بٹورتے ہیں پھر دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر پھینکتے ہیں۔" پھر وہ دھیمی آواز اور رازدارانہ لہجے میں بولا "ساجد نامی اس شخص کو تو لگتا ہے خود ان لوگوں ہی نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔"

"ٹھکانے لگا دیا ہے' کیا مطلب۔" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اسے قتل کروادیا ہے؟"

وہ میرے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی ہی دھن میں بول رہا تھا "یہ خبر تو سارے اخباروں میں چھپی تھی۔ ساجد حسن سے شاہدہ نے جھوٹی منگنی کر رکھی تھی' جب ساجد نے شادی پر اصرار کیا تو بے چارہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یوسف کریمی نے تو بیٹی کو کمائی کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ وہ اس کی شادی کیسے کرسکتا ہے۔ جب ساجد نے اپنی رقوم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو انہوں نے اسے قتل کروادیا۔ میں اسی لیے آپ کو ابھی سے ہوشیار کررہا ہوں۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ آپ ان کے چکر میں پڑکر خود کو خوار نہ کریں۔"

وہ شخص یہی سمجھ رہا تھا کہ میں شاہدہ کے چکر میں وہاں آیا ہوں۔ میں نے اس کی خوش فہمی برقرار رکھتے ہوئے کہا "یاد آرہا ہے' یہ خبر تو میں نے بھی پڑھی تھی۔ قاتل تو غالباً پکڑا بھی گیا تھا۔"

"جو شخص پکڑا گیا ہے' وہ بھی اسی نامراد کے چکر میں تھا۔" نامراد سے اس کی مراد شاہدہ سے تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "مجھے تو یقین نہیں آتا کہ فرقان صدیقی نے ساجد کو قتل کیا ہو۔ وہ تو خاصا سمجھ دار اور شریف آدمی دکھائی دیتا تھا۔ شاید اسے بھی شاہدہ نے شادی کا جھانسا دیا ہوگا۔ تھا۔ وہ اچھی خاصی رقمیں شاہدہ پر خرچ کرتا رہا ہے۔"

میں نے پوچھا "آپ کے خیال میں ساجد کو کس نے قتل کیا ہوگا؟"

"یہ بات تو میں نہیں جانتا۔" وہ قدرے محتاط "لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ اس قتل میں یوسف کریمی کے گھرانے کا ہاتھ ہے۔"

"کیا آپ یہ بات عدالت میں بھی کہہ سکتے ہیں؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر قدرے خفگی لہجے میں بولا "آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا۔"

میں نے کہا "آپ نے تعارف کا موقع ہی نہیں دیا۔ اب آپ پوچھ رہے ہیں تو بتا تا ہوں۔ میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ میں ساجد حسن مرڈر کیس میں وکیل صفائی ہوں۔"

وہ جلدی سے بولا "میں ساجد حسن' فرقان صدیقی اور شاہدہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ جائیں اپنا کام کریں۔"

پھر وہ چپکے سے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ شریف شہری لفاظوں اور عدالتوں کی خواری سے ڈرتے ہوئے حقائق کو سامنے لانے سے کتراتے ہیں۔ معمولی سی گواہی کے لیے بھی



عدالتوں پر حاضر ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص رضاکارانہ طور پر کوئی اہم اطلاع دینے تھانے چلا جائے تو پولیس والے اس کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں' وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اس شخص کو بھی جیسے ہی معلوم ہوا تھا کہ میں ایک وکیل ہوں' وہ کان دبا کر شرافت سے ایک جانب ہوگیا تھا۔

میں نے اپنی گاڑی کو گلی سے باہر نکالا اور مین روڈ پر آکر اس کا رخ اپنے گھر کی جانب موڑ دیا۔

○☆○

مقدمے کی ابتدائی کارروائی مکمل ہونے کے بعد عدالت نے میرے موکل اور اس مقدمے کے ملزم فرقان صدیقی پر فرد جرم عائد کردی اور باقاعدہ سماعت کے لیے تاریخ دے دی۔ جب ملزم پر فرد جرم لگائی گئی تو اس نے صحت جرم سے انکار کردیا۔

استغاثہ کی جانب سے آٹھ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی۔ میں یہاں پر صرف اہم گواہوں کا تذکرہ ہی کروں گا۔ ان اہم گواہوں میں یوسف کریمی کا پڑوسی صدرالدین' یوسف کریمی' شاہدہ کریمی اور کاشف محمود شامل تھے۔

پوسٹ مارٹم کی فائنل رپورٹ کے مطابق مقتول ساجد حسین کی موت آٹھ اگست کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب اعشاریہ تین دو کی وہ گولی بنی تھی جو فرقان صدیقی کے ریوالور سے چلائی گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر امنر کی رپورٹ سے اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ پیشانی میں لگنے والی مذکورہ گولی ہی سے مقتول کی موت واقع ہوئی تھی۔

پولیس نے قتل کا محرک محبت اور رقابت کو قرار دیا تھا۔ تفتیشی پولیس نے عدالت میں جو چالان پیش کیا تھا' اس کے مطابق وقوعہ کے روز مقتول اور ملزم کے درمیان شاہدہ کے گھر پر ابھی خاصی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ ملزم کو اس بات پر غصہ تھا کہ شاہدہ نے شادی کا وعدہ تو اس سے کیا مگر منگنی توڑ کر ڈالی۔ پولیس کے مطابق جب مقتول شاہدہ کے گھر آیا تو ملزم پہلے سے وہاں موجود تھا۔ مقتول کی آمد نے ملزم کو مشتعل کردیا اور ان کے درمیان تلخ و ترش جملوں کا تبادلہ ہونے لگا پھر مقتول تقریباً نو بجے رات ناراض ہوکر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تقریباً دس منٹ بعد ملزم بھی وہاں سے رخصت ہوگیا تھا۔ ازاں بعد رقابت کے جذبے سے مغلوب ہوکر ملزم نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کی لاش کو اپنی گاڑی سمیت ایک ویران سڑک پر چھوڑ کر فرار ہوگیا۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "جناب عالی! میں ریکارڈ کی درستی کی خاطر اس کیس کے آئی۔ او (انکوائری افسر) سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

عدالت نے میری درخواست منظور کرلی۔

عدالت کے حکم پر اس کیس کا تفتیشی افسر مشتاق احمد گواہوں کے کٹہرے میں آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ ایک اے ایس آئی تھا اور سرکاری وردی میں ملبوس وہ خاصا چاق و چوبند نظر آتا تھا۔

میں نے اپنی فائل کھول کر اس کے ایک صفحے پر نظر جماتے ہوئے "آئی او" سے سوال کیا "جناب انکوائری افسر صاحب! ایف آئی آر کے مطابق آپ کو اس واردات کی اطلاع تقریباً رات گیارہ بجے پہنچائی گئی تھی اور پولیس تقریباً پندرہ منٹ بعد جائے وقوعہ پر پہنچ گئی تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"پولیس نے جائے وقوعہ کا جو نقشہ تیار کیا ہے' اس کے مطابق مقتول کی لاش گرے کلر کی ٹویوٹا کے اندر پائی گئی تھی؟"

"بالکل صحیح ہے جناب۔"

"آلہ قتل بھی گاڑی کے اندر ہی سے دستیاب ہوگیا تھا؟"

"بالکل درست۔"

میں نے کہا "آلہ قتل جو اعشاریہ تین دو کا ایک ریوالور تھا' اس پر سے ہر قسم کے فنگر پرنٹس صاف کردیے گئے تھے؟"

وہ بولا "آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "آلہ قتل اور مذکورہ گرے کلر ٹویوٹا ملزم فرقان صدیقی کی ملکیت ہیں؟"

"بجا فرمایا آپ نے۔" وہ معتدل لہجے میں بولا "اسی لیے ہم ملزم کو پانے میں کامیاب ہوئے۔"

میں دانستہ گھما پھرا کر یہ غیر اہم سوالات کررہا تھا۔ اس طرح دراصل میں انکوائری افسر کے دماغ کو الجھانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی تھی پھر میں نے ایک اہم سوال کیا۔

"آئی او صاحب!" میں نے اے ایس آئی مشتاق احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے

کہ ملزم قتل کی واردات کرنے کے بعد اپنی گاڑی کو سراب گوٹھ کے قریب ایک ویران سڑک پر لاش سمیت چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

"بالکل' ایسا ہی ہوا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"اور بوکھلاہٹ میں وہ گاڑی کی چابیاں بھی نکالنا بھول گیا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا "کیونکہ اس وقت وہ جلد از جلد جائے واردات سے دور چلا جانا چاہتا تھا؟"

"جی ہاں' ملزم نے ایسا ہی کیا تھا۔"

چابیوں والی بات پولیس رپورٹ میں شامل نہیں تھی۔ یہ بات میں نے اپنی طرف سے لگائی تھی۔ میں نے آئی او کو چابیوں کے بارے میں سوچنے کا زیادہ موقع نہیں دیا اور فوراً ہی اگلا سوال کر ڈالا۔

"پولیس رپورٹ کے مطابق ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد آپ نے مذکورہ گرے کلر کی ٹویوٹا اپنے قبضے میں لے لی تھی اور آپ قریباً رات بارہ بجے وقوعہ سے روانہ ہوئے تھے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

میری توقع کے عین مطابق وہ میرے سوال کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "مذکورہ گاڑی کو اپنی تحویل میں لینے کے بعد آپ واپس متعلقہ تھانے میں آ گئے تھے۔ آپ نے اپنی رپورٹ میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں کیا کہ گاڑی کو جائے وقوعہ سے کون ڈرائیو کر کے تھانے تک لایا تھا؟"

آئی او نے کہا "یہ اتنی اہم بات نہیں تھی اس لیے اس کا ذکر ہم نے ضروری نہیں سمجھا۔"

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میری معلومات کے لیے اس پولیس اہلکار کا نام بتا دیں جو ملزم کی گاڑی کو جائے وقوعہ سے تھانے تک لایا تھا؟"

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا "میرا خیال ہے' ہیڈ کانسٹیبل شرافت علی نے مذکورہ گاڑی کو ڈرائیو کر کے تھانے تک پہنچایا تھا۔"

"تھینک یو آئی او صاحب۔"

اس کے بعد میں نے سوالات کا سلسلہ ختم کر دیا۔

استغاثہ کے گواہوں میں سے سب سے پہلے شاہدہ کا بڑوسی صدر الدین گواہی دینے کے لیے آیا۔ اس نے حج بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بیان میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ اس بات کا گواہ تھا کہ وقوعہ کے روز اس نے شاہدہ کے گھر کے سامنے ملزم کی گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔ چونکہ میرا موکل سرے سے اس روز وہاں گیا ہی نہیں تھا لہٰذا صدر الدین کی گواہی سراسر پولیس کا کارنامہ تھا۔ صدر الدین کی عمر لگ بھگ پینتیس سال تھی۔ وہ شکل سے ایک موقع پرست اور لالچی شخص دکھائی دیتا تھا۔ شاید اسے کچھ رقم دے کر خریدا گیا تھا۔

صدر الدین اپنا بیان ریکارڈ کروا چکا تو وکیل استغاثہ نے چند رسمی سے سوالات کیے۔ سارا زور اس بات پر تھا کہ وقوعہ کے روز اس نے ملزم کی گاڑی یوسف کریمی کے دروازے پر کھڑی دیکھی تھی۔ وکیل استغاثہ اپنے سوالات سے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مذکورہ روز میرا موکل وہاں گیا تھا۔

اپنی باری پر میں جرح کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے صدر الدین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا "صدر الدین! تم کام کیا کرتے ہو؟"

"ادھر پونی موڑ پر پھل کا ٹھیلا لگاتا ہوں جناب۔"

میں نے پوچھا "وقوعہ کے روز تم نے کتنے بجے ملزم کی گاڑی کو یوسف کریمی کے دروازے پر کھڑے دیکھا تھا؟"

"میں نے گھڑی تو نہیں دیکھی جناب! لیکن میرا خیال ہے' اس وقت ساڑھے آٹھ کا وقت ہو گا۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا تم اس وقت گلی میں ہی کھڑے تھے؟"

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا "پھر اس وقت گھر کے اندر ہو گے۔"

"نہیں جناب' میں اس وقت اپنا ٹھیلا کھڑا کر کے واپس گھر آ رہا تھا۔" اس نے جواب دیا "میں نے ایک نظر گاڑی پر ڈالی پھر اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ گاڑی وہاں سے کتنے بجے روانہ ہوئی تھی؟"

"نہیں جناب' میں نے اس گاڑی کو اپنی آنکھوں سے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ خواہ مخواہ جھوٹ کیوں بولوں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا "خواہ مخواہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔" پھر میں نے دھیمے لہجے میں خود کلامی کی "اور اگر کوئی فائدہ مند جواز موجود ہو تو جھوٹ بولنے میں دیر بھی نہیں کرنی چاہیے۔"

میرا یہ تبصرہ جج کی سماعت تک نہیں پہنچا تھا البتہ صدر الدین نے واضح طور پر میری بات سن لی تھی جس پر وہ تھوڑا خفیف بھی ہوا تھا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"صدر الدین! جس گلی میں آپ کی رہائش ہے' کیا اس میں اسٹریٹ لائٹس نصب ہیں؟"



"نہیں جناب' ہماری گلی میں روشنی کا ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔"

"کیا آپ لوگوں نے گلی کو روشن کرنے کے لیے اپنے گھروں کے باہر بلب وغیرہ لگا رکھے ہیں؟"

"نہیں جناب۔" اس نے نفی میں سر ہلایا "ہماری گلی میں گھروں کے باہر بلب وغیرہ نہیں لگے ہوئے۔"

"آپ نے بیان دیا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے یوسف کریمی یعنی اپنے پڑوسی کے گھر کے سامنے گرے کلر کی ایک گاڑی دیکھی تھی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سی گاڑی تھی؟"

وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا "بس وہ گاڑی تھی۔ کون سی کیا مطلب!"

میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا "میرا مطلب ہے گاڑی کا مارک کیا تھا؟"

"یہ کیا ہوتا ہے جناب؟" اس نے الجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں نے کہا "صدر الدین صاحب! یہ بتائیں وہ گاڑی مزدا تھی' فورڈ تھی' ٹویوٹا تھی یا کوئی اور قسم کی گاڑی تھی۔"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" اس نے بے بسی سے وکیل استغاثہ کو دیکھا "میں نے تو بس اتنا دیکھا تھا کہ گاڑی کا رنگ گرے تھا۔"

"آپ نے اس گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا؟"

"جی نہیں' میں نے گاڑی کا نمبر نوٹ نہیں کیا تھا۔"

"کیا آپ کو ملزم کی گاڑی کا نمبر یاد ہے؟"

اس نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا "آپ کو گاڑی کا مارک معلوم نہیں' اس کے نمبر سے آپ واقف نہیں ہیں اس کے باوجود آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ نے ملزم کی گاڑی کو وقوعہ کے روز یوسف کریمی کے دروازے پر کھڑے دیکھا تھا۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا "میں اس گاڑی کو پہلے بھی یوسف کے دروازے کے سامنے کھڑے دیکھ چکا تھا اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ شاہدہ کی فیکٹری کے منیجر فرقان صدیقی کی گاڑی ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا آپ یہ بات دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی گلی میں کبھی گرے کلر کی کوئی دوسری گاڑی داخل نہیں ہوئی یا یوں سمجھیں کہ کیا آپ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یوسف کریمی کے دروازے کے سامنے ملزم کی گاڑی کے علاوہ کبھی کوئی گرے کلر کی گاڑی کھڑی نہیں ہوئی؟"

"میں یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں جناب۔" وہ پریشان ہو کر بولا "میں سارا دن گلی میں پہرا تو نہیں دیتا۔"

میں نے پوچھا "صدر الدین صاحب! کیا آپ کو یہ بات معلوم تھی کہ وہ گاڑی قتل کی کسی واردات میں استعمال ہونے والی ہے؟"

"جی نہیں' میں یہ بات کیسے جان سکتا تھا۔"

"آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے گلی میں گرے کلر کی گاڑی کھڑی دیکھ کر بس یہ فرض کر لیا کہ ملزم وہاں آیا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

میں نے کہا "اگر میں یہ کہوں کہ آپ نے وقوعہ کے روز جو گاڑی دیکھی تھی وہ میری تھی تو آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب۔" وہ بے چارگی سے بولا "آپ وکیل ہیں' میں آپ سے بحث تو نہیں کر سکتا۔"

"اس کا مطلب ہے' آپ کو اس بات کا پورا یقین نہیں ہے کہ آپ نے جو گاڑی یوسف کریمی کے دروازے پر کھڑی دیکھی تھی اس میں ملزم فرقان صدیقی ہی وہاں پہنچا ہو گا؟"

وہ قدرے بیزاری سے بولا "جناب' میں نے نہ تو اپنی آنکھوں سے ملزم کو اس گاڑی سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور نہ ہی یوسف کا دروازہ کھٹکھٹا کر یہ پوچھا تھا کہ ان کے گھر میں کون آیا ہے۔"

میں نے اسے چکر دینے کے لیے کہا "میں نے خود اس گلی میں جا کر اہل محلہ میں سے بعض لوگوں سے پوچھ گچھ کی تھی لیکن کسی نے بھی گرے کلر کی گاڑی کی وہاں موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔"

"دوسروں کے بارے میں' میں جواب دہ نہیں ہوں۔" وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا "میں نے جو دیکھا تھا وہ آپ کو بتا دیا۔"

وہ خاصا پریشان دکھائی دینے لگا تھا۔

میں نے مزید ایک دو سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کر دی۔ اپنی جرح سے میں نے معزز عدالت کو یہ باور کرا دیا تھا کہ گواہ صدر الدین نے رٹا رٹایا بیان دیا تھا۔ پولیس نے اسے جو سبق پڑھایا تھا اس کی معلومات اس سے زیادہ نہیں تھیں اور صدر الدین کے بیان سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وقوعہ کے روز میرا موکل یوسف کریمی کے گھر گیا تھا۔

اگلی گواہی یوسف کریمی کی تھی۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ عدالت میں ایک وقت میں صرف ایک گواہ کی گواہی لی جاتی ہے۔ تاکہ ایک گواہ کی شہادت دوسرے گواہ کو

متاثر نہ کر سکے۔

یوسف کریمی نے حلف اٹھانے کے بعد بیان دیا کہ وقوعہ کے روز اس کا ہونے والا داماد مقتول ساجد حسن تقریباً نو بجے ان کے گھر آیا تھا۔ وہ اپنی ہنڈا اون ٹوفائیو میں وہاں پہنچا تھا۔ گھر میں اس وقت ملزم فرحان صدیقی پہلے سے موجود تھا جو کسی ضروری کام سے وہاں آیا ہوا تھا۔ کسی بات پر ان دونوں میں تلخ کلامی ہوگئی۔ ملزم دراصل مقتول کو اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ تاہم تھوڑی دیر کے بعد مقتول وہاں سے چلا گیا۔ اس کی موٹر سائیکل خراب ہوگئی تھی اس لیے اسے ٹیکسی میں وہاں سے جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد ملزم بھی اپنی گاڑی میں وہاں سے روانہ ہوگیا تھا۔

اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے سرسری سی جرح کے بعد مجھے موقع فراہم کیا۔ میں سوالات کے لیے یوسف کریمی کے کٹہرے کے پاس آیا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یوسف صاحب! وقوعہ کے روز ملزم آپ کے گھر کتنے بجے پہنچا تھا؟"

"تقریباً آٹھ بجے۔"

"وہ آپ کے گھر سے کتنے بجے رخصت ہوا تھا؟"

"میرا خیال ہے، دس سوا دس بجے وہ چلا گیا تھا۔"

میں نے پوچھا "آپ ذرا یہ بھی بتا دیں کہ اس روز آپ کا ہونے والا داماد آپ کے یہاں کتنے بجے آیا تھا؟"

اس نے جواب دیا "ساجد حسن تقریباً نو بجے ہمارے یہاں پہنچا تھا۔"

"اس کی روانگی کتنے بجے ہوئی تھی؟"

"ملزم سے چند منٹ پہلے۔" یوسف کریمی نے جواب دیا "میرا خیال ہے ساجد کے کوئی دس پندرہ منٹ بعد ملزم بھی وہاں سے چلا گیا تھا۔"

"آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ مقتول اور ملزم کے مابین کسی بات پر تلخ کلامی ہوگئی تھی۔ کیا آپ اس بات کی وضاحت کرنا پسند کریں گے؟"

"اصل بات تو مجھے معلوم نہیں" وہ سوچتے ہوئے بولا "ویسے ان کے درمیان اصل مسئلہ رقابت کا تھا۔"

"کیسی رقابت؟"

"ہم نے شاہدہ کی منگنی ساجد حسن سے کر دی تھی اور عنقریب ان کی شادی ہونے والی تھی لیکن ملزم اس بات پر بضد تھا کہ شاہدہ کی شادی اس سے کر دی جائے۔ وہ ساجد حسن کو اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ کی بیٹی نے میرے موکل سے شادی کا وعدہ کر رکھا تھا؟"

"یہ سراسر جھوٹ ہے" وہ قطعیت سے بولا "ملزم کا گھڑا ہوا افسانہ ہے۔ میری بیٹی ایسی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کی بیٹی نے مختلف اوقات میں مختلف افراد سے شادی کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس کی مل کا منیجر اور میرا موکل تو کئی مرتبہ اسے اپنی گاڑی میں گھر چھوڑنے بھی آیا تھا اور اس نے شادی کے وعدے کی آس میں آپ لوگوں پر اچھی خاصی رقم بھی خرچ کر دی تھی؟"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "وکیل صفائی معزز گواہ کی نجی زندگی کو مجروح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں اس حرکت سے روکا جائے۔"

جج نے مجھے ہدایت کی کہ میں گواہ کی گواہی تک محدود رہوں۔ میں نے کہا "جناب عالی! معزز گواہ کی اصلیت ظاہر کرنے کے لیے اس کے خانگی معاملات کا ذکر از حد ضروری ہے۔ اس سے خدانخواستہ کسی کی دل آزاری مقصود نہیں ہے۔"

جج نے مجھے محتاط سوال کرنے کی اجازت دے دی۔

میں نے کٹہرے میں کھڑے ہو کر یوسف کریمی سے پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ آپ ایک پرائیویٹ فرم میں ڈھائی سو روپے ماہوار پر کام کرتے ہیں اور آپ کی تنخواہ میں سے چار سو روپے "ایچ پی ایف سی" کی قسط ادا ہو جاتی ہے۔"

"آپ کی معلومات درست ہیں۔"

"کیا یہ بھی درست ہے کہ آپ کا چھوٹا بیٹا صدر میں جوتوں کی ایک دکان پر کام کرتا ہے اور وہاں سے ایک ہزار روپے اسے ماہوار ملتے ہیں جس میں سے کبھی اس نے پانچ سو سے زیادہ گھر پر نہیں دیے۔"

اس نے میری معلومات کی تصدیق کر دی۔ میں نے کہا "آپ کی بیٹی شاہدہ کریمی پچھلے چھ ماہ سے فائن ٹیکسٹائل مل میں کام کر رہی ہے اور اس کی ماہانہ آمدنی پندرہ سو روپے ہے جس کا کم و بیش نصف وہ اپنی آرائش و زیبائش پر خرچ کر دیتی ہے؟"

"میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میں اس کے شوق کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا" وہ قدرے برہم لہجے میں بولا۔

"رکاوٹ بننا یا نہ بننا آپ کا ذاتی معاملہ ہے" میں نے بے پروائی سے کہا "میں صرف اس بات کی تصدیق چاہتا ہوں کہ آپ کے گھر میں ماہانہ زیادہ سے زیادہ دو ہزار روپے آتے ہیں یعنی ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کی قسط اور شاہدہ کے ذاتی اخراجات نکال کر۔"



"آپ نے جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں وہ تقریباً درست ہیں۔"

"شکریہ یوسف صاحب!" میں نے فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "اب اس بات کی تصدیق بھی کر دیں کہ گزشتہ چھ ماہ میں آپ کے گھر میں ہیں انچ کا رنگین ٹی وی، وی سی آر، ڈیک، عمدہ قالین، صوفہ سیٹ اور دیگر سجاوٹ کی چیزیں لائی گئی ہیں۔ اس خریداری کے لیے پیسا کہاں سے آیا؟"

وکیل استغاثہ نے فوراً مداخلت کی "جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے، وکیل صفائی انتہائی غیر متعلق سوالات کر رہے ہیں۔ یہ انکم ٹیکس کا کیس نہیں ہے۔ معزز گواہ کو فاضل وکیل کے سوال کا جواب دینے کے لیے پابند نہیں کیا جا سکتا۔"

جج نے مجھے تنبیہہ کی کہ میں موجودہ کیس سے متعلق ہی سوال کروں۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں جس جانب عدالت کی توجہ دلانا چاہتا تھا وہ کام ہو چکا تھا۔ میں نے یوسف کریمی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کریمی صاحب! کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ وقوعہ کے روز مقتول اور ملزم کے علاوہ بھی باہر کا ایک آدمی آپ کے گھر میں موجود تھا۔"

"میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا" وہ جلدی سے بولا "اس روز کاشف محمود بھی میرے گھر میں موجود تھا۔"

"کاشف سے آپ کی کیا رشتے داری ہے؟" میں نے پوچھا "میں نے سنا ہے، وہ آپ کا بھتیجا لگتا ہے؟"

وکیل استغاثہ نے اپنی موجودی کا احساس دلایا "جناب عالی! وکیل صفائی معزز گواہ کے اندرونی معاملات میں خوامخواہ مداخلت کر رہے ہیں۔ مجھے اس پر سخت اعتراض ہے۔"

جج میرا زاویہ سوال سمجھ گیا تھا۔ اس نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا حکم دیا۔ میں نے یوسف کریمی کے سامنے اپنا سوال دہرایا تو اس نے جواب دیا۔

"کاشف سے ہماری کوئی رشتے داری نہیں ہے، بس ہمارے درمیان خاندانی تعلقات ہیں۔"

"کیا کاشف شادی شدہ ہے؟"

"جی نہیں، اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

"میں نے سنا ہے، کاشف بھی آپ کی بیٹی کے چاہنے والوں میں سے ایک ہے" میں نے کہا "شاہدہ نے اس سے بھی شادی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ کاشف محمود ہی کی سفارش پر شاہدہ کو فائن ٹیکسٹائل مل میں نوکری ملی تھی۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں سن رکھا" وہ ناگواری سے بولا "نہ ہی میں ایسی باتوں کے بارے میں جانتا ہوں۔"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کاشف کے گھر کا اور کون کون سا فرد آپ کے گھر میں ملنے آتا ہے؟"

وہ اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا "میں دن بھر دفتر میں ہوتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔"

"آپ کتنی مرتبہ کاشف کے گھر لیاقت آباد گئے ہیں؟" میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

"آ... آپ... مجھے بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں" وہ کلنٹ آمیز لہجے میں بولا "میں آپ کے سوال کا جواب نہیں دوں گا۔"

اس موقع پر وکیل استغاثہ اس کی مدد کو آیا اور "ہم بجیکشن یور آنر" کہنے کے بعد اس نے مختصر سی تقریر کر ڈالی لیکن جج نے اس کے تمام اعتراضات کو یکسر مسترد کرتے ہوئے گواہ کو جواب دینے کا حکم دیا۔ دراصل جج میری جرح کے مقصد کو سمجھ گیا تھا۔ میں اسے اپنے خطوط پر سوچنے کے لیے مجبور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

یوسف کریمی نے تھوک نگل کر گلا صاف کیا اور بولا "میں دن بھر دفتر میں مصروف رہتا ہوں، اس لیے کبھی کاشف کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"آپ کاشف کے کسی اور رشتے دار کو جانتے ہیں؟"

اس نے نفی میں جواب دیا، میں نے پوچھا "کاشف کا آپ کے گھر کا آنا جانا کس طرح شروع ہوا تھا؟"

"وہ میرے بیٹے عارف کا دوست تھا۔"

میں نے کہا "مجھے پتا چلا ہے کہ کاشف محمود نے کئی مرتبہ مقتول ساجد حسن کو دھمکی دی تھی کہ وہ شاہدہ سے شادی سے باز آ جائے۔ کیا وہ شاہدہ میں دلچسپی لے رہا تھا؟"

"مجھے ایسی فضول باتوں کا بالکل علم نہیں ہے۔"

جج نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا "بیگ صاحب! ان دھمکیوں کے سلسلے میں آپ کوئی ثبوت بھی پیش کر سکتے ہیں؟"

"بالکل جناب!" میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا "لیکن سردست اس کا ذکر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ جب صفائی کے گواہوں کی باری آئے گی تو میں ثبوت پیش کروں گا۔"

یہ بات میں نے اس لیے کہی تھی کہ مقتول کی والدہ قمرالنساء نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ اس بات کی گواہی دے سکتی ہے کہ کاشف محمود نے ان کے گھر آ کر یہ شادی نہ کرنے پر زور دیا تھا اور الٹی سیدھی دھمکیاں بھی دی تھیں۔

جج بار بار دیوار گیر کلاک کو دیکھ رہا تھا۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا "بیگ صاحب! آپ گواہ پر مزید جرح کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "میری جرح مکمل ہو چکی ہے جناب عالی!"
جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

○☆○

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں شاہدہ کریمی کھڑی تھی۔
اس نے خوبصورت پرنٹ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آرہی تھی۔۔۔ حسین اور پراعتماد۔
شاہدہ کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ ساجد حسن کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اسے بس یہ معلوم تھا کہ آٹھ اگست کی رات اس کا منگیتر ان کے گھر آیا تھا' اس وقت ملزم بھی گھر میں موجود تھا۔ دونوں میں کچھ دیر تک تناؤ کی سی کیفیت رہی پھر تلخ کلامی شروع ہوگئی۔ نتیجے میں وہ دونوں یکے بعد دیگرے وہاں سے روانہ ہوگئے۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا' وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔
وکیل استغاثہ نے سرسری سے سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کردی۔ میں اپنی باری پر جج کی اجازت سے جرح کے لیے شاہدہ کے کٹہرے کے قریب آگیا۔ پھر سلسلہ سوالات کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔
"شاہدہ کریمی! مجھے تمہارے منگیتر مقتول ساجد حسن کی موت کا بہت صدمہ ہے۔"
اس نے کوئی جواب یا تبصرہ نہیں کیا بلکہ خاموش نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں اس کی ہوشیاری اور چالاکی کے بہت سے کارنامے سن اور دیکھ چکا تھا اس لیے میں نے جارحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔
"شاہدہ بی بی! کیا یہ بات درست ہے کہ مقتول ساجد حسن تمہارا اصلی منگیتر ہی تھا؟"
"اصلی اور نقلی منگیتر میں کیا فرق ہوتا ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔
میں نے کہا "جس کے ساتھ باقاعدہ منگنی کی رسم ادا ہو وہ اصلی منگیتر ہوتا ہے۔ نقلی کے بارے میں تم زیادہ بہتر جانتی ہو!"
وہ بولی "ساجد میرا باقاعدہ منگیتر نہیں تھا۔ ہاں' یہ ہے کہ اس کے ساتھ میری شادی کی بات چل رہی تھی۔"
اس نے یہ عجیب رنگ دکھایا تھا۔ اس کے تیوروں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اچھی خاصی تیاری کے بعد آج عدالت میں آئی تھی۔ میں نے سوال کیا۔
"کیا یہ درست ہے کہ کچھ لوگوں کو مقتول سے تمہاری شادی پر اعتراض تھا؟"
"شادی بیاہ کے معاملات میں ایسا تو ہوتا ہی ہے۔"
"کیا ان معترض افراد میں تمہارا نام نہاد کزن کاشف محمود بھی شامل تھا؟"
"بالکل نہیں" وہ سرے سے مکر گئی البتہ ہمارے مل کے منیجر اور آپ کے موکل فرقان صدیقی کو اس شادی پر خاصی تکلیف تھی جس کا وہ گاہے بہ گاہے اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔"
"میرے موکل کا موقف ہے کہ تم نے اس سے شادی کا وعدہ کر رکھا تھا؟"
"آپ کا موکل جھوٹ بولتا ہے۔"
یہ بھی جھوٹ ہے کہ میرا موکل کئی مرتبہ تمہیں اپنی گاڑی میں تمہارے گھر چھوڑنے آیا تھا؟"
"یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے" وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی "اکثر فرموں کے مالک اور فیکٹریوں کے گاڑیوں والے افسران ورکرز کو ڈراپ کرتے ہیں۔"
میں نے کہا "تمہاری بات میں وزن ہے لیکن کبھی کسی ڈراپ کرنے والے نے کسی خاتون ورکر کو اپنا ریوالور نہیں دیا ہوگا۔"
"کون سا ریوالور؟"
"اعشاریہ تین دو کا ریوالور۔"
"جی نہیں' آپ کیا الٹی سیدھی ہانک رہے ہیں۔" وہ غصے سے کٹہرے میں کھڑی تاہم ریوالور کے ذکر پر میں نے اس کی آنکھوں میں خوف کی ایک پرچھائیں لہراتے ہوئے دیکھی تھی۔
میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "وقوعہ سے چند روز قبل آپ کو گھر آتے ہوئے ڈراپ کیا تھا اور آپ ملزم کی گاڑی میں گھر تک آنا نہیں چاہتی تھیں چنانچہ ملزم نے تمہاری حفاظت کی خاطر تمہیں اپنا ریوالور دیا تھا' اسی تک تم نے واپس نہیں کیا" ایک لمحے کے توقف میں نے اضافہ کیا "اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس ریوالور سے مقتول ساجد حسن کی کھوپڑی میں سوراخ کیا گیا ہے؟"
"یہ کیا بکواس ہے؟" وہ غصیلے لہجے میں بولی "میں ایسے کسی ریوالور سے واقف نہیں ہوں۔"
وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا "یور آنر! وکیل صفائی خوامخواہ معزز لوگوں کو ہراساں کر رہے ہیں۔"
جج نے شاہدہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "تم اس سلسلے میں کیا کہتی ہو بی بی؟"
"میں نے آج تک کسی ریوالور کی شکل نہیں دیکھی" وہ



زچ ہوتے ہوئے بولی "وکیل صفائی ایک فرضی کہانی کا سہارا لے کر مجھے نروس کر رہے ہیں۔ ان کا موکل جھوٹا اور بہتان طراز ہے۔ میں نے نہ کبھی اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا اور نہ ہی اس نے میری حفاظت کی خاطر کبھی مجھے کوئی ریوالور یا پستول دیا تھا۔"
میں نے مختصراً جج کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ جواباً اس نے پوچھا "یگ صاحب! آپ نے اپنے کاغذات میں اس ریوالور کا اس انداز میں تذکرہ نہیں کیا؟"
میں نے کہا "جناب عالی! چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر میں یہ ذکر نہیں کرسکا۔"
پھر میں نے جج کی اجازت سے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
"شاہدہ بی بی! مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارا نام نہاد کزن اکثر تمہارے گھر آتا جاتا رہتا ہے۔ کیا تم بھی کبھی اس کے گھر گئی ہو؟"
"نہیں' مجھے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔"
"تمہارے والد اپنی گواہی میں اس بات کی تصدیق کر چکے ہیں کہ کاشف محمود سے آپ لوگوں کی کوئی باقاعدہ رشتے داری نہیں ہے بلکہ وہ تمہارے چھوٹے بھائی عارف کا دوست ہے" میں نے شاہدہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا "کیا تم اس بات کی وضاحت کروگی کہ کاشف کا کس تعلق' کس ناتے سے تمہارے گھر آنا جانا ہے؟"
"اگر باقاعدہ رشتے داری نہ ہو تو کیا کوئی شخص گھر میں نہیں آسکتا؟"
جج نے کمرے سخت لہجے میں کہا "بی بی' آپ سوال نہ کریں۔ یگ صاحب آپ سے جو پوچھ رہے ہیں' بس اس کا جواب دیں۔"
وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولی "میرے والد آپ کے سوال کا جواب دے چکے ہیں۔ کاشف میرے چھوٹے بھائی کا دوست ہے۔ وہ اسی ناتے سے ہمارے گھر آتا ہے۔"
"کیا تم اس بات سے انکار کروگی کہ کاشف تمہارے چھوٹے بھائی عارف اور تمہارے والد کی غیر موجودگی میں بھی کئی بار تمہارے گھر میں گزارتا ہے؟"
"تو کیا دروازے پر آئے ہوئے شخص کو واپس لوٹا دیا جاتا ہے؟" وہ ہاتھ نچا کر بولی "اصل چیز انسان کے اخلاق ہوتے ہیں۔ اگر کبھی کاشف میرے والد اور بھائی کی عدم موجودگی میں گھر آجاتا ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟"
"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے" میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ۔۔۔ بلکہ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ ایک غیر شادی شدہ غیر مرد بلا روک ٹوک آپ کے گھر کس ناتے سے آتا ہے؟"
"بس' وہ ہم سے ملنے آتا ہے" وہ برہمی سے بولی "کیوں آتا ہے کا کیا سوال ہے؟"
جج میرا نقطہ نظر سمجھ رہا تھا۔ جب شاہدہ نے میرے سوال کا کوئی واضح جواب نہ دیا تو اس نے مجھ سے کہا "یگ صاحب! آپ اس سوال کو نظرانداز کرکے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھائیں۔"
میں نے کہا "شاہدہ بی بی! کیا یہ صحیح ہے کہ کاشف اکثر تمہیں ہوٹلوں میں کھانا کھلانے بھی لے جاتا ہے؟"
وہ اچانک غصے سے پھٹ پڑی "آپ نے انتہائی گھٹیا سوال کیا ہے وکیل صاحب! آپ میری کردار کشی کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو کسی دوست نے کبھی کسی ہوٹل میں کھانا نہیں کھلایا؟"
"یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں" میں نے اس کے غصے کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا "کیا کاشف تمہارا دوست ہے؟ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اکثر و بیشتر تمہیں قیمتی تحفے بھی دیتا رہتا ہے؟"
"یہ سراسر جھوٹ ہے' مجھ پر الزام ہے۔"
"شاہدہ بی بی! میں نے سنا ہے کہ تم نے کاشف محمود سے بھی شادی کا وعدہ کر رکھا ہے؟"
وہ روہانسی ہوگئی "بالکل بکواس' جھوٹ۔۔۔ آپ کو ایک لڑکی سے اس قسم کے سوالات کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"
وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کو ظاہر کرتے ہوئے کہا "یور آنر! وکیل صفائی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔"
میں نے وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرے فاضل دوست! عام حالات میں مجھے واقعی ایسے سوالات نہیں کرنے چاہئیں لیکن استغاثہ کے مطابق مقتول

انتباہ
سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

ساجد حسن رقابت کا نشانہ بنا ہے۔ اس کے رقیب میرے موکل نے اسے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ یہی موقف ہے نا استغاثہ کا؟" میں نے ایک لمحے کو رک کر سوالیہ نظروں وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ اس نے اثبات میں سرہلایا۔ میں جج کی جانب روئے سخن کو موڑتے ہوئے بولا۔

"جناب عالی! اگر میرے موکل اور اس کیس کے ملزم کو مقتول کا رقیب مان بھی لیا جائے تو حالات وواقعات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مقتول کے ایک سے زیادہ رقیب موجود تھے۔ ان شواہد کی روشنی میں اس بات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ قاتل کوئی اور شخص بھی ہوسکتا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے پرجوش لہجے میں کہا "مقتول کو ملزم کے ریوالور سے ملزم کی گاڑی میں قتل کیا گیا تھا۔ قاتل کوئی اور کیسے ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا "میرے موکل کی گاڑی چوری ہوگئی تھی اور ریوالور کا احوال بھی ابھی بیان کیا جاچکا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے کہا "ابھی تک نہ تو یہ ثابت ہوا ہے کہ ملزم کی گاڑی چوری ہوئی تھی اور نہ ہی معزز گواہ شاہدہ کریمی نے ریوالور کے بارے میں آپ کے موقف کی تصدیق کی ہے۔"

میں نے کہا "میرے فاضل دوست! آپ خاطر جمع رکھیں، وقت آنے پر یہ باتیں ثابت ہوجائے گی۔"

جج نے کہا "آپ لوگ آپس میں الجھنے کے بجائے مقدمے کی کارروائی کو آگے بڑھائیں" پھر وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "بیگ صاحب! آپ گواہ سے مزید کوئی سوال کریں گے؟"

"ضرور جناب!" میں نے گردن کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے کہا پھر کٹہرے میں کھڑی شاہدہ کریمی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"شاہدہ بی بی! وقوعہ کی رات مقتول اور ملزم کے علاوہ کاشف محمود بھی آپ کے گھر میں موجود تھا۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گی کہ وہ کتنے بجے آپ کے گھر سے رخصت ہوا تھا؟"

"میرا خیال ہے، وہ ساجد اور فرقان کے جانے کے کچھ دیر بعد چلا گیا تھا۔"

"تقریباً کتنی دیر بعد؟"

"میرا اندازہ ہے کہ وہ گیارہ بجے تک گیا ہوگا۔"

"کیا اس کے پاس اپنی سواری ہے؟"

"نہیں، وہ اکثر کشادا اور ٹیکسی میں سفر کرتا ہے۔"

"اس روز بھی یقیناً وہ رکشا یا ٹیکسی پر ہی گیا ہوگا۔"

"یہ بات تو آپ اسی سے پوچھیے گا" وہ بیزاری سے بولی۔

میں نے اس تذکرے کو یہیں چھوڑا اور سوالات کا زاویہ بدلتے ہوئے پوچھا "شاہدہ بی بی! تم فائن ٹیکسٹائل مل میں کتنے عرصے سے کام کررہی ہو؟"

"تقریباً چھ ماہ سے۔"

"اس سے پہلے تم کہاں کام کرتی تھیں؟"

"اس سے پہلے میں کافی عرصہ فارغ رہی تھی" اس نے جواب دیا "تقریباً ایک سال کی فراغت کے بعد مجھے یہ نوکری ملی تھی۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ مذکورہ نوکری تمہیں کاشف محمود کی سفارش سے ملی تھی؟"

"ہاں، یہ سچ ہے۔"

"فائن ٹیکسٹائل میں تمہیں کتنی تنخواہ ملتی تھی؟"

"پندرہ سو روپے" وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر شاہدہ کے لیے ناپسندیدہ موضوع چھیڑ دیا "شاہدہ بی بی! مجھے پتا چلا ہے کہ حال ہی میں تم نے اپنے گھر کے لیے چند نئی چیزیں خریدی ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کیا ہیں؟"

"جن لوگوں کا گھر ہوتا ہے وہ اس کی آرائش و زیبائش کے لیے ضروری اشیا خریدتے ہی رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا یہ سچ ہے کہ تم نے پچھلے دنوں اکاؤ ڈیک، سونی کلر ٹی وی، ہیں ایچ۔ جینسل کا وی سی آر، ایک شاندار قیمتی قالین اور نیا آرام دہ صوفہ سیٹ خریدا ہے؟"

"آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔"

"کیا تم معزز عدالت کو بتانا پسند کرو گی کہ یہ سامان تم نے نقد خریدا ہے کہ قسطوں پر؟"

وہ فخریہ لہجے میں بولی "بالکل نقد۔ میں قسطوں کے جھنجٹ کو پسند نہیں کرتی۔"

میں نے کہا "یہ اتفاق ہے کہ میں یہ تمام سامان اپنی آنکھوں سے تمہارے ڈرائنگ روم میں رکھا دیکھ چکا ہوں اور میرا اندازہ ہے کہ اس کی مجموعی مالیت لگ بھگ ساٹھ ہزار روپے ہوگی، اس قیمتی سامان کی خریداری کے لیے تمہارے پاس رقم کہاں سے آئی تھی؟"

"آپ کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ہم گھر کے تین افراد ہیں اور تینوں ملازمت کرتے ہیں" وہ یاددہانی کے انداز میں بولی "ہم نے اپنی تنخواہ سے رقم بچا کر یہ چیزیں خریدی ہیں۔"



میں نے کہا "آپ تینوں کی تنخواہ سے ماہانہ جو بچت ہوسکتی ہے اس کا مجھے بہ خوبی اندازہ ہے۔ چھ ماہ میں زیادہ سے زیادہ آپ چھ ہزار کی بچت کرلیں گے۔ ساٹھ ہزار تو اس سے دس گنا زیادہ ہوتے ہیں۔"

"میں ٹیوشن بھی پڑھاتی ہوں۔"

"پھر بھی یک مشت اتنی رقم اکٹھی نہیں ہوسکتی۔"

وہ برہمی سے بولی "آپ کیا انکم ٹیکس والوں کی طرح کریدکرید کر سوالات کررہے ہیں؟"

میں نے کہا "آپ اگر جواب نہ دینا چاہیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ ویسے اگر تم جواب دے دیتیں تو تمہاری پوزیشن واضح ہوسکتی تھی۔"

"میں آپ کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی" وہ رکھائی سے بولی۔

جج بڑی دلچسپی سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے کہا کہ وہ میرے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی تو جج کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔ میرے لیے یہ بات واضح تھا کہ جج میرے سوالات کے مقصد کو پوری طرح سمجھ رہا تھا۔

اس روز عدالت میں ہمارا کیس خاصی تاخیر سے لگا تھا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "بیگ صاحب! عدالت کا وقت ختم ہونے میں دس منٹ باقی ہیں، آپ گواہ سے اور کچھ پوچھنا چاہیں گے؟"

میں تمام ضروری سوالات کرچکا تھا اس لیے کہا "یس آل یور آنر۔ مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"

جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا حکم جاری کردیا۔ آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہ کاشف محمود کو شہادت کے لیے پیش ہونا تھا۔

○☆○

ٹھیک دس روز بعد کاشف محمود گواہوں کے کٹہرے میں موجود تھا۔ اس نے سیاہ پتلون پر چیک دار شرٹ زیب تن کررکھی تھی۔ وہ ایک اسمارٹ اور قدآور شخص تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر لگ بھگ ستائیس سال تھی۔

حلف اٹھانے کے بعد اس نے اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بیان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے وہی بیان دیا جو اس سے پہلے پولیس والوں کو دے چکا تھا۔ اس کا بیان نہایت ہی مختصر تھا جس کے مطابق وقوعہ کے روز وہ شاہدہ کے گھر پر موجود تھا اور سب سے آخر میں وہاں سے گیا تھا۔

جب وہ وکیل استغاثہ کی سرسری سی جرح کا سامنا کرچکا تو میں سوالات کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"کاشف محمود! آپ کتنے عرصے سے فائن ٹیکسٹائل مل میں ملازمت کررہے ہیں؟"

"تقریباً چھ سال سے۔"

"ملزم مذکورہ مل سے کتنے عرصے سے وابستہ ہے؟"

"مجھے صحیح عرصے کا تو اندازہ نہیں ہے" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "لیکن وہ کافی عرصے سے اس مل سے وابستہ ہے۔"

"کافی عرصہ۔۔۔ مثلاً دس سال؟"

"اس سے بھی زیادہ۔"

میں نے پوچھا "کاشف صاحب! آپ اس وقت مذکورہ مل میں سپروائزر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ چھ سال قبل آپ کس حیثیت سے اس مل میں ملازم ہوئے تھے؟"

"شروع میں، میں انڈر ٹریننگ تھا اور میرے سپرد اسٹور کا کام کیا گیا تھا" اس نے بتایا "پھر ترقی کرتے کرتے گذشتہ چھ سال میں، میں سپروائزر بن گیا ہوں۔"

"آپ کی تعلیم کتنی ہے؟"

"میٹرک!" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا "مجھے پتا چلا ہے کہ سپروائزر ہونے کے باوجود تمہیں میرے موکل فرقان صدیقی کی زیرنگرانی کام کرنا پڑتا تھا؟"

"آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے" وہ متحمل لہجے میں بولا "مل کا ہر شخص منیجر کی زیرنگرانی ہی کام کرتا ہے۔"

"ایک باس کی حیثیت سے ملزم کا برتاؤ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟"

اس نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا "مجھے ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی تھی۔"

"اس کا مطلب ہوا، ملزم کا سلوک تمہارے ساتھ اچھا تھا؟"

"یہی کہا جاسکتا ہے۔"

وہ بڑی سمجھ داری سے سوچ سمجھ کر جواب دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ شاہدہ کریمی کو آپ کی سفارش پر فائن ٹیکسٹائل مل میں ملازمت ملی تھی؟"

"ہاں، یہ سچ ہے" اس نے اثبات میں جواب دیا "یہی بات یہ ہے کہ وہ اس کی اہل بھی تھی۔ بلاشبہ شاہدہ بہت ہارڈ ورکر اور ذہین لڑکی ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا اور پھر پوچھا "سننے میں آیا ہے کہ شاہدہ کریمی آپ کی بہت اچھی دوست تھی ہے؟"

"آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے" اس نے تردیدی لہجہ اختیار کرنے کے بجائے بڑے ٹھوس انداز میں اس دوستی کی تصدیق کی "شاہدہ کے اندر ایک اچھے دوست کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔"

"کیا یہ درست ہے کہ آپ اکثر شاہدہ کو ہوٹلوں میں کھانا کھلانے بھی لے جاتے ہیں؟"

"ہاں' یہ درست ہے" اس کے لہجے سے بلا کا اعتماد جھلکتا تھا۔ ایسے گواہوں کو توڑنے کے لیے بعض اوقات بہت مشکل زاویے سے سوال کرنا پڑتا ہے۔ میں نے پوچھا۔

"کیا یہ بھی سچ ہے کہ آپ اکثر و بیشتر شاہدہ کو تحفے تحائف بھی دیا کرتے ہیں؟"

"سچے دوست تو ایک دوسرے کے لیے جان کی بازی بھی لگا دیتے ہیں" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا "تحفوں وغیرہ کی کیا اہمیت ہے؟"

میں نے پوچھا "کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ آپ شاہدہ سے شادی کرنا چاہتے تھے؟"

وہ مسکرایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "ہاں' میں اس بات سے واقعی انکار کروں گا۔"

"پھر آپ شاہدہ کی شادی میں رکاوٹیں کیوں ڈالتے رہے؟"

"میں نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی" وہ سنجیدہ لہجے میں بولا "اس حوالے سے آپ کی معلومات ناقص ہیں۔ شاہدہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ میں اس کی شادی میں رکاوٹ کیوں بنوں گا۔"

"پھر ان دھمکیوں کی کیا حیثیت تھی جو منگنی کے بعد آپ مقتول ساجد حسن اور اس کی والدہ کو دیتے رہے؟" میں نے پہنچتے ہوئے لہجے میں کہا "ایک مرتبہ تو آپ بہ نفس نفیس ان کے گھر واقع گلشن اقبال بھی پہنچ گئے تھے۔"

"آپ صریحاً غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں" وہ متانت سے بولا "یا پھر آپ کی معلومات انتہائی ناقص ہیں۔ میں نے کبھی اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کی۔"

"مقتول تو گواہی دینے کے لیے زندہ نہیں ہے" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "لیکن اس کی والدہ قمرالنساء میری بات کی تصدیق کر سکتی ہے۔"

"اگر وہ کسی ایسی بات کی تصدیق کرے گی تو یقیناً دروغ گوئی سے کام لے گی" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا "کیا وہ اس سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت بھی پیش کر سکتی ہے؟"

میں نے کہا "وقت آنے پر ٹھوس ثبوت بھی پیش کر دیا جائے گا۔ فی الحال آپ یہ بتائیں کہ وقوعہ کے روز آپ شاہدہ کے گھر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

"مجھے بالکل ٹھیک وقت یاد نہیں ہے" وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا "ویسے مقتول اور ملزم کے درمیان تلخ جملوں کا تبادلہ میری موجودگی میں ہی ہوا تھا۔"

"ان کے درمیان کس بات پر تلخی ہوئی تھی؟"

"ظاہر سی بات ہے' وجہ نزع شاہدہ ہی تھی" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا "شاہدہ مقتول سے شادی کرنے جا رہی تھی اور ملزم کو یہ بات قطعاً گوارا نہیں تھی۔"

"آپ کے خیال میں ملزم کیا چاہتا تھا؟"

"وہ شاہدہ سے شادی کا متمنی تھا۔"

"اور شاہدہ کیا چاہتی تھی؟"

"ظاہر ہے' اس کی ساجد سے منگنی ہو چکی تھی۔ وہ اسی سے شادی بھی کرنا چاہتی تھی لیکن ملزم اس بات پر بضد تھا کہ شاہدہ وہ منگنی توڑ دے۔ پہلے ملزم اور شاہدہ کے درمیان یک طرفہ جھوٹ ہوتی رہی پھر مقتول کی آمد کے بعد براہِ راست اور ملزم کے بیچ ترش جملوں کا تبادلہ ہونے لگا۔"

میں نے کہا "سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ شاہدہ نے میرے موکل سے بھی شادی کا وعدہ کر رکھا تھا؟"

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی" وہ حیرت آمیز لہجے میں بولا "ورنہ شاہدہ مجھے ضرور بتاتی۔ وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔"

وہ بار بار شاہدہ اور اپنی دوستی کا تذکرہ کر رہا تھا۔ میں نے کھلے لہجے میں کہا "کاشف صاحب! آپ یہ بات جانتے ہی ہوں گے کہ ہمارا معاشرہ لڑکی اور لڑکے کی دوستی کو اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ خالصتاً مغربی تصور ہے۔"

"اس کے باوجود یہ اچھا نہ سمجھا جانے والا" فعل بڑے دھڑلے سے ہمارے معاشرے میں پنپ رہا ہے۔ میں پوش علاقوں میں ایسی بیسیوں کیا سیکڑوں مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔۔۔ اور رہی مغربی تصور کی بات تو ہمارے یہاں مشرقی ہی کتنا گیا ہے وکیل صاحب! معاف کیجئے گا' آپ بھی بھلی طرح اس وقت مغربی لباس میں نظر آ رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں روانی سے اور منہ بگاڑ کر انگریزی بولنے والوں کو معتبر اور معزز سمجھا جاتا ہے۔ میں اپنے معاشرے میں رائج معمولی رسوم و رواج کی درجنوں مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔"

وہ ایک اچھا مقرر تھا۔ اور ہر بات ناپ تول کر اور سوچ سمجھ کر کرتا تھا۔ پوری جرح کے دوران میں اس نے نہ تو کھل کر شاہدہ کی یا کسی بھی اور کی حمایت کی تھی اور نہ ہی کوئی ایسا تاثر دیا تھا کہ وہ ملزم ہی کو صد فی صد قاتل سمجھتا ہے۔ اس نے بڑی ڈپلومیٹک پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں تیار شدہ پلان کے مطابق اسے گھیرنے کی کوشش کی۔

"کاشف صاحب! استغاثہ کے دیگر گواہان کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ آپ وقوعہ کی رات شاہدہ کے گھر سے رخصت ہونے والے آخری شخص تھے۔ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ آپ وہاں سے کتنے بجے نکلے تھے؟"

"اس وقت تقریباً رات کے گیارہ بج رہے تھے۔"

"آپ وہاں سے سیدھے اپنے گھر گئے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"آپ اپنے گھر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

"شاید ساڑھے بجے۔"

"سنا ہے آپ بس یا ویگن میں سفر نہیں کرتے" میں نے کہا "وقوعہ کے روز آپ نے اپنے گھر آنے کے لیے کون سی سواری اختیار کی تھی؟"

"میں اس روز رکشا میں واپس آیا تھا۔"

"پولی موڑ سے رکشا ایک گھنٹے میں تو لیاقت آباد نہیں آتا" میں نے کہا "زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا لگنا چاہیے۔"

"آپ بھول جاتے ہیں" اس نے سرکو انتہائی جنبش دی "شاہنی حسن کے پاس آگر خراب ہو گیا تھا۔ دس منٹ تک میں اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتا رہا لیکن رکشا والا جب کسی بھی طور اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوا تو اس نے مجھ سے معذرت کر لی تھی۔ چنانچہ دوسرا رکشا کرنے کے لیے مجھے مزید پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے آدھے گھنٹے کا سٹرائیک گھنٹے میں کیا تھا۔"

اس کا طویل جواب ختم ہوا تو میں نے اچانک حملہ کیا "کاشف صاحب! میرے موکل کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ بھی کبھار اس کی گاڑی بھی استعمال کر لیا کرتے تھے؟"

"میں نے کبھی اپنے ذاتی کام کے لیے ان کی گاڑی استعمال نہیں کی" وہ جلدی سے بولا "انہوں نے جب بھی اپنی گاڑی دی مل کے کسی کام کے لیے ہی دی تھی۔"

میں نے پوچھا "کاشف صاحب! کیا آپ سوچ کر بتا سکتے ہیں کہ میرے موکل نے آخری بار آپ کو گاڑی کب دی تھی؟"

کاشف نے کن انکھیوں سے فرقان صدیقی کو دیکھا پھر پرسوچ لہجے میں بولا "میرا خیال ہے' جولائی کے شروع میں' میں نے آخری بار ملزم کی ٹویوٹا استعمال کی تھی۔"

میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "جناب عالی! میں معزز عدالت کی اجازت سے اپنے موکل سے ایک انتہائی اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وکیل استغاثہ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟"

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا مگر اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ جج نے مجھے ملزم سے سوال کرنے کی اجازت دے دی۔

"فرقان صاحب!" میں نے اپنے موکل کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا "آپ نے آخری بار اپنی گاڑی کی مکمل سروس کب کروائی تھی؟"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا "تین اگست کو۔"

عکاس پبلیکیشنز

میں نے جج کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے کہا "یور آنر! گواہ کاشف محمود کے بیان کے مطابق اس نے ملزم کی گاڑی جولائی کے شروع میں آخری مرتبہ استعمال کی تھی۔ ملزم کا کہنا یہ ہے کہ اس نے تین اگست کو گاڑی کی مکمل سروس کروائی تھی۔ اس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ گواہ کی انگلیوں کے نشانات مکمل سروس کے بعد گاڑی پر سے کلی طور پر صاف ہو گئے ہوں گے۔ ان حالات کی روشنی میں معزز عدالت سے میری پرزور استدعا ہے کہ گاڑی پر سے فنگر پرنٹس اتارنے کا حکم جاری کیا جائے۔"

میں نے بات ختم کرتے ہی کٹہرے میں کھڑے گواہ کاشف محمود کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشان آمیز الجھن کی لکیریں نمودار ہو چکی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے نظر آنے والا اعتماد اب دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

وکیل استغاثہ فوراً بول اٹھا "جناب عالی! وکیل صفائی عجیب بات کر رہے ہیں۔ مکمل سروس کے بعد سے اب تک اس گاڑی کو کئی افراد ہینڈل کر چکے ہوں گے۔ اس پر تو متعدد افراد کی انگلیوں کے نشانات موجود ہوں گے۔"

میں نے کہا "انہی متعدد نشانات میں ایک آدھ نشان اس چور کی انگلیوں کا بھی ہو گا جس نے یہ گاڑی چرا کر قتل کی واردات کی تھی۔"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے کہا "وکیل صفائی خوا مخواہ اس کیس کو غلط رخ پر ڈال

رہے ہیں۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے' آپ کے خیال کے برعکس میں کیس کو صراط مستقیم پر ڈال رہا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے' میرا موکل بے گناہ ہے۔ آٹھ اگست کو وہ واردات اسی کار چور نے کی تھی جس کی مجھے تلاش ہے۔"

وکیل استغاثہ نے میری جانب دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا "میرے فاضل دوست اپنے ملک کی پولیس کو اسکاٹ لینڈ یارڈ سمجھ رہے ہیں۔ مجھے تو ان کی بات ہی بے معنی معلوم ہو رہی ہے۔ اگر کچھ مختلف قسم کے فنگر پرنٹس حاصل کر بھی لیے گئے تو یہ کیسے پتا چلے گا کہ ان میں چور کے پرنٹس کون سے ہیں؟"

میں نے کہا "ہمیں سب سے زیادہ نقصان ہمارے احساسِ کمتری نے پہنچایا ہے۔ اگر ہمارے پولیس والے پوری دیانت داری اور محنت سے کسی کیس کو حل کرنے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائیں تو اسکاٹ لینڈ یارڈ والے ہمارے موزوں میں دبکے ہوئے نظر آئیں گے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جنابِ عالی! آپ پرنٹس اٹھانے کے احکامات صادر کریں۔ مبینہ چور کے فنگر پرنٹس فراہم کرنا میرا کام ہے۔ میں یہ درخواست کسی شک کی بنیاد پر ہی کر رہا ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ فنگر پرنٹس کے تجزیے کے بعد یہ کیس صحیح رخ پر آجائے گا۔"

جج نے فوری طور پر فنگر پرنٹس حاصل کرنے کا حکم جاری کردیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو انکوائری افسر نے مجھے گھیر لیا "بیگ صاحب! آپ نے یہ کیا نیا چکر چلا دیا ہے؟"

میں اسے اپنے ساتھ ایک تنہا گوشے میں لے گیا اور رازدارانہ لہجے میں کہا "میں آپ کو ایک ٹپ دینا چاہتا ہوں۔"

اس نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر میری جانب دیکھا اور بولا "ٹپ دینا چاہتے ہیں کہ راہ سے بھٹکانے کا ارادہ ہے؟"

میں نے اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "اگر آپ تھوڑی ہمت سے کام لیں تو اصل مجرم گرفتار ہو سکتا ہے۔"

"ہم نے اصل مجرم کو ہی گرفتار کر رکھا ہے جناب!" وہ محتاط لہجے میں بولا "آپ ہمیں چکر نہیں دے سکتے۔"

میں نے دھیمے لہجے میں کہا "اس وقت میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ آپ کو قائل کرتا پھروں۔ ہاں' اگر آپ ایک کام کرسکتے ہیں تو کر ڈالیں۔ انشاء اللہ اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔"

"کون سا کام؟" انکوائری افسر نے بھی رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا "ملزم کی ٹویوٹا آپ کے قبضے میں ہے۔ آپ ایسا کریں کہ ایک سادہ لباس پولیس اہلکار کی اس گاڑی پر ڈبونی لگا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ قاتل مذکورہ گاڑی پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنے کی کوشش کرے گا۔"

انکوائری افسر نے تمسخرانہ نظر سے مجھے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ میں اس کی ذہنی سطح پر افسوس کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ افسوس' ہمارے ملک کی پولیس ذہن استعمال کرنے سے زیادہ ڈنڈے سے کام نکالنے کی عادی ہے!

○☆○

جب سے ستارہ نے ٹویوٹا کی اصل چابیاں میرے پاس پہنچائی تھیں۔ میری پوری توجہ اسی بات پر لگی ہوئی تھی کہ کار چور کا پتا لگاؤں۔ اگر کار چور پکڑا جاتا تو میرا موکل بڑی آسانی سے بری ہو سکتا تھا۔ پھر جب فرقان نے مجھے بتایا کہ کاشف کبھی کبھار اس کی گاڑی استعمال کرلیتا تھا تو مجھے کاشف کے بارے میں زیادہ کرید ہوئی۔ کاشف کے پیچھے کور سرگرمیوں نے بھی مجھے اس کی طرف سے الرٹ کردیا تھا۔ پھر جب گواہی پر میں نے وہ فنگر پرنٹس اٹھانے کا شوشہ چھوڑا تو اس کا خاطر خواہ ردِعمل دیکھنے میں آیا تھا۔ اور کسی کے پاس نوٹ کی ہو یا نہ کی ہو لیکن میں نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ جب میں جج سے مذکورہ گاڑی پر سے فنگر پرنٹس اٹھانے کا مطالبہ کر رہا تھا تو اچانک کاشف کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس طرح تبدیل ہوئے تھے جیسے اس نے سانپ دیکھ لیا ہو۔

اسی شام میری توقع کے عین مطابق کاشف محمود میرے دفتر میں موجود تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا "بیگ صاحب! آپ نے یہ فنگر پرنٹس کا کیا چکر چلا دیا ہے؟"

میں نے پوچھا "کیوں' کیا ہو گیا؟"

وہ بولا "آپ جانتے ہیں' فرقان صاحب میرے باس بھی رہ چکے ہیں اور محسن بھی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ وہ تو پولیس کے دباؤ میں آکر میں نے اسٹامپ کے گواہوں میں اپنا نام لکھوا دیا تھا۔"

"تو پھر اس سلسلے میں آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟"

"آپ فرقان صاحب کی مدد کر رہے ہیں۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" وہ رازداری سے بولا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں مل کر کام کریں؟"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

"مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی ہدایت کے مطابق کوئی ایسا بیان دے دیتا ہوں جو فرقان صاحب کے حق میں جاتا ہو۔ اس کے بدلے میں آپ وہ فنگر پرنٹس والا سلسلہ ختم کردیں۔"

"فنگر پرنٹس کی وجہ سے تم کسی پریشانی میں ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "پریشانی دراصل یہ ہے کہ گاڑی کی سروس کے بعد بھی کئی مرتبہ اس گاڑی پر کئی مرتبہ میرا ہاتھ لگا ہوگا۔ آپ نے عدالت میں فنگر پرنٹس کا نکتہ اس وقت اٹھایا ہے جب مجھ پر جرح کر رہے تھے۔ اگر بدقسمتی سے میرے ہاتھ کے نشانات بھی گاڑی پر مل گئے تو پولیس میری جان عذاب کردے گی۔"

"ہوں!" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "ایسا تو ہو سکتا ہے۔"

"دراصل آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قانون میں بہت گنجائشیں ہوتی ہیں۔ وکیل اگر ہوشیار ہو تو اچھے خاصے بے گناہ آدمی کی گردن میں بھی پھانسی کا پھندا فٹ کرسکتا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس معاملے کو طول نہ دیں۔"

وہ خود بہ خود میری چال میں آگیا تھا۔ اب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ فرقان کی گاڑی اسی نے چرائی ہوگی۔ میں نے چالاکی سے کہا "لیکن اس میں میرا کیا فائدہ ہوگا؟"

"فائدہ کیوں نہیں ہوگا؟" وہ آگے کو جھک آیا "آپ حکم کریں' کیا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔"

میں نے کہا "اصل مسئلہ فنگر پرنٹس کا ہے۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ جج فنگر پرنٹس حاصل کرنے کا حکم دے چکا ہے۔"

وہ بولا "جج کو فنگر پرنٹس اٹھانے دیں۔ یک طرفہ فنگر پرنٹس سے کچھ ثابت نہیں ہو سکے گا۔ بس آپ اپنی زبان نہ کھولیں۔ اگر آپ خاموش رہیں گے تو معاملہ سیٹ رہے گا۔"

میں نے قدرے مایوسی سے کہا "میری خاموشی سے اب کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے جس انداز میں جج کو مبینہ



حسن وہ! جو چھپائے نہ چھپے!
میرے نسوانی حسن کا راز
بلوسم بریسٹ کریم (یونانی)
قدرتی جڑی بوٹیوں پر برسہابرس کے تجربے اور تحقیق کے بعد ایک نئی ایجاد
بلوسم بریسٹ کریم جو قیمت 1501
• بریسٹ کے ٹشوز کو سخت کرکے اُبھار لاتی ہے۔
• بریسٹ کے چھوٹے پن میں اضافہ کرکے پروقار شخصیت کا مالک بناتی ہے
• کھوئی ہوئی نسوانی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ہے
ایسٹ ایکسٹ
ظاہر شاپنگ سینٹر بریلوی بازار راولپنڈی
ویژن ہوم اپلائنس بشیر بازار فیصل آباد
رابعہ بازار نزد فیصل بازار سیالکوٹ
پاکستان بزنس سٹور کچہری بازار گوجرانوالہ
علیم ہوزری سینٹر مدینہ مارکیٹ غلہ منڈی فیصل آباد
اوکے شاپنگ سینٹر صدر بازار فرید خانی خان
ابن سینا سٹور گھنٹہ گھر بازار فرید خانی خان
حبیب دواخانہ گھنٹہ گھر بازار ملتان
امداد ہومیو سٹور باغی سٹریٹ ساہیوال
شہزاد دواخانہ کارخانہ بازار فیصل آباد
شاہی طبی دواخانہ کارخانہ بازار فیصل آباد
گورے ہاؤزویئر میڈیسل سٹور کچہری بازار سرگودھا
نگار میڈیکل سٹور ریلوے روڈ چیلاکوٹ
حرمین ہومیو سٹور گرو بازار گوجرانوالہ
الحافظ دواخانہ بازار مارکیٹ کلاں بازار
فرید خانی خان
ریاض محمود ۹۹ نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور
محمد صادقین اینڈ سنز ہائی کورٹ مارکیٹ میرپور آزاد کشمیر
محمد طبی دواخانہ۔ ایبٹ آباد
مختار اینڈ سنز ہائی کورٹ مارکیٹ میرپور آزاد کشمیر
محمد طبی دواخانہ۔ ایبٹ آباد
شاہی طبی دواخانہ بوہڑ بازار راولپنڈی
مفتی اقلیم جنرل سٹور ہسپتال روڈ گوجرانوالہ
گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی پارسل منگوانے کے لیے
حکیم اینڈ سنز پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

چور کے فنگر پرنٹس مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہے اس سے جج اور وکیل استغاثہ بہ خوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ اس ضمن میں میرا روئے سخن آپ ہی کی طرف تھا۔ اب اگر میں اس معاملے میں خاموش رہا تو جج ازخود بھی آپ کے فنگر پرنٹس لے سکتا ہے۔"

اس کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ تشویش ناک لہجے میں بولا "اس کا بھی ایک حل ہے میرے پاس۔ میں مال خانے کی ڈیوٹی دینے والے سپاہی کی مٹھی گرم کرکے پوری گاڑی ہی صاف کروا دیتا ہوں۔ بس آپ اپنی زبان بند رکھنے کا وعدہ کریں۔ اس کے لیے میں آپ کی خدمت میں آپ کا مطلوبہ نذرانہ پیش کرنے کو تیار ہوں۔"

میری چال نہایت ہی کامیاب رہی تھی۔ اگر کاشف میرے پاس نہ بھی آتا تو بھی میں اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا تاہم اب اس کے پھنسنے کا میں نے بڑا شاندار بندوبست کردیا تھا۔ اس وقت میری ٹیبل کے نیچے ایک ٹیپ ریکارڈر آن تھا جس میں ہمارے درمیان ہونے والی تمام گفتگو ریکارڈ ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "گاڑی کو صاف کرنے والا کام خاصا خطرناک ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔"

وہ بولا "ہمارے ملک میں دولت کے بل بوتے پر ہر خطرناک کام نہایت ہی سہل ہو جاتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں، میں پانچ ہزار روپے دے کر مال خانے کے نگراں سپاہی کو رام کردوں گا۔ پانچ چھ سو تنخواہ پانے والا سپاہی اتنی رقم میں تو سو گاڑیاں بھی صاف کرنے پر تیار ہو جائے گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد میں نے تسلی تشفی دے کر اسے رخصت کردیا۔

مقابلہ تھانے کا انچارج میرا دیرینہ شناسا تھا۔ میں نے رات کو اسے اپنے گھر پر بلالیا پھر اسے ریکارڈ شدہ گفتگو سنانے کے بعد ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ تھانا انچارج نے مجھے یقین دلایا کہ وہ کاشف کے لیے ایسا چوہے دان تیار کرے گا کہ وہ بچ کر کہیں نہیں جاسکے گا۔ جاتے ہوئے وہ اس ریکارڈ شدہ کیسٹ کی ایک ڈپلی کیٹ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مجھے اس پر پورا بھروسا تھا۔

دو روز بعد کاشف محمود کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا گیا۔

اسی رات پولیس کی روایتی مہمان نوازی کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے اقبالِ جرم کرلیا۔ وہ ریکارڈ شدہ ٹیپ کی موجودگی میں کسی بات سے انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اگلے روز پولیس نے اسے عدالت میں پیش کرکے سات روز کا ریمانڈ حاصل کرلیا۔ اب کیس کی نوعیت بالکل تبدیل ہو گئی تھی اس لیے عدالت نے پولیس کو نیا چالان پیش کرنے کا حکم دیا۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل فرقان صدیقی کو باعزت بری کردیا۔ ریکارڈ شدہ گفتگو اور میرے فراہم کردہ ٹیوٹا کی اصلی چابیوں کے گچھے نے کاشف کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔

جج نے مجھ سے پوچھا "بیگ صاحب! آپ کو یہ چابیاں کہاں سے ملی تھیں؟"

جواب میں میں نے جج کو ستارہ کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔

جج نے اور وکیل استغاثہ نے باری باری ان چابیوں کا معائنہ کیا اور ساری بات ان کی سمجھ میں آگئی پھر کاشف کا اقراری بیان بھی میرے موکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ کاشف نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ موقع ملتے ہی اس نے فرقان کی گاڑی کی ڈپلی کیٹ چابیاں تیار کروالی تھیں۔ اس نے پولیس کو جو بیان دیا اس میں اس نے شاہدہ کو بھی قتل کے منصوبے میں ملوث کردیا تھا۔ اس نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ شاہدہ درحقیقت ساجد حسین سے شادی کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ صرف اسے بے وقوف بنا کر اس سے لمبی رقمیں اینٹھ رہی تھی۔ جب ساجد حسن نے اس طریقہ واردات کا علم ہوا تو وہ سختی پر اتر آیا اس نے شاہدہ پر مطالبہ کردیا کہ یا تو شاہدہ اس سے شادی کرے یا پھر اس رقم واپس کردے۔ اس پر شاہدہ نے ساجد کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور کاشف کو اس طرح اپنا آلہ کار بنایا کہ قتل کے کیس میں فرقان صدیقی پھنس جائے۔

شاہدہ نے اس کے برعکس بیان دیا۔ اس کے خیال میں کاشف محمود، ساجد کو قتل کرکے فرقان کو پھانسی لگوانا چاہتا تھا تاکہ ازاں بعد وہ شاہدہ سے شادی کرسکے۔ شاہدہ پر وعدہ معاف گواہ بن گئی تھی اس لیے سزا سے بچ گئی۔ کورٹ نے کاشف کو سزائے موت سنادی!

چلتے چلتے یہ بھی بتاتا چلوں کہ کچھ عرصے بعد موکل نے شاہدہ جیسی خطرناک لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ اب وہ اس کے چار بچوں کی ماں ہے۔

فرقان صدیقی نے شاہدہ سے شادی کرکے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا یا کوئی حماقت کی تھی اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ شاید کاتب تقدیر نے صید اور صیاد کا عمر بھر کا ساتھ لکھ دیا تھا!

(تحریر: شمام)



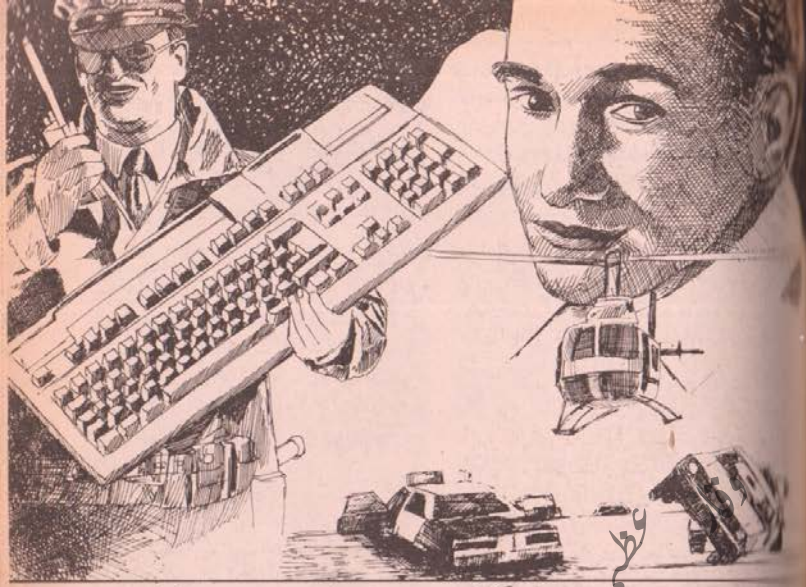

کہتے ہیں کہ موجودہ دور تبدیلی اور ترقی کا دور ہے۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ اور میدان ان روز افزوں تبدیلیوں سے محفوظ نہیں رہا۔ ازمنہ قدیم کے انسانوں کا مرغوب مشغلہ شکار بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔ اب یہی ایک مترقی سا فاسٹ شکار کی عجیب داستان جو بھری پری سڑکوں پر کھیلا گیا۔

**شکار**

محمود احمد مودی

**دورِ جدید کی گوناگوں برائیوں میں سے ایک برائی کا چشم کشا قصہ**

میکس محسوس کررہا تھا کہ اس کی کمر پسینے سے بھیگنے لگی ہے۔ گھبراہٹ اور پریشانی کی نشانی تھی اور اسے اس پر غصہ آرہا تھا۔ وہ ہر قسم کے دباؤ کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا اور آسانی سے پریشان نہیں ہوتا تھا لیکن پھر اس نے عقب نما آئینے میں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑی گٹھری کی طرف دیکھا جس پر دو جگہ حفاظتی بیلٹ بھی بندھی ہوئی تھی۔ وہ کمبل میں لپٹا ہوا ایک انسانی جسم تھا۔ میکس اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرادیا۔ موجودہ صورتِ حال میں اس کا تھوڑا بہت پریشان ہونا قابلِ معافی تھا۔ وہ سفید رنگ کی ایک نہایت عام سی گاڑی میں تھا جو اس نے اسٹوڈیو سٹی سے کرائے پر حاصل کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی گاڑی ٹریفک میں مدغم ہو جائے، ذرا بھی الگ یا نمایاں نظر نہ آئے۔ وہ ہر ممکن احتیاط برت رہا تھا۔ اسے پچھلی سیٹ پر موجود گٹھری کو ہر حال میں حفاظت سے منزل تک پہنچانا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

○☆○

"کار نمبر انیس... ہائی وے نمبر چار سو پانچ پر آجاؤ۔" شیٹ نے کمپیوٹر کی اسکرین پر نظر جماتے ہوئے حکم دیا۔

کمپیوٹر اسکرین پر لاس اینجلس اور اس کے نواح کا نقشہ پھیلا ہوا تھا اور اس پر مختلف مقامات پر روشن، نیلے نقطے متحرک نظر آرہے تھے۔ دراصل یہ وہ گاڑیاں تھیں جو مقررہ راستوں پر رواں تھیں اور شیٹ اپنی وین میں بیٹھے بیٹھے کمپیوٹر اسکرین پر نظر ڈال کر جان سکتا تھا کہ کس لمحے کون سی گاڑی کہاں تھی۔ اس کے سر پر ایک ہیڈ سیٹ چڑھا ہوا تھا جس کے ذریعے اس کا ہر گاڑی سے رابطہ تھا اور وہ ان کے لیے ہدایات جاری کرسکتا تھا۔ جدید ترین آلات سے لیس اس کی اپنی وین بھی تیز رفتاری سے محوِ سفر تھی۔

"کار نمبر انیس آپ سے مخاطب ہے کیپٹن!" اس کے ہیڈ فون میں آواز ابھری "ہم مل ہولینڈ کے مقام سے ہائی وے نمبر چار سو پانچ پر آرہے ہیں۔"

شیٹ، جسے اس کے ساتھی "کیپٹن سی" کے نام سے

مخاطب کرتے تھے، پوری طرح الرٹ تھا۔ اس نے دیکھا، کمپیوٹر کی اسکرین پر ایک اور متحرک و روشن نقطے کا اضافہ ہوچکا تھا۔ یہ کار نمبر انیس تھی جو الیکٹرانک آلات کی رینج میں آگئی تھی۔

"اس کا کوئی نام و نشان نظر آیا؟" شیٹ نے پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں۔" کار نمبر انیس کی طرف سے جواب ملا۔ "اس کی گاڑی کے بارے میں کوئی یقینی اطلاع ملی ہے؟"

"نہیں۔" شیٹ نے جواب دیا "ہمارا خیال ہے کہ اس نے اسٹوڈیوسٹی میں رک کر گاڑی تبدیل کی ہے۔ غالباً اس نے کرائے پر کوئی کار حاصل کی ہے۔ ہمارے آدمی کاریں کرائے پر دینے والی کمپنیوں سے معلومات کر رہے ہیں۔ جلد ہی اس سلسلے میں صحیح اطلاع مل جائے گی۔ اس وقت تک تم ان دونوں گاڑیوں میں سے کسی ایک کی تلاش جاری رکھو جو وہ ماضی میں استعمال کر رہا ہے یعنی سیاہ شیرو کی جیپ یا سبز رنگ کی بی ایم ڈبلیو۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ کی ہدایات پر عمل ہوگا۔" کار نمبر انیس سے جواب ملا اور اس کے بعد ہیڈ فون خاموش ہوگیا۔

"شیٹ سے آگے سنہرے بالوں والا ایک نوجوان کمپیوٹر کے کنسول پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اپنے ہیڈ فون کے ذریعے وہ بھی یہ گفتگو سن چکا تھا۔ اس نے گردن گھما کر شیٹ کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر بولا "ہماری دین جدید ترین آلات سے لیس ہے۔ اس کے باوجود ہم کو اس اندھیرے میں تاک ٹوئیاں مارتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ سیٹلائٹ تک سے ہمارا رابطہ ہے لیکن اپنے مطلوبہ آدمی کو تلاش کرنے کے لیے ہم انتظار کرنے پر مجبور ہیں۔ کاریں کرائے پر دینے والی کسی کمپنی میں بیٹھا ہوا کوئی احمق سا کلرک کریڈٹ کارڈز کی رسیدیں چیک کرنے کے بعد ہمارے کسی ساتھی کو بتائے گا کہ ہمارا مطلوبہ آدمی کون سی کار کرائے پر لے کر روانہ ہوا ہے تب صحیح معنوں میں ہماری کامیابی کے امکانات پیدا ہوں گے۔"

"تم اس لائن میں نئے ہو۔ اس لیے کبھی کبھی تم میں تحمل کی کمی محسوس ہوتی ہے۔" شیٹ مربیانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "ایک بار ہمارے مطلوبہ آدمی کی گاڑی کے بارے میں صحیح معلومات حاصل ہوجانے دو، پھر یہ وین اس سارے وقت کی تلافی کردے گی جو اب تک تلاش میں ضائع ہوچکا ہے۔"

"ہاں... خیر... یہ تو مجھے بھی اندازہ ہے۔" نوجوان جس کا نام لارسن تھا، ایک اور گہری سانس لے کر بولا "اس کی گاڑی کا پتا چلتے ہی ہم چند لمحوں میں ایس کے سریر جا پہنچیں گے اور اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں مل سکے گا۔"

"بس تم اپنی توجہ آلات پر رکھو لارسن!" شیٹ نے ہدایت کی "مشرق کی سمت سے جب کار نمبر سترہ اور کار نمبر اکیس ہماری رینج میں آئیں تو مجھے بتا دینا۔"

"بہت بہتر۔" لارسن نے دوبارہ سر جھکا کر کمپیوٹر کے کنسول پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

○☆○

ہائی وے پر ٹریفک کم ہی تھا۔ میکس، سانتا مونیکا کی پہاڑیوں کے قریب سے گزر چکا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ رفتار کچھ بڑھا دے مگر اس نے خود کو باز رکھا۔ وہ کوئی بھی ایسی حرکت کرنا نہیں چاہتا تھا جس سے کسی کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوتی۔ اس نے گھڑی دیکھی اور طمانیت سے سر ہلایا۔ اسے امید تھی کہ وہ صحیح وقت پر منزل پر پہنچ جائے گا۔

پچھلی سیٹ سے ایک بار پھر کراہ سنائی دی لیکن میکس نے اس پر توجہ نہیں دی۔ اس کے خیال میں فکر یا پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے اعصاب کو سکون دینے کے خیال سے ریڈیو آن کر کے موسیقی سننے کا ارادہ کیا مگر اس پر عمل کرنے کی نوبت نہ آسکی کیونکہ اسی لمحے اسے ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اس نے آگے چمکتے ہوئے ونڈ اسکرین سے اوپر کی طرف دیکھا اور اسے وہ چھوٹا سا ہیلی کاپٹر نظر آگیا جس کی اسے اندیشہ تھا۔ وہ ایک ہیلی کاپٹر تھا۔

اس کے اعصاب کو جھٹکا سا لگا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے گہری سانس لے کر سیٹ سے ٹیک لگا لی اور اپنے آپ کو سمجھایا کہ وہ خوا مخواہ پریشان ہو رہا تھا۔ ہائی وے نمبر چار پر پانچ پر تو اکثر ہی ہیلی کاپٹر پرواز کرتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ بھی یقیناً کوئی عام سا ہیلی کاپٹر ہوگا جو ہوائی ٹریفک کا ایک حصہ تھا۔

○☆○

"کیپٹن...!" لارسن نے گردن گھما کر کہا۔ اس کی آنکھیں اندرونی جوش اور ہیجان سے چمک رہی تھیں "کار نمبر سترہ اور کار نمبر اکیس رینج میں آگئی ہیں اور "بڑ نمبروں" نے بھی ہائی وے کے اوپر فضا میں چکر لگانا شروع کردیے ہیں۔"

شیٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ کمپیوٹر کی اسکرین کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے تینوں کاروں کی پوزیشن چیک کی۔ اسکرین پر "بڑ نمبروں" کی پوزیشن بھی ظاہر تھی۔ بڑ نمبروں سے مراد ایک ہیلی کاپٹر تھا جس میں آدمی سفر کرسکتے تھے۔ یہ ہیلی کاپٹر تمام ضروری آلات سے لیس تھے۔



لارسن بدستور پرجوش لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہمیں یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ اس نے کون سی کار کرائے پر حاصل کی ہے۔"

"بہت خوب!" شیٹ مسکرایا "مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔" "وہ کچھ دوسرے آلات کو چیک کرنے کی غرض سے چند منٹ کے لیے پچھلی سیٹ پر چلا گیا تھا لیکن اب اس نے محاذ جنگ پر موجود کسی جنرل کی طرح مستعدی سے دوبارہ اپنی جگہ سنبھال لی تھی۔

"وہ پچھلے سال کے ماڈل کی ایک سفید بیوک ہے۔ اس کی پلیٹ فورنیا کی نمبر پلیٹ ہے۔" لارسن نے نمبر بھی بتا دیا۔

"ہمارے جو آدمی اس وقت اس کی تلاش میں تیزی سے حرکت میں ہیں، تم نے انہیں یہ تازہ اطلاع دے دی ہے؟" شیٹ نے رسٹا پوچھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ کام اس کے کچھ لمحے پہلے ہی ہوگیا ہوگا۔ لارسن بے شک اس لائن میں نیا تھا لیکن وہ بے وقوف نہیں تھا۔ وہ ہر ضروری کام بلا تاخیر کرتا تھا اور ہدایات کے لیے ہدایات کا انتظار نہیں کرتا تھا۔

لارسن نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا "بڑ دن نے تو اب تک اسے تلاش بھی کرلیا ہوگا۔" پھر اس کے لہجے میں قدرے مایوسی آگئی "ہائی وے پر اس وقت اتنا کم ٹریفک ہے کہ ان لوگوں کو اسے تلاش کرنے میں ذرا بھی دشواری نہیں آئے گی۔"

شیٹ مسکراتے ہوئے بولا "تم ابھی سے یہ مت سمجھو کہ ہماری مہم سے دلچسپی اور سنسنی خیزی رخصت ہوگئی ہے۔ ابھی اس وقت تک پوری طرح مستعد اور پرجوش رہنا ہے تک ہم اس کے سر پر نہیں پہنچ جاتے۔ تمہیں معلوم ہے پہاڑیوں کے درمیان کئی چھوٹی چھوٹی سڑکیں ہیں اور کار ان سے اچھی طرح واقف بھی ہے۔ اگر وہ ان میں کسی پر مڑ گیا تو ہمارے لیے اچھا بھلا مسئلہ کھڑا ہوجائے گا اسے تلاش کرنا بہت مشکل ہوجائے گا۔"

"اب ایسی بھی بات نہیں کیپٹن!" لارسن بولا "ہماری کاروں اور بڑ نمبروں جن آلات سے لیس ہے، ان کی مدد سے اسے کہیں بھی تلاش کرنے میں تھوڑی بہت دقت ہو سکتی ہے لیکن یہ کام مشکل نہیں ہوگا۔"

"میں بیشہ سازوسامان اور آلات سے زیادہ انسانوں پر بھروسا کرتا ہوں۔" شیٹ بولا "اچھے اور جدید آلات سے لیس ہونا اچھی بات ہے لیکن اصل کام بہرحال انسانوں ہی کو کرنا ہوتا ہے۔ ہماری اصل ٹیم چھ افراد پر مشتمل ہے اور ان میں سے دشمن نے اس قسم کی زیادہ مہمات میں حصہ نہیں لیا ہے اس کے باوجود، بہرحال مجھے امید ہے کہ وہ اپنا کام اچھی طرح انجام دیں گے۔"

○☆○

میکس نے ایک بار پھر جھک کر ونڈ اسکرین سے اس ہیلی کاپٹر کو دیکھا اور اس کا دل ڈوب سا گیا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ اپنی منزل کی طرف رواں کوئی عام ہیلی کاپٹر نہیں تھا۔ ہیلی کاپٹر میں موجود افراد کو یقیناً اسی کی تلاش تھی اور انہوں نے اب ہیڈ لائٹس کا رخ گاڑی کی ونڈ اسکرین کی طرف کردیا تھا۔ تیز روشنی سے میکس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں اور وہ زیرلب انہیں کوستے ہوئے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ لوگ اب اس قسم کی مہموں میں جدید آلات سے لیس ہیلی کاپٹر بھی استعمال کرنے لگے تھے اور ان کے پاس اسی قسم کے آلات سے لیس ایک ایسی وین بھی موجود تھی جو شاید محکمہ دفاع بھی شاذونادر ہی استعمال کرتا ہو۔

میکس کو یہ امید نہ تھی تو تھا کہ وہ لوگ اس بات سے آگاہ ہوجائیں گے کہ وہ کس راستے سے سفر کرے گا لیکن اس کا خیال تھا کہ شاید وہ لوگ اس کی سیاہ شیرو کی جیپ یا سبز بی ایم ڈبلیو کی تلاش میں بھٹکتے رہیں گے اور انہیں یہ شبہ نہیں ہوپائے گا کہ وہ سفید رنگ کی ایک عام سی بیوک میں سفر کر رہا ہوگا۔ شاید انہیں اسٹوڈیوسٹی کی ان کمپنیوں سے رجوع کرنے کا خیال آگیا تھا جو کاریں کرائے پر دیتی تھیں۔ وہ اس کی حکمت عملی سمجھ گئے تھے۔ لیکن پھر میکس نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ وہ خوا مخواہ یہ باتیں فرض کر رہا تھا۔ درحقیقت کوئی اس کے تعاقب میں نہیں تھا۔

تسلی خواہ جھوٹی تھی یا سچی... لیکن اس سے اس کے دل کو کچھ سہارا ملا۔ اس نے گردن گھما کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔ کمبل میں لپٹی ہوئی اور حفاظتی بیلٹوں میں سے کسی ہوئی اس کی سواری کسمسا رہی تھی اور ہونٹ بھینچ کر اپنی تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"زیادہ بہادری دکھانے کی ضرورت نہیں..." وہ دوبارہ سڑک کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "تم چاہو تو اونچی آواز میں کراہ سکتی ہو۔ میں تمہاری کراہیں برداشت کرسکتا ہوں۔"

وہ عقب نما آئینے میں اس کے عکس کو قہرآلود نظروں سے دیکھتے ہوئی بولی "بکواس مت کرو۔"

میکس مسکرا دیا۔ اسے اس عورت کی یہ ادا پسند تھی۔ گو کہ اس وقت وہ پوری طرح بے بس تھی اور میکس کے رحم وکرم پر تھی لیکن غصہ دکھانے سے باز نہیں آئی تھی۔

ایک بار پھر اسے ہیلی کاپٹر کی آواز قریب آتی محسوس ہوئی۔ اس نے آگے جھک کر دیکھا۔ ہیلی کاپٹر کچھ نیچے آرہا تھا لیکن چند لمحے بعد وہ دوبارہ بلند ہوا اور گھوم کر واپس روانہ ہوگیا۔ کیا وہ لوگ اسے پہچان کر واپس جا رہے تھے؟ میکس

نے سوچا "کیا وہ کچھ اور انتظامات کرنے کے لیے واپس روانہ ہوئے تھے؟"

اسے ان سوالوں کا کوئی جواب نہ ملا۔ خود کو کوستے ہوئے اس نے ڈرائیونگ جاری رکھی۔

○☆○

"برڈ نمبرون رپورٹنگ کیپٹن!" شیٹ کے ہیڈ فون میں آواز ابھری۔ لارسن بھی اپنے ہیڈ فون کے ذریعے یہ آواز سن رہا تھا "ہم نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ میکس ہی ہے۔ کار نمبر انیس اور ایکس اس کی تعاقب میں روانہ ہوئی ہیں۔ ہم نے فی الحال اسے کچھ آگے نکل جانے کا موقع دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم صحیح پوزیشن میں آجاؤ۔ تمہاری ہیڈ لائٹس سے ٹریفک میں خلل نہیں پڑنا چاہیے، جو کہ قانون کا تقاضا ہے۔ لیکن بہرحال ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔" شیٹ نے پرسکون لہجے میں کہا۔

○☆○

ہائی وے کے کنارے مضافات کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ میکس نے یہ سوچ کر قدرے اطمینان کی سانس لی کہ کچھ دیر میں کلاس ایجلس کی گنجان آبادیاں پیچھے رہ جائیں گی اور دیہی علاقہ شروع ہو جائے گا۔ اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے اس نے جان بوجھ کر طویل راستہ چنا تھا کیونکہ اس پر ٹریفک کم ہوتا تھا۔ وہ راستے میں کہیں پھنسنے یا رکنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ طویل راستہ اختیار کرنے کے باوجود اسے امید تھی کہ وہ بروقت اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔

اب اسے کافی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا تھا لیکن ابھی وہ احساسِ طمانیت سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے بھی نہ پایا تھا کہ اس کی نظر اپنے بائیں طرف والے عقب نما آئینے پر پڑی اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ایک خاص قسم کی وین اس کے تعاقب میں چلی آرہی تھی۔ یہ کار نما وین تھی اور میکس اس قسم کی گاڑیوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

○☆○

شیٹ نے بغور کمپیوٹر اسکرین کا جائزہ لیا پھر کنسول پر بائیں نمبر دبایا اور مائیکروفون میں کہا "کار نمبر بائیس۔ لگتا ہے تم اس کے قریب پہنچ گئے ہو۔ رپورٹ دو۔ کیا اس نے تمہیں پہچان لیا ہے؟"

"ہاں۔ یقیناً" کار نمبر بائیس سے جواب ملا۔

"ٹھیک ہے۔ تو پھر اب اپنے آپ کو چھپانے کی ضرورت نہیں۔" شیٹ نے ہدایت کی "پوزیشن لے لو۔"

پھر اس نے مزید کچھ بٹن دبائے اور تیزی سے بولا "تمام یونٹس خبردار ہو جائیں۔ کار نمبر بائیس کو پہچان لیا گیا ہے۔ اب ہمیں اپنے ٹارگٹ کو شوٹ کرنے کے لیے اپنی اپنی پوزیشن پر آجانا چاہیے۔ برڈ نمبرون۔ تم صحیح پوزیشن پر پہنچ جاؤ اور اس طرح لائٹ ڈالو کہ ہمیں بھی اپنے ٹارگٹ کو شوٹ کرنے میں آسانی رہے۔ ایکشن کا وقت آگیا ہے۔ ہر آدمی ہوشیاری سے اپنا کام کرے۔"

جب تینوں گاڑیوں اور ہیلی کاپٹر کی طرف سے پیغام مل گیا کہ انہوں نے ہدایات سن لی تھیں تو شیٹ عرف کیپٹن کی پُرخیال انداز میں دوبارہ کمپیوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہوا جس پر روشن نقطے زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگے تھے۔

○☆○

میکس کو گاڑیاں نظر آنے سے پہلے ہی احساس ہو گیا کہ اسے گھیرا جا رہا تھا۔ اس معاملے میں اس کی چھٹی حس بہت تیز ہو چکی تھی۔ اس نے تھوک نگلنے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ اس کا گلا خشک ہو چکا تھا۔ پچھلی سیٹ سے اسے ایک بار پھر کراہ سنائی دی اور وہ خود کو کوس کر رہ گیا۔ منزل صرف تین چار میل دور رہ گئی تھی۔ اگر اسے صرف تین چار منٹ کی مہلت اور مل جاتی تو وہ ان لوگوں سے بچ نکل گیا ہوتا۔

اس نے رفتار بڑھا دی۔ اسپیڈ میٹر کی سوئی [illegible] ہندسے کو چھونے لگی۔ یہ رفتار مقررہ حد سے [illegible] اب اس نے اس کی فکر چھوڑ دی۔ اچانک ہیلی کاپٹر کی [illegible] لائٹس نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ وہ دوبارہ اس [illegible] پر آن پہنچا تھا۔ پھر اس نے دیکھا' ایک مخصوص کار نما وین اس کے دائیں طرف سے اور دوسری بائیں طرف سے قریب آرہی تھی۔ پیچھے دیکھنے [illegible] اسے اندازہ ہو گیا کہ ایک وین پیچھے بھی ہوگی۔ گویا اسے [illegible] طرف سے گھیرا جا رہا تھا۔ تاہم ابھی وہ گاڑیاں پیچھے تھیں جن میں [illegible] اور گاڑیاں حائل تھیں جس پر میکس نے دل ہی دل میں [illegible] کیا۔ وہ اب بھی انہیں ڈاج دینے کی کوشش کر سکتا تھا۔

اس نے جونہی اگلا موڑ کاٹا' اسے اپنی سانس [illegible] رکتی محسوس ہوئی۔ آگے ٹریفک جام نظر آرہا تھا۔ گاڑیوں کی سرخ ٹیل لائٹس اسے تیزی سے قریب آتی محسوس ہوئیں۔ اس نے پوری طاقت سے بریک لگایا۔ اس کی کار لڑکھڑاتی اور اگلی گاڑیوں سے بہ مشکل بچتی ہوئی ترچھی ہو کر سڑک کے کنارے جا رکی۔

اس نے گھبرا کر سب سے پہلے پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔ کمبل میں لپٹی ہوئی عورت پھٹی پھٹی آنکھوں سے [illegible] کی طرف دیکھ رہی تھی۔ حفاظتی بیلٹوں کی وجہ سے [illegible] سے گرنے سے محفوظ رہی تھی۔ اس کی طرف سے [illegible]



اور کر میکس نے آنکھیں سکیڑ کر شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ٹریفک کیوں رکا ہوا تھا۔ کافی آگے اسے ایمبولینسوں کی رنگین روشنیاں گردش کرتی دکھائی دیں۔ غالباً وہاں کوئی حادثہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ٹریفک رک گیا تھا۔

"خدا کی پناہ!" وہ بے اختیار کراہ کر رہ گیا "یہ بھی اسی وقت ہونا تھا۔"

○☆○

شیٹ کو ہیڈ فون میں اپنے ساتھیوں کے فاتحانہ سے نعرے سنائی دیے۔ وہ بہت خوش تھے کہ ٹریفک جام کی وجہ سے شکار ان کے نرغے میں پھنس گیا تھا۔ اب انہیں تیز رفتاری سے اس کے تعاقب میں گاڑیاں دوڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔

شیٹ عرف کیپٹن سی نے ہیلی کاپٹر کو ہدایت کی کہ وہ لائٹ بھرپور طریقے سے ڈالے پھر اس نے معنی خیز انداز میں گاڑیوں والوں کو پیغام دیا "تم سب کو صحیح زاویوں سے ٹھیک [illegible] لینے ہیں۔"

○☆○

میکس نے دیکھا' وہ لوگ اپنا اپنا سامان سنبھالے گاڑیوں سے کود رہے تھے۔ اس نے پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا' کمبل میں لپٹی ہوئی عورت کی آنکھیں ایک انجانے خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اسے بھی گویا یہ خوبی اندازہ تھا کہ اب کیا ہونے والا تھا۔ اس کی تکلیف بھی لمحہ بہ لمحہ [illegible] جا رہی تھی۔

میکس اس کی کیفیت کو بہ خوبی سمجھ سکتا تھا۔ اس کی حالت اس وقت درندوں میں گھرے ہوئے شکار کی سی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اچانک اس کے [illegible] کو امید کا سورج طلوع ہو گیا۔ اس نے دیکھا' ایک پولیس کار سڑک کے کنارے رینگتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی چھت پر بھی مخصوص روشنیاں گردش کر رہی تھیں۔ اس میں موجود پولیس آفیسرز صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے اور غالباً ٹریفک کو رواں کرنے کے اقدامات پر غور کر رہے تھے۔

میکس نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا۔ اس نے کار سے چھلانگ لگائی' اسے متقل کیا اور پولیس کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ گو کہ دوڑنا اس کے لیے ایک مشکل کام تھا لیکن اس وقت اس کی جان پر بنی ہوئی تھی اس لیے وہ خوب تیز دوڑ رہا تھا۔ پولیس والوں نے اسے دیکھ لیا اور گاڑی روک لی۔

میکس قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے بولا "خدا کے لیے میری مدد کرو۔ میں فلم ڈائریکٹر میکس رولینڈ ہوں۔ ہالی وڈ کی مشہور ترین فلم اسٹار مئے رولینڈ میری بیوی ہے۔ ہمارے ہاں کسی بھی لمحے بچے کی ولادت متوقع ہے۔ اور میں اپنی بیوی کو لے کر اسپتال جا رہا ہوں۔ لیکن فوٹو گرافرز ہمارے پیچھے لگ گئے ہیں جنہیں پاپا رازی کہا جاتا ہے۔ وہ بیبلی کاپٹر جو میری گاڑی پر تیز روشنی ڈال رہا ہے۔ وہ بھی انہی کا ہے۔ یہ لوگ اس فکر میں ہیں کہ ولادت گاڑی میں ہی ہو جائے اور یہ کسی طرح اس کی فلم بنا لیں۔ خدا کے لیے ہمیں ان سے بچاؤ۔"

"میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔" ایک پولیس آفیسر بولا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھیں۔"

وہ میکس کو گاڑی میں بٹھا کر واپس وہاں تک لائے جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس وقت تک چھ آدمی گاڑی کو گھیرے میں لے چکے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں کیمرے تھے۔ کوئی ونڈ اسکرین پر جھک کر تصویر بنانے کی کوشش کر رہا تھا' کوئی پچھلے شیشے پر لٹک کر اور کوئی کھڑکی پر کیمرا ٹکا کر۔

پولیس والوں نے اپنی کار کا سائرن آن کر دیا پھر وہ اپنے ریوالور تانے گاڑی سے کودے اور انہوں نے فوٹو گرافروں کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ انہوں نے جب اس حکم کی بھی پروا نہ کی تو پولیس والوں نے انہیں کالروں سے پکڑ پکڑ کر گھسیٹ کر دور پہنچایا اور میکس کو ہدایت کی کہ وہ گاڑی میں اپنی بیوی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھ جائے' گاڑی پولیس آفیسر ڈرائیو کرے گا اور وہ لوگ اپنی معیت میں اسے اسپتال تک پہنچا دیں گے۔

چند لمحے بعد میکس کی گاڑی اس طرح روانہ ہوئی کہ پولیس کی ایک گاڑی سائرن بجاتی اس کے آگے تھی اور مزید ایک گاڑی بھی آن پہنچی تھی جو اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ اس کا بھی سائرن بج رہا تھا اور چھت پر رنگین روشنیاں گردش کر رہی تھیں۔ میکس کی گاڑی پولیس آفیسر ڈرائیو کر رہا تھا۔ تمام پولیس والوں کے ریوالور ان کے ہاتھوں میں تھے۔

تمام فوٹو گرافرز وہیں کھڑے ہاتھ ملتے اور پاؤں پٹختے رہ گئے۔ سب سے زیادہ افسوس شیٹ کو تھا۔ وہ فوٹو گرافروں کی رہنمائی کرنے اور اہم مواقع کی تصویروں کا لاکھوں ڈالر میں سودا کرنے میں ماہر تھا۔ اسی لیے اس کے ساتھی اسے "کیپٹن کیش" یا مختصراً کیپٹن سی کہتے تھے۔ لیڈی ڈائنا کی نیم عریاں اور پھر اس کی حادثاتی موت کی تصویریں بھی اسی نے بنائی تھیں۔ وہ سب بہت دیر تک وہاں کھڑے شکار ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس کرتے رہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

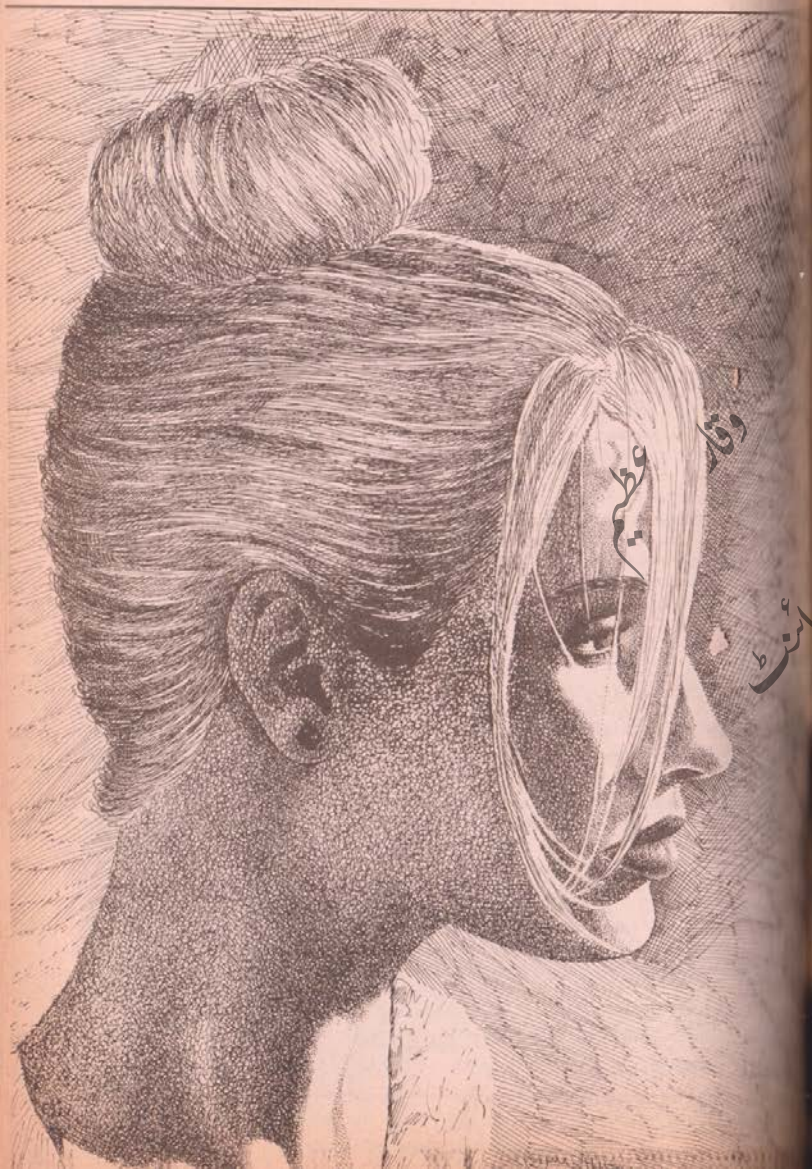

# اقلیم علیم

ایک نوجوان کی خود نوشت۔ اس پر دنیا کی منفی طاقتوں کے عالمی ایجنڈے کے خلاف وہ ذاتی طور پر برسرِ محاذ کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد کیا کچھ ہوا۔ اس کی ایک دلچسپ داستان

سسپنس کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ۔ اللہ کا فضل اور ہر قسط میں کوہ قاف والوں کی تصویریں

## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

لاہور میں جائے پیدائش ہے۔ والد صاحب کی وفات اور سوتیلی ماں کے مظالم پر میں نے گھر اور شہر چھوڑ کر کراچی میں پناہ لی تو یہاں جاگیر، داؤد اور بادر سے میری دوستی ہوئی اور ہم چاروں بے روزگاری سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں منشیات فروشوں کی ایک بھیانک عالمی تنظیم ٹی کے پنجے چنگ گئے۔ ان لوگوں نے مقامی معاشرے کو بھی اپنی دہشت کے شکنجے میں کس رکھا۔ جگن پیدا کرکے پاکستان کو نشے کی لعنت میں مبتلا رکھنے کے لیے پاکستان میں چرس ک

کی بیماریوں کا آغاز ہوا اور وہ ایڈز (AIDS) اور امریکی حکومت کے مابین ہونے والے خفیہ معاہدے کیے کے افشا ہونے کے باعث امریکیوں کی نظر میں مشکوک ٹھہرا۔ اپنے مشن کی کامیابی کے بعد ہم پاکستان واپس پہنچے' یہاں مدتوں سے کیل کانٹے سے لیس انتظار میں بیٹھی ہوئی راجدھانی کا نام سنتے ہی' اپنی سیاسی حیثیت کے باعث وہ ہمارے لیے آسان شکار ثابت نہیں ہوا اور ہمارے ہاتھوں سے مچھلی کی طرح پھسلنے کے بعد اسلام آباد پہنچا' مگر اس کے ستارے گردش میں آچکے تھے اور وہاں کراچی لایا گیا اور وہ بھی تجسس کے نیچے میں امریکی ایجنٹوں سمیت ہم سے واصل ہوا۔ اب ہمارے سامنے امریکی تو خصلیت کا ملازم اور ایرانی ذہنی منٹ تھا۔ میں اس سے امریکن گرین کارڈ کے لالچی جمال دستی کے روپ میں ایس ٹی ایف کے نمائندے کی حیثیت سے ملا اور اسے یقین دلایا کہ میں ذہنی کو تلاش کرنے اس کے حوالے کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔ وہ دو سرے امریکیوں کے مقابلے میں قدرے مشکل ثابت ہوا تھا' اس نے میرے اور اول خان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہونے کی خبر کی۔ اس کی یہ دعویٰ ہوائی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے اول خان نے حکام سے بات کی اور انہوں نے فیصلہ ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا۔ میں نے ابھی سے رابطہ کیا مگر وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا' اس نے مجھے ایڈین تو قصلیت کے بیجر شمی کے سپرد کر دیا۔ جس نے مجھے دھمن رابع سے بھی متعارف کرادیا۔ بیجر شمی گرفتار جمال دستی کا فنی ماضی جانتا چاہتا تھا اس پکڑ میں اس نے مجھے اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی' اس لیے اس کی دل جوئی کے لیے جلد ہی گھر کا رخ کرنا چاہیے تھا۔

وہ اپنے معمول کے برعکس' اس محفل سے جلد ہی اٹھ گیا۔

روی اس شام کی حسین یادوں کے بارے میں سوچتا ہوا' اولڈ کلفٹن کے رہائشی علاقے میں واقع اپنے گھر پہنچا تو بھانک سے گاڑی اندر لے جاتے ہوئے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ گھر کا ماحول سازگار نہیں تھا۔

روشن برآمدے میں اس کا بڑا بھائی خراب تیوروں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ وہ شاید روی کی گاڑی کا ہارن سن کر برآمدے میں آیا تھا اور دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھے' اس کا منتظر تھا۔ اس کی تیزی سے پھولتی اور پچکتی ہوئی توند سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ غصے کی شدت سے ہانپ رہا تھا۔ روی کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اس نے جگدیش کو اتنے بگڑے ہوئے موڈ میں کم ہی دیکھا تھا۔

وہ سعادت مندانہ انداز میں سر جھکا کر اپنی گاڑی سے اترا اور ڈرائنگ روم کے سامنے' برآمدے میں کھڑے ہوئے جگدیش کو نظر انداز کر کے بغلی راستے کی طرف بڑھا لیکن جگدیش کی قہر آواز نے اسے اپنا رخ بدلنے پر مجبور کر دیا۔

"جی' بھایا جی!" اس نے پلٹ کر ادب اور خلوص سے کہا اور اپنے بڑے بھائی کی طرف ہو لیا۔

جگدیش نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو اس کے قریب پہنچنے کا انتظار کیے بغیر مڑ کر ڈرائنگ روم کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف چل دیا۔ اس وقت اس کی چال ڈھال تک سے برہمی کا اظہار ہو رہا تھا۔

روی موہن اپنے بڑے بھائی کے رویے سے ذرا سہما' اس کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی موٹی اور بدشکل بھاوج پہلے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

روی نے وہ منظر دیکھا تو اس کا سارا غصہ ہرن ہو گیا۔ دوستوں کے ساتھ گزارے ہوئے پر تعیش وقت کا احساس ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں تہ نشین ہو گیا۔ اس کے دماغ پر صرف بھایا جی اور اس کی بیوی کا تسلط باقی رہ گیا۔

ان واقعات کی دھند صاف ہوئی اور ہماری طرف سے اشارہ ملنے کے بعد وہ گھر آیا تو کرشن کمار کا قصہ پاک ہو چکا تھا لیکن اول خان کے سر پر ہری چند کی تلاش کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اس کی نشان دہی روی اور ماروتی ہی کر سکتے تھے۔ یوں روی کو فرصت کی چند گھڑیاں ملنے سے پہلے ہی ایک نیا چکر شروع ہو گیا اور اسے ہمارے ساتھ ایک سفر پر روانہ ہونا پڑا۔

ہری چند کی زندگی کی ڈور ہمارے ہی ہاتھوں منقطع ہوئی مگر وہ اس سے پہلے مکافاتِ عمل کا شکار ہو کر ایک خوف ناک حادثے سے دوچار ہو گیا۔ وہ ماروتی کا اکلوتا ماموں زاد بھائی تھا اور اسے بہت عزیز تھا۔ روی اپنی حسین اور چہیتی بیوی کی نظروں میں بُرا نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس نے حیدر آباد کے مضافات سے واپسی پر ماروتی کو ایک الگ ہی کہانی سنائی اور اسے بتایا کہ ہری چند ایک ٹریفک حادثے میں اس بری طرح زخمی ہوا تھا کہ حیدر آباد میں کسی قسم کی طبی امداد ملنے سے پہلے چل بسا۔

اس نے اپنے گھر سے فون کر کے مجھے اپنے اس جھوٹ سے آگاہ کیا۔ وہ ماروتی کے سامنے اپنی سرخ روئی کے لیے مجھ سے صرف اتنے تعاون کا طلب گار تھا کہ میں ماروتی سے اگلی ملاقات میں روی کے جھوٹ کی تائید کروں۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست تھی کہ ہری چند ایک حادثے میں بری طرح زخمی ہوا اور پھر جہنم واصل ہو گیا۔ اس درمیان میں اس کے ساتھ کیا کچھ ہوا' مجھے اس کے بارے میں اپنی زبان بند رکھنی تھی۔ میں نے روی کی کہانی کی تصدیق کرنے کا وعدہ کر لیا۔

وہ روی کے ذہن پر آخری بوجھ تھا۔ اس سے نجات ملتے ہی اسے یہ بیک احساس ہوا کہ اس کی گذشتہ شامیں روحی پھیکی اور بے جان گزر رہی تھیں۔ اس نے چند دوستوں کو فون کیے اور آزردہ خاطر ماروتی کو اپنے مرے ہوئے ماموں زاد بھائی کا سوگ منانے کے لیے گھر میں چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ وہ جلد از جلد اور ہر قیمت پر اپنے بے فکرے دوستوں کے ساتھ مل بیٹھنے کے لیے بے چین تھا۔

روی اور اس کے سارے دوست بے راہ روی میں مبتلا تھے۔ ان کی محفلوں میں شراب کے دور چلتے تھے' شہر کی دل ربا اور بدنام لڑکیاں ان محفلوں کے مخمور شرکا کو اپنے ناز و انداز سے مسحور کر کے ان کی جیبیں خالی کراتی تھیں۔ شہر کے گلے ہوئے رئیس زادے نہ صرف ان پر پیسا لٹاتے تھے بلکہ ہوئے میں بھی دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔

روی نے اس شام دل کھول کر اپنی چند روز کی محرومیوں کا حساب چکایا اور رات کا اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے وہ اس شام کی ساری رنگینیاں اپنے دامن میں سمیٹ کر آسودہ ہو چکا تھا۔

اس کے معدے میں الکحل کی خاصی مقدار پہنچ چکی تھی مگر وہ بلانوش تھا۔ چڑھتے ہوئے خون کی گرمی' شراب کے تیز نشے کو اس کے حواس پر اثر انداز نہیں ہونے دیتی تھی۔ اپنی نشہ آرزوؤں کی تکمیل کے بعد اسے دھیان آیا کہ اس شام اس کی بیوی اپنے ماموں زاد کی موت پر سوگوار بیٹھی تھی اور اسے اس کی دل جوئی کے لیے جلد ہی گھر کا رخ کرنا چاہیے تھا۔



**روی موہن بارباش اور رنگین مزاج آدمی تھا جس کی بیشتر شامیں محفل آرائیوں میں گزرتی تھیں لیکن جب سے ہم کرشن کمار کی تلاش کے سلسلے میں اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے' اس کے سارے معمولات درہم برہم ہو کر رہ گئے تھے۔ گھر سے فرار اور ہم لوگوں کے خوف سے روپوشی کے دوران میں وہ بالکل اکیلا ہو کر رہ گیا تھا۔**

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"بھا... بھایا جی! کیا ہوگیا؟ خیریت تو ہے؟" روی نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

جگدیش بڑھتے بڑھتے' اچانک رک کر روی کی طرف پلٹ پڑا۔ روی رکتے رکتے بھی اپنے بڑے بھائی کے روبہ رو جا پہنچا۔

"پوچھتا ہے کیا ہوا؟" جگدیش آنکھیں نکال کر دبی دبی آواز میں غرایا "یہ پوچھ کہ آج کیا نہیں ہوا۔"

روی کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس کی استفسار طلب نگاہیں اپنی بے ڈول بھاوج کے ہراساں چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں خوف' تشویش اور بے یقینی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ روی کے وجود میں اترتی ہوئی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں وہ بے بسی سے نفی میں اپنا سر ہلا کر رہ گئی۔ روی کو یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دشواری پیش نہ آئی کہ وہ بے چاری اپنے شوہر کی برہمی پر خود پریشان تھی۔ گھر میں پائی جانے والی کشیدگی کا جو بھی سبب تھا' وہ صرف اور صرف بھایا جی کے علم میں تھا۔

وہ روی کے ساتھ جس انداز میں پیش آیا تھا' اس سے یہ ضرور ظاہر ہو رہا تھا کہ اس گڑبڑ میں کہیں نہ کہیں اور کچھ نہ کچھ ماروتی کا بھی حصہ تھا۔ وہ بھایا جی کی کھوپڑی میں بھرے ہوئے بھس میں چنگاری ڈال کر خود کہیں غائب تھی۔

"بھایا جی! میں ابھی ابھی' تمہارے سامنے باہر سے آیا ہوں۔" روی نے لجلجاتی ہوئی آواز میں کہا "مجھے کیسے علم ہوا سکتا ہے کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ تم بتاؤ گے تو معلوم ہوگا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔"

بھایا جی نے غصے میں اس کے سینے پر دو ہتڑ مار کر اسے پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کردیا اور دبی دبی' غراتی ہوئی آواز میں بولا "مجھ سے دور رہ کربات کر۔ تیرے منہ سے شراب کی بو آرہی ہے۔ ہر وقت نشے میں دھت رہتا ہے۔ تو جانتا ہے کہ تیری بیوی کے کیا کرتوت ہیں؟"

روی کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا اندیشہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ بھایا جی کی زبان پر آخر کار ماروتی کا نام آہی گیا۔ اس نے نیم مردہ آواز میں پوچھا "کیا آج پھر ماروتی نے کسی کے ساتھ بدتمیزی کی ہے؟"

"بدتمیزی!" جگدیش کی آواز غصیلی اور تحقیر آمیز مگر نیچی تھی "تیری جورو نے ہم سب کے منہ کالے کردیے۔ ہمارے پرکھوں کی ہڈیوں پر پیشاب کردیا اور تو اس کی بدتمیزی کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔"

اس بار بھایا جی کے عائد کیے ہوئے الزامات سنگین تھے' اس کے الفاظ ہتک آمیز تھے۔ روی سے نہ رہا گیا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی کی بات کاٹ کر درمیان میں پوچھا "کچھ بتاؤ گے یا یوں ہی پہیلیاں بجھواتے رہو گے۔"

"ہماری عزت خاک میں مل گئی' ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔" فرط جذبات سے بھایا جی کی آواز رندھنے لگی "میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے' میں انگاروں پر لوٹ رہا ہوں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ میں اپنی ذلت اور رسوائی کی کہانی خود دہرا سکوں۔ لے پڑھ لے۔ اس میں جو کچھ لکھا ہے' جا کر ماروتی سے پوچھ کہ اس میں کوئی بات جھوٹ تو نہیں ہے۔ اس نے یہ باتیں خود مجھے بتائی ہیں۔ وہ تجھ سے بھی انکار نہیں کرے گی۔ اگر تو موہن رام کا خلف ہے' تجھے اپنے بڑوں کی عزت کا ذرا سا بھی پاس ہے تو جا اور جا کر اس گستاخی کو گولی مار دے۔"

وہ اندر سے واقعی کھول رہا تھا۔ بولتے ہوئے اس کے دہانے کے گوشے پر ہلکا سا کف آگیا۔ اس نے اپنی جیب سے تہ کیا ہوا ایک کاغذ نکال کر' ایک جھٹکے سے روی کی طرف بڑھا دیا۔

جگدیش کی باتیں مبہم تھیں لیکن ان میں پوشیدہ مفہوم بہت واضح تھا۔ روی نے اپنے بڑے بھائی کے ہاتھ سے تہ کیا ہوا کاغذ لیا تو خود اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو نہ رکھ سکا۔

اس کاغذ پر جگدیش کی شکستہ تحریر میں ماروتی کے انتقام کی ہوش ربا کہانی نقش تھی۔ اس نے اپنے [illegible] زبانی کا عملی انتقام تو اسی وقت لے لیا تھا جب اس نے کرشنا کی نشان دہی کے بدلے میں مجھے ایک ہوٹل کی خلوت میں [illegible] سے ملنے پر مجبور کردیا تھا مگر اس کا وہ انتقام ادھورا تھا۔ جگدیش کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو سکا تھا کہ حسین و جمیل ماروتی' رات کے اندھیرے میں اپنے گھر سے فرار ہو کر کہاں گئی تھی اور کس کو اپنی دریا دلی سے فیض یاب کرنے کے بعد واپس لوٹی تھی۔

اس نے روی کے گھر سے چلے جانے کے بعد انٹر کام پر جگدیش کو وہ سب سنا کر اپنا انتقام مکمل کرلیا تھا۔ جگدیش واقعی انگاروں پر لوٹ رہا تھا اور ماروتی شاید [illegible] اوپر والی منزل پر آرام کر رہی تھی۔

جگدیش کی تحریر میں سب کچھ وہی تھا جو ماروتی کے طے کیے ہوئے منصوبے کے تحت رونما ہوا تھا۔ بس اس میں کسی کا نام نہیں تھا۔ ماروتی نے اپنے بھایا جی سے صرف ایک مسلمان کا ذکر کیا تھا۔

روی کو وہ سب پڑھتے ہوئے' اپنی نگاہوں کے سامنے گھٹتے بڑھتے ہوئے دائرے چکراتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اسے یقین نہیں تھا کہ جگدیش نے ماروتی کی سنائی ہوئی کہانی قلم بند کی تھی۔ ماروتی اتنی بگڑی ہوئی نہیں تھی' وہ ایسی ہو ہی نہیں سکتی تھی!

روی نے تحریر پڑھنے کے بعد کاغذ کو پرزوں میں تبدیل



کرنا شروع کردیا۔ اس کی بھاوج نے مضطربانہ انداز میں اپنی جگہ چھوڑ دی۔

اس وقت تک بھایا جی کی بیوی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے شوہر کے اشتعال کا کیا سبب ہے۔ جگدیش نے جن نفرانی کلمات کے ساتھ' اپنا لکھا ہوا پرچہ روی کو دیا تھا ان کی بنا پر اس کے دل میں تجسس پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ وہ ایک عورت تھی اور یہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کے شوہر نے ماروتی کے بارے میں کیا کچھ لکھا تھا۔

"روی... روی!" وہ فضا میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولی "یہ کیا کر رہے ہو... کاغذ مت پھاڑو!"

"بھابی! یہ کاغذ نہیں' گندی گالی ہے جو بھایا جی نے ماروتی کو دی ہے۔" روی کی آواز میں یک لخت تلخی عود کر آئی۔ شاید اس لیے کہ اس بار وہ اپنے آمر بھائی سے نہیں بلکہ اس کی بیوی سے مخاطب تھا۔

"گندی گالی!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ لہجہ بے [illegible] گیا۔

"یہ فل نہیں' سچ مچ صرف سچ ہے۔" جگدیش نے درشت مگر دھیمی آواز میں [illegible] میری بات کا یقین نہ ہو تو اوپر جا اور اپنی چہیتی سے پوچھ... [illegible] بے غیرت نے مزے لے لے کر ساری باتیں مجھے بتائی ہیں۔"

روی نے اپنے پھاڑے ہوئے کاغذ کے پرزے قالین یا فرش پر بکھیرنے کے بجائے اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے جواب دیا "میں جب تک ماروتی سے بات نہ کرلوں' میں کسی بات پر یقین نہیں کرسکتا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک گھر اور ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کیسی کیسی کدورتیں پروان چڑھ رہی ہیں۔"

وہ تینوں آپس میں الجھ رہے تھے۔ الزام تراشیاں کر رہے تھے اور بحث کر رہے تھے مگر ان کی آوازیں دھیمی تھیں۔ تینوں کو احساس تھا کہ معاملہ ان کے گھرانے کی عزت کا تھا۔ بات نکل کر ملازموں کے کانوں میں پڑ جاتی تو وہ بھی کو منہ دکھانے کے..... قابل نہ رہتے۔

"روی! تو دو ٹکے کی عورت کے لیے میرے منہ آرہا ہے..." جگدیش کا وہ فقرہ ادھورا رہ گیا۔

روی نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی "وہ دو ٹکے کی عورت نہیں' میری بیوی ہے' بھایا جی!"

"میرے منہ نہ لگ۔" جگدیش اپنی مٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر نیچی مگر تیز آواز میں بولا "جا کر اس سے پوچھ لے کہ میں نے کتنا جھوٹ لکھا ہے۔ پندرہ منٹ میں تو نے اسے گولی نہ ماری تو پھر وہ ہوگا جو تیرے تصور میں بھی نہیں آسکتا۔"

"میں بلاوجہ اس کا خون اپنے سر نہیں لوں گا۔" روی کا لہجہ فیصلہ کن ہوگیا "اول تو یہ سب جھوٹ ہے۔ اگر یہ سچ ہے تب بھی ہری چند کی طرح ماروتی کا انجام اس کا پیچھا کرے گا۔ میں نے پچھلے دن بہت خوف اور دہشت میں گزارے ہیں۔ مجھے آزادی کی زندگی کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو چکا ہے۔ میں جذبات کے ریلے میں آکر کوئی غلطی نہیں کروں گا۔"

"مجھے بھی تو کچھ بتاؤ کہ اس چڑیل نے کیا کیا ہے۔" جگدیش کی بیوی نے قریب آکر اپنے شوہر کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے فریاد کی "میں اپنے ہاتھ سے اس کی ناک چوٹی کاٹ لوں گی۔"

"الگ ہٹ!" جگدیش نے حقارت سے اپنی بیوی کو جھڑک کر دور دھکیل دیا "ماروتی کی باتوں نے عورت ذات پر سے میرا اعتبار تس نہس کرکے رکھ دیا ہے۔ تو کہیں کی چوہدرانی نہیں ہے۔"

"بھایا جی!" روی نے زندگی میں پہلی بار اپنے بھائی کو کڑی نظروں سے گھورا اور خوف ناک لہجے میں کہا "تم نے میرے کلیجے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ آج اس گھر میں کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔"

"مجھے دھمکانے کی ضرورت نہیں۔" جگدیش نے اس پر آنکھیں نکالیں "میں تیری طرح بزدل نہیں ہوں۔ گھڑی دیکھ لے' اگر پندرہ منٹ میں اوپر سے گولی چلنے کی آواز نہ آئی تو تو زندگی بھر سر پکڑ کر روئے گا۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔"

روی نے خوں خوار نظروں سے بھایا جی کی طرف دیکھا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

وہ اوپر پہنچا تو ماروتی حریری لباس پہنے' مسہری پر دراز تھی۔ اس کے غمگین چہرے اور قدرے متورم آنکھوں پر نگاہ پڑتے ہی روی کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ اپنے اکلوتے ماموں زاد بھائی کی ناگہانی موت کے صدمے سے نڈھال تھی اور بھایا جی اس پر الزام تراشی کر رہے تھے۔

وہ جو کچھ سوچتا ہوا اوپر گیا تھا' وہ سب اس کے ذہن سے نکل گیا۔ ماروتی کوئی اناڑی لڑکی نہیں' ایک جہاں دیدہ عورت تھی۔ روی کی بدحواسی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی اور وہ پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گئی "کیا بات ہے روی؟ تم کچھ الجھے الجھے اور پریشان نظر آرہے ہو۔"

"کک... کچھ نہیں... دراصل بھایا جی کے دماغ پر کچھ سنک سوار ہے۔" ماروتی کی معصومانہ ہمدردی نے روی کو اندر سے بالکل پگھلا کر رکھ دیا۔ اس بوکھلاہٹ میں اسے بھایا جی کے رقعے میں لکھا ہوا بس ایک فقرہ ہی یاد رہ سکا اور اس

نے سنبھل کر ماروتی سے پوچھا "بھایا جی سے مسلمانوں کی چار شادیوں کے بارے میں تمہاری کیا بات ہوئی تھی؟"

ماروتی کے ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ تیر گئی۔ مجھے پوری بات یاد نہیں۔ شاید بھایا جی نے کچھ پوچھا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ مسلمان چار عورتوں کو خوش رکھ سکتے ہیں اس لیے چار شادیاں کرتے ہیں۔ دنیا کے بہتیرے مرد تو ایک ہی بیوی کا بوجھ ڈھو ڈھو کر گدھے کی طرح ہانپنے لگتے ہیں۔ کیا انہیں میری یہ بات بری لگ گئی؟ میں نے انہیں تو کچھ نہیں کہا تھا۔"

روی اس کے ساتھ ہی مسہری پر بیٹھ گیا اور ناصحانہ لہجے میں بولا "تمہیں معلوم ہے کہ بھایا جی تم سے جلتے ہیں۔۔۔ اپنے اوپر بڑا پن سوار کر کے وہ کچھ جھکی بھی ہو گئے ہیں۔ ان سے ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔ نہ جانے انہیں کب کیا بات بری لگ جائے۔"

"آئندہ میں اور زیادہ احتیاط کروں گی۔" ماروتی نے پیار سے اپنی بانہیں روی کے گلے میں ڈال دیں۔

وہ نچلی منزل پر اپنے بھائی کے سامنے تھا تو اسے وہاں نفرت اور حقارت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ماروتی کے پاس اس کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ اس کے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ بھایا جی کے الزامات کے بارے میں یاد دہانی پر کوئی جرح کر کے اس کے تازہ زخم پر نمک پاشی کرے۔ وہ اپنے بڑے بھائی کی فطرت سے واقف تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ خود جھک کر خود ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

جگدیش کے جارحانہ تیوروں نے روی کے پیٹ میں پڑی ہوئی شراب کے اثرات کو وقتی طور پر معطل کر دیا تھا۔ ماروتی کے پیار نے اسے تحریک دی اور روی نے بھایا جی کو بھول جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

روی کو ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ اس شام بھایا جی کی انا صرف مجروح نہیں ہوئی تھی، لہولہان ہو کر رہ گئی تھی۔ خاندانی عزت، شرف اور وقار پر اس کا گھمنڈ ٹوٹ گیا تھا۔ ماروتی اس کی لگائی ہوئی ہر چوٹ کو سنار کی چوٹ سمجھ کر ایک مدت سے سہہ رہی تھی۔ موقع ملتے ہی اس نے بھایا جی پر لوہار والی ایک زبردست ضرب لگائی تھی جس نے اسے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

وقت بہت دھیمے دھیمے اور غیر محسوس انداز میں سرکتا رہا۔ روی اپنی ماروتی کے ساتھ ہنستا کھیلتا رہا پھر اچانک زیریں منزل سے گولی چلنے کا ہولناک دھماکا سنائی دیا۔ اسی کے ساتھ ایک کربناک چیخ گونجی۔

وہ اس گھر کے لیے عجیب رات تھی۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ روی کی نظریں بے اختیار دیوار گیر گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ اسے یاد آیا کہ وہ ٹھیک پندرہ منٹ پہلے اوپر آیا تھا۔

اس کے ذہن میں آندھی کا سا ایک بگولا اٹھا، پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔ اس کی نگاہوں میں بھایا جی کا مشتعل چہرہ مجسم ہونے لگا۔ وہ ماروتی کو چھوڑ کر اندھا دھند زینوں کی طرف بھاگا۔

نیچے سے اس کی بھاوج کے بین کی کریہہ آوازوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ کئی کئی زینے پھلانگتا ہوا، بدحواسی کے عالم میں نیچے پہنچا تو بھایا جی کی لاش قالین پر چت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے اپنی کنپٹی میں گولی مار کر خودکشی کر لی تھی۔

جگدیش کی بیوی جنون کے عالم میں کبھی اپنے آپ کو اور کبھی اپنے شوہر کے بدن کو نوچ رہی تھی اور سینہ پیٹ پیٹ کر روتی اور چیختی جا رہی تھی۔ وہ دل کھول کر روی اور ماروتی کو کوس رہی تھی۔

وہ اوپر گیا تو وہ موٹی اور بھدی عورت بھایا جی کی بیوی تھی۔ پندرہ منٹ بعد نیچے آیا تو وہ بیوہ ہو چکی تھی۔ روی نے نظر انداز کر کے اپنے بھائی کی نبض ٹٹولی، دل کی دھڑکن دیکھی اور مایوس ہو کر اٹھ گیا۔

بھایا جی کی آخری چیخ ایسی بھیانک اور دل دوز تھی کہ گھر میں موجود ہر فرد وہاں پہنچ چکا تھا۔ ان ہی کے درمیان ماروتی بھی تھی جو اپنے چہرے سے سب سے زیادہ سوگوار اور غمگین نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے باریک لباس پر ایک بڑی سی چادر اوڑھ لی تھی۔

روی کے نزدیک اس بے چاری کا غم دہرا تھا۔ پچھلی رات وہ اپنے ماموں زاد بھائی کی موت کا صدمہ جھیل چکی ں اور دن پورا ہونے سے پہلے اس کا جیٹھ اپنی زندگی کا خاتمہ کر چکا تھا۔ ایک دن میں اپنے دو پیاروں سے محرومی کسی کے لیے بھی جاں گسل ہو سکتی تھی۔

گھر میں گولی چلی تھی اور بھایا جی نے واضح طور پر خودکشی کی تھی۔ روی کی نظروں میں پولیس والوں کی وردیاں اور ہتھکڑیاں گھومنے لگیں۔ اسے خوف تھا کہ واقعے کی تفتیش کے لیے پولیس موہن ہاؤس پہنچے گی تو وہ ضرور کسی نئی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔

فرار کا نتیجہ وہ پچھلے چند دنوں میں بھگت چکا تھا۔ پناہ کے لیے اس کے پاس ہمارے سوا کوئی راہ نہیں تھی۔ وہ سب کو چھوڑ چھاڑ کر بہت تیزی سے اوپر گیا اور پھر اس نے ہمارے گھر کا نمبر ملایا۔

وہ اظہر یا مظہر سے بات کرنے کا خواہاں تھا مگر وہاں صرف سلطان شاہ تھا۔ اس نے سلطان شاہ کو کچھ بتانے سے

صاف انکار کردیا۔ سلطان شاہ کی طرف سے پیغام ملنے کے بعد میں نے اس سے رابطہ کیا تو وہ پھٹ پڑا اور رکے بغیر بہت کچھ بتاتا چلا گیا۔ جو رہ گیا تھا' وہ میں نے موہن ہاؤس پہنچنے کے بعد اس کی زبان سے سن لیا۔ وہ مجھ سے لان پر باتیں کرتا رہا۔ اول خان پہنچا تو وہ ہم دونوں کو اپنے ساتھ اوپر والی منزل پر لے گیا۔

روی اس وقت بھی مصر تھا کہ اس کے بھائی کی الزام تراشی کے بارے میں ماروتی سے کوئی بات نہ کی جائے۔

"مظہر جی! تم خود گواہ ہو کہ اس روز ماروتی میری معافی کے بارے میں تم سے ملنے اور باتیں طے کرنے کے لیے ہوٹل گئی تھی۔" روی بہت جذباتی انداز میں مجھ سے کہہ رہا تھا "بھایا جی کو سر پر کا کچھ علم نہیں تھا۔ بس انہوں نے ماروتی پر الزام لگادیا۔"

"تم بتا رہے ہو کہ بھایا جی نے لکھا تھا کہ وہ باتیں ماروتی نے خود اسے انٹرکام پر بتائی تھیں۔" اول خان نے کمزور لہجے میں نشان دہی کی۔ میری فون کال کے نتیجے میں وہ پولیس کی آمد سے پہلے موہن ہاؤس پہنچ چکا تھا۔ میں نے روی کے گھر سے ذرا دور اتر کر غزالہ کو گاڑی سمیت گھر کی طرف روانہ کردیا کیونکہ اس کا غیر ضروری طور پر کسی کی نظروں میں آنا مناسب نہیں تھا۔

"میں ماروتی کو یہ سب بتانا بھی شرمناک سمجھتا ہوں۔" روی نے زور دے کر کہا "بھایا جی کو میری اور اس کی شادی پسند نہیں تھی۔ وہ اس سے جلتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں سرحد پار بھاگنے کے بجائے ان کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے دوبارہ گھر میں آگیا ہوں تو انہوں نے مایوس ہوکر ہم دونوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لیے ایک نیا سوانگ تیار کرلیا۔"

"آپنے سگے بھائی کی موت کو تم سوانگ قرار دے رہے ہو؟" اول خان بے ساختہ بولا۔

"ان کی موت تو ایک اٹل حقیقت ہے۔ سوانگ الزام تراشی کا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں اوپر جاکر نشے میں ماروتی کو شوٹ کردوں گا اور پھر اس کے قتل کے الزام میں سولی پر چڑھ جاؤں گا۔ ان میں سے کچھ بھی نہ ہوا۔ بس' میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ بھایا جی سٹھیا گئے تھے۔ ان کا آخری حربہ ناکام ہوا تو ان کی عقل ماؤف ہوگئی۔ ہم دونوں سے اپنی جان نہ چھوٹتے دیکھ کر انہوں نے مایوسی میں خود کو مار لیا جو گڑھا وہ میرے لیے کھود رہے تھے' اس میں خود ہی جا گرے۔ اب یہ بات تم ہی پولیس والوں کو سمجھا سکو گے۔"

یہ اندازہ مجھے بھی ہوچکا تھا کہ جگدیش کی خودکشی کا معاملہ پولیس کیس تھا۔ مقامی پولیس کی بے رحمانہ تفتیش سے نمٹنا میرے بس سے باہر تھا کیونکہ میرے پاس کوئی ایسی شناخت نہیں تھی جس کی بنا پر میں ان کی کسی کارروائی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا۔ وہ شعبدہ اول خان یا اس کا کوئی ماتحت دکھا سکتا تھا۔ میں نے وہ سب بھانپتے ہوئے اسے جلد از جلد موہن ہاؤس پہنچنے کے لیے کہا تھا اور وہ میری توقع سے پہلے وہاں آگیا۔

"معاملہ ذرا سنگین ہے۔" اول خان نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم مرتے تو جگدیش مشکوک قرار پاتا۔ اس کی خودکشی کے بعد سب کچھ تمہارا ہوجائے گا اس لیے اب تم پر شبہ کیا جائے گا۔ خطرناک بات یہ ہے کہ تمہاری بھاوج' جگدیش کے لکھے ہوئے پرچے کی بات اچھالے گی۔"

"وہ کچھ نہیں جانتی کہ اس میں کیا لکھا ہوا تھا۔" روی نے جلدی سے وضاحت کی "اظہر جی! میں نے وہ خطرناک کاغذ' پڑھتے ہی پھاڑ ڈالا تھا۔ میں کہہ دوں گا کہ میں نے اسے کوڑے میں بہادیا۔ ہم دونوں بھائیوں کی ساری باتیں اشاروں کنایوں میں ہوئی تھیں۔"

"میں نے تمہاری بھاوج کو دیکھا ہے۔" میں نے زبان کھولی "وہ اتنی سیدھی نہیں ہے کہ عزت اور موت کے حوالوں کے باوجود بات نہ سمجھی ہو۔"

"نہیں' نہیں۔۔۔ مظہر بھائی! اس کے بھائی سے گہرے تعلقات ہیں۔ اس کا آدمی حرام موت مرا ہے۔ وہ کسی نہ کسی کو تو الزام ڈالے گی۔ وہ جو کچھ سمجھتی ہے' سمجھتی رہے۔ ثبوت کہاں سے لائے گی؟ تم کہو تو میں کاغذ سے ہی مکر جاؤں گا۔ کیسا کاغذ؟ کہاں کا کاغذ؟ اس کے پرزے میری جیب میں ہیں۔ وہ میں ابھی چولھے پر ڈال کر ذرا سی دیر میں جلائے دیتا ہوں۔" وہ اپنی حرکت کے لیے سب کچھ کرگزرنے پر تلا ہوا تھا۔

"اگر ماروتی کے منہ سے کوئی ہلکی سی بھی بات نکل گئی تو کیا بنے گا؟" اول خان نے پوچھا۔

"وہ بے چاری تو اپنے کمرے میں لیٹی' ہری چٹنی رو رہی تھی۔" روی نے اپنی بیوی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا "اس کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ نیچے کیا ہو رہا تھا۔ وہ کوئی غلط بات کہہ ہی نہیں سکتی۔ ہم ایک گھر میں اوپر نیچے رہتے ہیں۔ دن بھر میں بیسیوں دفعہ انٹرکام پر بات ہوتی ہے۔ بولنے اور سننے والے کے سوا تیسرے کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا باتیں ہوئی ہیں۔ جب کہ تم دونوں میرے ساتھ ہو' میری بھاوج کی باتوں پر کوئی کان نہیں دھرے گا۔"

"ہم دونوں تمہارے ساتھ ہیں۔" اول خان نے نرمی سے کہا "لیکن یہ ساتھ ہر جگہ کام نہیں آسکتا۔ ہم نے جس معاملے میں تمہارے پورے تحفظ کا یقین دلایا تھا' اس بارے میں کوئی تمہیں ملوث نہیں کرے گا۔ تمہارے نئے اور گھریلو



مسائل اس یقین دہانی میں شامل نہیں تھے۔"

"اوہ' اظہر جی! یہ کیا کہہ دیا تم نے؟" روی نے فوراً ہی اعتراض جڑ دیا۔ "میں نے تمہیں کرشن کمار کے بارے میں بتادیا تھا۔ وہاں ماروتی کا وعدہ پورا ہوگیا اور میں آزاد ہوگیا پھر بھی میں نے ہری چند کو پکڑوانے میں تمہارا پورا پورا ساتھ دیا۔ تم کو بھی میرا ساتھ دینا چاہیے۔ آڑے وقت میں مجھے یوں اکیلا نہ چھوڑو۔ حیدر آباد سے واپسی کے سفر میں' میں دیکھ چکا ہوں کہ پولیس والے تمہارا کیسا لحاظ کرتے ہیں۔"

اول خان نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے جواب دیا "ہم تمہیں تنہا نہیں چھوڑ رہے۔ اب بھی تمہارا ساتھ دیں گے لیکن کہیں نہ کہیں ہمیں بھی کوئی مجبوری پیش آسکتی ہے۔"

"مطلب یہ ہے کہ اب یہ دیکھ لو کہ میرے گھر میں جو کچھ ہوا' وہ میری وجہ سے نہیں ہوا۔" روی نے اپنی جگہ پہلو بدلتے ہوئے کہا "بھایا جی کو ماروتی پر الزام تراشی کا موقع یوں ملا کہ اسے ملنے گئی تھی۔ نہ جاتی تو کچھ بھی نہ ہوا ہوتا۔"

"اچھی تم نے کہی۔ ایک بھایا جی اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں جا گرا۔" کچھ خاموش ہاکر اول خان نے بات جاری رکھی "اس نے خودکشی نہ کی ہوتی تو وہ کہیں نہ کہیں تمہیں پھنسوا دیتا۔ اس کی خودکشی کا ماروتی کے جانے یا نہ جانے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

اس دوران میں میری توجہ کسی اور طرف مبذول ہوچکی تھی۔ گھر کے نچلے حصے میں کہرام برپا تھا۔ سب لوگ اوپر والی منزل کو بھولے ہوئے تھے مگر میری چھٹی حس نے اچانک ہی مجھے خبردار کیا تھا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ کوئی کمرے کے باہر چھپ کر ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔

میرا وہ احساس چند ہی لمحوں میں اس قدر توانا ہوگیا کہ میں اول خان کی بات مکمل ہوتے ہی' اپنی جگہ چھوڑے بغیر' اس نادیدہ شخص کو للکار بیٹھا "باہر کون ہے؟ سامنے آؤ۔"

میری کرخت آواز پر وہ دونوں بھی بھڑک اٹھے اور اسی لمحے فرش پر کسی کے ننگے پاؤں دوڑنے کی دھمک سنائی دی۔

میرا شبہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا' میری آواز سنتے ہی بھاگ نکلا تھا۔

ہم تینوں نے بہ یک وقت دروازے کی طرف چھلانگیں لگائیں مگر ہمیں تاخیر ہوچکی تھی۔ ننگے پاؤں بھاگنے والا ہم سب کی توقع سے کہیں زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا تھا اور چشم زدن میں کسی چھلاوے کی طرح غائب ہوچکا تھا۔ اس منزل کے کسی دور افتادہ حصے میں ننگے پاؤں دوڑنے کی دھمک بس مزید ایک لمحے کے لیے برقرار رہی اور پھر یکایک معدوم ہوگئی۔

ہم دونوں مکان کی ساخت سے بے خبر تھے۔ اس لیے پیشوائی روی کے ذمے آگئی تھی۔ اس نے مکان کے ایک مخصوص حصے کی طرف دوڑ لگائی اور ہم اس کے پیچھے ہولیے۔ آگے وہ راستہ مسدود ہوگیا۔ وہاں دور دور تک کسی کا نام ونشان نہیں تھا۔ وہ واقعہ اس قدر انوکھا اور سنسنی خیز تھا کہ ہم تینوں پریشان ہوگئے۔ وہ جو کوئی بھی تھا' اس نے ہمارے درمیان ہونے والی بہت اہم باتیں سن لی تھیں۔

ہم تینوں نے ایک دوسرے سے الگ ہوکر پورا فلور چھان مارا مگر کہیں کوئی ذی روح نہیں مل سکا۔

یہ بات یقینی تھی کہ بھاگنے والے نے زینوں کی راہ اختیار نہیں کی تھی۔ غالب امکان یہ تھا کہ وہ مکان کے پچھلے حصے کی طرف گیا تھا اور وہاں واقع اسٹور کی کھلی ہوئی دو کھڑکیوں میں سے کسی کے ذریعے پیچھے پرکود کر نیچے پہنچ گیا تھا۔

مجھے اور اول خان کو وقت کی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ فرار ہونے والا نامعلوم شخص نیچے موجود سوگواروں کی بھیڑ میں مل کر بھی فوری طور پر اپنے چڑھے ہوئے سانسوں پر قابو نہیں پاسکتا تھا۔ ہم دونوں تیزی سے زینے اترتے چلے گئے۔ اس بار روی ہمارے پیچھے تھا مگر وہ زینے ختم ہونے سے پہلے ہم سے آملا۔

"نیچے اسے کیسے تلاش کرو گے؟" اس نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

"اس کا سانس چڑھا ہوا ہوگا۔ میری آواز پر وہ پوری رفتار سے بھاگا تھا۔" میں نے کہا۔

"حیرت ہے کہ کسی آہٹ کے بغیر تمہیں شبہ ہوگیا۔ میں دیکھتا ہوں۔" روی بڑبڑایا اور آگے بڑھ گیا۔

جگدیش کے لواحقین اور ملازم ڈرائنگ روم میں اس کی لاش کے گرد جمع تھے۔ روی ان کا جائزہ لے کر ناکام لوٹ آیا مگر اس بار وہ خجلت میں تھا۔ اس نے بہت بے تابی سے نچلی منزل کا جائزہ لیا۔ دو تین ملازموں سے پوچھ گچھ کی پھر شکست خوردہ انداز میں واپس آگیا۔ "شیام غائب ہے۔ تھوڑی دیر پہلے وہ یہیں موجود تھا۔ میں نے اوپر جاتے ہوئے خود اسے دیکھا تھا۔"

"وہ موجود تھا تو اب کہاں گیا؟" اول خان نے زینوں کا رخ کرتے ہوئے پوچھا۔

"سب باتھ روم کھلے ہوئے ہیں۔ رامو بتا رہا ہے کہ وہ اگلے حصے سے باہر نہیں آیا۔ معلوم نہیں کہاں مرا ہوا ہے۔" روی اس واقعے سے خوف زدہ نظر آرہا تھا۔

"ماروتی نے رات گئے گھر سے نکلنے کے لیے ایک نیا راستہ دریافت کیا تھا۔" میں نے اسے یاد دلایا "ہوسکتا ہے کہ شیام نے بھی بھاگنے کے لیے وہی راہ اختیار کی ہو۔ اس میں

اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ لاکارے جانے کے بعد گھر میں رکا رہتا۔"

اس بار ہم تینوں اوپری منزل کی لابی میں رک گئے۔ جہاں کسی کے چھپنے یا سن گن لینے کی کوئی گنجائش نہیں تھی مگر ہماری وہ احتیاط بعد از وقت اور قطعی بے سود تھی۔ ہمارا مجرم اپنا کام پورا کر کے فرار ہو چکا تھا۔

"اسے کرشن کمار نے بھیجا تھا۔" روی خود کلامی کے انداز میں بولا "صورت سے بہت مسکین اور ضرورت مند نظر آتا تھا مگر پکا نمک حرام نکلا۔ ہر ملازم بتا رہا ہے کہ وہ تھوڑی دیر پہلے نیچے منڈلا رہا تھا۔ اب غائب ہے۔"

روی کے انکشاف پر ہم دونوں چونک پڑے۔ کرشن کمار جنم واصل ہو چکا تھا مگر اس کا آسیب ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔ شیام اس کا بھیجا ہوا آدمی تھا تو یقیناً اسی کا منجھا تھا جسے کرشن کمار نے جگدیش اور روی کی گھریلو سرگرمیوں کی نگرانی کے لیے، ملازم کے روپ میں وہاں بھیجا تھا۔ وہ خود کراچی سے بہت دور، ٹھر کے ریگستانی علاقوں میں رہتا تھا۔ امکان یہ تھا کہ شیام اپنی اطلاعات کسی مقامی شخص کو پہنچاتا رہا ہوگا جو چیدہ چیدہ نکات کرشن کمار تک بڑھاتا رہا ہوگا۔

اس وقت تک ایسا کوئی درمیانی شخص ہماری نظروں میں نہیں آیا تھا۔ وہ جہاں بھی تھا، بالکل محفوظ اور شیام کے ساتھ اس کا خفیہ رابطہ بدستور استوار تھا۔ جگدیش کی خودکشی کے بعد شیام نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، وہ اس نامعلوم شخص کے علم میں آتا گزرے ہو چکا تھا۔

دیکھے بھالے اور پہچانے ہوئے دشمن سے کوئی بھی سنگین نقصان نہیں اٹھاتا۔ پہلے سے کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ دشمن کس کمزور پہلو پر وار کرے گا۔ اس سے دفاع میں خاصی مدد مل جاتی ہے لیکن ان دیکھے دشمن کا وار ہمیشہ خطرناک اور کاری ہوتا ہے۔

اس وقت نیچے سے خبر ملی کہ پولیس پارٹی موہن ہاؤس کا پھاٹک کھلوا کر اندر آ چکی ہے۔

"تم میری گاڑی لے کر نکل جاؤ۔" اول خان نے روی کو نیچے بھیج کر مجھے مشورہ دیا "یہاں مجھے اچھے آثار نظر نہیں آ رہے۔ ہو سکتا ہے کہ شیام کے علاوہ بھی کوئی ملازم کسی کا زر خرید ہو۔ تمہارا زیادہ دیر تک یہاں رہنا مخدوش ہو سکتا ہے۔"

میں نے اس سے بحث نہیں کی اور سنجیدگی سے کہا۔ "ہو سکے تو پولیس پارٹی کو شیام کی راہ پر ڈال دینا۔"

"یہی کرنا ہوگا۔ اب تم میرے پیچھے پیچھے آؤ اور کسی سے الجھے بغیر باہر نکلتے چلے جاؤ۔ مجھے یہاں کسی نئی سازش کی بو آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ روی اپنی بیوی کو چارہ بنا کر تمہیں شکار کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہو۔" اول خان یکایک بہت زیادہ فکرمند نظر آنے لگا تھا۔

اس کا آخری اندیشہ بعید از امکان تھا مگر میں نے خاموشی اختیار کر لی اور اس کے پیچھے ہو لیا۔

باوردی سپاہیوں اور افسروں کی بھاری نفری گھر میں داخل ہو کر، ہر شخص کو جگدیش کی لاش سے دور رہنا کہہ چکی تھی۔ اس وقت لاش ان ہی لوگوں کے گھیرے میں تھی۔ انسپکٹر کے عہدے کا ایک افسر بہت غور سے لاش کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک سب انسپکٹر کیمرہ تپروں کے ساتھ روی سے بات کر رہا تھا۔ صوفے پر سرکاری فوٹو گرافر اپنے بیگ سے کیمرا اور اس کے لوازم نکال کر تاروں کو آپس میں جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پیشہ ور فوٹو گرافر تھا اور تجلے سے صرف تصویر کشی کا معاوضہ لیتا تھا مگر پھر بھی اس کا کیمرا تیار نہیں تھا۔

اول خان نے انسپکٹر کو مخاطب کر کے پتی آواز میں کوئی بات کی۔ وہ لاش کے قریب قالین پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ اول خان کی بات سنتے ہی وہ تیزی سے اٹھا اور اس سے ہاتھ ملانے لگا۔ اول خان نے اپنے سر کی ہلکی سی جنبش سے مجھے اشارہ کیا اور میں کسی سے کچھ کہے سنے بغیر نکاس کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ انسپکٹر کی ہدایت پر اس کا ایک ماتحت میرے پیچھے آیا تھا تاکہ باہر پہرے پر مامور عملے کو میری طرف سے چشم پوشی کا حکم دے سکے۔

میں موہن ہاؤس سے نکلا اور اول خان کی گاڑی میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

روی موہن کے تازہ ترین مسئلے کی اہم تفصیلات مجھ سے پہلے گھر تک پہنچ چکی تھی۔ وہ واقعی اس قدر چالاک اور غیر متوقع طور پر پیش آیا تھا کہ غزالہ اپنے ہیجان پر قابو نہیں پا سکی۔ جو کچھ اسے معلوم تھا، وہ اس نے روی اور سلطان شاہ کے سامنے اگل دیا۔

میں گھر پہنچا تو وہ تینوں باہمی تبادلہ خیال سے فارغ ہو کر میرے منتظر تھے۔

میں نے راستے میں غور و فکر کرنے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ماروتی کے بارے میں جگدیش کے لکھے ہوئے پرچے کا ذکر بالکل گول کر دیا جائے۔ اس کے مندرجات کی بنا پر میری اور ماروتی کی ملاقات ایک مرتبہ پھر موضوع سخن بن جاتی۔ یہ نکتہ میرے حق میں تھا کہ روی موہن نے بھی اپنا دامن صاف رکھنے کے لیے بھابی جی کی اس تحریر کو اپنے بیان سے حذف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"جگدیش نے خودکشی کرنے کے لیے بہت ناموزوں وقت کا انتخاب کیا۔" میرے گھر پہنچتے ہی ویرا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔



"جرائم چوہیں گھنٹے ہوتے ہیں مگر یہ حقیقت حیران کن ہے کہ دن دہاڑے ہونے والے جرائم کی شرح ہیشہ سے کم رہی ہے۔" سلطان شاہ نے اس کی بات پر سنجیدگی سے گرہ لگائی۔ "دنیا بھر میں جرائم..... سورج ڈھلنے کے بعد یا رات کے اندھیرے میں کیے جاتے ہیں۔ اگر جگدیش موہن نے خود کشی کے لیے رات کا وقت منتخب کیا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"تمہیں وقت کی موزونیت پر کیا اعتراض ہے؟" میں نے سگریٹ سلگا کر ویرا سے پوچھا۔

"اسے افسوس ہے کہ ہم دونوں سلمٰی کے تیار کیے ہوئے لذیذ کھانوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکے۔" ویرا کے بولنے سے پہلے غزالہ نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "کھانا شروع ہوتے ہی ہمیں وہاں سے عجلت میں نکلنا پڑا۔"

"سلمٰی نے تمہارے لیے ضرور بہت اہتمام کیا ہوگا۔" ویرا مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "تمہاری دل جوئی کے ہر موقع سے فائدہ اٹھاتی ہے۔"

"خرافات کو چھوڑو۔" سلطان شاہ نے اسے گھور کر کہا۔ اور مجھ سے پوچھا "جگدیش کو خود کشی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"میں سر کھپا کر تھک آیا۔ اب پولیس والے یہی دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔" میں نے خوش دلی سے جواب دیا "بظاہر وہ کسی گھریلو تنازعے کا سنگین انجام نظر آتا ہے۔ وہ روی اور ماروتی کے چھپنوں سے خوش نہیں تھا۔"

"اسے خوش ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔" ویرا نے برجستہ کہا "رات کے دو بجے گھر کی دیواریں پھاند کر بھاگنے والی عورت کو کوئی شریف آدمی خوشی سے برداشت نہیں کر سکتا۔ نہ معلوم اس نے روی کو کتنے الّو بنوں کا گوشت کھلایا ہوا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کی بے راہ روی کی طرف سے اپنی آنکھیں بالکل بند کی ہوئی ہیں۔ ماروتی کسی عزت دار گھرانے کی بہو بننے کے قابل نہیں ہے۔"

"تم دونوں یہاں سے ہوا خوری کے ارادے سے گئے تھے۔" سلطان شاہ کو اچانک خیال آ گیا "پھر تم جہانگیر کے گھر کیسے پہنچ گئے؟"

"بس، ساحل کی طرف جاتے جاتے، راستے میں رک گئے۔" غزالہ نے ہنس کر کہا "انہیں کچھ ڈالر بھی لینے تھے۔"

"ڈالر لینے کا مطلب ہے کہ تمہارے ذہن پر سفر سوار ہو رہا ہے!" ویرا نے سر کو جنبش دیتے ہوئے رائے زنی کی۔

"سفر ناگزیر ہو چکا ہے۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر جواب دیا "کرشن کمار مارا جا چکا ہے لیکن اس کا خفیہ نیٹ ورک اب بھی کام کر رہا ہے۔ یہاں ایک ایک کی تلاش اور سرکوبی کے بجائے ہمیں نئی دہلی میں کام کرنا پڑے گا۔"

"اس کا خفیہ نیٹ ورک تمہیں کہاں نظر آ گیا؟" ویرا نے چونک کر پوچھا۔

میں نے موہن ہاؤس میں پیش آنے والا تازہ ترین واقعہ انہیں سنا دیا۔ غزالہ بھی میرے اس تجربے سے لاعلم تھی۔ تینوں کے لیے یہ بات حیران کن ثابت ہوئی کہ موہن ہاؤس میں کرشن کمار کا کوئی مخبر موجود تھا۔ ان کے لیے جگدیش کی خودکشی میں زیادہ دلچسپی کی گنجائش نہیں تھی لیکن شیام کا قصہ سامنے آتے ہی گفتگو میں دلچسپی کا ایک نیا عنصر پیدا ہو گیا۔

وہ تینوں آپس میں باتیں کرتے رہے اور میں شیام کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ بات ہر شک و شبے سے بالاتر تھی کہ اس نے چھپ کر ہماری گفتگو سننے کی کوشش کی تھی اور پھر پکڑے جانے کے خوف سے موہن ہاؤس سے ہی فرار ہو گیا تھا۔ یہ عام گھریلو ملازمین کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ بظاہر سر جھکا کر اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن فطری تجسس کے تحت اپنے مالکان کی نجی گفتگو پر کان لگائے رہتے ہیں۔ جب وہ کام سے فارغ ہو کر فرصت سے بیٹھتے ہیں تو گھروں میں ہونے والی باہمی نوک جھوک اور فقرے بازیوں کو دہرا کر اپنی اپنی معلومات کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ شیام کی حرکت اس زمرے سے خارج تھی۔ اس نے روی میں سن گن لینے کے بجائے سازشی انداز میں باتیں سننے کی کوشش کی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس سازش میں کون اس کی پشت پناہی کر رہا تھا۔

کرشن کمار نے اسے موہن ہاؤس میں ملازمت ضرور دلوائی تھی اور شاید اسے مخبری کی براہِ راست ہدایت بھی دی ہو لیکن کرشن کمار کے لیے براہِ راست شیام سے رابطہ برقرار رکھنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ شیام یقینی طور پر کسی اور سے رابطے میں تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ کرشن کمار کی موت سے بے خبر رہا ہو۔ اس کے بارے میں اخبارات میں اتنا کچھ چھاپا گیا تھا کہ اس کی بازگشت ان پڑھ لوگوں میں بھی پہنچنی چاہیے تھی۔ اس کے مرجانے کے بعد شیام کی مجرمانہ سرگرمیوں کا سلسلہ موقوف نہیں ہوا تھا۔ وہ موہن ہاؤس میں اپنے کام پر مستعد تھا مگر سوال وہی تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہا تھا۔

کرشن کمار کی سرکوبی کی مہم پر کام کرتے ہوئے ہمارے سامنے دو این جی اوز کے نام آئے تھے۔ فریڈم انٹرنیشنل امریکا کی رسوائے زمانہ فورڈ فاؤنڈیشن کی پروردہ غیر سرکاری تنظیم تھی۔ مراد ظریف کی صحرائی تنظیم مقبول چوہدری کی زر خرید تھی۔ وہ سب اپنے حواریوں سمیت انجام کو پہنچ چکے

تھے۔ ان کے سوا کوئی بھی بھارتی سفارتی اہل کار ہمیں اس محاذ پر سرگرم نظر نہیں آیا تھا۔

اس سے پہلے رونما ہونے والے واقعات کے سلسلے میں میجر بخشی کا نام میرے سامنے تھا۔ میں خود ہری چند کے نام سے دو مرتبہ اس سے فون پر بات کر چکا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ میجر بخشی کو کرشن کمار اور اس کے مشن کے بارے میں بنیادی تفصیلات کا پوری طرح علم تھا' اس کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں لیکن وہ عملی طور پر ان کے مشن میں شامل نہیں تھا۔

میجر بخشی سے ہونے والی آخری گفتگو اس اعتبار سے اہم تھی کہ اس نے مجھے ہری چند سمجھتے ہوئے' سرحد پار فرار ہو جانے کا مشورہ دیا تھا۔ را اور اس کے مفادات سے ہمدردی رکھنے والوں کی ہلاکتوں میں تسلسل پیدا ہو جانے کے بعد میجر بخشی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پاکستان میں ان لوگوں کے لیے حالات مخدوش ہو چکے تھے۔ وقت کا تقاضا تھا کہ وہ لوگ عارضی طور پر اپنی سرگرمیاں موقوف کر کے سرحد پار کر جائیں تاکہ ان کی جانیں محفوظ رہ سکیں۔ حالات بہتر ہو جانے پر وہ دوبارہ پاکستان آکر اپنی کارروائیوں کا آغاز کر سکتے تھے۔

وہ میجر بخشی کا مشورہ تھا۔ وہ کوئی ہدایت دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ لے دے کر بس اسی کا نام میرے ذہن میں چکراتا رہا۔ اپنی سرکاری حیثیت میں وہ اتنا باخبر ضرور تھا کہ میری زبان سے انل بسواس کا نام سنتے ہی چونک پڑا تھا۔ نادانستگی میں اس نے یہ اگل دیا تھا کہ انل بسواس ایک بڑے عہدے پر فائز تھا۔ میجر بخشی کو اس کے بارے میں میرا لب ولہجہ پسند نہیں آیا تھا۔

ایک طرف مجھے اس سے کوئی سراغ ملنے کی امید نہیں تھی' دوسری طرف میں اس سے مزید ایک اور رابطے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ روک رہا تھا کہ اس وقت تک ہری چند کی موت کا راز فاش ہو چکا ہوگا۔

کراچی کے کسی حصے میں پائی جانے والی ہری چند کی لاش کی حالت سے پہلی ہی نظر میں یہ نشان دہی ہو سکتی تھی کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوا ہوگا۔ لاش ملنے کے چند گھنٹوں بعد ہی یہ معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ وہی قومی شاہراہ کے حادثے کا گم شدہ زخمی تھا جسے کسی لاوارث کی طرح پھینک دیا گیا تھا۔

"ہم مسلسل بول رہے ہیں اور تم اداس بیٹھے ہو۔ کیا سوچ رہے ہو؟" ویرا نے وہ سوال کر کے مجھے چونکا دیا۔

"شیام کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میں اسے للکارنے کی غلطی نہ کرتا تو وہ کسی دبکے ہوئے چوہے کی طرح ہمارے ہاتھ آگیا ہوتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ اب کہاں گیا ہوگا!"

"ایک مرتبہ پھر میجر بخشی کی دم مروڑو۔ وہ کچھ نہ کچھ اگل دے گا۔" ویرا نے خلوص سے مشورہ دیا۔

"اب تک ہری چند کی موت کا راز کھل چکا ہوگا۔ وہ بہت کائیاں آدمی ہے۔ میں نے کسی اور نام سے اسے فون کیا تو وہ اپنے خول سے ذرا بھی باہر نہیں آئے گا۔ اسے چھیڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔۔۔"

"بخشی ویسے بھی کرشن کمار کے نیٹ ورک میں شامل نہیں تھا۔" سلطان شاہ نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"وہ نیٹ میں ہو یا نہ ہو' ایک ذمے دار افسر ضرور ہے۔ خاموشی سے ان سب کی سرگرمیاں مانیٹر کرتا رہتا ہوگا۔" ویرا اپنی بات پر اڑی رہی "ایسا نہ ہوتا تو وہ کرشن کمار کے بارے میں زیادہ باخبر نہیں ہو سکتا تھا۔"

"سب سے الگ تھلگ رہ کر وہ ان کی سرگرمیوں پر نظر نہیں رکھ سکتا۔" غزالہ بولی۔

"یہ جدید مواصلاتی سہولتوں کا دور ہے۔" ویرا نے استہزائیہ انداز میں کہا "فون اور موبائل سے زیادہ وائرلیس اپریٹس استعمال ہوتے ہیں۔ ایسے کاموں میں ہر وقت اور ہر جگہ رابطے کی سہولت کی فراہمی ناگریز ہوتی ہے۔ بخشی ایک آپریٹس آن رکھ کر ان کی زیادہ تر باتیں سننے کی پوزیشن میں ہے۔ ان کے مذاکرات میں دخل انداز ہوئے بغیر وہ پل پل کی خبر رکھ سکتا ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں اس پہلو کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔ اگر شیام' را کا کوئی تجربے کار ایجنٹ تھا تو وہ ایک حساس مگر ننھے سے لاسلکی آلے کے ذریعے کسی کو بھی اپنی رپورٹ دے سکتا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس کا کراچی ہی میں کسی سے رابطہ ہو۔

"پھر بھی میں اسے چھیڑنے کا خطرہ مول نہیں لوں گا۔" میں نے قدرے توقف کے بعد فیصلہ کن لہجے میں کہا "شیام بہت کچھ سن لینے کے بعد فرار ہوا تھا۔ اگر وہ لوگ کرشن کمار کی موت کے بعد بھی فعال ہیں تو شیام کے فرار کا نتیجہ کہیں نہ کہیں سامنے ضرور آئے گا۔"

"تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ نتیجہ زیادہ خوش گوار نہیں ہوگا۔" ویرا نے مجھے یاد دلایا۔

"سب سے پہلے روی کی شامت آئے گی۔" میرے دل میں جنم لینے والا اندیشہ سلطان شاہ کی زبان پر آگیا "تم بتا چکے ہو کہ گفتگو کے آخری موڑ پر وہ کرشن کمار اور ہری چند کے انجام کے بارے میں اپنی خدمات گنوا رہا تھا۔"

"ہاں۔" میں نے اقرار کیا "شیام نے گفتگو کا وہ آخری حصہ ضرور سنا ہوگا۔ اب روی کو محتاط رہنا پڑے گا۔"

ہم دونوں جہانگیر کے گھر سے خالی پیٹ لوٹے تھے۔ غزالہ نے کھانا لگایا۔ ویرا اور سلطان شاہ پہلے ہی اپنی شکم سیری کر چکے تھے۔ ہمارا ساتھ دینے کے لیے میز پر آبیٹھے۔ آپس کی باتیں ایک دائرے میں گھومتی رہیں۔ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا کہ شیام کہاں گیا ہوگا۔

اول خان رات بارہ بجے کے بعد ٹیکسی کے ذریعے گھر پہنچا۔ وہ خاصا تھکا ہوا تھا اور مضمحل نظر آرہا تھا۔ اگر اس کی گاڑی میرے پاس نہ ہوتی تو شاید وہ موہن ہاؤس کے معاملات نمٹانے کے بعد سیدھا اپنے گھر روانہ ہوگیا ہوتا۔ روبی نے اسے اپنی گاڑی میں واپس بھجوانے کی پیش کش کی تھی جسے اول خان نے نرمی سے مسترد کردیا۔ وہ ہمارے فون نمبر سے پہلے ہی واقف تھا' اول خان اسے گھر دیکھا کر مزید کوئی الجھن مول لینے پر آمادہ نہیں تھا۔

موہن ہاؤس پہنچنے والی پولیس پارٹی کا سربراہ سمجھ دار اور نرم خو آدمی تھا۔ اول خان کو اسے یہ سمجھانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی کہ جگدیش کی خود کشی ایک خالص گھریلو معاملہ تھا اور وہ گھرانا اپنی بعض مذموم سرگرمیوں کی وجہ سے اسپیشل ٹاسک فورس کی نظروں میں آیا ہوا تھا۔ ایسی صورت میں پولیس کو زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔

جگدیش نے جن حالات میں خود کشی کی تھی ان کی بنا پر ماروتی اور جگدیش کی بیوہ کے درمیان خاصی تلخی تھی جو ایک مرحلے پر ہاتھا پائی تک پہنچ گئی مگر روبی نے خاصی بردباری سے کام لیا۔ پولیس افسر رسمی کارروائی اور خانہ پری کے بعد آسانی سے اس پر آمادہ ہوگیا کہ مرنے والے کے پس ماندگان کی خواہش پر لاش کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے۔

پولیس پارٹی کو گھر سے رخصت کرنے کے بعد اول خان روانہ ہوا تھا۔ روبی اس کی مدد کے لیے تہ دل سے اس کا ممنون تھا۔

اول خان کو بھی شیام کے نکل جانے کا قلق تھا۔ اس نے انسپکٹر کے ساتھ دوسرے ملازمین سے خاصی بازپرس کی تھی جس کے نتائج میں اس سے زیادہ کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی کہ اوپر والی منزل کے ایک حصے سے شیام کی چپلیں مل گئی تھیں لیکن اس کا دور دور تک کوئی سراغ نہیں تھا۔ افراد خانہ اور ملازمین' شیام کی کسی غیر معمولی حرکت پر روشنی نہیں ڈال سکے تھے۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ وہ اپنے مالکوں اور ساتھیوں کے لیے ہمیشہ نہایت ہمدرد اور فرماں بردار ثابت ہوا تھا۔ اس کے اچانک غائب ہوجانے پر سب حیران تھے۔

اول خان زیادہ دیر تک رکنے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن جب اسے شیام کے بارے میں ہمارے قائم کیے ہوئے نظریات کا علم ہوا تو اس نے پریقین لہجے میں کہا "تم یہ سب باتیں کرتے ہوئے ہری چند کے اقبالی بیان کو بھول رہے ہو۔ اس نے صاف اور واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اندرون سندھ کرشن کمار کا اپنا کوئی گروہ نہیں تھا۔ وہ اپنا ہر کام مراد ظریف کی صحرا نامی این جی او سے لیتا تھا۔ یہ سب کے تجربے کی بات ہے کہ کرشن کمار ہر قیمت پر مراد ظریف کو آزاد کرانے کے لیے بلبلایا ہوا تھا اور وہ اپنی اسی کوشش میں کیفرِ کردار تک پہنچا تھا۔"

اول خان نے ہری چند کے کہے ہوئے الفاظ دہرا کر پورا منظر نامہ بدل کر رکھ دیا۔ اس بیان کی روشنی میں شیام کی روپوشی کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ بننے کے بجائے ایک مدافعانہ اقدام میں بدل کر رہ گئی تھی۔

"پھر بھی اس کا تلاش کیا جانا ضروری ہے۔ کرشن کمار کا ہمدرد ہمارا دوست نہیں ہوسکتا۔" میں نے کہا۔

"اس سے مجھے ذرا بھی اختلاف نہیں۔ اسے زندہ نکلنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" اول خان بولا۔

"جاتے ہوئے اپنے دونوں تحفوں کو واپس لیتے جانا۔" اول خان کو واپسی کے لیے پر تولتے دیکھ کر ویرا نے ہانک لگائی۔

"تحفے؟" اول خان نے حیرت سے دہرایا "میں نے تمہیں تحفے کب دیے ہیں؟"

"میں ان دونوں کی بات کررہی ہوں جو چھت پر ہیں۔ وہ اپنی زبان سے پانی تک نہیں مانگتے۔ ہروقت ان کی ضروریات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔" ویرا نے اپنے مذاق کی وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا "کسی بھی وقت ذہن چوک گیا تو وہ بھوکے پیاسے رہ جائیں گے۔ ویسے بھی اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ مائیکرو سینٹر کی تباہی سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ امریکی ہمارے اس ٹھکانے سے بے خبر ہیں۔"

اول خان کی استفہامیہ نظریں میری طرف اٹھیں "آج رات انہیں رہنے دو۔ کل میں انہیں واپس بلالوں گا۔"

"ان کی واپسی کی تجویز میری نہیں' ویرا کی تھی۔ میرے لیے ان کی موجودگی اطمینان کا باعث ہے۔" میں نے دل کی بات کہہ دی۔

"بس تو پھر وہ یہیں ٹھیک ہیں۔ ان کے بارے میں بعد میں سوچا جائے گا۔" اول خان نے یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

اول خان واپس چلا گیا۔ رات گہری ہوچکی تھی۔ میں ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا چھوڑ کر اپنی خواب گاہ میں آگیا۔ غزالہ میرا موڈ سمجھتی تھی۔ اس نے خاموشی سے میری تقلید کی اور سیدھی غسل خانے میں جا گھسی۔

شب خوابی کے لباسوں میں بستر پر دراز ہوکر ہم دونوں کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر میری آنکھ لگ گئی۔

رات کے گہرے سناٹے میں کھٹاک کی ایک غیر معمولی آہٹی آواز پر میری آنکھ کھل گئی اور میں ہڑبڑا کر بستر سے اتر گیا۔ میرے حواس پر غنودگی پوری طرح غالب تھی۔ کوئی بات واضح طور پر میری سمجھ میں نہیں آسکی مگر مجھے یہ اندازہ ہوچکا تھا کہ میری آنکھ بلا سبب نہیں کھلی تھی۔ مجھے بستر سے اترے لمحہ بھر ہی گزرا تھا کہ پھر وہی آواز سنائی دی۔ اس بار مجھے باہر کی پرسکوت فضا میں کسی گاڑی کے انجن کی دور ہوتی ہوئی آواز بھی آئی۔

اس مرتبہ مجھ سے اندازے کی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ کھٹکے کی وہ آواز بے آواز رائفل سے ہونے والے فائر کا منطقی نتیجہ تھی۔

ہمیں اس نئے گھر میں آباد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس دوران میں یکے بعد دیگرے چند ایسے واقعات رونما ہوچکے تھے کہ ہم اپنے دشمنوں کی نگاہوں میں آگئے تھے۔ کرشن کمار کے برادرانہ حملے اور پھر اس کے بھیجے ہوئے بھیلوں سے تصادم کے بعد ایسے نہیں تھے جنہیں کسی گنجان آبادی میں معمول قرار دے کر نظر انداز کیا جاسکے۔ اس وجہ سے اول خان نے اپنے آدمیوں کو ایسی رائفلوں کے ساتھ بھیجا تھا جن کی نالوں پر سائلنسر چڑھے ہوئے تھے۔ سائلنسر دھماکے کا شور جذب کرلیتے ہیں مگر مشینی کھٹکے کی گرخت آواز کو تحلیل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ وہ دونوں آوازیں یقینی طور پر بے آواز رائفلوں کے فائر کی تھیں۔ دونوں فائروں کے درمیان بہت قلیل سا وقفہ تھا۔

میں مضطرب ہوکر خواب گاہ سے باہر نکل آیا اور چیتوں کے بل چلتا ہوا زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ چھت پر کھلی فضا تھی مگر اس میں جلے ہوئے بارود کی تیز بو محسوس ہورہی تھی۔ ہوا کے ٹھہراؤ کی وجہ سے بوجھل بارودی دھواں بہت دھیرے دھیرے تحلیل ہورہا تھا۔ ایس ٹی ایف کے دونوں آدمی اپنی اپنی رائفلیں سنبھالے دیوار کی اوٹ میں جھکے ہوئے تھے۔ ان کی عقابی نظریں باہر کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

میری آہٹ پاکر وہ دونوں چونکے' انہوں نے مجھے سلام کیا پھر ایک شخص میرے قریب آیا۔ "سوری سر!" اس نے دھیمی اور معذرت خواہانہ آواز میں کہا "ابھی ایک مشتبہ گاڑی کی رفتار کم ہوئی تھی۔ ہمیں دو فائر کرنا پڑے۔ ہم نے آدمیوں کے بجائے کار کی باڈی کو نشانہ بنایا تھا۔"

"کیا وہ گاڑی ہماری گھر کے سامنے رکتی نظر آرہی تھی؟" میں نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔

"یس سر! آثار کچھ ایسے ہی تھے۔ اسٹریٹ لیمپس کی دھندلائی روشنی میں' اس میں دو مسافر نظر آئے تھے۔"

"کیا یہ مناسب نہ ہوتا کہ اس گاڑی کے رکنے کا انتظار کرلیا جاتا..؟ ہمیں علم ہونا چاہیے تھا کہ وہ کون ہیں اور کس ارادے سے اس طرف آئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بے ضرر شہری ہوں اور گاڑی میں کسی خرابی کی وجہ سے رکنے پر مجبور ہوئے ہوں۔ فائرنگ سے خوف زدہ ہوکر وہ بھاگ گئے۔ اب ہمیں علم نہیں ہے کہ حقیقت کیا تھی۔" میں نے کسی ترشی کے بغیر سنجیدگی سے کہا۔

"گاڑی کی بریک لائٹس جلی تھیں۔" اس نے کسی ندامت کے بغیر جواب دیا "وہ یہاں رکنے کی دانستہ کوشش کررہے تھے۔ ہم دونوں نے سب سے پہلے یہی بات نوٹ کی تھی۔ گاڑی خراب ہوئی ہوتی تو وہ رکنے پر مجبور ہوجاتے' بھاگنے والی حرکت نہ کرتے۔"

ان دونوں نے گھبراہٹ میں غیر ارادی طور پر رائفلیں نہیں چلائی تھیں' سوچ سمجھ کر ایک قدم اٹھایا تھا مگر میں ان کے خیال سے متفق نہیں تھا۔ انہیں کچھ توقف کرکے یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ آنے والوں کے کیا عزائم تھے۔"

"فائر کرکے انہیں بھگانے کے بجائے پکڑنے کی کوشش کی جاتی تو تمہیں زیادہ کامیابی حاصل ہوسکتی تھی۔"

"نہیں۔" اپنی کارروائی کے بارے میں اس کا ذہن بالکل صاف تھا "ہمیں چیف کی طرف سے ریڈ الرٹ کا حکم ملا ہوا ہے۔ مقابلے کا خطرہ مول لینے کے بجائے ہمیں ہر مشتبہ آدمی اور گاڑی کو آپ کے گھر سے دور رکھنا ہے۔ کوئی ریموٹ کنٹرولڈ کار سے گھر پر دستی بم بھی پھینک سکتا ہے۔ ہمارے لیے کسی کی گرفتاری سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ آپ لوگوں اور آپ کے گھر کو ہر خطرے سے بچایا جائے۔"

"اوہ! مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ چیف نے تمہیں ایسی ہدایات دی ہوئی ہیں۔" مجھے اس کا پیش کیا ہوا جواز تسلیم کرنا پڑا "چیف کے حکم کی روشنی میں تمہارا فیصلہ بالکل درست اور بروقت تھا۔"

"شکریہ سر۔" اس نے مشینی لہجے میں کہا "ہم نے وہ گاڑی پہچان لی ہے۔ وہ لوگ دوبارہ ادھر نظر آئے تو ہم براہِ راست گاڑی پر فائر کریں گے اور انہیں زندہ یا مردہ حالت میں پکڑلیں گے۔ آپ لوگ بالکل بے فکر ہوکر آرام کریں۔"

میرا چھت پر رکنا بے سود تھا۔ میری موجودگی کی وجہ سے دیکھ بھال کا بوجھ ایک آدمی پر آگیا تھا۔ دوسرا مجھ سے باتوں میں مصروف تھا اور مجھے نظر انداز کرکے اپنے کام پر دھیان نہیں دے سکتا تھا۔ میں خاموشی سے واپس لوٹ آیا۔ اس

واقعے نے میرے ذہن میں ایک مرتبہ پھر الجھن پیدا کردی تھی۔ ہمارے امریکی دشمن بہت طاقت ور اور جدید ہتھیاروں سے لیس تھے۔ وہ کروزوں دور سے دستی لانچرز کے ذریعے راکٹ یا بم فائر کرکے مائیکرو سینٹر کو اڑا سکتے تھے تو ان کے لیے ہمارے گھر کو ملبے کے ڈھیر میں بدلنا بھی دشوار نہیں تھا۔ وہ نامعلوم کار ان کی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ کسی برے ارادے سے آئے ہوتے تو دو گولیاں چلنے سے میدان چھوڑ کر نہ بھاگتے۔ ذرا سا خطرہ مول لے کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔

منزل کے اس قدر قریب آکر بزدلی سے فرار ہونے والے ان سے کہیں کم تر لوگ تھے جب کہ ہم اپنے ایسے کسی دشمن کے وجود سے لاعلم تھے۔ ہم ایک ایک کرکے اپنے کئی دشمنوں کا صفایا کرچکے تھے۔ ان میں سے صرف شیام ہماری گرفت سے بچ کر نکل جانے میں کامیاب ہوا تھا لیکن وہ ہمارے گھر سے واقف نہیں تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس نے چند گھنٹوں میں ہمارے بارے میں بہت کچھ معلوم کرلیا ہو۔

وہ واقعہ میرے ذہن پر اس بری طرح مسلط ہوا کہ میں بستر پر دراز ہونے کے باوجود دوبارہ سونے کی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ کچھ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد میں نے مسہری چھوڑ دی تاکہ میری بے چینی کی وجہ سے غزالہ کی نیند خراب نہ ہو۔ میری وہ کوشش زیادہ دیر تک کامیاب نہیں ہوسکی۔ وال کلاک کی سوئیاں صبح کے چار بجے سے آگے بڑھی ہی تھیں کہ اچانک فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔

میں نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔ گھنٹی کا شور اس وقت تک غزالہ کی نیند میں خلل انداز ہوچکا تھا۔ وہ بوکھلا کر بیدار ہوئی۔ خواب گاہ میں پھیلی ہوئی دھیمی روشنی میں اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ میں نے فون کا ریسیور اٹھالیا تھا۔

"ہیلو! کون بول رہا ہے؟" دوسری طرف سے ایک سرد آواز میرے کانوں میں آئی اور میرے وجود میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں مجرم بخشی کی آواز ہزاروں میں الگ سے پہچان سکتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا کہ ہمارے گھر کا فون نمبر مجرم بخشی تک کیسے پہنچا۔ وہ نمبر ہم لوگوں کے سوا صرف روی اور ماروتی کے علم میں تھا۔

اس نے خود ہمارا نمبر ملایا تھا اور یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ اس کی بات کون سن رہا تھا۔ اگر اسے نمبر کے ساتھ ہمارے بارے میں علم ہوتا تو اس کی گفتگو کا انداز خاصا مختلف ہوتا۔ میں نے فوری طور پر آواز بدل کر بولنے کا فیصلہ کیا اور پوچھا "تم کون بول رہے ہو اور کس سے بات کرنا چاہ رہے ہو؟ شاید تمہیں فون کرنے کے آداب سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔"

"مجھے اخلاق سکھانے کی کوشش مت کرو۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے پہلی ہی گھنٹی پر ریسیور اٹھالیا۔ میں جاننا چاہ رہا تھا کہ الّو کی طرح شب بیداری کے عادی شخص کا نام کیا ہوسکتا ہے۔" اس کے لہجے کی سرد مہری برقرار تھی "مجھے اظہر یا مظہر سے کچھ گفتگو کرنی ہے۔"

ہمارے گھر کے فون نمبر سے واقفیت کے اظہار کے بعد اس نے وہ دونوں نام لے کر واضح نشان دہی کردی تھی کہ اس کی اطلاعات کس کی مرہون منت تھیں۔ ہمارے وہ فرضی نام اس وقت صرف روی اور ماروتی کو معلوم تھے۔ ماروتی جیسی بھی تھی، مجھے یقین تھا کہ میجر بخشی کی مخبر نہیں ہوسکتی تھی۔ ہمارے خلاف روی نے ہی میجر بخشی کو اکسایا تھا۔

روی موہن کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد سب کچھ بہت پیچیدہ محسوس ہونے لگا۔ ایک طرف وہ مقامی قانون اور پولیس سے تحفظ کے لیے میری اور اول خان کی مدد کا خواہاں تھا اور دوسری طرف میجر بخشی جیسے سازشی سفارت کار کی کاسہ لیسی کررہا تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے جگدیش کی خودکشی نے اس کے دماغ کی سلامتی کو براہِ راست متاثر کیا تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کررہا ہے۔

"میں مظہر بول رہا ہوں۔" میں نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا "تم شاید روی کے کوئی ساتھی ہو!"

"روی!" میرے طنز پر اس کی آواز یکایک زہریلی ہوگئی "اس کا حشر بہت جلد تمہارے سامنے آجائے گا۔ غداری کرنے والے کو سزا ملنی یوں بھی ضروری ہوتی ہے کہ اس سے دوسروں کو عبرت حاصل ہوتی ہے۔ اسے اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہوگی مگر اس سے پہلے شاید تمہاری باری آنے والی ہے۔ میرا ہاتھ کسی بھی وقت تمہارے گریبانوں تک پہنچ سکتا ہے۔"

میں نے اسے اپنی بات مکمل کرنے کا پورا موقع دیا۔ روی کے بارے میں اس کے لب و لہجے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے جو کچھ کہا، روی کو اس کا ہمدرد اور ساتھی سمجھ کر کہا تھا مگر وہ میرے طنز کا الٹا مفہوم سمجھا تھا اور میری کہی ہوئی بات پر زیادہ غور کیے بغیر، روی کے خلاف اپنی نفرت کا بے ساختہ اظہار کر بیٹھا تھا۔ اگر وہ روی سے اسی قدر ناخوش تھا تو پھر اسے ہمارا فون نمبر کیسے ملا۔ میرے ذہن میں وہ بڑا سوالیہ نشان ابھر آیا۔

"کیا صبح کے چار بجے تم نے یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے؟" میں نے ترشی سے پوچھا۔

"تم دونوں شہر میں جو کچھ کرتے پھر رہے ہو، اس کا انجام بتائے بغیر تمہاری سمجھ میں آجانا چاہیے۔" میجر بخشی اسی زہریلے لہجے میں بول رہا تھا "چند روز پہلے تم روی کے



دشمن تھے۔ وہ تمہارے خوف سے گھر سے نکل بھاگا تھا۔ آج وہ تمہارا سب سے زیادہ چہیتا ہے۔ دشمنی سے دوستی تک کا سفر طے کرنے کے لیے وہ تمہیں دو انسانی جانوں کی بھینٹ پیش کرچکا ہے۔ اب اس کی اور تمہاری باری ہے۔"

میرے ذہن میں خیالات کے بگولے مسلسل رقصاں تھے۔ اگر بخشی کو روی نے معلومات فراہم نہیں کی تھیں تو پھر وہ کام شیام کا ہوسکتا تھا۔ بخشی جو کچھ کہہ رہا تھا "وہ روی کے گھر میں چھپا ہوا کوئی مخبر ہی جان سکتا تھا۔ شیام نے اپنے کانوں سے روی کے اعترافات سنے تھے، وہ ہماری اور جگدیش کی پہلی ملاقات کا شاید چشم دید گواہ تھا" اسے معلوم تھا کہ اس روز روی اپنے گھر سے بھاگ گیا تھا پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ روی لوٹ آیا اور اس مرتبہ ہم نے دوستانہ ماحول میں اس سے ملاقات کی۔ وہ سب ناقابلِ فہم تھا۔ شیام گھر کا بھیدی ہونے کی وجہ سے بہت کچھ جانتا تھا لیکن اسے ہمارے گھر کا نمبر معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔ بخشی کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ روی سے بہت دور تھا۔ روی اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔

"ہماری باریاں" کے ساتھ اپنا تعارف کرادو تو تمہیں فوری طور پر کوئی مناسب جواب دیا جاسکتا ہے۔" میں نے اپنے ذہنی تحفظات کو گفتگو کے تسلسل میں حارج نہیں ہونے دیا اور اس سے اپنی بات جاری رکھی "یہ تمہاری بزدلی کا کھلا ثبوت ہے کہ تم فون پر کھوکھلی دھمکیاں دے رہے ہو۔ ہماری دسترس سے دور ہو مگر پھر بھی اپنی شناخت چھپا رہے ہو۔"

"تمہیں مجھ کو پہچاننے کا موقع ضرور ملے گا مگر وہ تمہارا آخری وقت ہوگا۔ اس کے بعد تم زندہ نہیں رہو گے۔"

"تمہارا ایک طواف بری طرح ناکام ہوچکا ہے۔" میں نے تھوڑی دیر پہلے نظر آنے والی مشتبہ کار کے حوالے سے ایک گول مول سی بات کہی "ہمت تھی تو بس ذرا سی دیر کے لیے رک جاتے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجاتا۔"

"میں طواف کا قائل نہیں ہوں۔ پانی سر سے اونچا ہوجاتا ہے تو بڑھ کر دشمن پر صرف ایک ہی وار کرتا ہوں جو کاری ہوتا ہے۔"

وہ میرے سوال کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکا تھا لیکن اس کے جواب نے میرے شبے کی تردید کردی۔ اسے صرف ہمارے نام ملے تھے یا گھر کا فون نمبر۔ وہ اس کال کے ذریعے یہ تصدیق کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ فون نمبر ہمارا ہی تھا۔

فون نمبر کے ذریعے پتا معلوم کرنا زیادہ دشوار نہیں تھا۔ شاید میجر بخشی کا یہی منصوبہ تھا۔ اس نے اپنا آخری فقرہ مکمل کرکے فون بند کردیا۔

پاکستان میں را کے ایجنٹوں کی مسلسل ناکامیوں نے ان کے ہر ہمدرد کو پریشان کیا ہوا تھا۔ ان سے بالکل الگ تھلگ ہونے کے باوجود میجر بخشی حالات سے خود کو لاتعلق نہیں رکھ سکتا تھا۔ ہم لوگوں کے باہمی تبادلہ خیال میں پیش کیا جانے والا یہ نظریہ کہ میجر بخشی کا کرشن کمار کے میٹ ورک سے کوئی تعلق نہیں تھا، بالکل غلط ثابت ہوچکا تھا۔ وہ اپنی جگہ مضطرب اور پریشان تھا۔ ایک ایک کرکے، زنجیر کی ساری کڑیاں ٹوٹتی جارہی تھیں۔ اسے جوں ہی یہ سراغ ملا کہ کرشن کمار کو اس کے انجام تک پہنچانے والوں تک رسائی ممکن ہے، وہ خود میدان میں کود پڑا۔

اس نے اپنی معلومات کی تصدیق کے لیے بہت بھونڈا اور روایتی طریقہ استعمال کیا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ وہ حالات سے بہت زیادہ پر آگندہ خاطر ہوچکا تھا اور اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بڑی حد تک ماؤف ہوکر رہ گئی تھی۔ اس کے ذہن پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح کرشن کمار کے قاتل یا قاتلوں کو مار کر اس کے خون کا بدلہ لے لیا جائے۔

اس وقت تک غزالہ نیند کے اثرات سے پوری طرح آزاد ہوچکی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ وہ فون کال میجر بخشی کی تھی تو کئی ثانیوں تک وہ حیرت اور بے یقینی کے عالم میں اپنی پلکیں جھپکاتی رہی۔ میری طرح اس کے لیے بھی وہ سوال پریشان کن تھا کہ بخشی کو ہمارا فون نمبر کس ذریعے سے ملا۔

ہم دونوں نے ایک مرتبہ پھر غور کیا۔ ایک دوسرے سے سوالات کیے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ باہر کے لوگوں میں صرف روی اور ماروتی ہی ہمارے فون نمبر سے باخبر تھے۔ وہ نمبر جگدیش کے علم میں بھی تھا مگر وہ دنیا سے کوچ کرچکا تھا۔

ہماری نیندیں اچاٹ ہوچکی تھیں۔ میجر بخشی کا فون آنے کے بعد یہ معلوم کرنا بے حد ضروری بلکہ ناگزیر ہوچکا تھا کہ اسے ہماری راہ پر کس نے ڈالا تھا۔ اگر وہ روی نہیں تھا تب بھی اسی سے اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب مل سکتا تھا۔

اس رات موہن ہاؤس کے مکین اپنی چھت کے نیچے جگدیش کی لاش لیے بیٹھے تھے۔ اس کی ارتھی اٹھنے اور پھر چتا جلائے جانے تک روی کا سونا ممکن نہیں تھا۔ میں نے وقت کی پروا کیے بغیر موہن ہاؤس کا وہ فون نمبر ملالیا جس پر ماروتی سے میرا رابطہ ہوتا رہا تھا۔

فون روی نے اٹھایا۔ اس کی آواز تھکی تھکی اور پژمردہ تھی۔ مجھے احساس تھا کہ جگدیش کی خودکشی پر اس گھرانے میں اٹھنے والے طوفان پر قابو پانا خاصا اعصاب شکن کام

تھا۔ روی جیسے خوش باش اور بے فکرے شخص کے لیے ان مسائل پر قابو پانا آسان نہیں تھا۔

"اچھا ہوا تم جاگ رہے ہو۔ مجھے اس وقت شدت سے تمہاری ضرورت تھی۔" میں نے اس کی آواز سن کر کہا۔

"میں نے ابھی خواب آور دوا دے کر ماروتی کو سلایا ہے تاکہ وہ بے چاری کچھ آرام کرلے ورنہ اگلے کئی دن بڑی بے آرامی میں گزریں گے۔" اس کی آواز میں تازگی اور شگفتگی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ وہ بے زاری کے عالم میں کہہ رہا تھا "ہمارے خاندان میں موت بھی شادی بیاہ سے کم نہیں ہوتی۔ میرپور خاص، عمرکوٹ، حیدرآباد اور دوسرے شہروں میں دوستوں اور رشتے داروں کو فون کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔ میرپور خاص سے بچے کراچی آجائیں تو میرا بوجھ ذرا کم ہوگا۔"

"یہ آخری پریشانی ہے جو تمہیں برداشت کرنی ہوگی" میں نے اسے دلاسا دیا "اس کے بعد تم سکھ چین کی زندگی گزار سکو گے۔"

"مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بھایا جی ایک دن یوں اچانک رخصت ہوجائیں گے۔ وہ زندگی بھر مجھے حیران کرتے رہے۔ مرتے مرتے بھی انہوں نے اپنی یہ ریت برقرار رکھی۔ یہ سب زندگی کا حصہ ہے۔ تم بتاؤ کہ تمہیں میری کیا ضرورت پیش آگئی۔"

"اظہر نے ہمارا فون نمبر جگدیش کو دیا تھا۔ اس کے ذریعے یہ خاص نمبر تمہیں اور ماروتی کو معلوم ہوا تھا۔ ابھی ابھی انکشاف ہوا ہے کہ ہمارا فون نمبر ایک خطرناک دشمن تک بھی پہنچ چکا ہے۔ سچ سچ بتانا کہ ہمارا نمبر تم نے اور کس کو بتایا تھا۔"

"کسی کو نہیں۔ ہمیں تمہارا فون نمبر کسی اور کو بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا تمہارے دشمن نے تمہیں فون کیا ہے؟"

"دس پندرہ منٹ پہلے اس نے بہت سی دھمکیاں دی ہیں۔ میں ان سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ اسے فون نمبر کے ساتھ میرے اور اظہر کے نام بتائے گئے ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تم نے شنکر اور ہری چند کو موت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔"

"ارے باپ رے!" ریسیور پر روی کی بے ساختہ آواز ابھری "وہ تمہارا دشمن ہے تو پھر مجھے نہیں چھوڑے گا۔ یہ مجھے اسی نمک حرام، شیام کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔ کچھ باتیں وہ جانتا تھا۔ باقی اس نے چھپ کر سن لی ہوں گی۔"

"میں ہر بات مان سکتا ہوں۔ میرا ذہن بھی بار بار اسی کی طرف بھٹک رہا ہے۔ اسے ہر بات معلوم ہوسکتی ہے لیکن ہمارا فون نمبر اس تک کیسے پہنچا؟ یہ غلطی تم ہی کرسکتے تھے۔ تم اس سے انکار کررہے ہو۔ یہ ایک بات صاف ہوجائے تو گتھی سلجھ جاتی ہے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اسے یا کسی اور کو تمہارا فون نمبر نہیں دیا تھا۔ اگر وہ ہمارے گھر کی جاسوسی کررہا تھا اور میرے پیچھے لگا ہوا تھا تو اسے بہت کچھ معلوم ہوچکا ہوگا۔ وہ چند گلوں کی خاطر یہ سب کچھ کسی اور بتاتا ہوگا اور اب میرے گھر سے بھاگ کر اسی کے پاس گیا ہوگا۔"

"مجھے اور کسی بات کی پروا نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے ہمارا فون نمبر کیسے معلوم کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"بھایا جی کی ہتیا کے بعد میں نے اوپر آکر تمہارے گھر فون کیا تھا" لمحہ بھر کے توقف کے بعد روی فون پر بتا رہا تھا "تم وہاں نہیں تھے۔ میں پیغام دے کر دوبارہ نیچے چلا گیا۔ اگر وہ حرامی کہیں آس پاس چھپا ہوا تھا تو اس نے میرے جانے کے بعد فون کا ایک بٹن دبایا ہوگا اور اسے معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں نے کس نمبر پر بات کی تھی۔ دراصل میرے فون پر میموری موجود ہے۔ خاص بٹن دباتے ہی، ملایا ہوا آخری نمبر اسکرین پر آجاتا ہے۔"

"پھر کیا ہوا ہے" میں اضطراری انداز میں بولا۔

روی نے ایک مشکل ترین سوال کا جواب نہایت آسانی سے فراہم کردیا تھا۔

"شیام نے جو گھٹیا حرکت کی ہے اس کی وجہ سے اب تم خطرے میں پڑ گئے ہو۔ شاید میں بھی محفوظ نہیں ہوں۔"

"ہم دونوں سے زیادہ خطرہ تم کو ہے" میں نے کسی مبالغے کے بغیر اسے آگاہ کیا "تمہیں جگدیش کی ارتھی کے ساتھ اپنے شمشان تک جانا ہوگا۔ اس بس میں بہت سے لوگ ہوں گے۔ ضروری نہیں کہ تم ہر ایک کو پہچانتے ہو۔ اس بھیڑ میں شامل ہوکر کوئی بھی تم کو مار سکتا ہے۔"

"یہ خطرہ سب سے سنگین ہے" اس نے میری تائید کی "اس کا مطلب ہے کہ بھایا جی کے پیچھے پیچھے میری روانگی بھی ہوسکتی ہے" وہ زندگی سے محبت کرنے والا اور زندہ رہنے کی آرزوؤں کو پروان چڑھانے والا آدمی تھا۔ خطرے کا ذکر آتے ہی گھبرا گیا۔

"شیام کا معاملہ صاف ہوجانے کے بعد ہم کوئی نہ کوئی پیش قدمی کریں گے۔ ہوسکتا کہ خطرہ ٹل ہی جائے" میں نے اسے دلاسا دیا "پھر بھی یہ ضروری ہے کہ تم چوکنا رہو۔ تمہیں ہر طرف سے ہوشیار رہنا ہوگا۔"

"تم جتنی تیزی سے بات کی تہ تک پہنچتے ہو، میں اسی تیزی سے اپنے بچاؤ کے بارے میں سوچتا ہوں۔ بھایا جی تو مر



گئے۔ میرے شمشان جانے سے وہ زندہ نہیں ہوسکتے۔ ان کے چکر میں، میں مارا جاسکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں ان کی ارتھی سے دور ہی رہوں تو میرے حق میں اچھا رہے گا۔"

"شاید وہ تمہارا اکلوتا بھائی تھا" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "تم ساتھ نہ گئے تو سب تم پر لعن طعن کریں گے۔"

"میں سب کے منہ بند کرنے جانتا ہوں" اس کی آواز میں بہت موہوم سی مکارانہ شوخی عود کر آئی "بس میرپور خاص سے تینوں لڑکے گھر آجائیں، میں ڈراما کرکے گھر سے سیدھا اسپتال پہنچ جاؤں گا۔ سب سمجھیں گے کہ بھائی کی موت کے صدمے نے رنگ دکھایا ہے۔ کوئی کچھ نہیں کہہ سکے گا۔"

اس کی تجویز لاجواب تھی۔ میں داد دیے بغیر نہ رہ سکا "تم بہت دور کی کوڑی لائے ہو۔ اسپتال والوں نے دیکھ بھال کرنے کے بعد تمہیں واپس روانہ نہ کردیا تو تم بہت بڑے خطرے سے محفوظ ہوجاؤ گے اور اپنی آنکھوں سے اپنے دشمن کا انجام دیکھ سکو گے۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ شہر میں کئی ایسے اسپتال ہیں جو ہٹے کٹے آدمیوں کو بھی مایوس نہیں لوٹاتے۔ اپنے خالی کمروں کو آباد رکھنے کے لیے ہر ایک کو دو چار روز کے لیے اسپتال میں ڈال لیتے ہیں۔ یہ بھایا جی کی بدنصیبی ہے کہ انہیں اکیلے شمشان جانا ہوگا۔ جب ان کا بڑا لڑکا ان کی چتا کو آگ لگائے گا تو میں اسے تسلی دینے کے لیے وہاں موجود نہیں ہوں گا۔ یہ سب مقدر کے فیصلے ہوتے ہیں جن پر ہمارا کوئی بس نہیں ہوتا۔"

"تم نے اپنے بچاؤ کی راہ سوچ لی۔ اب ہم یک سو ہوکر اپنے دشمن کے خلاف کوئی قدم اٹھاسکیں گے۔"

"یہ تو بتاؤ کہ میرا اور تمہارا اپنا دشمن کون ہے۔ تم نے تو کہا تھا کہ ہری چند کے بعد میدان صاف ہوجائے گا۔"

میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ روی ابتدا سے ہی قابلِ اعتماد ثابت ہوا تھا۔ آپس میں مفاہمت ہوجانے کے بعد اس نے کسی بھی مرحلے پر ہمیں دغا دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس پر اعتبار کیا جاسکتا تھا۔ میں نے کہا "اس کا نام میجر بخشی ہے اور وہ۔۔۔"

"بس، بس۔ میں سمجھ گیا" اس نے میری بات درمیان سے ہی کاٹ دی "وہ بہت رنگیلا بڈھا ہے۔ بھایا جی سے اس کی پرانی دوستی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی ارتھی اٹھائے جانے پر وہ بھی ہمارے گھر آئے۔ تم اسے بہت آسانی سے گھیر لوگے۔"

روی کے اس انکشاف پر میرے وجود میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے ہونے والی گفتگو ذرا طویل ضرور ہوگئی تھی مگر وہ میرے لیے توقع سے کہیں زیادہ سود مند ثابت ہورہی تھی۔ ایک طرف اس نے شیام کے کردار کے بارے میں ایک بڑا ابہام دور کردیا تھا۔ دوسری طرف وہ میجر بخشی کو گھیرنے کے ایک نادر موقع کی نشاندہی کررہا تھا۔ میں نے اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش کیے بغیر کہا "تمہیں اسپتال میں ہی بخشی کے بارے میں کوئی اچھی خبر ملے گی۔ شاید تمہیں پنڈت منوہر لال اور اس کی بیٹی، موہنی پنڈت کے بارے میں معلوم ہوگا۔ بخشی نے پنڈت سے دوستی گانٹھی ہوئی تھی اور موہنی کے ساتھ عشق کررہا تھا۔"

"ارے مظہر جی! رہنے دو۔ کیوں پرانے زخموں کو کریدتے ہو" روی نے ایک گہری سانس لے کر ایک مرتبہ پھر میری بات کاٹ دی "اونچے طبقے کے سارے ہندو گھرانوں میں بہت گہرا میل جول ہے۔ پنڈت منوہر لال کا نصیب خراب تھا کہ وہ رستم ایرانی کے چکر میں پڑ گیا ورنہ وہ آج کہیں اور ہوتا۔ اس نے اپنی بیٹی کو بہت چالاکی سے اپنی کامیابی کا زینہ بنایا ہوا تھا۔ شہر کے آدھے رئیس زادے موہنی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے مگر وہ بہت بے لوث لڑکی تھی۔ میں نے بھی اسے کوئی مہنگا تحفہ نہیں دیا پھر بھی وہ مہینے میں ایک دو دن میرے ساتھ ضرور گزارتی تھی۔"

ماضی کی یادیں زندہ ہوتے ہی روی کا لب و لہجہ بدل گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے موہنی پنڈت کا نام سنتے ہی وہ اپنے بھایا جی کی خود کشی کو فراموش کر بیٹھا ہو۔ میں نے اس سے کام کی باتیں اگلوالی تھیں۔ خرافات سننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں نے نئے دشمن کے خلاف تیاری کا بہانہ کرتے ہوئے فون بند کردیا۔

ذات پات اور برادری کے کڑے بندھنوں میں بندھے ہوئے باحیثیت گھرانوں کے باہمی مراسم کے بارے میں روی کا انکشاف زیادہ حیران کن نہیں تھا۔ کسی کے ہتائے بغیر بھی وہ سب بہت واضح تھا۔ وہ آپس میں ملتے تھے، ایک دوسرے گھری دوستیاں جتاتے تھے اور موقع پاکر جڑیں کاٹنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ میجر بخشی ان تضادات کی سب سے زیادہ گھناؤنی مثال بن کر ابھرا تھا۔

پنڈت منوہر لال اور موہنی پنڈت والے قصے میں، میں نے میجر بخشی کو انفرادی کیچ روی کی رعایت دے کر نظر انداز کردیا تھا۔ موہنی پنڈت ایک آزاد خیال ماڈل گرل تھی۔ اس کے باپ نے اپنی رنگ رلیوں کی وجہ سے اسے کھلی چھوٹ دی ہوئی تھی۔ ایسے میں بخشی جیسے عمر رسیدہ شخص کا رال ٹپکانا کسی حد تک قابلِ فہم تھا مگر موہن برادران کے معاملے میں وہ بڑی حد تک ناقابلِ معافی نظر آرہا تھا۔

جگدیش موہن ایک روکھا پھیکا اور خشک مزاج آدمی تھا۔ بخشی سے اس کی دوستی تھی۔ بخشی کو یہ علم بھی رہا ہوگا کہ کرشن کمار، ہری چند کے ذریعے موہن برادران کے وسائل اور مراسم سے فیض اٹھا رہا ہے پھر بھی وہ شیام کے ذریعے اس گھرانے کی نگرانی کراتا رہا۔ میجر بخشی کے فون اور روی موہن کے انکشافات کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آچکی تھی کہ شیام کو کرشن کمار نے موہن ہاؤس میں ملازمت دلوائی تھی۔ شیام خدمت کی آڑ میں موہنوں کی جاسوسی کرتا تھا اور اپنی جمع کی ہوئی معلومات میجر بخشی کو فراہم کرتا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو شیام موہن ہاؤس سے فرار ہونے کے بعد میجر بخشی سے رجوع نہ کرتا۔

جب تک وہ کھیل حسب منشا چلتا رہا، میجر بخشی پس منظر میں دبکا، اپنا کام کرتا رہا۔ جوں ہی بازی الٹی اور راکی بچھائی ہوئی بساط کے مہرے ایک ایک کرکے پٹتے چلے گئے، بخشی اپنے خم ٹھونک کر میدان میں اتر آیا۔ اس کی خبر لینی ضروری ہوگئی تھی۔

میری اور غزالہ کی نیند ضرور خراب ہوئی تھی مگر اس کے صلے میں مجھے بڑی کامیابی حاصل ہوچکی تھی۔ گو صبح کے آثار نمودار ہونے والے مگر باہر اس وقت بھی اندھیرے کا راج تھا اور ہواؤں میں مسحور کن تازگی پیدا ہوئی تھی۔ شدید ذہنی اور اعصابی دباؤ سے نجات پانے کے بعد جب میں دوبارہ بستر پر دراز ہوا تو کسی کوشش کے بغیر ہی نیند کی دیوی نے ذرا سی دیر میں مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

شاید میں دیر تک سوتا رہتا مگر دس بجے غزالہ نے مجھے نرمی سے بیدار کردیا۔ میرے چہرے پر کسل مندی اور نگاہوں میں ناپسندیدگی کی علامات دیکھ کر اس نے مجھے بتایا کہ اول خان خاصی دیر سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا میرا انتظار کررہا تھا۔ میرے لیے بستر چھوڑنے کے سوا کوئی راہ نہیں تھی۔

غسل خانے میں پانی کی تیز دھاروں میں نہاتے ہوئے میرے سر پر میجر بخشی کی فکر سوار ہوگئی۔ وہ بہت ڈرپوک اور محتاط آدمی تھا۔ اس کے دفتری اوقات میں اس تک رسائی ناممکنات میں سے تھی۔ گھر پر بھی ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ اسے زیر کرنے کی بہترین راہ وہی تھی جو صبح سویرے روی موہن نے بجھائی تھی لیکن ضرورت کے مطابق اس میں کچھ ردوبدل ضروری تھا۔

بخشی نے مجھ سے فون پر بات کرتے ہوئے دوٹوک لہجے میں یہ جتادیا تھا کہ وہ میرے اور اظہر کے ساتھ روی کو بھی دوسروں کے لیے نشانِ عبرت بنانے کا تہیہ کرچکا تھا۔ اسے یہ خوش فہمی تھی کہ وہ اپنی شناخت کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب ہوگیا تھا جب کہ میں نے اس کی آواز پہچاننے کے بعد اپنا پروگرام کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ایک بار وہ ہماری گرفت میں آجاتا تو شیام تک پہنچنا مشکل نہ ہوتا۔

میرے ذہن میں نقشہ کچھ یوں بن رہا تھا کہ میجر بخشی روایات کی پاسداری میں جگدیش موہن کی آخری رسوم میں بس واجبی سی شرکت کرے گا۔ اس کی بہترین صورت یہ ہوتی کہ وہ ارتھی روانہ ہونے سے پہلے ہی موہن ہاؤس پہنچتا اور منافقانہ انداز میں جگدیش کے پس ماندگان سے تعزیت کرکے لوٹ جاتا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ روی نے خود کو بچانے کے لیے اسپتال میں پناہ لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے یہ بات اس وقت معلوم ہوتی جب وہ موہن ہاؤس پہنچ چکا ہوتا اور اہل خانہ میں روی موہن کو موجود نہ پاتا۔

وہ ارتھی کے ساتھ موہن ہاؤس سے شمشان تک جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لمبے دورانیے میں اس کے ساتھ کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش آسکتا تھا۔ وہ اور روی، دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خطرات بھانپ رہے تھے۔ روی کو بخشی سے براہ راست خطرہ تھا جب کہ بخشی اپنی محتاط فطرت کا اسیر تھا۔ اگر وہ جلوس کے دوران میں روی کو مروانے کا ارادہ کرچکا تھا اس کے اسپتال پہنچنے کی خبر پانے کے بعد اسے وہ ارادہ ملتوی کرنا پڑجاتا۔ روی کو مہلت مل جاتی مگر میرے لیے وقت بہت کم رہ جاتا ہمیں میجر بخشی کے خلاف جو کچھ کرنا تھا، اس کے لوٹنے تک کرنا تھا۔

میں کپڑے تبدیل کرکے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو اول خان کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی طاری تھی۔ رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد اس نے مجھ سے رات والے واقعے کے بارے میں سوال کیا۔ اس بارے میں میری معلومات ناقص اور محدود تھیں۔ جو کچھ ہوا، اس کے عینی شاہد ایس ٹی ایف والے تھے۔ میں اوپر پہنچا تو دونوں رائفلیں خاموش تھیں اور مشتبہ کار کا دور دور تک کہیں کوئی نشان نہ تھا۔ مجھے صرف ایک بات معلوم ہوسکی تھی کہ شیام یا میجر بخشی نے ہمارے گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ اس وقت وہی ایسے دشمن تھے جو فون نمبر کے سہارے ہمارے گھر تک پہنچ سکتے تھے۔ ویرا کے ساتھ سلطان شاہ بھی حیرت اور خاموشی سے وہ سب سن رہا تھا۔

"شیام کے ساتھ بخشی کا نام کیسے آگیا؟" میرا جواب سن کر اول خان نے حیرت سے پوچھا۔

"رات اس نے فون کیا تھا" میں نے اسے آگاہ کیا اور وہ سنبھل کر اپنی جگہ پر سیدھا ہوگیا۔ وہ بات صرف اتنی ہی نہیں تھی۔ اس سے بہت سے سوالات وابستہ تھے۔ اول خان پوچھتا رہا اور میں اسے بتاتا چلا گیا کہ میں نے کن معلومات اور اندازوں کی بنا پر ایک رائے قائم کی تھی۔

جب اول خان کو اس کے ہر سوال کا جواب مل گیا تو آخر میں پھر اپنے پہلے سوال پر آگیا "یہ سب اپنی جگہ درست ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ مشتبہ کار کس کی تھی؟ وہ کون لوگ تھے جو اس طرف آئے تھے؟"

"وہ کار الجھاوے پیدا کررہی ہے" میں نے ایمانداری سے کہا "فی الحال ہمیں اس کو بھول جانا چاہیے۔ وہ تمہارے آدمیوں کی غلط فہمی بھی ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فون کرنے تک میجر بخشی کو یہ یقین نہیں تھا کہ شیام نے اسے کوئی اہم فون نمبر دیا ہے۔ فون کرنے کے بعد اسے صحیح اندازہ ہوسکا تھا جب کہ مشتبہ کار اس کا فون آنے سے پہلے دیکھی گئی تھی۔"

"میں کار کے بارے میں فکر مند تھا اور اسی وجہ سے یہاں آیا تھا۔ تم ایک بالکل نئی کہانی لیے بیٹھے ہو" وہ بولا "ویرا اور سلطان شاہ ان باتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ کیا رات کو تم تنہا ہی جاگ رہے تھے؟"

"غزالہ بھی جاگ گئی تھی۔ ہم نے اس بارے میں تبادلہ خیال بھی کیا تھا" میں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"مگر اس نے مجھے ایک لفظ نہیں بتایا۔ سب بے خبر معلوم ہورہے ہیں" اول خان نے شکوہ کیا۔

"اس بے چاری کو باورچی خانے سے کب فرصت ملتی ہے" ویرا نے غزالہ کے لیے کلمہ حق بلند کیا "وہ اس وقت بھی ہم سب کے لیے ناشتا تیار کرنے میں مصروف ہے۔ فارغ ہوتی تو تمہیں کچھ بتاتی۔"

"حیرت ہے کہ رات کو یہ سب ہوگیا اور ہمیں بھنک تک نہیں ملی" سلطان شاہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔

"رات نہیں' وہ صبح کا اول وقت تھا۔ اصل اور گہری نیند کا غلبہ اسی وقت ہوتا ہے۔ تم دونوں گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے" میں نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا "تم دونوں کو ہر وقت دیکھ بھال کی ضرورت رہتی ہے۔"

"اب تم اس کار کو نظر انداز کرکے میجر بخشی سے بھڑ جانے کا فیصلہ کیے بیٹھے ہو؟" اول خان نے پوچھا۔

"یہ میرا فیصلہ نہیں' مجبوری ہے۔ اب سارا کھیل پپل کرنے پر منحصر ہے۔ اسے وقت مل گیا تو وہ فون نمبر کے سہارے یہاں کا پتا معلوم کرکے کوئی بھی مہم جوئی کر گزرے گا۔ پہلے بھی ہم ایسے تلخ تجربات میں نقصان اٹھا چکے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"ایک طرف تم بھارت جانے کا قصد کیے بیٹھے ہو۔ دوسری طرف میجر بخشی سر اٹھا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت ہمیں بھارتیوں سے بہت دور اور الگ تھلگ رہنا چاہیے۔ اس وقت کی آویزش بھارت میں تمہارے لیے مشکلات پیدا کرسکتی ہے" اول خان نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

"تم پھر وہی بات دہرا رہے ہو۔ صبح سویرے بخشی نے مجھے فون کیا تھا۔ میں نے اسے نہیں چھیڑا۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم اسے اور اس کی دھمکی کو نظر انداز کردو" ویرا بے ساختہ بولی "اول خان کی تشویش بالکل بجا ہے۔"

"بالکل نظر انداز کردو یہ یاد رکھنا کہ رات تک کرائے کے غنڈے یہاں یلغار کرکے سب کچھ تس نہس کردیں گے" میں نے تلخ لہجے میں جواب دیا "میجر بخشی بزدل آدمی ہے۔ وہ خود سامنے نہیں آئے گا۔ دوسروں کے بل پر اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنائے گا۔"

"وہ آئے تو ہم انہیں خاک اور خون میں نہلا دیں گے" ویرا نے پرجوش لہجے میں کہا "ہم نہتے نہیں ہیں۔"

"محلے والے ہماری وجہ سے مزید کوئی خوں ریزی برداشت نہیں کریں گے" اس بار میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا "آنے والوں کو خون میں نہلانے کے بعد ہمیں بھی یہاں سے کوچ کرنا پڑے گا۔ یہ شرنا کی آبادی ہے' غنڈوں اور لڑاکوں کی بستی نہیں ہے۔"

اول خان توجہ اور خاموشی سے وہ بحث سن رہا تھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں لب کشائی کی "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ دونوں طرف سے بات ٹل گئی ہے۔ جب تک بخشی کو لگام نہیں دی جاتی' خوں ریز تصادم کا خطرہ ہمارے سروں پر منڈلاتا رہے گا۔"

"تم اسے کس طرح لگام دو گے؟" ویرا اسی سے الجھ گئی "کیا اسے جان سے مار دو گے؟"

"یہ سوچنا پڑے گا" میں نے قدرے تشویش سے کہا "وہ سفارتی افسر ہے۔ پاکستان اور بھارت میں روز اول سے رقابت اور دشمنی چلی آرہی ہے۔ وہ لوگ کسی دلیل یا شہادت کو نہیں مانیں گے۔ جو کچھ بخشی کے ساتھ ہوگا وہی نئی دہلی میں کسی پاکستانی سفارت کار کے ساتھ ہوسکتا ہے۔"

"میرے ذہن میں بھی یہی سب اندیشے ہیں" اول خان نے میری تائید کی "میجر بخشی کے خوف سے ہم گھر چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے۔"

"اس اعتبار سے امریکی بہتر ہیں" سلطان شاہ نے زبان کھولی "یہاں ان کے متعدد آدمی مارے اور ذلیل کیے گئے ہیں لیکن اس کے جواب میں واشنگٹن یا نیویارک میں ہمارے کسی سفارتی افسر کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی گئی۔"

"امریکی اپنے ملک کا امن و امان برباد نہیں کرتے" ویرا نے جلے کٹے لہجے میں جواب دیا "وہ اسی سرزمین پر انتقام لیتے ہیں جہاں واردات ہوتی ہے۔ کیا تم لاکیرو سینٹر کی تباہی اور اسلام آباد میں ہونے والے بم دھماکے میں چار افراد کی ہلاکت کو بھول گئے؟"

سلطان شاہ چپ بہ جبیں ہو کر رہ گیا۔ ویرا نے اپنی بات جاری رکھی "اس طرح امریکیوں کی رواداری اور عظمت کا پرچم بلند رہتا ہے اور بدلہ بھی لے لیا جاتا ہے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کے جو آدمی مارے یا پکڑے جاتے ہیں وہ کھلے سفارتی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں پھر بھی غنڈا گردی ہوتی ہے' بدلے لیے جاتے ہیں' دہشت گردی کرکے بے گناہ شہری مارے اور معذور کیے جاتے ہیں۔"

"پھر تم نے کیا سوچ کر میجر بخشی کے خلاف پپل کرنے کی تجویز پیش کی تھی؟" اول خان نے پوچھا۔

"اسے پکڑ کر ذہنی طور پر مفلوج کیا جائے اور پھر چھوڑ دیا جائے" میں نے سفاکانہ انداز میں کہا "اس کا دماغ شیطانی خانہ ہے۔ اس کی تباہی ضروری ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ان کی ایجنسی کارروائی ہمارے کسی آدمی پر معمولی جسمانی تشدد تک محدود رہے گی۔"

"اسے کسی ممکن دوا کا ضرورت سے زیادہ ڈوز دینا چاہتے ہو؟" اول خان نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"کیمیائی تجزیے میں ایسی دوا پکڑی جائے گی۔ دماغ کے کسی نازک حصے پر ضرب ہی سب سے بہتر رہے گی۔"

"کیوں نہ اس بارے میں فون پر جلال سے مشورہ کرلیا جائے؟" اول خان نے دھیرے سے تجویز پیش کی۔

میرے دل میں جلال کے لیے بہت عزت تھی مگر اول خان کی تجویز پر میں چڑ کر رہ گیا۔ وہ ہمارا اتالیق نہیں ہے کہ ہر بات میں اس سے مشورہ کیا جائے۔ تم کچھ نہیں کرنا چاہتے تو اس سے مشورہ کیے بغیر بھی انکار کرسکتے ہو۔ میں تمہاری بات مان لوں گا۔"

اول خان چند ثانیوں کے لیے گنگ ہو کر رہ گیا پھر بولا "کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم بتاؤ' کیا کرنا چاہتے ہو' تم جس طرح چاہو گے' اسی طرح کیا جائے گا۔ میں نے آج تک تمہارے بتائے ہوئے کسی کام سے منہ نہیں موڑا۔"

اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں طیش میں آکر اس کے ساتھ زیادتی کر گزرا تھا۔ میں نے اسے منانے کے لیے مفاہمانہ لہجے میں کہا "تم جانتے ہو کہ جلال کس ایجنسی کے لیے کام کرتا ہے۔ ان لوگوں کے اپنے ضابطے اور مجبوریاں ہیں۔ وہ ہمیں قانون کے دائرے سے باہر کوئی کام کرنے کا مشورہ نہیں دے گا۔ ہم نے اسے چھیڑا تو اخلاقی طور پر ہم اس کے مشورے کے پابند ہو کر رہ جائیں گے۔"

"کسی سے مشورہ لیا جائے تو پھر اس کا احترام کرنا لازم ہوجاتا ہے۔" ویرا نے سہلاتے ہوئے میرا ساتھ دیا "وہ ہمارا قابل احترام دوست ہے۔ سب کچھ گزرنے کے بعد اسے بتا دیا جائے کہ کیا کچھ ہوا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی شکوہ کرلے گا مگر ہمیں روک نہیں سکے گا۔"

"میں امریکیوں کے چکر میں ایک مرتبہ تبادلے کی سزا بھگت چکا ہوں۔" اول خان نے ماضی کو یاد کرتے ہوئے ہلکی سی تلخی سے جواب دیا "وہ بحری جہاز سے ممنوعہ ہتھیاروں کی ایک بھاری کھیپ ملک میں اسمگل کرنے کا کھلا کیس تھا۔ اس معاملے میں میرے باس پر اتنا شدید دباؤ ڈالا گیا کہ وہ میرے اقدام کو حق بہ جانب سمجھنے کے باوجود میرا تبادلہ کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔"

"وہ واقعہ مجھے آج بھی یاد ہے مگر وہ حکومت کمزور تھی۔ امریکا سے گورے کلرک تک آکر یہاں کے بڑے بڑے عہدے داروں کو ڈانٹ پھٹکار کر چلے جاتے تھے اور کسی میں دم مارنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ آج وہ حالات تبدیل ہوچکے ہیں۔" میں نے بہت تحمل سے کہا۔

"اور ہمارے سامنے امریکی نہیں' بھارتی ہیں۔ ان کا کوئی اثر و رسوخ ہے نہ حمایت۔" سلطان شاہ نے قہقہہ دیا۔

"بھارتیوں کے بارے میں یہ تمہاری بھول ہے۔" ویرا نے ٹانگ اڑائی "بھارتی براہ راست بے بس ہیں لیکن درپردہ انہیں امریکا کی بھرپور تائید اور حمایت حاصل ہے۔ امریکی ان کی ہر بات پوری توجہ اور پسندیدگی کے ساتھ سنتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں اپنے مفاد کے تحفظ کا پورا حق حاصل ہے۔"

غزالہ موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے ٹرالی پر ناشتا سجا کر ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔ اول خان نے ناشتے کا آغاز کرتے ہوئے مجھے ایک مرتبہ پھر ٹوکا اور میں نے اسے میجر بخشی کے بارے میں اپنے پروگرام سے آگاہ کرنا شروع کردیا۔

○☆○

موہن ہاؤس کے باہر بھانت بھانت کے ماڈل کی گاڑیوں کا ہجوم دیکھ کر مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ موہن برادران کا میل جول کا حلقہ کتنا وسیع تھا۔ احاطے میں نصب پر شکوہ پھاٹک کا ایک در کھلا ہوا تھا۔ پورچ میں پڑی ہوئی کرسیوں پر لوگوں کی خاصی تعداد براجمان تھی۔ بہت سے افراد باہر ٹولیوں کی شکل میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ بہت سی گاڑیوں میں ڈرائیور وغیرہ بھی موجود تھے۔

اول خان نے پھاٹک سے آگے نکل کر گاڑی گھمائی اور ایسی جگہ پارک کردی کہ موہن ہاؤس کے پھاٹک سے باہر نکلنے والے ہمیں نظر آتے رہیں۔ ہم دونوں کسی فکر کے بغیر اپنی گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ وہاں جو ماحول تھا' اس کی روشنی میں ہمیں کسی کی توجہ کا مرکز بننے کا اندیشہ نہیں تھا۔

اس مہم پر ہم دونوں کے آنے کا سبب یہ تھا کہ ہم ہی میجر بخشی کو بہت اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اول خان اپنے پیشے کی ذمے داریوں کی بنا پر مشتبہ سفارت کاروں کی ذاتی طور پر دیکھ بھال کرتا تھا۔ میں کرنل جمال دستی کے روپ میں براہ راست میجر بخشی سے ملتا رہا تھا۔ ان دنوں وہ مجھے ایس ٹی ایف سے منحرف سمجھ کر مجھ پر ڈورے ڈالنے کی سرتوڑ کوشش کررہا تھا۔ وہ سلسلہ اس قدر طول پکڑ گیا تھا کہ اس سے گلوخلاصی کے لیے آخری ایام میں مجھے یہ کہانی تراشنی پڑی کہ مجھے ایس ٹی ایف میں مشتبہ قرار دے کر فارغ کردیا گیا تھا اور جبری طور پر مستعفا روانہ ہونے کا حکم دے دیا گیا تھا۔

اس دوران میں' میں نے دانستہ طور پر اپنے حلیے میں ایسی تبدیلیاں کرلی تھیں کہ میجر بخشی پہلی نظر میں مجھے کرنل جمال دستی کے طور پر ہرگز نہیں پہچان سکتا تھا۔ ہاں' میرے یا دولانے پر وہ آواز' چال ڈھال اور انداز گفتگو سے فوراً سمجھ لیتا کہ اس کا کس سے پالا پڑا ہے۔

ہم نے گھر سے نکلنے سے پہلے یہ اطمینان کرلیا تھا کہ میجر بخشی "کسی کام" سے نکلا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس روز بخشی کے لیے جگدیش موہن کی خودکشی پر اس کے پس ماندگان سے تعزیت سے زیادہ اہم کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے اس کے گھر فون کیا تو وہاں گھنٹیاں بجتی رہیں لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے دفتر فون کیا تو کسی خاتون نے جواب دیا۔ وہ خود فون پر نہیں تھا۔

میجر بخشی کے بارے میں کچھ بتانے سے پہلے اس خاتون نے میرا تعارف حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا نام تک رام تھا۔ میجر بخشی نے پچھلی رات یہ طے کیا تھا کہ وہ میرے ساتھ مل کر جگدیش موہن کے گھر جائے گا۔ اس اجنبی خاتون کے لیے میرا نام اور تعارف متاثر کن تھا۔ اس نے کسی وسوسے میں پڑے بغیر بتادیا کہ میجر بخشی اپنے گھر سے نکل کر سیدھا موہن ہاؤس گیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر اسے اپنے دفتر آنا تھا۔

وہ اطلاع ملتے ہی ہم دونوں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ہمیں ڈر تھا کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے میجر بخشی وہاں سے روانہ ہوگیا تو وہ سنہری موقع ضائع ہوجائے گا۔ ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ اس وقت میجر بخشی کہاں موجود تھا۔

ہم دونوں اس کے انتظار میں موہن ہاؤس کے باہر اپنی گاڑی میں بیٹھے رہے۔ میں عجلت میں روانگی کے سبب صبح کا اخبار نہیں دیکھ سکا تھا لیکن راستے میں باتوں کے دوران میں اول خان نے میرے استفسار پر دو نکات واضح کردیے تھے۔ گھریلو اسباب کی بنا پر جگدیش موہن کی خودکشی کی خبر اخبار کے پہلے صفحے پر نمایاں انداز میں شائع کی گئی تھی اور پچھلے روز مقامی پولیس دن کے گیارہ بجے سے پہلے ہری چند کی اس مسخ شدہ لاش تک پہنچ گئی تھی جسے اول خان کے آدمیوں نے صبح سویرے شہر کے ایک غیر آباد ساحلی علاقے میں ڈال دیا تھا۔ پچھلی شام میں نے ہری چند بن کر میجر بخشی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہوتی تو اس کا بھڑکنا یقینی تھا۔ وہ ایک فعال اور محترک سفارت کار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے مفادات سے تعلق رکھنے والی ایسی تمام خبروں اور افواہوں سے باخبر رہتا ہوگا جو شہر میں جنم لیتی رہتی تھیں۔

"یہاں بیٹھ کر انتظار کرنا خاصا صبر طلب کام ہے۔" میں نے اپنی آنکھوں پر جمتے ہوئے دھوپ کے چشمے کو درست کرتے ہوئے کہا "ہم دونوں میں سے کسی نے بھی اندر قدم رکھا تو موہن ہاؤس کے ملازمین ہمیں پہچان لیں گے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کیا جائے۔"

"اس وقت انتظار کرنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ میں تمہیں کوئی خطرہ مول لینے کا مشورہ نہیں دوں گا۔" اول خان نے فکرمندانہ لہجے میں کہا "یہاں پہنچنے کے بعد مجھے محسوس ہورہا ہے کہ میجر بخشی کے بارے میں ہمارا منصوبہ خاصا مشکل اور بے لچک ہے۔"

"کیوں؟ تمہیں اس کے اغوا میں کیا دشواری حائل ہوتی نظر آرہی ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہمارے پاس بہت کم وقت ہوگا۔ ولیم طے کرتے ہوئے ہم یہ بھول گئے کہ موہن ہاؤس سے بھارتی قونصلیٹ کا تقریباً سارا راستہ بہت پرہجوم اور بارونق ہے۔ کسی بھی سڑک سے ہم اسے نہیں لے جاسکیں گے۔"

اول خان کا وہ اندیشہ درست تھا۔ اولڈ کانفٹن کا وہ محدود رہائشی علاقہ ہی کچھ پرسکون اور ویران سا تھا۔ میجر بخشی وہاں سے نکل کر مین کانفٹن روڈ پر پہنچ جاتا تو وہاں سے فاطمہ جناح روڈ تک' کہیں کوئی ایسا سنسان مقام نہیں آتا تھا جہاں اسے گھیر اجاسکے۔

"ہمارے پاس کوئی متبادل نہیں ہے۔" میں نے چند ثانیوں تک اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد کہا "وہ ایک مرتبہ اپنے دفتر میں جاگھسا تو اس پر ہاتھ ڈالنے کا موقع ملنا مشکل ہے۔ کسی بزدل حریف کو گھیرنا کوئی آسان نہیں ہوتا۔"

"دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔" اول خان نے بے یقینی سے



کہا "ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ گاڑی خود چلا رہا ہے یا ڈرائیور کے ساتھ یہاں آیا ہوا ہے۔ اگر وہ ڈرائیور کے ساتھ ہے تو پھر ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ کوئی بھی چوک ہوئی تو ڈرائیور گاڑی نکال لے جائے گا۔"

میں نے اپنا اعتماد متزلزل ہوتا محسوس کیا اور ہلکی سی کھوکھلی ہنسی کے ساتھ کہا "وہ عام طور پر خود ہی ڈرائیونگ کرتا ہے۔"

"بڑے افسران اپنے دفاتر میں آمدورفت کے لیے شوفر کی موجودگی ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سے شان وشوکت کا اظہار ہوتا ہے۔"

ہم باتوں میں وقت گزارتے رہے۔ تقریباً بیس منٹ بعد موہن ہاؤس کے پھاٹک سے ہمیں میجر بخشی نکلتا ہوا نظر آیا۔ اس کے شانے ڈھلکے ہوئے تھے اور وہ آنے والی بدنصیبی سے بالکل بے خبر' اطمینان سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ وہ دن کا وقت تھا۔ سورج کی تیز روشنی میں دور ہی سے دیکھا جاسکتا تھا کہ اپنے ایک قریبی عزیز کی خودکشی پر میجر بخشی کے چہرے پر کوئی حزن وملال نہیں تھا۔

تھوڑی سی پیش قدمی کے بعد وہ سڑک کے دوسرے پہلو پر پارک کی ہوئی اپنی گاڑی کے پاس رک گیا۔

یہ دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کہ وہ رک کر چابی سے ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے کا قفل کھول رہا تھا۔ اس کے آس پاس کسی ڈرائیور کا سایہ تک نہیں تھا۔ اول خان کے ایک حوصلہ شکن اندیشے کی تردید ہوچکی تھی۔ میری دانست میں وہ ہمارے لیے نیک شگون تھا۔

میجر بخشی کی گاڑی کے حرکت میں آنے سے پہلے اول خان اپنی گاڑی کا انجن اسٹارٹ کرچکا تھا۔ جوں ہی بخشی کی کار قطار سے نکل کر آگے بڑھی' اول خان کی گاڑی بھی حرکت میں آگئی۔ بس گلی کے اختتام تک وہ ترتیب برقرار رہی۔ بخشی نے اپنی کار واپس گھمانے کے بجائے موڑ کاٹ کر دوسری سڑک سے واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اپنے فیصلے کے نتیجے میں وہ آبادی کے اندرونی اور قدرے سنسان حصے میں آنکلا تھا۔ اول خان نے وہ سب پہلے ہی سوچا ہوا تھا۔ اس نے یکایک اپنی گاڑی کی رفتار بڑھادی اور موڑ پر بخشی کے برابر سے ہوتا ہوا آگے نکلتا چلا گیا۔

اس کی وہ حرکت بڑی حد تک اضطراری اور بے حد خطرناک تھی۔ اس وقت موڑ پر مخالف سمت سے کوئی گاڑی آنکلی ہوتی تو اس سے ہمارا آمنے سامنے کا زوردار تصادم ہونا یقینی تھا مگر وہ راستہ خالی تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے ابتدائی فکر اور تشویش کے بعد ہمارے کام خود بہ خود آسان ہوتا جارہا ہو۔

وہ موڑ گھومنے کے بعد دل خوش کردینے والا منظر ہمارے سامنے تھا۔ داہنی طرف ایک چھوٹا سا خالی میدان تھا۔ بائیں طرف وسیع رقبے پر بنے ہوئے مکانوں کے احاطے کی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ بڑے مکانات پر مشتمل بیشتر آبادیوں کی طرح وہاں بھی سناٹے کا راج تھا جسے اس ماحول کے عادی شہری سکون کا نام دیتے ہیں۔ اول خان نے میدان صاف پاکر اپنی گاڑی کو اتنی تیزی سے بائیں طرف دبایا کہ میجر بخشی اپنی تمام تر کوشش کے باوجود ایک ہلکے سے تصادم کو نہ ٹال سکا۔

اس کی کار کا بمپر کا داہنا حصہ ہماری گاڑی سے ٹکرایا تھا۔ اول خان نے بریک لگادیے۔ میجر بخشی اپنی کار کا انجن بند کرکے ہم دونوں کے ساتھ ہی اپنی کار سے نیچے آیا تھا۔ اس کی بھویں تنی ہوئی تھیں اور چہرے پر شدید برہمی کے آثار تھے۔

"تم بہت رف ڈرائیونگ کررہے تھے۔" وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے انگریزی میں بولا "میں بروقت بریک نہ لگاتا تو یہ حادثہ سنگین ہوسکتا تھا۔"

اس کے مقابلے میں اول خان کی شخصیت مرعوب کن تھی اس لیے میجر بخشی اپنے غصے کا پوری طرح اظہار نہ کرسکا۔ اول خان نے اپنی گاڑی کا جائزہ لیا اور بولا "نقصان ہم دونوں کا ہوا ہے۔ غلطی میری نہیں' تمہاری ہے۔ تم نے پیچھے سے کار لڑائی ہے۔"

میجر بخشی کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے مگر اس کے بولنے سے پہلے میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں نے اپنے داہنے ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھی میں جمنے کی جگہ لگے ہوئے کیپسول کا رخ ہتھیلی کی طرف گھمایا تھا۔ میں نے بخشی کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر کہا "بڑے میاں! زیادہ مت پھیلو۔ ہمارا نقصان پورا کرو ورنہ تھانے چلنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔" میں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے داہنے ہاتھ کی انگلیوں پر ہلکا سا زور ڈالا۔

کیپسول میں بھرا ہوا سریع الاثر سیال باریک سوئی کے ذریعے میجر بخشی کے جسم میں اتر گیا۔ اس نے غصیلی نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن اسے جواب دینے کی مہلت نہ مل سکی۔ وہ کھڑے کھڑے تیورا گیا۔ میں نے پھرتی سے اسے اپنے بازوؤں پر سنبھال لیا۔ اول خان نے دوسری طرف سے بخشی کی بغل میں ہاتھ دیا اور ہم نے آناً فاناً میں اس کے بے ہوش وجود کو اول خان کی گاڑی کی عقبی نشست پر پہنچادیا۔

میں نے یہ بات پہلے نوٹ کرلی تھی کہ میجر بخشی کی کار پر کوئی سفارتی نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ وہ پرائیویٹ نمبر والی کار

استعمال کررہا تھا۔

"تم اس کی کار لے کر میرے پیچھے چلے آؤ۔" اول خان نے اپنی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے مجھے ہدایت دی۔

جب تک ہم انتظار کے تکلیف دہ مراحل سے گزر رہے تھے، وہ سب بہت مشکل نظر آرہا تھا۔ جب کارروائی کرنے کا وقت آیا تو سب کچھ اتنی سرعت اور روانی سے ہوتا چلا گیا جیسے وہ کسی ڈرامے کا پہلے سے لکھا ہوا منظر ہو اور ہر اداکار کو معلوم ہو کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میجر بخشی کو کسی بھی قسم کی مزاحمت کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ہماری دوسری خوش نصیبی یہ تھی کہ دور دور تک کوئی متنفس موجود نہیں تھا جو ہماری اس کارروائی میں مخل ہوتا یا عینی شاہد بنتا۔

میں نے میجر بخشی کی کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، انجن اسٹارٹ کیا اور اول خان کے پیچھے روانہ ہوگیا۔

ہم دونوں گھر سے روانہ ہوئے تو سب ہمارے بارے میں فکرمند تھے۔ سوچنے کی حد تک بخشی کا اغوا بہت مشکل کام نظر آرہا تھا۔ میں نے گاڑی چلاتے ہوئے بائیں ہاتھ کی مدد سے موبائل فون پر گھر کا نمبر ملایا تو دوسری طرف سے فوراً ہی ویرا لائن پر آگئی۔

"تم کہاں اور کس حال میں ہو؟" میری آواز سنتے ہی ویرا نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

"حال نہ پوچھو، بس یہ سمجھ لو کہ مرغا جال میں ہے اور اب ہم واپسی کا سفر طے کررہے ہیں۔"

"واپسی میں دیر ہو تو فون پر رابطہ کرتے رہنا۔" ویرا نے تاکید کی پھر بتایا "تھوڑی دیر پہلے تمہارے لیے جلال کا فون آیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ موبائل پر تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کررہا ہو۔"

"اس وقت میں اس سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" میں نے تیزی سے کہا "جب تک بخشی کا قصہ نہیں نمٹ جاتا، اس سے کوئی بات نہیں ہوگی۔ اس کا دوبارہ فون آئے تو تم میری طرف سے بے خبری ظاہر کرنا۔ اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں کہاں مل سکوں گا۔"

"وہ تم سے بات کرنے کے لیے خاصا مضطرب تھا۔ تم سے رابطہ نہ ہوا تو وہ اول خان کو پکڑ لے گا۔" ویرا نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ اسے میں سمجھا دوں گا بلکہ وہ خود بھی الگ تھلگ رہے تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

"مجھے حیرت ہے کہ تم جلال کی طرف سے اچانک اتنے بھڑک گئے ہو۔ تم نے ایک قدم اٹھالیا ہے۔ اب وہ تمہیں کیا مشورہ دے سکتا ہے؟"

"اسے بھڑکنا نہیں کہتے۔ میں احتیاط سے کام لے رہا ہوں۔ بخشی سے نجات حاصل کرنے کے بعد میں خود اس سے بات کرلوں گا۔"

ہم اولڈ کلفٹن سے نکل کر مصروف تر سڑکوں پر پہنچ رہے تھے۔ میں نے گفتگو مختصر کرکے فون بند کیا اور پھر اس کا سوئچ ہی آف کردیا کہ باہر سے آنے والی کوئی بھی فون کال میرے اپریٹس تک نہ پہنچ سکے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ جلال سے بات ہوئی تو وہ میجر بخشی کے بارے میں ہمارے فیصلے سے اختلاف کرے گا۔

اول خان نے شہر کے وسط سے گزرنے کے بجائے ڈیفنس کا راستہ اختیار کیا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا اور دل ہی دل میں اس کی حاضر دماغی کو سراہ رہا تھا۔ اس سفر میں میجر بخشی کی کار میرے استعمال میں تھی۔ شہر کے قلب سے گزرنے میں یہ خطرہ تھا کہ بخشی کا کوئی دوست یا ساتھی اس کی گاڑی میں ایک اجنبی چہرہ دیکھ کر خطرے کی بو سونگھ لیتا اور شہر میں قبل از وقت ہی وہ خبر پھیل جاتی۔ ایسی صورت میں ہم بخشی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اپنی مرضی کی راہ اختیار نہیں کرسکتے تھے۔ اس واقعے کی سنگینی کو کم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ بخشی اور اس کی کار ایک ہی مقام سے بازیاب ہو تاکہ اس کے اغوا کی کسی کہانی میں جان نہ پڑ سکے۔

ڈیفنس، گورا قبرستان اور پھر شارع فیصل سے ہوتے ہوئے ہم تھوڑی دیر بعد ملیر چھاؤنی کی حدود میں داخل ہوگئے۔ اسٹیشن فور کی چیک پوسٹ سے گزرنے کے بعد اول خان اپنی گاڑی کو اس بلاک کی طرف لیتا چلا گیا جس میں اس کا دفتر واقع تھا۔ وہاں حامد اور اس کے چند ماتحتوں نے ہمارا استقبال کیا۔ اول خان نے ان کو بخشی کے بارے میں چند ہدایات دیں اور مجھے ساتھ لے کر اپنے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

دفتر میں پہنچ کر میں نے اسے بتایا کہ جلال میری تلاش میں تھا مگر میں نے اس سے بچنے کے لیے اپنا موبائل فون بند کردیا تھا۔

"اب ہم بخشی پر ہاتھ ڈال چکے ہیں۔ وہ ہم سے یہ توقع نہیں کرسکتا کہ ہم اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اسے آزاد کردیں گے۔" اول خان نے سوچتے ہوئے کہا "تمہیں دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اپنی مجبوریوں کے ساتھ وہ تمہارے طریقہ کار سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔"

"بخشی ہوش میں آجائے اور ہم اس کے تیوروں کا اندازہ لگالیں پھر میں جلال سے بھی بات کرلوں گا۔" میں نے سگریٹ سلگا کر جواب دیا "اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک نام باقی تھا۔ بخشی کے ذریعے ہمیں شیام کا سراغ لگانا تھا۔ اسے ختم کرنے کے بعد کہانی کا وہ باب مکمل طور پر ختم

ہو جاتا۔

اول خان کے نوادرات کے ذخیرے سے دستیاب ہونے والی انگوٹھیوں کی کارکردگی میرے لیے آزمودہ تھی۔ ہم لوگ چائے نوشی سے فارغ ہوئے تھے کہ حامد نے دفتر میں آکر بخشی کے ہوش میں آنے کی اطلاع دی۔ اول خان نے اٹھ کر دراز بند کی اور ہم اس کے دفتر سے باہر نکل گیا۔

میرا خیال تھا کہ بھارتی فوج کے ریٹائرڈ میجر بخشی کو ایس ٹی ایف کی روایات کے مطابق کسی خالی کوٹھری میں بند کیا گیا ہوگا لیکن میں اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی دفتر تھا۔ میز کے پیچھے پڑی ہوئی بڑی سی کرسی خالی تھی۔ میجر بخشی ملاقاتیوں والی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ایس ٹی ایف کے دو سیاہ پوش اہل کار مسلط تھے جن سے وہ نالاں نظر آرہا تھا۔

اس نے ہمیں بہت غور سے دیکھا۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں خوف اور تشویش کے سائے لرزاں تھے۔

اول خان اس پر کوئی خاص توجہ دیے بغیر گھومنے والی کرسی پر جا بیٹھا۔ میں نے پہلو میں پڑی ہوئی گرسی سنبھال لی تاکہ کسی حد تک بخشی کے چہرے کا جائزہ لیتا رہوں۔ وہ میز کے ایک سرے پر اول خان کے روبہ رو موجود تھا۔ حامد دونوں ماتحتوں کے ساتھ دیوار کے قریب کھڑا ہوا تھا۔

"تم لوگ کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد بخشی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کچھ ضروری مذاکرات کرنے تھے۔" اول خان نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر خشک لہجے میں کہا "تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میجر بخشی نے بے بسی سے اپنے اردگرد نظریں دوڑائیں پھر کہا "یہ کوئی سرکاری دفتر معلوم ہوتا ہے۔ شاید تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ میں تمہارے ملک میں مہمان سفارت کار ہوں۔ مجھے دیانا کنونشن کے تحت یہاں بہت سے تحفظات اور سہولتیں حاصل ہیں۔ تم مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ مجھ سے کوئی شکایت ہے تو میرے سفارت خانے سے رجوع کرو اور مجھے ناپسندیدہ قرار دے کر یہاں سے نکال دو۔ اس سے آگے تمہاری ہر حرکت غیر قانونی ہوگی۔"

"تمہیں قانون پڑھانے کے لیے نہیں لایا گیا۔" اول خان کا اشارہ پا کر میں نے سخت لہجے میں کہا "تمہیں اگر قانون کی ابجد سے بھی واقفیت ہے تو تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ شرفا کو فون پر قتل وخوں ریزی کی دھمکیاں دینا کس قدر سنگین جرم ہے۔"

"میں نے کسی کو کوئی دھمکی نہیں دی۔" اس نے ہڑبڑاتے ہوئے، مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"میرا نام مظہر ہے۔" میرے وہ الفاظ اس کے اعصاب کے لیے بم ثابت ہوئے۔ وہ کرسی میں یوں اچھلا جیسے اچانک کسی بچھو نے اسے ڈنک مارا ہو۔ میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "آج صبح سویرے تم نے مجھے دھمکیاں دی تھیں۔ ان کے جواب میں تم اس وقت یہاں نظر آرہے ہو۔ یہ اظہریں۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر اول خان کی طرف اشارہ کیا "چاہو گے تو روبی بھی یہاں آجائے گا۔"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔" اس نے اپنے نچلے ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "میں کسی اظہر یا مظہر کو نہیں جانتا۔ روبی میرے مرنے والے دوست کا بھائی ہے مگر مجھے اس سے بھی کوئی پرخاش نہیں ہے۔ میں کسی کو فون پر کیوں دھمکیاں دوں گا؟"

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا تھا مگر تمہاری آواز پہچان لی گئی تھی۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی کرسی چھوڑ دی اور ٹہلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے بوکھلا کر اپنی کرسی چھوڑ دی۔ گفتگو شروع ہونے کے بعد اس کا خوف دھیرے دھیرے دہشت میں تبدیل ہو رہا تھا۔

میں اس کے سامنے کھڑا، چند ثانیوں تک اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر یکایک میرا داہنا ہاتھ گردش میں آیا۔ تڑاخ کی آواز کے ساتھ بھرپور طمانچہ اس کے بائیں رخسار پر پڑا اور وہ اپنا توازن کھو کر کرسی سمیت فرش پر گر گیا۔

طمانچہ کھا کر اس کے منہ سے چند مہمل آوازیں نکلی تھیں پھر وہ پھٹ پڑا "یہ ظلم اور بربادی ہے۔ تم مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے..."

"شٹ اپ!" میں نے دہاڑ کر اسے ڈانٹا پھر اس کی قمیص کا کالر کھینچ کر اسے فرش سے اٹھنے میں مدد دی۔ پے در پے تین مار کھا کر اس کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور کرسی میں ڈھیر ہو گیا۔

"تت... تم... منظر نہیں ہو۔" وہ خوف زدہ آواز میں ہکلایا "تمہاری آواز بدلی ہوئی اور کچھ جانی پہچانی سی ہے۔"

"ہاں!" میں نے درشت لہجے میں اس کی بات کاٹی "اب تمہارا دماغ صحیح سمت میں چل رہا ہے۔ صبح میں نے تمہاری آواز پہچان کر اپنی آواز بدل لی تھی۔ ذہن پر تھوڑا سا زور دو گے تو تمہیں ریٹائرڈ کرنل جمال دستی یاد آجائے گا۔ تمہیں آخر دنوں میں اس پر شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ ڈبل ہے۔ تم اور اوبرائن اسے گھیرا چاہ رہے تھے۔ وہ تم سے کھیل رہا تھا۔ وہ سب میرے ہی روپ تھے۔"



میری باتیں سن کر اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلتی چلی گئیں۔ میرے خاموش ہونے پر اس کے ہونٹوں سے پھنسی پھنسی، سرگوشیانہ آواز برآمد ہوئی "تم ذیبی ہو؟ اس کا مطلب ہے کہ میرے شبہات روزِ اول ہی سے درست تھے۔"

"اب تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ تم کہاں ہو۔ یہ کوئی سرکاری دفتر نہیں ہے۔ یہ کمرا تمہارا مقبرہ بھی بن سکتا ہے۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے ایک لمبا اور گہرا سانس لینے کے بعد تھکی تھکی آواز میں پوچھا۔

"تھوڑا سا تعاون!" میں نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ہمیں معلوم ہے کہ تم بڑھے ہو۔ آوارگیوں کی وجہ سے تمہاری ہڈیوں کا گودا بہت کم رہ گیا ہے۔ ہم تم پر تشدد نہیں کرنا چاہتے۔ بولتے رہو گے تو اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ اڑنے یا مکاری دکھانے کی کوشش کی تو تمہارا حشر کرشن کمار اور چند سے بھی زیادہ خراب ہوگا۔ ہم تمہیں سکا مار ڈالیں گے۔"

"تمہارے تیور خراب ہیں۔" وہ اپنے بائیں رخسار کو سہلاتے ہوئے بولا "تم نے مجھے بتایا ہے کہ تم ہی ذیبی ہو۔ یہ تمہاری نیت کی خرابی کی نشانیاں ہیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم مجھے مارنے کا فیصلہ کر چکے ہو۔ میں کچھ بھی کروں، تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔"

میں نے اسے پوری بات کہہ لینے کا موقع دیا پھر زبان کھولی "ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم نے ہٹ دھرمی نہ دکھائی تو تم زندہ رہو گے۔ تمہارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ ہم خاموشی سے تمہیں آزاد کردیں گے۔"

"میں کیسے مان لوں؟ تم آج تک صرف اس وجہ سے زندہ ہو کہ تمہاری کوئی تصویر ریکارڈ پر نہیں ہے۔ کوئی تمہیں دیکھ کر ڈبی کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتا۔ تم ایسے آدمی کو کیوں زندہ چھوڑو گے جو تمہیں پہچاننے کے قابل ہو چکا ہو۔"

"یہ پر امن بقائے باہمی کا سودا ہوگا۔" اس کے اٹھائے ہوئے مضبوط نکتے پر چند ثانیوں تک غور کرنے کے بعد میں نے زبان کھولی "تم مجھے بھولے رہو گے، میں تمہیں نظر انداز کرتا رہوں گا۔ جس دن تم نے میرے خلاف زبان کھولی، موت کہیں نہ کہیں سے تم پر ٹوٹ پڑے گی۔"

"تمہارے لیے میں دشمن ہوں... دشمنوں میں بھی شاید ایک نمبر دشمن۔ میں تمہارے قبضے میں آیا ہوا ہوں۔ تمہیں میری زندگی سے کیا محبت ہو سکتی ہے۔ تم مجھے کیوں زندہ رہنے دو گے؟ تم کیوں مجھے فریب دینے کی کوشش کر رہے ہو؟"

وہ بدکا ہوا تھا۔ اسے راہِ راست پر لانے کے لیے یہ یقین دلانا ضروری ہو گیا تھا کہ میں اسے زندہ رکھنے کے بارے میں کوئی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ یکایک میرے ذہن میں جلال کے فلسفے نے سر ابھارا اور میری زبان خود بہ خود چل پڑی۔

"تم ہمارے گلے کی ہڈی ہو۔" میں نے کہا "تمہیں نگلا جا سکتا ہے نہ اگلا جا سکتا ہے۔"

وہ خاموش اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا جیسے میری طرف سے مزید وضاحت کا منتظر ہو۔ میں نے دل ہی دل میں اس خبیث کو ایک بھاری سی گالی دے کر اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھا "اس بات کو یوں سمجھ لو کہ تم کتنے ہی بدمعاش اور موذی سہی، یہاں اپنے ملک کے ایک اہم سفارتی افسر ہو۔ تمہیں مار دیا گیا تو نئی دہلی میں اس کا ردِعمل ہوگا۔ تمہاری برادری کے لوگ تمہارے رتبے کے کسی پاکستانی افسر کو مار ڈالیں گے۔ یہ سودا بہت مہنگا ہوگا۔ یہ خطرہ ہم مول لے سکتے ہیں اور نہ نئی دہلی والے ایسی کوئی حماقت کریں گے۔ آپس کی دیرینہ دشمنی کے باوجود یہ خوف دونوں کے سفارتی عملے میں چھپے ہوئے سرکاری جاسوسوں اور مخبروں کی زندگی کا ضامن ہے۔ اب تمہیں یقین آجانا چاہیے کہ تم زندہ رہو گے۔"

"تم بہت خوں خوار اور درندہ صفت دشمن ہو۔ تمہاری شہرت خراب ہے۔ دشمن ہاتھ آجائے تو تم اسے بے رحمی سے ادھیڑ ڈالتے ہو۔ تمہاری زبان سے زندگی کی یہ سب یقین دہانیاں عجیب محسوس ہو رہی ہیں۔" وہ میری طرف سے شدید بے اعتمادی میں مبتلا تھا۔

"میں اتنا سفاک نہیں ہوں۔ تمہیں مارنا ہوتا تو میں اسی وقت تمہارا خاتمہ کر دیتا جب میں جمال دستی بن کر تمہارے بہت قریب ہو گیا تھا۔ جس خوف نے اس وقت مجھے تمہارے خون سے دور رکھا وہی اندیشہ اب بھی تمہاری زندگی کا ضامن ہے۔"

اس کا داہنا خشک ہو رہا تھا اس نے تھوک نگل کر بولنے کی کوشش کی تو اس کے الفاظ کا تلفظ بگڑا ہوا تھا "تم پر اعتبار کرنا مشکل ہے پھر بھی تم پوچھ لو۔ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"مجھے آدمی کے بدلے آدمی چاہیے۔ شیام کہاں چھپا ہوا ہے؟" میں نے براہِ راست سوال کیا۔

"تو کیا تم میرے بجائے اسے مارنے کا ارادہ کیے بیٹھے ہو؟" اس نے میرے سوال پر چونک کر پوچھا۔

"تمہیں اپنی زندگی کے سوا کسی اور چیز سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔" میں نے سرد مہری سے کہا "شیام یہاں کوئی سفارتی افسر نہیں ہے۔ وہ یہاں کا شہری ہے۔ اس نے

کوئی غداری کی ہے تو اس کو سزا ملنی ضروری ہے۔ یہ بتاؤ کہ وہ کہاں ملے گا۔"

"اس نے کسی سے غداری نہیں کی۔ وہ سب آپس کی باتیں تھیں۔ کرشن کو ہمیشہ سے دھڑکا رہتا ہے کہ روی کسی بھی وقت اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ سکتا ہے۔ اس ڈر کی وجہ سے اس نے شیام کو موہن ہاؤس میں ڈالا ہوا تھا۔ کرشن کمار کا وہ ڈر بالکل صحیح تھا۔ شیام نے خبر دی ہے کہ اسے روی نے ہی تمہارے ہاتھوں مروایا تھا۔ اس نے کرشن کمار کے ساتھ اپنے سالے سے بھی بے وفائی کی۔"

"آپس کی ان باتوں سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ وہ ایسی ذاتی باتیں تم تک کیوں پہنچاتا تھا؟" میں نے پہنچتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ماروتی کے لچھن اچھے نہیں ہیں مگر وہ کرشن کمار کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ میں نے جب بھی اس سے قریب ہونے کی کوشش کی' اس نے مجھے انکل کہہ کر میرے ارمانوں پر اوس ڈال دی۔ اس خوب صورت ناگن کی وجہ سے میں نے کرشن کمار کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی کو اس گھر کی نگرانی پر لگادے۔ اس نے شیام کو وہاں بھیج دیا۔ وہ اپنی خبریں مجھے دیتا تھا۔ میں کرشن کمار سے بات کرلیا کرتا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے اور کرشن کمار کے درمیان گہرے مراسم تھے؟" میں نے طنزیہ سوال کیا۔

"تم جانتے ہو کہ جب سیکرٹ ایجنٹ اپنے ملک سے باہر رہ کر ایک ساتھ کام کرتے ہیں تو ان کے درمیان کیسی گہری دوستیاں ہوجاتی ہیں۔" اس نے اس مرتبہ کھلے دل سے جواب دیا "یہ دوستیاں عمر بھر کام آتی ہیں۔ کبھی کبھی لے ڈوبتی ہیں۔" کرشن کمار یہاں اپنا کام کررہا تھا۔ اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہمارا تعلق ماروتی اور شیام سے آگے کچھ نہیں تھا۔"

"تم کرشن کمار سے لاتعلق تھے تو وہ یہاں کس کی ہدایات پر کام کررہا تھا؟"

"اس سوال کا جواب وہی دے سکتا تھا۔ میں نے کبھی اس کی ٹوہ لینے کی کوشش نہیں کی۔" بخشی کا بایاں ہاتھ غیر ارادی طور پر ایک مرتبہ پھر وہ رخسار سہلانے میں مصروف ہوگیا جو طمانچے کی زد میں آیا تھا۔

"تم انل بسواس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے توقف کے درمیان سگریٹ سلگانے کے بعد اچانک پوچھ لیا۔

اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی تیر رہی تھی "تمہارے دشمن تم سے بلاوجہ خائف نہیں رہتے۔ تم بہت باخبر معلوم ہوتے ہو۔ وہ انڈین سیکرٹ سروس کا ایک سینیئر افسر ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔"

"کیا تمہیں بھی معلوم نہیں کہ کرشن کمار اسی کے لیے کام کررہا تھا؟" میرالہجہ غیر ارادی طور پر ترش ہوگیا۔

"مجھے انل بسواس کی صحیح پوسٹنگ کا علم نہیں ہے۔ اگر وہ را کے پاکستان ونگ کا سربراہ ہے تو پھر کرشن کمار اسی کو جواب دہ ہوگا۔" وہ وہی بات کہہ رہا تھا جو جلال نے مجھے پورے وثوق سے بتائی تھی۔

انل بسواس کے بارے میں بخشی کے آخری جواب سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی مزاحمتی قوت دم توڑ چکی تھی۔ بس وہ اپنی پیشہ ورانہ فطرت سے مجبور ہوکر ہر جواب میں آڑ موڑ سے کام لے رہا تھا۔ اسے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ آس اس نکتے سے بندھی تھی کہ میں نے جمال دستی کے روپ میں اس سے بہت قریب ہوتے ہوئے اس کی جان لینے کی کوشش نہیں کی تھی تو اصل روپ میں سامنے آنے کے بعد بھی میں اس کی جان کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اپنی زندگی کی وہ ضمانت مل جانے کے بعد بخشی مجھ سے پوری طرح تعاون کررہا تھا۔

بخشی جن دنوں کراچی میں پیش آنے والے واقعات میں پوری طرح ملوث تھا' میں نے اس وقت اپنی طرف سے چشم پوشی اختیار کرلی تھی۔ اس کے مقابلے میں وہ اس تقریباً گوشہ نشین تھا۔ وہ اپنی کسی نئی سرگرمی کے نتیجے میں کا مستحق نہیں تھا۔ میں اس سے پوچھ گچھ کرکے اسے چھوڑ دیتا تو میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہوتا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ میری قید میں رہتے ہوئے جو وعدے کرتا' آزادی مل جانے کے بعد انہیں سرے سے فراموش کردیتا اور اپنے تجربات کو را کے ریکارڈ کا ایک حصہ بنوادیتا۔ اس کی ہر ہر کوئی حرکت مستقبل میں ہمارے لیے مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔

"باتوں کے جال میں تم نے میرے ایک سوال کو ابھی تک الجھایا ہوا ہے۔" میں نے اس سے ہونے والی ساری گفتگو کو اپنے ذہن میں دہراتے ہوئے خشک لہجے میں کہا "میرے ہر سوال کا جواب دیے بغیر تم آزادی حاصل نہیں کرسکو گے۔"

"اب کچھ بھی نہیں رہا۔ میں نے تمہیں ہر بات بتادی ہے۔ کرشن کمار کے مشن کے بارے میں مجھے تفصیل کا علم نہیں ہے۔"

"نشن خفیہ ہوتے ہیں۔" کرشن کمار کا ذکر نکل آنے پر میں نے وہی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "لیکن قریبی لوگ بھانپ لیتے ہیں کہ کون کیا کررہا ہے۔ تم نے اس کی سرگرمیوں کے بارے میں اپنی کوئی رائے ضرور قائم کی ہوگی۔"



"بھارت میں آباد ہندو ہی نہیں' مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی اب اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ دو قومی نظریہ غلط تھا۔ اس کی بنیاد پر خون کے دریا بہا کر برصغیر کو تقسیم کرنا اس سے بھی بڑی غلطی تھی۔ یہ زمین ہمیشہ سے ایک تھی اور اسے ایک ہی رہنا چاہیے۔ یہاں بھیجے جانے والے ہر خفیہ مشن کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے۔ مقصد حاصل کرنے کے طریقے حکومتوں کے آنے جانے سے بدلتے رہتے ہیں۔" اس نے رک رک کر کہا۔

"یہ اکھنڈ بھارت کا پرانا نعرہ ہے۔ اس کے ذریعے ہندو پورے علاقے پر اپنا راج قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔" اول خان نے کہا۔

"برصغیر ہمیشہ سے غیر مسلم اکثریت کا علاقہ رہا ہے۔" اس نے اپنے الفاظ کی حمایت میں وہ زہریلا مواد اگلنا شروع کردیا جو نہ جانے کب سے اس کے ذہن میں پک رہا تھا "چھوٹے موٹے رجواڑوں کو چھوڑ کر محمود غزنوی سے بہادر شاہ ظفر تک' مسلمانوں نے اس خطے پر راج کیا۔ یہ راج اقتدار کے بل بوتے میں ملا تھا۔ آج بھی وہی حکومت کرتا ہے جو طاقت ور ہوتا ہے۔ طاقت کی پوجا برصغیر کے رہنے والوں کے خمیر اور مزاج میں شامل ہے۔ بھارت ایک تھا' اسے ایک ہی رہنا چاہیے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ اس پر کون حکومت کرتا ہے۔ جس میں طاقت اور صلاحیت ہوگی' وہی اکھنڈ بھارت کو چلائے گا۔ جب باہر سے آنے والے مٹھی بھر مسلمان صدیوں حکومت کرگئے تو اکھنڈ بھارت میں بسنے والے کروڑوں مسلمان دوبارہ اپنے بزرگوں کے وارث کیوں نہیں بن سکتے؟"

"تم اکھنڈ بھارت بناکر خاموشی سے مسلمانوں کی بالادستی قبول کرلو گے؟" اول خان نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"تم برا نہ مناؤ تو مجھے کہنے دو کہ تم جیسے تنگ نظر سب کچھ گنڈ کروتے ہیں۔ اکھنڈ بھارت کو اسلام اور مسلمانوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اسلام اسی خطے کا مذہب ہے۔ یہ باہر سے آیا اور پھر یہاں پھیلتا چلا گیا مگر یہاں بسنے والے سارے مسلمان بغداد اور مدینے سے نہیں آئے۔ وہ پرانے زمانوں سے یہاں بسے ہوئے آریاؤں' دراوڑوں اور دوسری قوموں کی اولادیں ہیں جنہوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا اور بڑوں کے مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہوگئے۔ یہ سلسلہ دس بیس پشتوں سے یوں ہی چلا آرہا ہے۔ کبھی کسی نے مذہب کی بنا پر زمین کی تقسیم کا نعرہ نہیں لگایا تھا۔"

"اپنی یہ بکواس بند کرو۔" اول خان نے غصے میں اس کی بات کاٹ دی "تمہاری یہ رٹی رٹائی تقریر سادہ لوح دیہاتیوں کو گمراہ کرسکتی ہے۔ ہم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ تم لوگوں نے حقائق کو اسی طرح مسخ کیا ہوا ہے۔"

"تم نے چھیڑا ہے تو پھر مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔" میجر بخشی نے ڈھٹائی سے اصرار کیا اور اپنی بات جاری رکھی "ہماری اصل لڑائی صرف پاکستان سے ہے۔ جب امریکا میں مسلمان رہتے ہیں' چین میں رہتے ہیں تو اکھنڈ بھارت میں بھی رہ سکتے ہیں۔"

"دو قومیں اور دو ملک" اول خان نے اپنے داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں کو پوری طاقت سے فضا میں لہرا کر کہا۔

"یہ غلط ہے۔ ملک قوموں سے نہیں بنا کرتے۔ مسلمان ایک قوم ہیں تو پھر بنگلہ دیش کیوں بنا؟ تم ایران' افغانستان اور عراق سے کیوں نہیں مل جاتے۔ یہاں سے ترکی اور پھر افریقہ کے ساحل تک سب ہی مسلمان ہیں۔ انہیں ملا کر ایک ملک کیوں نہیں بنادیتے؟"

"اب تم نے اس بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہارا جبڑا توڑ دوں گا" اول خان کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے مکا تان کر اپنی کرسی چھوڑ دی۔

"ایک جبڑا ڈینی نے ہلایا ہے' دوسرا تم توڑ دو۔ میں بھارتی ہوں۔ تم میری آواز کو کچل سکتے ہو۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ ہر ایک یہی سوال کرتا نظر آئے گا۔ تم کس کس کے جبڑے توڑو گے؟ مخالف کی بات سننے اور دلیل کا جواب دلیل سے دینے کا حوصلہ پیدا کیے بغیر تم کچھ نہیں کرسکتے۔"

"اسکالر بننے کی کوشش مت کرو۔" میں نے بخشی کو ڈانٹا "ہم تمہارے نظریات سننے کے لیے تمہیں یہاں نہیں لائے۔ تم سے جو پوچھا جارہا ہے' اس کا جواب دو۔ زیادہ بڑھ بڑھ کر بولو گے تو میں بھی تم پر ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہوجاؤں گا۔"

"شاید تمہاری پوچھ گچھ ختم ہوچکی ہے۔ اب مجھے جانے کی اجازت دے دو۔ میں نے یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے کہ میری گاڑی باہر موجود ہے۔"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ شیام کہاں روپوش ہے" میں نے اسے یاد دلایا۔

"تم ہاتھ دھوکر اس کے پیچھے پڑ گئے ہو" میجر بخشی نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اس کا قصور اتنا زیادہ نہیں ہے۔ وہ تمہیں لی مارکیٹ کے گلزار ہوٹل میں مل جائے گا۔ روی کے گھر سے بھاگ کر وہ سیدھا وہیں پہنچا تھا۔ وہ ہوٹل میں اپنے اصل نام سے ہی ٹھہرا ہوا ہے۔"

"ہوٹل کا پتا اور فون نمبر کیا ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

"اس سے آگے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اس نے خود مجھے فون کیا تھا۔ میرے لیے وہ کبھی بھی اتنا اہم نہیں رہا کہ میں

کوئی غداری کی ہے تو اس کو سزا ملنی ضروری ہے۔ یہ بتاؤ کہ وہ کہاں ملے گا۔"

"اس نے کسی سے غداری نہیں کی۔ وہ سب آپس کی باتیں تھیں۔ کرشن کو ہمیشہ سے دھڑکا رہتا ہے کہ روی کسی بھی وقت اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ سکتا ہے۔ اس ڈر کی وجہ سے اس نے شیام کو موہن ہاؤس میں ڈالا ہوا تھا۔ کرشن کمار کا وہ ڈر بالکل صحیح تھا۔ شیام نے خبر دی ہے کہ اسے روی نے ہی تمہارے ہاتھوں مروایا تھا۔ اس نے کرشن کمار کے ساتھ اپنے سالے سے بھی بے وفائی کی۔"

"آپس کی ان باتوں سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ وہ ایسی ذاتی باتیں تم تک کیوں پہنچاتا تھا؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ماروتی کے پھپھی اچھے نہیں ہیں مگر وہ کرشن کمار کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ میں نے جب بھی اس سے قریب ہونے کی کوشش کی، اس نے مجھے انکل کہہ کر میرے ارمانوں پر اوس ڈال دی۔ اس خوب صورت ناگن کی وجہ سے میں نے کرشن کمار کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی کو اس گھر کی نگرانی پر لگائے۔ اس نے شیام کو وہاں بھیج دیا۔ وہ اپنی خبریں مجھے دیتا تھا۔ میں کرشن کمار سے بات کرایا کرتا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے اور کرشن کمار کے درمیان گہرے مراسم تھے؟" میں نے طنزیہ سوال کیا۔

"تم جانتے ہو کہ جب سیکرٹ ایجنٹ اپنے ملک سے باہر رہ کر ایک ساتھ کام کرتے ہیں تو ان کے درمیان کیسی گہری دوستیاں ہو جاتی ہیں۔" اس نے اس مرتبہ کھلے دل سے جواب دیا "یہ دوستیاں عمر بھر کام آتی ہیں۔ کبھی کبھی لے ڈوبتی ہیں۔" کرشن کمار یہاں اپنا کام کر رہا تھا۔ اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہمارا تعلق ماروتی اور شیام سے آگے کچھ نہیں تھا۔"

"تم کرشن کمار سے لاتعلق تھے تو وہ یہاں کس کی ہدایات پر کام کر رہا تھا؟"

"اس سوال کا جواب وہی دے سکتا تھا۔ میں نے کبھی اس کی ٹوہ لینے کی کوشش نہیں کی۔" بخشی کا بایاں ہاتھ غیر ارادی طور پر ایک مرتبہ پھر وہ رخسار سہلانے میں مصروف ہو گیا جو طمانچے کی زد میں آیا تھا۔

"تم اجل بسواس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے توقف کے درمیان سگریٹ سلگانے کے بعد اچانک پوچھ لیا۔

اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی تیر رہی تھی "تمہارے دشمن تم سے بلاوجہ خائف نہیں رہتے۔ تم بہت باخبر معلوم ہوتے ہو۔ وہ انڈین سیکرٹ سروس کا ایک سینیئر افسر ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔"

"کیا تمہیں بھی معلوم نہیں کہ کرشن کمار اسی کے لیے کام کر رہا تھا؟" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر ترش ہو گیا۔

"مجھے اجل بسواس کی صحیح پوسٹنگ کا علم نہیں ہے۔ اگر وہ را کے پاکستان ونگ کا سربراہ ہے تو پھر کرشن کمار اسی کو جواب دہ ہو گا۔" وہ وہی بات کہہ رہا تھا جو جلال نے مجھے پورے وثوق سے بتائی تھی۔

اجل بسواس کے بارے میں بخشی کے آخری جواب سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی مزاحمتی قوت دم توڑ چکی تھی۔ بس وہ اپنی پیشہ ورانہ فطرت سے مجبور ہو کر ہر جواب میں آڑ موڑ سے کام لے رہا تھا۔ اسے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ آس اس نکتے سے بندھی تھی کہ میں نے جمال دستی کے روپ میں اس سے بہت قریب ہوتے ہوئے اس کی جان لینے کی کوشش نہیں کی تھی تو اصل روپ میں سامنے آنے کے بعد بھی میں اس کی جان کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اپنی زندگی کی وہ ضمانت مل جانے کے بعد بخشی مجھ سے پوری طرح تعاون کر رہا تھا۔

بخشی جن دنوں کراچی میں پیش آنے والے واقعات میں پوری طرح ملوث تھا، میں نے اس وقت اس کی طرف سے چشم پوشی اختیار کر لی تھی۔ اس کے مقابلے میں [illegible] تقریباً گوشہ نشین تھا۔ وہ اپنی کسی نئی سرگرمی کے نتیجے [illegible] کا مستحق نہیں تھا۔ میں اس سے پوچھ گچھ کر کے اسے چھوڑ دیتا تو میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہوتا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ میری قید میں رہتے ہوئے جو وعدے کرتا، آزادی مل جانے کے بعد انہیں سرے سے فراموش کر دیتا اور اپنے تجربات کو را کے ریکارڈ کا ایک حصہ بنوا دیتا۔ اس کی کوئی حرکت مستقبل میں ہمارے لیے ملک ثابت ہو سکتی تھی۔

"باتوں کے جال میں تم نے میرے ایک سوال کو ابھی تک الجھایا ہوا ہے۔" میں نے اس سے ہوئے دن بھر کی ساری گفتگو کو اپنے ذہن میں دہراتے ہوئے خشک لہجے میں کہا "میرے ہر سوال کا جواب دیے بغیر تم آزادی حاصل نہیں کر سکو گے۔"

"اب کچھ بھی نہیں رہا۔ میں نے تمہیں ہر بات بتا دی ہے۔ کرشن کمار کے مشن کے بارے میں مجھے تفصیل کا علم نہیں ہے۔"

"مشن خفیہ ہوتے ہیں۔" کرشن کمار کا ذکر نکل آنے پر میں نے وہی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "لیکن قریبی لوگ بھانپ لیتے ہیں کہ کون کیا کر رہا ہے۔ تم نے اس کی سرگرمیوں کے بارے میں اپنی کوئی رائے ضرور قائم کی ہو گی۔"



"بھارت میں آباد ہندو ہی نہیں، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی اب اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ دو قومی نظریہ غلط تھا۔ اس کی بنیاد پر خون کے دریا بہا کر برصغیر کو تقسیم کرنا اس سے بھی بڑی غلطی تھی۔ یہ زمین ہمیشہ سے ایک تھی اور اسے ایک ہی رہنا چاہیے۔ یہاں بھیجے جانے والے ہر خفیہ مشن کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے۔ مقصد حاصل کرنے کے طریقے حکومتوں کے آنے جانے سے بدلتے رہتے ہیں۔" اس نے رک رک کر کہا۔

"یہ اکھنڈ بھارت کا پرانا نعرہ ہے۔ اس کے ذریعے ہندو پورے علاقے پر اپنا راج قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔" اول خان نے کہا۔

"برصغیر ہمیشہ سے غیر مسلم اکثریت کا علاقہ رہا ہے۔" اس نے اپنے الفاظ کی حمایت میں وہ زہریلا مواد اگلنا شروع کر دیا جو نہ جانے کب سے اس کے ذہن میں پک رہا تھا "چھوٹے موٹے رجواڑوں کو چھوڑ کر محمود غزنوی سے بہادر شاہ ظفر تک، مسلمانوں نے اس خطے پر راج کیا۔ یہ راج اکثریت کے بل بوتے نہیں ملا تھا۔ آج بھی وہی حکومت کرتا ہے جو طاقت ور ہوتا ہے۔ طاقت کی پوجا برصغیر کے رہنے والوں کے خمیر اور مزاج میں شامل ہے۔ بھارت ایک تھا، اسے ایک ہی رہنا چاہیے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ اس پر کون حکومت کرتا ہے۔ جس میں طاقت اور صلاحیت ہوئی، وہی اکھنڈ بھارت کو چلائے گا۔ جب باہر سے آنے والے مٹھی بھر مسلمان صدیوں حکومت کر گئے تو اکھنڈ بھارت میں بسنے والے کروڑوں مسلمان دوبارہ اپنے بزرگوں کے وارث کیوں نہیں بن سکتے؟"

"تم اکھنڈ بھارت بنا کر خاموشی سے مسلمانوں کی بالادستی قبول کر لو گے؟" اول خان نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"تم پرانا مناؤ تو مجھے کہنے دو کہ تم جیسے تنگ نظر سب کچھ گنڈ گدڑ کر دیتے ہیں۔ اکھنڈ بھارت کو اسلام اور مسلمانوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اسلام اسی خطے کا مذہب ہے۔ یہ باہر سے آیا اور پھر یہاں پھیلتا چلا گیا مگر یہاں بسنے والے سارے مسلمان بغداد اور مدینے سے نہیں آئے۔ وہ پرانے زمانوں سے یہاں بسے ہوئے آریاؤں، دراوڑوں اور دوسری قوموں کی اولادیں ہیں جنہوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا اور بڑوں کے مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے۔ یہ سلسلہ دس بیس پشتوں سے یوں ہی چلا آ رہا ہے۔ کبھی کسی نے مذہب کی بنا پر زمین کی تقسیم کا نعرہ نہیں لگایا تھا۔"

"اپنی یہ بکواس بند کرو۔" اول خان نے غصے میں اس کی بات کاٹ دی "تمہاری یہ رٹی رٹائی تقریر سادہ لوح دیہاتیوں کو گمراہ کر سکتی ہے۔ ہم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ تم لوگوں نے حقائق کو اسی طرح مسخ کیا ہوا ہے۔"

"تم نے چھیڑا ہے تو پھر مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔" میجر بخشی نے ڈھٹائی سے اصرار کیا اور اپنی بات جاری رکھی "ہماری اصل لڑائی صرف پاکستان سے ہے۔ جب امریکا میں مسلمان رہتے ہیں، چین میں رہتے ہیں تو اکھنڈ بھارت میں بھی رہ سکتے ہیں۔"

"دو قومیں اور دو ملک۔" اول خان نے اپنے داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں کو پوری طاقت سے فضا میں لہرا کر کہا۔

"یہ غلط ہے۔ ملک قوموں سے نہیں بنا کرتے۔ مسلمان ایک قوم ہیں تو پھر بنگلہ دیش کیوں بنا؟ تم ایران، افغانستان اور عراق سے کیوں نہیں مل جاتے۔ یہاں سے ترکی اور پھر افریقہ کے ساحل تک سب ہی مسلمان ہیں۔ انہیں ملا کر ایک ملک کیوں نہیں بنا دیتے؟"

"اب تم نے اس بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہارا جبڑا توڑ دوں گا۔" اول خان کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے مکا تان کر اپنی کرسی چھوڑ دی۔

"ایک جبڑا ڈیڈی نے ہلایا ہے، دوسرا تم توڑ دو۔ میں بھارتی ہوں۔ تم میری آواز کو کچل سکتے ہو۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ ہر ایک یہی سوال کرتا نظر آئے گا۔ تم کس کس کے جبڑے توڑو گے؟ مخالف کی بات سننے اور دلیل کا جواب دلیل سے دینے کا حوصلہ پیدا کیے بغیر تم کچھ نہیں کر سکتے۔"

"اسکالر بننے کی کوشش مت کرو۔" میں نے بخشی کو ڈانٹا "ہم تمہارے نظریات سننے کے لیے تمہیں یہاں نہیں لائے۔ تم سے جو پوچھا جا رہا ہے، اس کا جواب دو۔ زیادہ بڑھ بڑھ کر بولو گے تو میں بھی تم پر ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"شاید تمہاری پوچھ گچھ ختم ہو چکی ہے۔ اب مجھے جانے کی اجازت دے دو۔ میں نے یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے کہ میری گاڑی باہر موجود ہے۔"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ شیام کہاں روپوش ہے" میں نے اسے یاد دلایا۔

"تم ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہو" میجر بخشی نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اس کا قصور اتنا زیادہ نہیں ہے۔ وہ تمہیں لی مارکیٹ کے گلزار ہوٹل میں مل جائے گا۔ روی کے گھر سے بھاگ کر وہ سیدھا وہیں پہنچا تھا۔ وہ ہوٹل میں اپنے اصل نام سے ہی ٹھہرا ہوا ہے۔"

"ہوٹل کا پتا اور فون نمبر کیا ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

"اس سے آگے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اس نے خود مجھے فون کیا تھا۔ میرے لیے وہ کبھی بھی اتنا اہم نہیں رہا کہ میں

اس کی نقل و حرکت سے ہر وقت باخبر رہنے کی کوشش کروں۔ وہ کوئی سستا' رہائشی ہوٹل ہوگا۔ آسانی سے مل جائے گا۔"

"اب شاید بخشی کا کام پورا ہو چکا ہے۔ اسے بخش دینا چاہئے!" میں نے اول خان سے کہا۔

"کسی احتیاط کی ضرورت نہیں" اول خان دیوار کے قریب کھڑے ہوئے حامد سے مخاطب ہو کر بولا "بلکہ بہت احتیاط سے بخشی کو یوں سلا دو کہ اسے ہمیشہ کے لیے یادِ ماضی سے نجات مل جائے۔ وہ اب اس کے لیے عذاب بنی ہوئی ہے۔"

"کک... کیا کہہ رہے ہو تم؟" میجر بخشی بوکھلا کر مدافعانہ انداز میں اپنی کرسی سے اٹھ گیا "تم مجھے نہیں مار سکتے۔ ڈینی نے مجھ سے معافی کا وعدہ کیا تھا۔"

"خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں" میں نے نرمی سے اسے سمجھایا "یہ تمہیں بے ہوش کر کے کہیں پہنچا دیں گے۔"

"اب بے ہوش کرنے کی کیا ضرورت ہے!" وہ گھبرایا ہوا تھا "مجھے معلوم ہے کہ میں اسپیشل ٹاسک فورس کے کسی اڈے پر ہوں۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ خاموشی سے اپنی گاڑی میں گھر لوٹ جاؤں گا۔"

"یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا" اول خان نے نرمی سے کہا "ایس ٹی ایف کے اس اڈے کا محل وقوع بہت اہم ہے۔"

اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ حامد اور اس کے دو ساتھیوں نے میجر بخشی کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ اس نے وحشت زدہ آوازوں میں چیخنا چلانا اور مچلنا شروع کر دیا۔ ان کا مقابلہ تین صحت مند اور توانا جوانوں سے تھا۔ اس کی ایک نہ چل سکی اور وہ تینوں اسے اٹھا کر اس کمرے سے نکل گئے۔ اول خان نے بھی کرسی چھوڑ دی اور ہم دونوں وہاں سے نکل کر اس کے دفتر میں آ گئے۔

"تم نے حامد کو سمجھا دیا تھا کہ بخشی کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے؟" میں نے اول خان سے تصدیق چاہی۔

"اسے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ اب یادِ ماضی کا کوڈ استعمال کر کے اسے یاددہانی کرا دی ہے۔ وہ مارشل آرٹس میں مہارت رکھتا ہے۔ تربیت کے دوران میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ کھیل میں اپنے حریف کے سر کے کن حصوں پر ضرب لگانے سے گریز کرنا چاہیے۔ ایسی ضرب سے یادداشت ختم ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔"

"یہ کوئی یقینی طریقہ نہیں ہے" میں نے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اندازے کی ذرا سی بھی غلطی ہوئی تو مشق بے سود ثابت ہوگی۔"

"میں اس امکان سے غافل نہیں ہوں" اول خان نے مسکراتے ہوئے کہا "اس کی بے ہوشی زیادہ طویل نہیں ہوگی۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ ہوش میں آئے گا تو اندازہ ہو جائے گا کہ ضرب کس حد تک کارگر رہی ہے۔ اطمینان کیے بغیر ہم اسے آزاد نہیں کریں گے۔"

"یہ دیکھنا تمہارا کام ہے۔ ہمارے پورے منصوبے میں یہ کارروائی سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔"

اپنی بات مکمل کر کے میں نے فون اپنی طرف سرکا لیا اور گولڈن فارمیسی کا نمبر ملایا۔ اس وقت دوپہر ہونے والی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ جہانگیر اپنی دکان پر پہنچ چکا ہوگا۔ اس نے دوسری گھنٹی بجنے پر ریسیور اٹھا لیا۔

"تمہاری آواز بہت تر و تازہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صبح ٹھنڈے پانی سے نہا کر دکان پر آئے ہو؟" میں نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

"اوہ... بہت اچھا ہوا کہ تم نے فون کر لیا۔ میں پریشان تھا کہ اب تم سے کیسے رابطہ ہوگا؟"

"کیوں؟ کیا سلمٰی نے تمہارے فون کرنے پر کوئی پابندی لگا دی ہے؟" میں نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

"وہ بے چاری کیا پابندی لگائے گی' دراصل ہماری فون نمبروں والی ڈائری گم ہو گئی ہے' اسی وجہ سے میں رات کو فون نہیں کر سکا۔ یوں سمجھ لو کہ ہم تمہارے گھر سے بہت مشکل سے زندہ بچ کر لوٹے ہیں۔ میری گاڑی میں دو سوراخ ہو چکے ہیں۔ وہ گولیاں ہمارے سروں میں بھی پیوست ہو سکتی تھیں۔"

جہانگیر کے اس انکشاف نے مجھے حیران کر دیا "اتنی رات گئے تم ہمارے گھر کے پاس کیا کرنے آئے تھے؟"

"یوں سمجھ لو کہ شامت نے دھکا دیا تھا۔ تم دونوں کھانا چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ سلمٰی نے بار بار افسوس کیا تو میری کھوپڑی سنک گئی۔ تھوڑی سی ترنگ بھی تھی۔ ہم دونوں کھانا لے کر تمہارے گھر پہنچے تھے مگر وہاں رکنے سے پہلے ہی ہماری گاڑی پر دو بے آواز فائر ہوئے اور ہم بوکھلا کر بھاگ نکلے۔"

"اوہ! تو وہ تمہاری گاڑی تھی" میں نے دانت پیس کر کہا "ہم سب پریشان ہیں کہ ہمارے گھر کے پاس مشتبہ گاڑی کیا کر رہی تھی۔ وہ کسی شریف آدمی کے گھر کھانا پہنچانے کا کون سا وقت تھا...؟ کیا تم یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم دونوں کو رات فاقے سے گزارنی پڑی ہوگی۔"

"بس نشے کی جھونک میں کچھ زیادہ ہی ہمدردی ابھر آئی تھی" وہ میرے غصے کا برا منائے بغیر بولا "سلمٰی نے بھی دکھ روکنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ میں ہر وقت

وقار یوسف
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تمہارے دروازے پر دستک دے سکتا ہوں۔ میں چل پڑا' یہ بتاؤ کہ وہ فائر کس نے کیے تھے؟"

"آئندہ بھول کر بھی ایسی حماقت نہ کرنا۔ آج کل ہماری چھت پر دو بے خطا نشانہ لگانے والے پہرے داری کرتے ہیں۔ انہوں نے گاڑی کا ہی نشانہ لیا تھا۔ تم کو زد میں لے لیتے تو ذرا سوچو کہ کیا ہوا ہوتا؟"

"چھوڑو یار! میرے تو رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ اب کان پکڑتا ہوں کہ رات میں کبھی تمہاری طرف نہیں آؤں گا۔"

اول خان حیرت سے منہ پھاڑے میری یک طرفہ گفتگو سن رہا تھا۔ میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بغیر اسے بتایا کہ رات گئے بلکہ صبح سویرے نظر آنے والی مشتبہ کار میں جہانگیر ہمارے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ وہ بات سن کر اول خان نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ یہ غنیمت ہوا تھا کہ اس کے مامور کیے ہوئے پہرے داروں کے نشانے سچے تھے۔ ان سے اندازے کی ذرا سی بھی غلطی ہوئی ہوتی تو ایک المناک سانحہ رونما ہو سکتا تھا۔

"اب زیادہ ڈھنڈورا نہ پیٹو اور پہلے اپنا نمبر لکھوا دو" ریسیور میں جہانگیر کی خفت آمیز آواز ابھری۔

میں نے اپنے گھر کا نمبر دہراتے ہوئے کہا "نمبر نوٹ کر لو مگر میں اس وقت گھر پر نہیں ہوں۔ کہیں اور سے بول رہا ہوں۔ میں نے ایک ضروری کام سے تمہیں فون کیا تھا۔ پتا نہیں تم وہ کام کر بھی سکو گے یا رہ جاؤ گے۔ اب تم کو کوئی دستے داری سوچنے سے پہلے کئی بار سوچنا پڑے گا۔"

"رات کی اور بات ہوتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ نشہ زیادہ ہو جائے تو عقل چوپٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔ دن میں' میں بوتل کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ مجھ سے زیادہ نخرے نہ کرو اور کام بتاؤ۔ کوئی ڈھنگ کا کام ہوا تو میں اسی وقت گرگزوں گا۔ وہ ہوش میں آکر رکے بغیر بولتا چلا گیا۔

"تھوڑی دیر کے لیے تمہیں اپنی دکان سے اٹھ کر جانا ہوگا۔" میں نے اس پر واضح کیا۔

"پہیلیاں نہ بجھواؤ' کام بتاؤ۔ ضرورت ہوئی تو میں تھوڑی دیر کے لیے دکان پر تالا بھی ڈال سکتا ہوں۔ دونوں ملازموں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"اپنے ساتھ جلوس لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں" میں نے اسے ڈانٹ دیا "لی مارکیٹ تمہاری دکان سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں گلزار ہوٹل پہنچ کر تمہیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہاں شیام نامی شخص کس کمرے میں مقیم ہے۔"

"یہ تو کوئی کام ہی نہ ہوا۔ میں دس منٹ میں دیکھ آتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ گلزار ہوٹل میرا دیکھا ہوا ہے۔"

"شیام کو معلوم نہ ہو سکے کہ تم اس کے بارے میں کچھ پوچھنے آئے تھے" میں نے اسے تاکید کی۔

فون پر جہانگیر کے ہنسنے کی آواز ابھری "میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اسی سے پوچھنے پہنچ جاؤں۔ چھوٹے ہوٹل کے کسی بیرے کے لیے پچاس روپے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ مجھے اس کا کھایا پیا تک معلوم ہو جائے گا۔" اس نے مجھے یقین دلایا۔

"بس پھر ابھی نکل جاؤ۔ میں پندرہ منٹ بعد تمہیں فون کروں گا۔ ہوٹل تمہاری دکان کے آس پاس ہی ہونا چاہیے۔"

میں نے فون بند ہی کیا تھا کہ اول خان بول پڑا "تم نے جہانگیر کو بلاوجہ ہی ملوث کر لیا۔ مجھے اس پر بھروسا نہیں ہے۔"

"تم اس کے ماضی سے لاعلم ہو اس لیے ایسا کہہ رہے ہو۔ ایسے معاملات میں وہ ویرا اور سلطان شاہ کے کان کتر سکتا ہے۔"

"وہ لی مارکیٹ میں ہی بیٹھا ہوا ہے۔ شیام کا پتا چلا لے گا اور وقت بچ جائے گا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ وہ اپنے کمرے میں موجود ہے تو میں پولیس کو وہاں روانہ کیے دیتا ہوں۔ اسے ہوٹل سے نکال کر خاص یہاں پہنچا دیا جائے گا۔"

"پھر جہانگیر کی تصدیق کا انتظار نہ کرو۔ کسی کو بھیج دو" میں نے اضطراری لہجے میں کہا "وہ کمرے میں نہ ہوا تو کسی اور وقت وہیں لوٹے گا۔ تمہارا آدمی ہوٹل کے آس پاس رک کر اس کا انتظار کر سکتا ہے۔ ہمیں وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔"

خامہ مصروف تھا۔ میجر بخشی کے دفتر پہنچے بغیر اسے کسی اور کام میں الجھانا مناسب نہیں تھا۔ اول خان نے فون پر ہی اپنے اردلی کو طلب کیا اور اس کے ذریعے سپاہیوں کی ماتحت کو دفتر میں بلوا لیا۔ ایس ٹی ایف کے بیشتر اہل کاروں کی طرح ستار بھی مضبوط بدن کا مالک تھا۔ اس کی کنپٹیوں پر نمودار ہونے والی' بالوں کی سفیدی اس کی ڈھلتی ہوئی عمر کی چغلی کھا رہی تھی ورنہ وہ اپنی صحت کے اعتبار سے جوان نظر آرہا تھا۔ اس نے دروازے سے اندر گھستے ہی اول خان کو فوجی انداز میں سلیوٹ کیا اور پھر اس کی میز کے سامنے پہنچ کر مودب انداز میں رک گیا۔

"لی مارکیٹ کے گلزار ہوٹل میں شیام نامی ایک شخص مقیم ہے" اول خان نے مختصر اور نپے تلے الفاظ میں اسے بتایا "خاموشی سے اسے اٹھا کر یہاں لانا ہے۔ ایم ٹی سیکشن والوں سے ڈرائیور سمیت گاڑی لے کر ابھی روانہ ہو جاؤ۔"



"یس سر!" اس نے ایڑیاں بجا کر کہا پھر پوچھا "سر! مار پیٹ' ٹوٹ پھوٹ کے لیے کوئی حکم؟"

"ضرورت کے تحت سب جائز ہوگا۔ ایریس ساتھ لے لینا تاکہ دیر ہونے کی صورت میں ریڈیو روم کو اطلاع دے سکو۔"

وہ ایڑیاں بجا کر پلٹا اور اول خان کے دفتر سے نکلتا چلا گیا۔ میری نگاہیں دروازے تک اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ اسپیشل ٹاسک فورس والوں کی زندگی بھی بہت عجیب اور قابلِ رشک تھی۔ وہ ویرانوں میں زندگی گزارتے تھے۔ گھر بار اور بال بچوں سے دور رہ کر دن رات خطرات سے کھیلتے رہتے تھے۔ ان کے نزدیک فرض ہی زندگی تھی اور فرض ہی تفریح۔ کرنے کو کچھ نہ ہو تو ان کے لیے ڈیوٹی کے اوقات مقرر تھے جن میں وہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے کیمپ کی مختصر سی دنیا کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے کوشاں رہتے تھے اور کام نکل آتا تھا تو دن' رات یا موسم کی پروا کیے بغیر وہ ہر وقت تیار رہتے تھے۔

"جہانگیر کا گلزار ہوٹل جانا ضروری نہیں تھا لیکن اس بہانے اس سے ملاقات ہو گئی" اول خان کہہ رہا تھا۔

"اس احمق نے بہت بڑا عقدہ حل کر دیا۔ وہ مشتبہ کار وہ رہ کر میرے ذہن میں چبھ رہی تھی" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس وقت تم اسے فون نہ کرتے تو شاید یہ الجھن کئی دنوں تک برقرار رہتی۔ پتا نہیں اس کی گم شدہ فون ڈائری کب ملتی ہے۔ خوف کی وجہ سے وہ تمہارے گھر کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں خاموشی سے تیر کر آنے والی گولیاں بڑے بڑے سورما کا پتا پانی کر سکتی ہیں۔"

"نشے میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ آدمی کے ذہن پر جو دھن سوار ہو جائے وہ اسے پورا کر کے رہتا ہے۔ سلمٰی نے اسے خیال دلایا کہ ہم اس کے گھر سے بھوکے واپس گئے ہیں اور وہ وقت کی پروا کیے بغیر دو بھوکوں کو کھانا پہنچانے پر تل گیا۔"

"بھوکے!" اول خان ہنس دیا "وہ سمجھ رہا ہوگا کہ روئے زمین پر تم دونوں کا اس رات کا رزق اسی کے گھر میں اتارا گیا ہے۔ شراب کی ان خوبیوں اور خامیوں پر تم ہی روشنی ڈال سکتے ہو۔ میں نے کبھی چکھی اور نہ میں نشے کے اثرات سے واقف ہوں۔"

"بس یہ سمجھ لو کہ نشہ بھنگی کو بادشاہ اور بادشاہ کو بھنگی بنا سکتا ہے۔ اس سے بچنا ہی سب سے بہتر ہے۔"

وقت بہت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ اول خان کا اردلی اس کی عادات سے واقف تھا۔ اپنے افسر کو فرصت میں دیکھ کر وہ دوبارہ چائے لے آیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے اول خان کو جلال کا خیال آگیا۔ ہماری توقعات کے برعکس اس نے اول خان سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد حامد نے دفتر میں آکر اطلاع دی کہ میجر بخشی کے سر کے عقبی حصے پر لگائی جانے والی ضرب کارگر ثابت ہوئی تھی۔ اس کی یادداشت ماؤف ہو کر رہ گئی تھی۔ اول خان نے اپنا دفتر چھوڑنے کے بجائے بخشی کو حامد کے ساتھ وہیں بلوا لیا۔

"بعض اوقات یادداشت عارضی طور پر ناکارہ ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ بحال ہو جاتی ہے۔ میں نے ان دونوں کے پہنچنے سے پہلے اندیشہ ظاہر کیا "دیکھنا ہوگا کہ حامد کا وار کتنا کامیاب رہا ہے۔"

میجر بخشی دفتر میں داخل ہوا تو اس کے چہرے سے ساری بشاشت رخصت ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ سیاٹ تھا' آنکھیں بالکل ویران نظر آرہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں لاتعلقانہ انداز میں یوں حرکت کر رہی تھیں جیسے اجنبی چیزوں کو دیکھ رہی ہوں۔

"میجر بخشی!" اول خان نے آزمانے کے لیے اسے پکارا۔ وہ چونک کر اول خان کی طرف متوجہ ہوا اور بڑھتا چلا آیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اول خان نے اسے ہدایت دی "اور یہ بتاؤ کہ تم اپنے دفتر کے بجائے یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"مجھے نہیں پتا۔ کچھ یاد نہیں آرہا کہ دفتر کہاں ہے اور میں کہاں ہوں' تم کون ہو؟" اس نے الجھے الجھے لہجے میں کہا۔

"تمہیں اپنا نام معلوم ہے؟" اول خان نے اس کی باتوں کو نظر انداز کر کے نرمی سے پوچھا۔

"ہاں۔ مگر کچھ اور یاد نہیں آرہا" اس کی آنکھوں میں زندگی کی ہلکی سی رمق نظر آئی۔ وہ اپنی بھوؤں پر زور دے کر تیوریوں میں بل ڈال کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی وہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکی۔ وہ تھک کر جھنجلا گیا۔ اس کی آنکھیں بے رونق ہو گئیں اور اس نے دونوں ہاتھوں سے بے اختیار اپنی کنپٹیاں بھینچ لیں "اوہ بھگوان! ہر طرف اندھیرا اور سناٹا ہے۔ کچھ یاد نہیں آتا۔ میرا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے' اسے توڑ دو۔"

وہ کسی گہری اذیت میں مبتلا تھا۔ اس کے اوپری ہونٹ کی جلد اور پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئیں۔

"تم روی' جگدیش' انل بساواں' کرشن کمار' ہری چند اور شیام میں سے کس کس کو جانتے ہو؟" اول خان کی آواز گونجی۔

"چپ رہو... اب چپ رہو۔ اجنبی نام میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہے ہیں، مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

اول خان کی نگاہوں میں، اس کے لیے رحم کا جذبہ عود کر آیا "اسے لے جاؤ" اس نے حامد کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اور بے ہوش کر کے اس کی گاڑی سمیت کسی پتھریلے ساحل پر چھوڑ آؤ۔ گاڑی دور ہو اور یہ پتھروں پر پڑا ہوا ہو۔ سمجھنے والے سب کچھ سمجھ لیں گے مگر دوسروں کو یہ معلوم ہو گا کہ ویران ساحل کی سیر کرتے ہوئے بخشی پتھروں پر گرا اور سر پر چوٹ آنے سے بے ہوش ہو گیا۔"

"او کے سر!" حامد نے کہا اور بخشی کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے کرسی سے اٹھا لیا۔ اس کے لب خاموش تھے مگر اس کی آنکھیں کربناک انداز میں نیم وا تھیں۔ حامد اسے دھیرے دھیرے باہر لے گیا۔

"بظاہر حامد کامیاب رہا ہے" میں نے خوش ہو کر کہا "اب یہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکے گا۔"

"اس کا قصہ نمٹ گیا۔ تم جلال سے کب بات کرو گے؟" اول خان نے میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر پوچھا۔

میں نے جیب سے موبائل فون نکال کر اس کا پاور سوئچ آن کر دیا اور کہا "اس کا فون نہ آیا تو میں گھر سے بات کروں گا۔" میرے ذہن میں یہ بات چبھ رہی تھی کہ جلال نے اس وقت تک اول خان سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اول خان کی لاعلمی میں مجھ سے کسی موضوع پر بات کرنے کا خواہاں تھا۔ ایسی صورت میں اسٹیشن فور سے اسے فون کرنا مناسب نہیں تھا۔

اول خان اپنے کاموں سے فارغ ہو چکا تھا۔ میجر بخشی کو حامد کے حوالے کیا جا چکا تھا۔ ستار، شیام کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ دفتر سے اٹھ گیا۔ اسی لمحے مجھے یاد آیا کہ جہانگیر ہوٹل سے مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے بعد میری کال کا انتظار کر رہا ہو گا۔ میں نے چلتے چلتے، اول خان کے فون پر اس کا نمبر ملا لیا۔

وہ اپنی دکان پر موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ ہوٹل پہنچنے کے بعد شیام اپنے ضروری کاموں کے لیے صرف دو تین بار تھوڑی دیر کے لیے ہوٹل سے نکلا تھا ورنہ مسلسل اپنے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ ناشتا اور کھانا بھی اس نے کمرے میں ہی منگوایا تھا۔

میں نے اسے بہت معمولی سا کام سونپا تھا جسے اس نے خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ برسوں پر محیط، ایک طویل وقفے کے بعد ایسا کام کرنے میں جہانگیر کو ایسا لطف آیا تھا، وہ شیام کے بارے میں مزید بہت کچھ کر گزرنے پر آمادہ تھا۔

میں چند فقروں میں اسے ٹال کر اول خان کے ساتھ دفتر سے نکل آیا۔ باہر میجر بخشی کی گاڑی کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ حامد چند منٹ کے اندر ہی اسے لے کر اسٹیشن فور سے روانہ ہو چکا تھا۔ ان لوگوں میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے میں کسی قدر تاخیر ہو سکتی تھی۔ فیصلوں پر عمل درآمد کے سلسلے میں پوری فورس بہت زیادہ مستعد تھی۔ چند ثانیوں بعد ہم بھی واپسی کا سفر طے کر رہے تھے۔

ہماری گاڑی اسٹیشن فور اور چھاؤنی کی حدود سے کچھ ہی دور نکلی تھی کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنی شروع ہو گئی۔ میں نے بٹن دبا کر کال ریسیو کی تو لائن پر جلال موجود تھا "تم کہاں غائب ہو؟" اس نے میری آواز سنتے ہی شکوہ کیا "اپنے گھر پر موجود نہیں ہو اور موبائل شاید بند کیا ہوا تھا۔ یہ میری پانچویں کال ہے۔ ہر بار ریکارڈنگ سنائی دے رہی تھی۔"

"بس، ایک چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ موبائل واقعی بند تھا۔ تمہاری طرف خیریت تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"خیریت ہی ہے۔ میں اپنی بات بعد میں سناؤں گا۔ پہلے تم یہ بتاؤ کس چکر میں مصروف تھے۔"

"میجر بخشی ہمارے گلے پڑ گیا تھا۔ اس کا قصہ نمٹا رہا تھا۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا تھا۔ مجھے جواب دیتے ہوئے یہ اندازہ تھا کہ جلال میری زبان سے میجر بخشی کا نام سنتے ہی اچھل پڑے گا۔

"وہ کیسے گلے پڑ گیا؟" جلال کی آواز سے پریشانی جھلک رہی تھی "میں نے تمہیں اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا۔"

"ہم اسے بھولے ہوئے تھے مگر اس نے آج صبح فون کر کے مجھے دھمکیاں دی تھیں۔"

"میری مس ویرا لائیڈ سے بات ہوئی تھی۔ اس نے اس بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا" اس کا لہجہ اشتباہ آمیز تھا۔

"تم نے بخشی کا ذکر کیا ہوتا تو وہ کچھ بتاتی۔ تم نے میرے بارے میں دریافت کر کے فون بند کر دیا تھا۔ اگر تمہیں میرے بیان پر یقین نہیں ہے تو تم اول خان سے اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔ وہ پورے واقعات سے باخبر ہے۔"

"مجھے تمہاری ہر بات پر یقین ہے۔ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہم جدھر سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں، وہیں پھنس جاتے ہیں" اس کی آواز میں بے چارگی جھلکنے لگی "مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ میں اپنے آدمیوں کے تحفظ کے لیے ایسے ہر تصادم سے بچتا ہوں۔ تم نے بخشی سے زیادہ پھیر چھاڑ تو نہیں کی؟"

"ہم چپ سادھ لیتے تو وہ ہمارے سروں پر چڑھ آتا۔ ام

اس کی یادداشت صاف کرکے آرہے ہیں۔"

"اوہو۔۔۔ یہ برا ہوا۔ اب دیکھ لینا' نئی دہلی سے جلد ہی ایسی کوئی خبر آجائے گی۔"

وہ اس واقعے کا پورا پس منظر جانے بغیر نتائج پر چھلانگیں لگا رہا تھا۔ میں نے اسے تحمل سے پوری تفصیل سننے کا مشورہ دے کر اپنی کہانی شروع کردی۔ وہ درمیان میں ضمنی سوالات بھی کرتا رہا۔ جن کے نتیجے میں وہ موضوع خاصا طول پکڑ گیا۔ جب میں اپنی بات مکمل کرکے خاموش ہوا تو وہ اس بات سے متفق ہوچکا تھا کہ ان حالات میں اس سے بہتر فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔

"یہ ناگزیر خطرہ تھا جو تمہیں مول لینا پڑا۔ اب میری آرزو ہے کہ بخشی کو کچھ بھی یاد نہ آسکے اور اس کے بڑے اس کے سر میں آنے والی چوٹ کو ساحل کی تفریح کے دوران میں پیش آنے والے حادثے کا نتیجہ سمجھتے رہیں ورنہ پھر کوئی بے گناہ پاکستانی افسر عتاب میں آجائے گا۔"

"میرے ساتھ اول خان نے بھی یہی کوشش کی ہے مگر یہ بات کوئی اہم نہیں کہ کیسے گاہ بخشی موہن ہاؤس والوں سے تعزیت کرنے کے بعد دفتر لوٹنے کے بجائے ویران ساحل پر بکھرے ہوئے پتھروں پر پھسلنے پہنچ گیا۔"

"یہ اندیشہ اپنی جگہ برقرار ہے" اس نے اعتراف کیا "وہ دفتر میں کسی نہ کسی کو اپنی سرگرمیوں سے ضرور باخبر رکھتا ہوگا۔ اس شخص کو معلوم ہوگا کہ بخشی کو صبح سویرے شیام کے ذریعے پیغام ملا اور بخشی نے اظہر اور منظر کو پھینٹی دے ڈالا۔"

"مجھے کسی اور کا خدشہ نہیں ہے۔ اس نے صبح چار بجے کے قریب اپنے گھر سے مجھے فون کیا تھا۔ پھر وہ گھر سے ہی موہن ہاؤس روانہ ہوگیا۔ وہاں سے واپسی پر وہ دھر لیا گیا۔ اسے دفتر میں اپنے کسی افسر یا ماتحت سے ملنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ فون پر کسی کو اپنی کارگزاریوں کی تفصیل سنانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ فوری طور پر شاید کسی کو کچھ معلوم نہ ہوسکے کہ بخشی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔"

"اگر تم نے پہلے سے یہ سب سوچا ہوا تھا تو پھر میں بھی پرامید رہوں گا کہ تمہاری کارروائی کا کوئی جواب نہیں آئے گا۔"

"ساری باتیں پہلے سے طے شدہ نہیں تھیں۔ واقعات رونما ہونے کے ساتھ ساتھ فیصلے ہوتے رہے۔ اسے ساحل پر ڈلوانے کا فیصلہ اول خان نے مشورے کے بغیر اور اچانک کیا تھا۔ یہ بات مجھے ابھی ابھی سوجھی ہے کہ بخشی کو کسی سے تفصیلی بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ مزید کچھ اچھے پہلو خود بہ خود سامنے آتے چلے جائیں۔"

"اسلام آباد خبروں کا گڑھ سمجھا جاتا ہے مگر یہاں سناٹا ہے۔ تم کراچی میں بیٹھ کر خبروں کو جنم دے رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ بخشی کے دفتر میں ابھی تک کسی کو علم نہیں ہوا کہ اس پر کوئی افتاد آپڑی ہے۔ انہیں پتا چل جاتا تو انڈین ہائی کمشنر کے دفتر میں کھلبلی مچ جاتی۔"

"وہ جگدیش موہن کی تعزیت کے لیے گیا تھا۔ اس کی ارتھی شام کو اٹھائی جائے گی" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا "انڈین تو نصلیٹ والے سمجھ رہے ہوں گے کہ اس نے اپنے ذاتی مراسم کی بنا پر آخری رسوم کی ادائیگی تک رکنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"پھر تو انہیں رات گئے ہی ہوش آئے گا۔ اس سے پہلے وہ اطمینان سے بیٹھے رہیں گے۔"

"میرا اندازہ ہے کہ اس سے پہلے پولیس بخشی تک پہنچ جائے گی۔ تم کو انڈین ہائی کمیشن کے ابتدائی ردعمل پر نگاہ رکھنی ہوگی۔ اس سے پتا چلے گا کہ وہ معاملات کو کس رخ پر لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"چھینٹا چھاڑ میں پہل بخشی نے کی مگر ایسے تصادم کے لیے یہ وقت بہت ناموزوں ہے۔ تم بھارت جانے کا قصد کیے بیٹھے ہو۔ میری خواہش ہے کہ تم جلد از جلد وہاں پہنچ جاؤ۔ دونوں ملکوں کے تعلقات میں کوئی تلخی یا کشیدگی پیدا ہوئی تو تمہیں روانگی کا ارادہ ملتوی کرنا ہوگا۔"

"اب بخشی کو رونے سے سود ہے۔ اسے بھول جاؤ اور نئے واقعات کا انتظار کرو۔ تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہیں میری تلاش کیوں تھی۔"

"میں تمہیں جگدیش موہن کی خودکشی سے آگاہ کرنا چاہ رہا تھا۔ تم پہلے ہی اس واقعے سے باخبر ہو۔"

"وہ ایک الگ کہانی ہے۔ جگدیش نے مارواڑی کی کچی روی سے دل برداشتہ ہوکر خودکشی کی ہے اور روپ من اپنی جان بچانے کے لیے کسی اچانک بیماری کا بہانہ کرکے کسی نہ کسی اسپتال میں پناہ گزین ہے۔ بخشی اس سے بھی بہت بدظن تھا۔" جگدیش کا ذکر آنے پر مجھے چند لفظوں میں اصل کہانی دہرانی پڑی۔ جلال کے لیے وہ ایک نیا موضوع تھا۔ اس پر بنت سنے واقعات منکشف ہورہے تھے۔ اس نے سوالوں کا سلسلہ شروع کردیا۔

بات سے بات نکلتی رہی اور مجھے شیام کا ذکر بھی کرنا پڑا۔ بخشی والی گڑبڑ میں کلیدی کردار اسی نمک حرام کا تھا۔

"اس کے بارے میں زیادہ سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں" جلال نے فیصلہ کن آواز میں مشورہ دیا "بعض اوقات دو ٹکے کے آدمی اپنے ذرا سے لالچ کے لیے کوئی قیامت ڈھا



کر دیتے ہیں۔ بخشی کو شیام نے ورغلایا تھا۔ اپنے مالک کو دغا دینے والے کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیے۔"

"آج میں تمہاری زبان سے پہلی بار کوئی سخت فیصلہ سن رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ اول خان چھوٹے گناہ گاروں کا خون بہانے سے ڈرتا ہے۔ شیام نے خود اپنے کسی بڑے جرم کا اعتراف نہ کیا تو اول خان اسے مارنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔"

"اسے سمجھاؤ کہ جب کسی گلتے ہوئے عضو کی وجہ سے انسان کی جان پر بن آئے تو ایسے عضو کی پرورش نہیں کی جاتی۔ بے رحمی سے عضو کو کاٹ کر الگ پھینک دیا جاتا ہے۔ تمہیں سوچنا چاہیے کہ آدھی انگڑیا لولا ہوجائے گا۔"

"اس وقت وہ ڈرائیونگ میں مصروف ہے۔ تم کسی وقت فون کرکے اسے خود ہی یہ بات سمجھا دینا۔ میری نظروں میں شیام بھی کرشن کمار کا ساتھی ہے۔ اسے مارنے کے لیے اس کا یہی ایک جرم کافی ہے۔ کرشن کمار اپنا آلۂ سیدھا کرنے کے لیے ہمیشہ عیب داروں کے سر پر ہاتھ رکھتا تھا۔"

"میری الک اور بات گرہ سے باندھ لینا" گفتگو کے دوران میں شاید جلال کو کوئی نئی بات یاد آگئی "بھول کر بھی ایگریشن کے ذریعے بھارتی سرحد عبور نہ کرنا۔ بھارت جانے کے لیے کھلی سرحد کا تھوڑا سا خطرناک حصہ ہی بہتر رہے گا۔"

"اول خان بلاوجہ ہی ہمارے پاسپورٹ اور ویزا کے لیے پریشان ہورہا ہے" میں نے کہا۔

"صرف شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوالو۔ ان کا ریکارڈ کہیں رہتا ہے۔ تمہیں ویزا لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں اول خان کو بتادوں گا۔ ایسے کام دو نمبر ہوں گے اور ایسے بے داغ ہوں گے کہ ان پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔"

"میں ایک بار ان کی سرزمین پر پہنچ جاؤں تو مجھے پاسپورٹ اور ویزا کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ بھارت میں پاکستانی کے بجائے بھارتی بن کر رہنا بہت آسان ثابت ہوگا۔ پاسپورٹ ہوا تو مسائل پیدا کرتا رہے گا" میں نے کہا۔

"کسی دوسرے ملک میں غیر قانونی طور پر رہنا اتنا آسان نہیں ہے" میرے کانوں میں اس کی ناصحانہ آواز آئی "ویسوں ایسے مسائل پیدا ہوں گے کہ تم پریشان ہوجاؤ گے۔ کہیں قانون کی گرفت میں آگئے تو تمہاری کوئی داد و فریاد تک نہیں سنی جائے گی۔"

"جب پاسپورٹ بنوانا ہے تو پھر قانونی طریقے سے سرحد کیوں نہ پار کی جائے؟"

"ویزا لینے اور سرحد عبور کرنے کے لیے تمہیں تصویروں کے ساتھ اپنے سارے کوائف دینے ہوں گے جو انڈین ریکارڈ کا ایک حصہ بن جائیں گے۔ میں تمہیں ریکارڈ سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔ کسی ریکارڈ کے بغیر اصل جیسا ویزا لگے گا۔ ایمگریشن کی مہریں لگی ہوں گی۔ امرتسر پہنچنے کے بعد تم ڈنکے کی چوٹ پر خود کو پاکستان کہہ سکو گے کوئی تمہاری سفری دستاویزات پر شبہ نہیں کرسکے گا۔"

"ابھی وہ مرحلہ دور نظر آرہا ہے" میں نے ہنس کر جواب دیا "وقت آئے گا تو دیکھ لیا جائے گا۔"

"پاسپورٹ تم بنوالو۔ باقی کام چند گھنٹوں میں ہوجائیں گے" اس نے اصرار کیا "یہاں رہ کر تم سنپولیوں کا سر کچلتے کچلتے تھک جاؤ گے۔ نئی دہلی جاکر اقبال بسواس کو ہمیشہ کی نیند سلادو۔ برسوں کے لیے چین ہوجائے گا۔"

میں نے دل میں سوچا کہ اوبرائن ڈی ہنٹ کے متعلق بھی ایسی ہی خوش فہمیاں تھیں۔ اس کو کراچی میں اس بری طرح خوف زدہ کیا گیا کہ ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے بھی نئی دہلی میں پناہ لی تھی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ میں ان ہی دنوں رستم ایرانی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا اور پھر بھاری معاوضہ دے کر رستم کے آدمیوں کے ذریعے اوبرائن کو نئی دہلی میں مروادیا۔

اوبرائن نئی دہلی میں بظاہر ایک حادثے کا شکار ہوکر مرا تھا۔ وہ رستم کے آدمیوں کی منصوبہ بندی تھی مگر کسی کام نہ آسکی۔ اوبرائن کی موت کے بعد امریکیوں کی سرگرمیاں ماند ضرور پڑیں تھیں مگر ان کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ پھر اوبرائن کی جگہ جان آسمتھ آگیا اور امریکیوں نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھانا شروع کردیا۔

جلال' اقبال بسواس کے بارے میں ایسی ہی خوش فہمیوں کا اظہار کررہا تھا مگر میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموشی سے اس کی بات سن لی۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پاکر جلال نے ذرا سے توقف کے بعد کہا "اگر تم گھر جارہے ہو تو وہاں پہنچ کر مجھے فون کرلینا۔ میں تمہیں اور اول خان کو تفصیل سے ہر بات سمجھا دوں گا۔ تم جب چاہو گے' بے فکری سے بھارت کے سفر پر روانہ ہوجاؤ گے۔"

"ابھی میں گھر کا رخ نہیں کروں گا" میں نے اسے ٹالنے کی نیت سے کہا "جب بھی وقت ملا' تم سے بات ہوجائے گی۔"

اول خان راستے میں مجھے اتار کر اپنے گھر جانے کا ارادہ کرکے اسٹیشن فور سے نکلا تھا مگر گلشن اقبال پہنچ کر اس کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ انجن بند کرکے میرے ساتھ ہی اتر گیا۔ گھر میں سب ہی بے چینی کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ فون کرکے ہمیں کچھ نہ کچھ

بتاتے رہنا لیکن تم اپنا موبائل ہی بند کر کے بیٹھ گئے" مجھ سے سامنا ہوتے ہی ویرا نے لڑاکا انداز میں کہا "تمہاری ان ہی حرکتوں کی وجہ سے میں تمہارے ساتھ جانے پر اصرار کرتی ہوں۔"

"دل کھول کر لڑ لینا مگر ڈینی کو گھر کے اندر تو پہنچنے دو" اول خان نے محظوظ ہوتے ہوئے میری سفارش کی۔

"تم ہر وقت ڈینی کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہو" ویرا مجھے بھول کر اول خان کی طرف متوجہ ہوگئی "یہ تمہارے ساتھ مل کر ہمیں بالکل فراموش کر دیتا ہے۔ اسے احساس نہیں ہوتا کہ ہم سب اس کی طرف سے کتنے فکر مند رہتے ہیں۔"

"فکر مند ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر ری کھیلنا فکر مندی کی نشانی ہے تو اس میں، میں بھی تمہارا شریک تھا" سلطان شاہ نے انکشاف کیا۔

"خدا کا خوف کرو ویرا!" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا "ری کھیل کر فکر مندی کا احسان جتا رہی ہو۔"

"وقت گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ تاش کا پیکٹ سلطان شاہ نے نکالا تھا" ویرا نے کھسیا کر کہا۔

"یہ باتیں چلتی رہتی ہیں۔ یہ بتاؤ کہ آپ کے دشمن کا کیا بنا!" ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد غزالہ نے پوچھا۔

"وہی ہوا جو ہم نے پہلے سے طے کر لیا تھا۔ وہ ہوش و حواس میں ہے مگر اپنی یادداشت سے محروم ہو چکا ہے" غزالہ ہماری باتوں میں بہت کم دخل انداز ہوتی تھی۔ میں نے اس کا صبر آزمانے کے بجائے فوراً ہی جواب دے ڈالا۔

"یہ کیسے ممکن ہوا؟" ویرا نے حیرت سے پوچھا "سر کے کسی حصے پر ایسی نپی تلی ضرب لگانا بہت مشکل کام ہے۔"

"اسٹیشن فور پر اس فن کا ایک ماہر موجود ہے" اول خان نے جواب دیا "یہ کام اسی نے کیا ہے۔"

"اس کی یادداشت متاثر ہوئی ہے تو وہ شہر میں بھٹکتا پھرے گا۔ اسے کہاں چھوڑا گیا ہے" وہ سوال بھی ویرا نے کیا تھا۔

"وہ بہت کچھ بھول چکا ہے مگر اپنا نام جانتا ہے" مجھے خاموش پا کر اول خان نے ہی بتایا "ہم نے اس پر زیادہ وقت برباد نہیں کیا۔ یہ اندازہ اس کے ساتھی لگا سکیں گے کہ اسے کیا کچھ یاد رہا ہے۔ وہ بیشتر باتیں فراموش کر چکا ہے۔"

"دیکھنا ہوگا کہ جلال اس واقعے پر کس ردِ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے" سلطان شاہ نے کہا۔

"اس سے بات ہوگئی ہے۔ وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ بخشی کی دھمکی کے بعد کوئی محدود جوابی کارروائی ضروری ہوگئی تھی" میں نے جواب دیا "بخشی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس سے بات کی جاتی تو شاید اس کا مشورہ کچھ اور ہوتا۔"

"روی اسپتال میں ہے یا اس نے ارادہ ملتوی کر دیا؟" غزالہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس کے بارے میں صحیح علم نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے ارادہ ملتوی نہیں کیا ہوگا۔ بخشی کی دھمکی سے وہ زیادہ خوف زدہ ہوگیا تھا۔"

جو لوگ اس مہم میں ہمارے ساتھ شریک نہیں تھے ان کے ذہنوں میں بے شمار سوالات کلبلا رہے تھے۔ جن کے جواب دینے کی ذمے داری اول خان نے سنبھال لی تھی اس دوران میں جب جہانگیر کا لطیفہ سامنے آیا تو سب ہی ششدر رہ گئے۔ یہ بات کسی کے سان و گمان میں بھی نہیں تھی کہ صبح سویرے ایس ٹی ایف کے پہرے داروں کی فائرنگ کی زد میں آنے والی کار جہانگیر کی ہو سکتی تھی۔

"وہ دیوانہ ہے" ویرا اضطراری انداز میں بولی "سلمیٰ نے اس کی بسیار نوشی پر قابو نہ پایا تو وہ کسی دن شہر میں آوارہ گردی کرتا ہوا مارا جائے گا اور وہ بیٹھے بٹھائے یہ ہو جائے گی۔"

ویرا کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ میں غصے کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا "پی لینے کے بعد وہ خود کو میں محفوظ رکھتا ہے۔ اپنی قیمت پر باہر نہیں نکلتا۔ رات کو اس کی ذہنی رو کسی کی طرف بھٹک گئی تھی اور وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔"

"پھر بھی اسے کم پینی چاہیے۔ وہ روزی آپے سے ہو جاتا ہوگا" ویرا نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

"خوب! یہ تم کہہ رہی ہو" سلطان شاہ نے موقع فائدہ اٹھالیا "وہ بے چارہ تم سے بات چھپاتے ہے۔ تمہارا خون بھی اب سرخ کے بجائے ہو چکا ہوگا۔ جس کو پتا جائے گا' وہ جھوم جھوم کر اپنی جان دے گا۔"

"مجھے اس سے مت ملاؤ" ویرا نے اس نکالیں" میں جو کچھ کرتی ہوں اپنی حد میں رہ کر کرتی میں سے کسی نے آج تک مجھے بہکتے ہوئے نہیں پی کر سرور میں آنے اور دھت ہو جانے میں بہت فرق ہے۔"

"تمہاری بتائی ہوئی ان باریکیوں سے ہم میں سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچے گا" سلطان شاہ نے کہا "ڈینی تمہاری برادری سے نکل چکا ہے۔ یہ باتیں کسی وقت جہانگیر کو بتانا، وہ تمہاری بے تکی باتیں بھی بہت دھیان سے سنتا ہے۔"

ویرا نے جھلا کر اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا پانی کا گلاس لائٹر سلطان شاہ پر پھینک مارا۔ وہ ویرا کے ایسے کسی جواب کے لیے تیار تھا۔ اس نے لائٹر لپک کر احترام سے میز



طرف بڑھادیا۔ میں نے بے پروائی سے اسے سینٹر ٹیبل پر ڈال دیا۔

ہمارے گھر پہنچنے کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد حامد کا فون آیا۔ وہ اپنی رپورٹ دینے کے لیے اول خان کی تلاش میں تھا جب کہ اول خان اس کا فون آنے سے چند ہی منٹ پہلے ہمارے پاس سے اپنے گھر کے لیے روانہ ہوا تھا۔ میں نے اس سے میجر بخشی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ ساحل کے مطلوبہ علاقے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا ٹکراؤ ایس پولیس پارٹی سے ہوگیا جس کی سربراہی کوئی نیا اے ایس پی کر رہا تھا۔

حامد نے اسے ایس ٹی ایف کا حوالہ دیا اور اپنا شناختی کارڈ بھی دکھایا لیکن وہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر محکمے میں نیا ہونے کے باعث ایس ٹی ایف کے وجود' افادیت اور اہمیت سے بالکل بے خبر تھا۔ اس نے بخشی کے بے ہوش وجود کو اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دیکھ کر حامد کو اپنی ساتھ پولیس کی گاڑی پر مجبور کیا۔ وہ حامد کے لیے نیا تجربہ تھا۔ وہ بھی اڑ گیا اور گزارش کرنے پڑی۔

حامد کے ساتھ واپسی کے لیے فورس کی ایک گاڑی اور کچھ مسلح آدمی بھی تھے۔ وہ سب سادہ لباس میں تھے۔ بات زیادہ بڑھ جانے پر حامد کو دونوں گاڑیوں سمیت تھانے جانا پڑا۔ وہاں پہنچتے ہی مسئلہ حل ہوگیا۔ ایس ایچ او نے خود اپنے دفتر سے باہر آکر حامد سے اپنے ماتحت کی بے خبری پر معذرت کی اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ خاموشی اور رازداری کے ساتھ اپنا کام پورا کرنے کے ارادے سے گیا تھا۔ اس ناخوش گوار واقعے کے نتیجے میں بات کھل چکی تھی۔ حامد نے ساحل کی طرف واپسی کا ارادہ ملتوی کر کے بخشی کو براہ راست پولیس کی تحویل میں دینے کا ارادہ کرلیا۔ ایس ایچ او اس بات پر راضی تھا کہ وہ بخشی اور اس کی کار کی برآمدگی ایس ٹی ایف والوں کے طے کردہ مقام سے دکھائے گا۔ اس گفتگو میں حامد نے بخشی کی کوئی شناخت ظاہر نہیں کی تھی۔

حامد نے اپنے ارادے کی توثیق کے لیے اسٹیشن فور فون کیا تو اول خان وہاں سے نکل چکا تھا۔ اس نے میرے موبائل نمبر پر رابطہ کرنا چاہا تو وہ دیر تک مصروف ملتا رہا۔ شاید اس وقت میری اور جلال کی بات ہو رہی تھی۔ حامد نے تبدیلی کا فیصلہ منسوخ کر دیا۔

وہ میجر بخشی کو کار سمیت اس ویران ساحل پر لے گیا جہاں دیوار بنانے کے لیے ریت پر پتھروں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ اس کی دونوں گاڑیوں کے پیچھے تھانے کا ایس ایچ او ایک موبائل میں نفری لے کر آیا تھا۔ حامد نے رسمی کارروائی کے طور پر جوں ہی بخشی کو پتھروں پر منتقل کیا' پولیس


فیروپائرین (رجسٹرڈ)
قائم شدہ 1956
T.M. Reg. 7635

فیروپائرین — دانتوں میں لگے ہوئے سب کیڑوں کو جڑ سے بالکل ختم کر دیتی ہے۔
فیروپائرین — دانتوں اور مسوڑوں میں ٹھنڈ اور گرمیاتی گلنا بند کر دیتی ہے۔
فیروپائرین — پائیوریا کی خطرناک بیماری دور کر کے دانتوں اور مسوڑوں کو تندرست رکھتی ہے۔
فیروپائرین — مسوڑوں سے گندہ اور بادی پانی خارج کر کے درم اور سوزش اتار تا ہے۔
فیروپائرین — مسوڑوں سے خون نکلنا بند کر کے مسوڑوں کو مضبوط اور سخت بناتی ہے۔
فیروپائرین — منہ کے ان تمام جراثیم کو ہلاک کرتی ہے جو دانتوں میں کیڑا لگانے کا سبب بنتے ہیں۔
فیروپائرین — منہ میں گندگی اور بدبو دور کر کے سانسوں کو خوشگوار بناتی ہے۔
فیروپائرین — دانتوں مسوڑوں اور منہ کی سب پیچیدہ بیماریوں کی بے مثال دوائی ہے۔
فیروپائرین — جراثیم کش ہے زخموں پر لگائی جا سکتی ہے۔

Packing
10 ml Rs. 12.00.
25 ml Rs. 24.00

ہر اچھے گھر کی ضرورت

تیار کردہ: فیر لیبارٹریز O/1084، غازی روڈ، راولپنڈی۔ فون: (051)4451631 4424026

کے عملے نے اپنی کارروائی شروع کردی۔ حامد انہیں معروف چھوڑ کر ایس بی ایف کی گاڑی میں لوٹ آیا۔

ایک بے خبر اور نئے پولیس افسر کی بے جا مداخلت کے سوا سب کچھ طے شدہ پروگرام کے تحت ہوا تھا۔ میں نے حامد سے وہ تفصیلات سننے کے بعد اول خان کو باخبر کرنے کی ذمے داری اپنے سر لیتے ہوئے فون بند کردیا۔

"میں ایسے کسی ناخوش گوار واقعے کے بارے میں کئی بار سوچ چکا تھا۔" سلطان شاہ نے حامد کے تجربے کی روداد سن کر کہا "ضروری نہیں کہ ہر چھوٹا بڑا پولیس اہل کار ایس بی ایف کے وجود سے باخبر ہو یا اس کے شناخت ناموں سے مرعوب ہوجائے۔"

"یہ واقعہ دوبارہ بھی رونما ہوسکتا ہے۔" ویرا نے اس کی تائید کی "پولیس کی بہت سی عشتی پارٹیوں میں کوئی پڑھا لکھا افسر نہیں ہوتا۔ نیم خواندہ عملہ اپنی وردی کی اہمیت جتانے پر تل جائے تو کسی وقت خون خرابے کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ ایک تجربہ ہوجانے کے بعد اس کا اعادہ روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ ہونا ضروری ہے۔ تمہیں کھل کر اول خان کو اس خطرے سے آگاہ کردینا چاہیے۔"

"تم دونوں ایک بات سنتے ہو اور عجلت میں فیصلے صادر کرنا شروع کردیتے ہو۔" میں نے ہلکی سی خفگی سے کہا "آج جو کچھ ہوا' وہ کوئی اتفاقیہ نہیں تھا۔ اس بارے میں اول خان مجھے بتاچکا ہے کہ ایس بی ایف کی رازداری برقرار رکھنے کے لیے پولیس کا ٹیسٹیل کی سطح تک اس کی تشہیر نہیں کی جاسکتی۔ ایس بی ایف کے ہر اہل کار کو یہ حکم ہے کہ کسی بھی سرکاری ایجنسی کا کوئی فرد انہیں رعایت دینے پر آمادہ نہ ہو تو وہ رضاکارانہ طور پر اس کے افسر تک جانے کی پیش کش کردیں۔ افسروں کو انفرادی طور پر ان اداروں کے بارے میں بتادیا جاتا ہے جنہیں وردی کے بغیر خاموشی سے اپنا کام کرنے کی آزادی ہے۔"

"پھر حامد نے بات کیوں بڑھائی؟ اسے پہلے ہی تھانے چلا جانا چاہیے تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔" ویرا نے نیا فیصلہ جاری کردیا۔

"حامد بھی ذمے دار آدمی ہے۔ اسے غلطی نہیں' عادت کی خرابی کہہ سکتی ہو۔ آج تک کسی نے اس کے شناخت نامے کو مسترد نہیں کیا ہوگا۔ نیا تجربہ اسے گراں گزرا۔ ایس ایف والے بھی ہم جیسے جذباتی انسان ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حامد نے نوجوان اے ایس آئی کا حکم ماننے میں سبکی محسوس کی ہو۔ وہ اسٹیشن فورپر اول خان کی نیابت کرتا ہے۔ اس کا درجہ اے ایس آئی سے بہت اوپر ہوگا۔"

"فورس میں سب ہی برابر معلوم ہوتے ہیں۔ حکم دینا یا ماننے کی نوبت آئے تو چھوٹے بڑے کا پتا چلتا ہے۔" سلطان شاہ نے بے پروائی سے کہا۔

"ہمارے گھر سے جمشید روڈ کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ دس منٹ بعد میں نے اول خان کے گھر فون کیا تو پتا چلا کہ وہ گھر پہنچتے ہی اسٹیشن فورسے رابطہ کرکے رپورٹ لے چکا ہے۔ حامد نے اسے اپنی اور میری گفتگو کے بارے میں بھی بتادیا تھا۔

"میں نے حامد کو تنبیہہ کی ہے۔" اول خان فون بند کردیا تھا "اسے خاموشی سے تھانے چل دینا چاہیے تھا۔ پولیس والوں کی اتفاقی مداخلت سے یہ فائدہ ہوا کہ وقت برباد نہیں ہوا۔ بخشی کا قصہ فوراً ریکارڈ پر آگیا۔ اب تو تفصیل خانے کو خبر مل چکی ہوگی۔"

"حامد تو کہہ رہا تھا کہ اس نے پولیس والوں کو بخشی کی شناخت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا!" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ تمہیں یہ بتانا بھول گیا کہ بخشی کی جیبوں میں ایسا مواد موجود تھا جس سے اس کی شناخت ہوجاتی۔"

"شیام کے لیے جانے والی پارٹی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی راستے میں ہیں۔ شیام ان کے ساتھ ہے۔ اس کی توقع ہوتی رہے گی۔ کل اسے دیکھا جائے گا۔"

"اسے اچھی طرح دیکھ لو تو مجھے نتیجے سے آگاہ کرنا بھولنا" میرے ساتھ وہ بھی ہنسنے لگا۔

اول خان سے گفتگو ہوجانے کے بعد میرے سر سے ایک ذمے داری کا بوجھ اتر گیا۔ ان طلوع ہونے سے پہلے واقعات نے جس بے ہنگم انداز میں خطوط اختیار کرنا شروع کیا تھا۔ وہ قابو میں آچکا تھا۔ ایک ایک کرکے تمام گتھیاں سلجھ چکی تھیں۔ صرف ایک مسئلہ اننت ہوا تھا۔ کچھ وعدے کے مطابق جلال سے فون پر بات کرنی تھی۔ اس کے بعد اس دن کا پرسکون اختتام ہوتا نظر آرہا تھا۔

"موہن ہاؤس فون تو کرو" ویرا نے بیٹھے بیٹھے اپنا تجویز پیش کی "کچھ پتا تو چلے کہ روی مکاری کرکے کس اسپتال میں پہنچا ہوا ہے اور کب تک گھر واپس آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

"یہ وقت مناسب نہیں ہے" میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈال کر جواب دیا "جگدیش کی آخری رسوم ادا ہونے تک وہاں افراتفری کا راج رہے گا۔ کوئی بھی فون پر صحیح بات نہیں بتاسکے گا۔ روی کے چلے جانے سے سب کچھ درہم برہم ہوگیا ہوگا۔"

"روی اور جگدیش کے بچوں نے میرپور خاص سے آکر انتظام سنبھال لیا ہوگا" ویرا نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے مجھے یاد دلایا "تم ہی نے بتایا تھا کہ اس گھر کی اوپر والی منزل نچلی منزل سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ روی کی مکاری کے بعد ماروتی بھی اوپر پڑی اینڈ رہی ہو۔ اس سے تمہاری بات ہوگئی تو وہ تمہیں گھر کے ساتھ ساتھ اپنے دل کا احوال بھی سنادے گی۔"

میں نے تیز نظروں سے ویرا کو گھورا لیکن اس کی ذومعنی مسکراہٹ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس موقع پر سلطان شاہ بھی اس کا ہم نوا بن گیا" ان کے اوپر والے نمبر پر ایک کوشش کرنے میں کیا مضایقہ؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کسی سے بات نہیں ہوگی۔"

میں نے سلطان شاہ کی بات سنی اَن سنی کردی۔ جگدیش بخشی کے بعد وہ ماروتی سے میری پہلی گفتگو ہوتی۔ اسے روی نے جگدیش کی آخری تحریر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اس گھر کی تلاشی میں پائی جانے والی کشیدگی کی بنا پر مجھے پورا یقین تھا کہ دوسری عورتوں نے ماروتی کو ذلیل کرنے کے لیے جگدیش اور روی کے درمیان ہونے والی گفتگو' اپنی مرضی کی ترامیم اور اضافوں کے ساتھ اسے سنادی ہوگی۔ ان مکالموں میں جگدیش کے عائد کیے ہوئے الزامات کی واضح جھلکیاں موجود تھیں۔

مجھے ڈر تھا کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے ماروتی اپنا دفاع کرتے ہوئے جذباتی نہ ہوجائے۔ پچھلے دنوں میں اس کے ساتھ جس نوعیت کے مراسم استوار ہوتے چلے گئے تھے ان کی روشنی میں' میں اس سے بے رخی اختیار کرکے فون بند نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی دل جوئی کے لیے مجھے جو کچھ کہنا پڑتا وہ ایسا ہرگز نہ ہوتا کہ میں اسے ان تینوں کی موجودگی میں بے فکری سے کہتا چلا جاتا۔

"ماروتی سے زیادہ اہم جلال ہے" اس نازک موڑ پر غزالہ نے میرے دل کی بات پڑھتے ہوئے یاد دلایا "یہ بری بات ہے کہ آپ آج سارا دن اسے ٹالتے رہے ہیں۔ وہ بہت بے چینی سے آپ کے فون کا انتظار کررہا ہوگا۔"

میں نے ویرا اور سلطان شاہ کے منہ بند رکھنے کے لیے فوراً ہی فون کا ریسیور اٹھالیا۔

دفتری اوقات ختم نہیں ہوئے تھے۔ جلال ویسے بھی دیر تک اپنے دفتر میں کام کرنے کا عادی تھا۔ میں نے نمبر ملایا تو وہ براہِ راست لائن پر موجود تھا۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ تم اپنا وعدہ بھول گئے۔ مجھے بہت شدت سے تمہارے فون کا انتظار تھا" میری آواز سنتے ہی اس کی طرف سے جواب آیا "بخشی کے بارے میں اسلام آباد میں افواہیں گردش میں آگئی ہیں۔ ہائی کمیشن کا ذمے دار عملہ فون پر آنے سے گریز کررہا ہے۔ اس خبر نے ان سب کو اضطراب میں مبتلا کردیا ہے۔"

"افواہیں کیا ہیں؟ تمہیں خیال رکھنا ہے کہ ان لوگوں کی سوچ کس سمت میں ہے۔"

"وہ بہت محتاط ہیں۔ بس یہ کہا جارہا ہے کہ کراچی میں ان کے عملے کے ایک رکن کے ساتھ کوئی سنگین واقعہ رونما ہوا ہے۔"

"واقعہ؟" میں نے حیرت سے دہرایا "اگر ان کی نیت صاف ہوتی تو وہ ابتدائی طور پر اسے حادثہ قرار دیتے۔ حادثے اور واقعے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ لوگ واقعی بہت کینہ پرور ہیں۔ پوری تفصیل جانے بغیر محاذ آرائی کی داغ بیل ڈال رہے ہیں۔"

"مجھے کراچی سے اطلاع ملی ہے کہ اسے پولیس کی تحویل سے نکال کر جناح اسپتال کے نیورو سرجیکل وارڈ میں پہنچادیا گیا ہے جہاں اس کے تفصیلی ٹیسٹ کیے جائیں گے۔ دوسری طرف اسے جلد از جلد پاکستان سے نکالے جانے کی تیاری کی جارہی ہے۔"

"یہ سب اسی طرح ہونا تھا" میں نے اس کی بات سن کر کہا "اس بارے میں مجھے یا تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"


دیوتا کا 40 چالیسواں حصہ
25 ستمبر 2000 کو شائع ہورہا ہے
بڑے شہروں میں ہمارے سول ایجنٹ یہ ہیں
الکوثر نیوز ایجنسی — فریئر مارکیٹ۔ کراچی
رابعہ بک ہاؤس — الکریم مارکیٹ۔ اردو بازار لاہور۔ فون نمبر 7121555
اشرف بک ایجنسی — کمیٹی چوک۔ راولپنڈی
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

"ابھی میں بھی فکر مند نہیں ہوں۔ تمہیں یہاں کی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا۔ ادھر وہ لوگ میجر بخشی کے قصے میں الجھ گئے ہیں۔ دوسری طرف دفتر خارجہ والوں نے ڈیوڈ اور جی کی موت کے بعد ملنے والے امریکی مراسلے کا منہ توڑ جواب امریکی سفیر کے حوالے کر دیا ہے۔ اس نے مراسلے کو توہین آمیز اور امریکی وقار کے منافی قرار دے کر وصول کرنے سے انکار کرنا چاہا تھا لیکن اسے امریکی مراسلے کی سفارتی زبان کے حوالے سے یہ سمجھا دیا گیا کہ امریکیوں کی نیک نیتی کے بارے میں پورے اعتماد کا اظہار کرنے کے بعد مراسلے میں وہ باتیں بیان کی گئی ہیں جو حقیقت نہ ہونے کے باوجود' عام آدمی کو حقائق سے قریب نظر آتی ہیں۔ لاجواب ہونے کے بعد اسے مراسلہ وصول کرنا پڑا۔"

"فنشکل یہ ہے کہ پچھلے چند دنوں میں یہاں واقعات میں اتنی تیزی آئی ہے کہ اب ہمیں کچھ روز کے لیے خاموشی اختیار کرنی ہوگی" میں نے جلال سے ملنے والی اطلاع پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ لوگ اپنے مسائل میں گھرے رہیں تو ان کی پیش قدمی بالکل رک جاتی ہے۔"

"اسی لیے میری خواہش ہے کہ تم جلد از جلد نئی دہلی روانہ ہونے کے بارے میں سوچو۔ اس سلسلے میں' میں پوری طرح تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"ابھی وقت ہے۔ میں آج تصویروں کا بندوبست کرتا ہوں۔ اول خان کل پاسپورٹ بنوا دے گا۔"

"پاسپورٹ ہاتھ میں آتے ہی تم لاہور پہنچ جاؤ" مجھے سفر پر آمادہ پا کر وہ خوش ہو گیا "میں بھی اسلام آباد سے وہیں آجاؤں گا۔ چٹکی بجانے میں تمہارے سارے مسائل حل کروا دیے جائیں گے۔"

"وہاں مجھے کن لوگوں سے مدد مل سکے گی؟" میں نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"نئی دہلی میں ہمارے تین آدمی ہیں۔ میں ان کے بارے میں معلومات یکجا کر کے لاہور میں تمہارے حوالے کر دوں گا۔ وہاں پہنچنے کے بعد تمہیں اپنے کام کے آغاز کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑے گی۔ وہ تمہارے لیے ہر اول کا کام سرانجام دیں گے۔"

"تم اپنا کام شروع کرو۔ میں اپنی تیاری کرتا ہوں۔ ممکن ہوا تو میں میجر بخشی کے پیچھے پیچھے نئی دہلی پہنچ جاؤں گا۔ اس کے سنبھلنے کے آثار نظر آئے تو لگے ہاتھوں اس کا بھی کریا کرم ہو جائے گا۔"

"جاتے ہوئے اور کچھ اپنے ساتھ لیوا نہ لو' سی ایس ڈی تو ضرور لے جانا۔" اسے اچانک وہ حساس آلہ یاد آگیا جو میں نے نیویارک میں راکے ایک پرانے ایجنٹ سے یارانے کے نتیجے میں حاصل کیا تھا۔ بدری ناتھ اسی پراسرار سرزمین پر میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا مگر اس کی یادگار مسلسل میرے کام آرہی تھی۔

"ٹیپس کے رابطے کے لیے ملاقاتیں خطرناک ہوتی ہیں۔ شاید تمہیں کوئی لاسلکی اپریٹس مل جائے" وہ کہہ رہا تھا "اگر سی ایس ڈی کے ذریعے فون پر ہونے والی گفتگو کو ناپسندیدہ مداخلت سے محفوظ بنایا جا سکے تو دشمن کی سرزمین پر تمہارا کام بہت آسان ہو جائے گا۔"

"اگر ہمیں ہوٹل میں رہنا پڑا تو سی ایس ڈی سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپریٹر کے ذریعے کوئی بھی کال ہمارے کمرے تک منتقل نہیں ہو سکے گی۔ اس کی ساری افادیت براہِ راست فون لائن تک ہے۔"

"وہ لوگ اس کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیں گے۔ اچھا ہوا کہ تم نے یہ نکتہ بتا دیا۔ شروع سے ہی اس کا خیال رکھا جائے گا" بات ختم کرتے کرتے اس نے چونکی ہوئی آواز میں پوچھا "ابھی تم نے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ کیا تم کسی اور کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟"

"میری بیوی میرے ساتھ ہوگی" میں [illegible] سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جواب دیا "پردیس کے ایک سے دو بہتر ہوتے ہیں۔ ایک پر کوئی برا وقت آجائے دوسرا اس کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو خبر خواہوں کو خبر ہی پہنچا سکتا ہے۔"

"اپنے معاملات کو تم زیادہ بہتر سمجھتے ہو" اس نے محتاط لب و لہجے میں کہا "میری دانست میں بیوی کو اس سفر پر اپنے ساتھ لے جانا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ خانہ جنگی ہے۔ جس میں گردنیں کٹنے کی نوبت آجاتی ہے۔ بیوی کے ساتھ [illegible] وقت ذہنی دباؤ میں رہو گے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میری بیوی ایسے معاملات میں [illegible] ثابت ہوتی ہے" میں نے ویرا کو آنکھ مار کر مایوس ہونے پر مجبور کر دیا "اس کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کہنا وہ تمہارا مشورہ پسند نہیں کرے گی۔"

"یہ صرف مشورہ ہی تھا" وہ جلدی سے بولا "میں تمہیں اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔"

اس سے گفتگو ختم کر کے میں نے ایک مرتبہ پھر اول خان کے گھر کا فون نمبر ملانا شروع کر دیا۔

انسانیت کے دشمنوں کی اس داستانِ عبرت کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے

ایرک خواب میں اپنے آپ کو میدان جنگ میں برسرِ پیکار دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف توپوں کی گھن گرج جاری تھی پھر اچانک ایک دیوار اس پر آن گری اور اسے اندازہ ہوا کہ اس کی موت کا وقت آن پہنچا تھا لیکن پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔

تھمن گرج دراصل گلی میں کوڑا اٹھانے والے ٹرک کی تھی۔ ٹرک کا عملہ گھروں کے سامنے سے کوڑے کے چھوٹے چھوٹے ڈرم اٹھا اٹھا کر ٹرک میں خالی کر رہا تھا۔ ایرک کے خیال میں کوڑا اٹھانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نیندیں حرام کرنا بھی ان لوگوں کے فرائض میں شامل تھا اس لیے وہ صبح منہ اندھیرے آتے تھے۔ ایرک کا مسئلہ یہ تھا کہ ایک بار اس کی آنکھ کھل جاتی تھی تو دوبارہ اسے نیند نہیں آتی تھی۔

ابھی اس کے پاس ایک گھنٹے کی گنجائش تھی اور وہ سونا بھی چاہتا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ سونے کی اس کی کوششیں کامیاب نہیں ہوں گی۔ اس کا سر بھاری تھا۔ گذشتہ رات ان کے پڑوسی جم اور ایلس ان کے ہاں آگئے تھے اور رات گئے تک پینے پلانے' کھانے اور گپیں لگانے کا شغل چلتا رہا تھا۔ پیر کے دن کا آغاز ایرک کو ہمیشہ ہی برا محسوس ہوتا تھا۔

ہلکی سی کراہ کے ساتھ کروٹ بدل کر اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے نیم وا ہونٹوں پر ایک خوب صورت مسکراہٹ لیے بے خبر سو رہی تھی۔ وہ ایک مختصر الوجود مگر خوب صورت عورت تھی اور چونکہ ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اس لیے ابھی ایرک کو وہ خوب صورت ہی لگتی تھی۔ وہ جتنی مختصر الوجود تھی' اتنی ہی پُرتیلی اور مستعد تھی۔ ایرک جتنا لمبا تڑنگا تھا' اس کی حرکات و سکنات میں اتنا ہی دھیما پن تھا۔ اس کی بیوی کا نام کیل تھا مگر وہ پیار سے اسے پلسی کہتا تھا اور اس پر ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس کا تعلق بونوں کے کسی خاندان سے تھا۔

گھریلو کے معاملات اور خصوصاً ازدواجی معاملات گھر میں طے ہو جائیں تو بہتر ہوتا ہے۔ ان کا چرچا دنیا داری سے ہٹ کر عموماً جگ ہنسائی کا سبب بنتا ہے مگر اس کے لیے وہ ازدواجی گتھیاں خوشیوں کا پیام بر ثابت ہوا۔

**اپنی بیوی کی عادات سے تنگ آکر ایک شوہر کا ہفتہ بھر کا ماجرا**

ڈاکٹر عابدہ الرحمٰن

# پیمانۂ صبر

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دوبارہ سونے کی کی کوششوں میں ناکام ہو کر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا مگر کسی چیز میں الجھ کے اوندھے منہ گرا۔ اس کی پیشانی چوکھٹ سے ٹکرائی اور اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے۔۔۔ بلکہ ہر رنگ کے تارے ناچ گئے۔ سر تھام کر جب وہ اٹھنے میں کامیاب ہوا تو اسے یہ دیکھ کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی کہ جس چیز میں وہ الجھ کر گرا تھا' وہ گیل کا فراک تھا۔ گزشتہ رات لباس تبدیل کرنے کے بعد اس نے فراک راستے میں ہی پھینک دیا تھا۔ اس قسم کی حرکتیں اس کے معمولات میں شامل تھیں۔

اس نے غصے سے گیل کی طرف دیکھا جو نہ صرف جاگ چکی تھی بلکہ گاؤ تکیے پر سر ٹکائے بڑے دلکش انداز میں مسکرا بھی رہی تھی۔ ایرک کی روح تک سلگ اٹھی۔ وہ مسکرا رہی تھی؟ اسے ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ یہ حادثہ ایک بہت بڑے المیے میں بھی تبدیل ہو سکتا تھا۔

"تم گر گئے تھے؟" اس نے انگڑائی لے کر معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میں ورزش کے چند نئے طریقے ایجاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" ایرک نے اپنی پیشانی پر ابھرنے والے گومڑ کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کرلیا ہے جس میں کھوپڑی پوری طاقت سے کسی چیز کے ساتھ ٹکرا کر چیک کیا جاسکتا ہے کہ کھوپڑی بالکل خالی ہے یا اس میں تھوڑا بہت بھوسا وغیرہ بھرا ہوا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ لگتا ہے بہت غصے میں ہو۔" گیل مصنوعی تشویش سے بولی "تمہاری سانس دمے کے مریض کی طرح تیز تیز چل رہی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ میں تو بہت خوش ہوں۔ جب بھی میری پیشانی پر کوئی زوردار چوٹ لگتی ہے' میرا خوشی سے رقص کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔" ایرک جل کر بولا۔

"میں نے جان بوجھ کر تو۔۔۔" گیل نے کچھ کہنا چاہا مگر ایرک نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کیا تم زندگی میں کبھی کوئی کام صحیح طریقے سے کرنے کے قابل ہو سکو گی یا نہیں؟" وہ بولا "یاد ہے پچھلے ہفتے جب میں پلاس ڈھونڈ رہا تھا تو وہ مجھے کہاں ملا تھا؟ اسے گیراج میں ہونا چاہیے تھا مگر وہ مجھے لان پر پودوں کے پاس گیلی زمین پر پڑا ملا تھا جہاں اسے بری طرح زنگ لگ رہا تھا۔ تم نے زمین میں لکڑی کی کوئی میخ ٹھونکنے کے لیے اسے ہتھوڑی کے طور پر استعمال کیا تھا اور وہیں پھینک دیا تھا۔"

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا پھر اسی برہمی سے بولا "اور یاد ہے نظموں کی وہ کتاب جو کافی دنوں سے میرے بک شیلف سے غائب تھی اور جسے میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔۔۔ وہ مجھے کہاں سے ملی؟ تم نے کافی ٹیبل کا توازن ٹھیک کرنے کے لیے اس کتاب کو میز کی ایک ٹانگ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ شاعری کی کتاب کے ساتھ یہ سلوک بھی ہو سکتا ہے؟ حد ہے جہالت کی۔۔۔"

"وہ دراصل۔۔۔" گیل نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر ایرک نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی "میں کس کس بات کا ذکر کروں۔۔۔ ٹوتھ پیسٹ والے معاملے کو ہی لے لو۔۔۔ میں نے ہزاروں مرتبہ تمہیں بتایا ہے کہ ٹیوب کو ہمیشہ پچھلے سرے کی طرف سے دبا کر ٹوتھ پیسٹ نکالنا چاہیے مگر تم ہمیشہ ٹیوب کو بیچ میں سے دبا کر پیسٹ نکالتی ہو۔ شادی سے پہلے میں تمہیں دنیا کے عظیم شاعروں اور فلسفیوں کو پڑھتے دیکھتا تھا اور ان کی کتابوں کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے سنتا تھا تو میں سوچا کرتا تھا کہ تم کتنی ذہین اور باذوق لڑکی ہو لیکن لگتا ہے' شادی کے بعد تم نے اپنا دماغ کسی گٹر میں پھینک دیا ہے۔"

"میں تمہارے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے شیریں لہجے میں بولی۔

"اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ پیتل رام سے سوجاؤ۔" ایرک نے جلے بھنے لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کا خیال تھا کہ گیل اس کے پیچھے پیچھے آئے گی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر معذرت کرے گی لیکن شاید اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے سچ مچ دوبارہ سو گئی تھی۔ ایرک باتھ روم میں گھس گیا اور آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا "دل درجے کے احمق ہو تم!"

پھر اس نے بڑبڑاتے ہوئے باتھ روم کا کیبنٹ کا دروازہ کھولا تو اس کی نظر ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب پر پڑی اور ایک بار پھر اس کا خون کھول اٹھا۔ ٹیوب کو دیکھ کر وہ کچھ ایسا تلملایا تھا کہ اس کے عین درمیان سے کسی چھوٹے سے ٹرک کی طرح گزر گیا تھا اور اس پر ڈھکنا بھی نہیں تھا۔ اس نے ڈھکنے کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی تو وہ اسے فرش پر پڑا ملا۔ ڈھکنا لگا کر اس نے ٹیوب کو اس کی صحیح حالت پر لانے کی کوشش کی۔ وہ اپنے وقت کی ایک مشہور کمپنی کا نہایت مقبول ترین ٹوتھ پیسٹ تھا اور ایرک اسی کمپنی میں بطور سیلز منیجر ملازم تھا۔

"اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔" اس نے دانت صاف کرتے ہوئے خود کو ہدایت کی۔

برش کرنے کے بعد اس نے اسپرین کی دو گولیاں حلق سے اتاریں اور شیو کرنے لگا۔ اسے یہ دیکھ کر خوش گوار سی حیرت ہوئی تھی کہ کم از کم سینٹی ریزر تو صحیح حالت میں اپنی جگہ موجود تھا۔ شیو بناتے ہوئے اور آئینے میں اپنا عکس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی خود کلامی کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

"اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔۔۔" وہ بڑبڑایا "ٹھیک ہے' میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں لیکن کیا یہ بھی کوئی کام صحیح طریقے سے کرنا سیکھے گی؟ ہماری شادی کو اب دو سال ہو چکے ہیں مگر اس میں ذرا بھی احساس ذمے داری پیدا نہیں ہوا۔ آؤچ۔۔۔"

اس کے حلق سے بے اختیار نکلنے والی کراہ کے باعث اس کا خود کلامی کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس کراہ کی وجہ اسے اس وقت معلوم ہوئی جب اس نے اپنا رخسار سے خون پونچھتے دیکھا۔ شیو کرتے وقت اپنی بے دھیانی کی وجہ سے اسے کٹ لگ گیا تھا۔ اس نے سینٹی ریزر واش بیسن میں پھینکا اور ٹشو پیپر سے خون صاف کرنے لگا۔ اپنا رخسار ٹشو پیپر سے دبائے اس نے میڈیسن کیبنٹ میں بینڈیج تلاش کرنا شروع کی۔ پچھلے ہفتے ہی گیل کو یاد دہانی کرائی تھی کہ اگر جائے تو فرسٹ ایڈ کی کچھ چیزیں لیتی آئے جو ختم ہو چکی تھیں۔ اب کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اگر وہ سامان لائی تھی تو اس نے کہاں رکھا ہوگا۔ وہ سامان اسے کچن میں بھی مل سکتا تھا۔

مگر پھر اسے بینڈیج کا پیکٹ کیبنٹ میں ہی مل گیا۔ یہ کسی دوا سے کا سامنہ تھا مگر جب اس نے پیکٹ کھولا تو اس کا دماغ مزید گھوم گیا۔ پیکٹ میں سفید رنگ کی کوئی بینڈیج نہیں تھی۔ نیلے' سبز' سرخ' اورنج اور جامنی رنگ کی' چپکنے والی چھوٹی چھوٹی پٹیاں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ یہ گیل کی ایک اور ناکارہ عادت کا ثبوت تھا۔ وہ بینڈیج بھی رنگ برنگی پسند کرتی تھی گویا یہ بھی سجاوٹ کی کوئی چیز ہو۔

خون ایرک کی انگلیوں کے درمیان سے رسنے لگا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا' اس سے پہلے کہ خون بہنے کے باعث اس کی موت واقع ہو جائے' اسے انہی میں سے کوئی بینڈیج لگا لینی چاہیے۔ دل پر جبر کر کے اس نے ایک نیلی اور ایک سبز پٹی نکالی۔ زخم کچھ اس طرح کا تھا کہ دو پٹیوں کی ضرورت تھی۔ اس کے گال پر دو رنگ کی پٹیوں کا کراس بن گیا تھا۔ اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ اچھا بھلا جو کردہ کھائی دے رہا تھا۔

وہ بیڈ روم میں واپس آیا تو گیل چادر لے لیٹی ہوئی تھی۔ گو کہ اس نے منہ بھی چادر میں چھپایا ہوا تھا لیکن اس کے شانے لرز رہے تھے۔ وہ فراز کچھ اس طرح نمایاں تھے کہ ایرک اپنا غصہ بھولنے لگا اور اس کے محسوسات کچھ اور رخ اختیار کرنے لگے مگر پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اگر اس وقت اس نے گیل پر مہربان ہونے اور جواباً اس کا التفات حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہ خوا مخواہ سر پر چڑھ جائے گی اور اس کی اصلاح کے امکانات جو پہلے ہی بہت کم تھے' بالکل ہی معدوم ہو جائیں گے۔


☆ نور جہاں فن کے آئینے میں ☆

گلوکارہ نور جہاں کی ان تھک پرفارمر اپنے زندگی کے لمبے سفر کی ساری زندگی کی نذر بیدار کہانی گو گدیاں بھی کڑب بھی پیار بھی درد بھی نور جہاں کے لئے نہ ایسی کتاب چھپی نہ چھپے گی۔ سونے کے ماہول والی شے قیمت صمد ڈاک خرچ Rs:350/-

اس کتاب میں نور جہاں کی نایاب اور بے شمار تصویریں شامل ہیں۔ قطع لوتصاویر ۳۶ صفحات ۵۰ سائز ڈبل۔

☆ سو کلاسک فلمیں ☆

1949 سے اب تک پاکستان کی بامد میدار اعلیٰ فلموں کی مکمل کہانیاں اس انداز سے اس طرح لکھے ہیں جیسے آپ فلم خود دیکھ رہے ہوں۔ یا سین گریجہ کے فلم کا جادو جگانے والی پاکستان کی فلمی دنیا کی ہر دلچسپ معلومات کا خزانہ۔ ہر فلم آپ طور انوکھی پیش کش قیمت صمد ڈاک خرچ Rs:275/-

☆ لکشمی چوک ☆

پہلا ایڈیشن فوراً ختم دوسرے ایڈیشن کے ساتھ کتاب کے مصنف یاسین گریجہ کو ایور ریڈی فلمی دنیا کے پردوں میں چھپے ہوئے رازہائے نرالا اور اسکینڈل بچی اور کھری کھری تحریر قیمت صمد ڈاک خرچ Rs:145/-

☆ نگار صد سالہ جشن فلم ۲۰۰۰ ☆

فلمی دنیا کے چپے چپے کی آگاہی کے لئے یہ نمبر آپ کے پاس آپ کی لائبریری میں ہونا لازمی ہے اس نمبر کی قیمت بڑھ رہی ہے اور بھی بڑھ جائی تو زیادہ نہ ہوتی محنت کاوش کی جاندار کی طرح چمکتی پیش کش پاکستان کے فن کار سے ملاقات اور حالات کی آگاہی ۵۰۰ صفحات سائز عام سائز سے ۳ گنا زیادہ اور قیمت صمد ڈاک خرچ Rs:350/-

☆ سو سالہ فلم ڈائرکٹری ☆

دنیا ایڈیشن آکر اب ختم ہونے جا رہا ہے۔ یہ فلم ڈائرکٹری آپ کو پاکستان کی ایک ایک فلم کے بارے میں پوری پوری معلومات دیتی ہے۔ لاثانی ہدایتکار اور ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے فنکاروں کے بارے میں آپ کو پاکستان کی سو سالہ فلم ڈائرکٹری نہیں دیکھتے ہیں اور آپ کے پاس پاکستان کی سو ڈاک خرچ Rs:275/-

☆ چہرہ در چہرہ آئینہ ☆

طفیل اختر کی الف لیلہ کی سی یاد حسین و جمال کہانی۔ نگہین تصاویر کے ساتھ لاجواب کتاب فلمی دنیا کی بے نقاب تحریریں۔ قیمت صمد ڈاک خرچ Rs:125/-

یہ بھی کتاب منگائیں اسی قیمت کا فی قادر روانہ کریں۔ وی پی بالکل نہیں جائیگی۔

روپ پبلشرز آسن مل لوجھارو ڈ کراچی

فون: 2628939 - 2624097

اس نے کچھ دیر خوا مخواہ ہی ادھر ادھر کھڑ پڑ کی کہ شاید گیل اس کی طرف متوجہ ہوجائے لیکن اس نے چادر سے منہ نہ نکالا۔ آخر کار وہ جوتے پہنتے ہوئے بہ آواز بلند بولا "شیو بناتے ہوئے میرے گال پر زخم لگ گیا ہے۔"

"میرا دل تمہارے لیے خون کے آنسو رو رہا ہے۔" وہ چادر چہرے سے ہٹائے بغیر بولی۔ اس کی آواز سے ایرک کو شبہ ہوا کہ شاید وہ رو رہی تھی لیکن پھر اس نے اس امکان کو مسترد کردیا۔

"تم نے کار میں پیٹرول ڈلوایا تھا؟" ایرک نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ پیر کو اپنے تین دوستوں کو اپنی گاڑی میں لے جانے کی اس کی باری ہوتی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کی موجودگی میں راستے میں پیٹرول ختم ہوجائے۔ گاڑی آخری بار گیل نے استعمال کی تھی۔

"مجھے یاد نہیں۔" گیل نے جواب دیا اور اس بار ایرک کو یقین ہوگیا کہ وہ رو رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل پسیجا کہ وہ معذرت کرلے لیکن پھر اس نے دل سخت کرلیا۔ اس نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ کسی بھی انسان کی اصلاح کے لیے تھوڑی بہت سختی ضروری تھی۔ وہ کمرے سے نکل آیا۔ شادی کے بعد کے دو برسوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ گیل اسے رخصت کرنے کار تک نہیں آئی تھی۔

کار میں بیٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے فیول گیج چیک کیا۔ اس کے اندیشے کے مطابق ٹنکی خالی تھی۔ اس نے اپنے آپ پر بہ مشکل ضبط کرتے ہوئے دو تین گہری گہری سانسیں لیں۔ فرینک کا سروس اسٹیشن اس کے گھر سے تقریباً چار فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ وہی پہلی جگہ تھی جہاں سے وہ پیٹرول ڈلوا سکتا تھا لیکن اسے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ وہاں تک بھی پہنچ نہیں پائے گا۔

"خدایا! مجھے سروس اسٹیشن تک پہنچادینا۔" روانہ ہوتے وقت اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

خدا نے اس کی دعا سن لی اور وہ سروس اسٹیشن تک پہنچ گیا لیکن وہاں گویا فرینک اس کے صبر کا امتحان لینے پر تل گیا۔ وہ اسے دیکھ کر اس کے رخسار کی طرف اشارہ کرکے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا "یہ کیا ہے؟"

ایرک نے جواب دینے سے پہلے دل ہی دل میں دس تک گنتی کی۔ غصے کو قابو میں رکھنے کا یہ اس کا آزمودہ نسخہ تھا۔

"بینڈیج۔" اس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

"وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے لیکن رنگ برنگی بینڈیج کیوں چپکا رکھی ہیں؟" فرینک نے سوال کیا۔

"سان فرانسسکو کے ایک بار میں تین نشے باز قسم کے بدمعاشوں سے میری لڑائی ہوگئی تھی۔ میں نے اکیلے انہیں مار مار کر بے ہوش کردیا لیکن اس لڑائی میں مجھے یہ زخم آگیا۔" ایرک نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی... رنگین بینڈیج کیوں؟" فرینک نے اصرار کیا۔ اسے اس کی تین بدمعاشوں سے لڑائی والی گپ پر تو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن رنگین بینڈیج کے بارے میں وضاحت ضرور درکار تھی۔

"اصل میں لڑائی کے بعد مجھے جس ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا' وہ زندگی میں ہر طرف رنگ ہی رنگ دیکھنا پسند کرتا تھا۔ وہ مریضوں کے زخموں پر بینڈیج بھی رنگین لگاتا تھا۔" ایرک نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔

فرینک نے گھور کر اسے دیکھا اور خاموشی سے گاڑی میں پیٹرول ڈالنے لگا۔ ایرک نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ اس کے بعد جو بھی اس کی بینڈیج کا مذاق اڑانے کی کوشش کرے گا' وہ اس کے منہ پر گھونسا رسید کرے گا۔

راستے میں اس نے اپنے دوستوں کو گاڑی میں بٹھایا تو ہاورڈ اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "ان رنگین پٹیوں سے تمہاری شخصیت کے حسن میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے۔"

"اور صلیب کا نشان بن جانے کی وجہ سے تقدس بھی جھلکنے لگا ہے۔" پال نے لقمہ دیا۔

"واقعی بہت خوب صورت لگ رہے ہو۔" جم نے تائید کی۔ جم اس کا وہی پڑوسی تھا جو بیوی سمیت گذشتہ رات گئے تک اس کے ہاں رکنے اور پینے پلانے کے شغل میں شریک رہنے کی وجہ سے ایرک کے سردرد کا ذمے دار تھا۔ اس کی بیوی بھی کام پر جاتی تھی۔ وہ اسے بس میں سوار کرانے کے بعد راستے میں ایرک کو ملتا تھا۔ ایرک اپنے عہد کے مطابق ان میں سے کسی کے بھی منہ پر گھونسا رسید نہ کرسکا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد جم مزید بولا "ان رنگین پٹیوں کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ان کا رنگ ایرک کی آنکھوں کے رنگ سے بہت مل رہا ہے یعنی نیلی پٹی کا رنگ ایک آنکھ سے اور سبز پٹی کا رنگ دوسری آنکھ سے مل رہا ہے۔"

"اگر تم تینوں نے مزید کوئی بکواس کی تو تمہیں پیدل دفتر جانا پڑے گا۔" ایرک نے اعلان کیا۔ وہ تینوں مختلف دفاتر میں کام کرتے تھے لیکن ان کے دفتر پاس پاس ہی تھے۔

اس کے اعلان کے بعد چند لمحے کے لیے کار میں

خاموشی چھا گئی پھر جم بولا "مسئلہ کیا ہے؟ آخر آج کانٹے کو کیوں دوڑ رہے ہو؟"

تب ایرک انہیں گیل کی پیچیدہ عادتوں اور خامیوں کے بارے میں بتائے بغیر نہ رہ سکا پھر وہ بولا "ان کی وجہ سے مجھے جو کوفت ہوتی ہے' وہ تو اپنی جگہ ہے لیکن میرا خیال ہے کہ دفتری حالات بھی میرے مزاج پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ہماری کمپنی کے ٹوتھ پیسٹ کی مقبولیت اب قصۂ پارینہ ہوتی جارہی ہے۔ مقابلہ بہت سخت ہو گیا ہے۔ روز ایک سے بڑھ کر ایک ٹوتھ پیسٹ مارکیٹ میں آرہا ہے اور نت نئے انداز سے ان کی پبلسٹی ہو رہی ہے۔ ہم اسی طرح لکیر کے فقیر چلے آرہے ہیں۔"

"کیا خرابی ہے تمہاری کمپنی کے ٹوتھ پیسٹ میں۔؟" بیمہ ایجنٹ ہاورڈ نے کہا اس کے مسئلے کا تجزیہ شروع کرتے ہوئے کہا۔

"سب سے پہلے تو نام کو ہی لے لو۔ اس کا نام ہے "ڈاکٹر ڈین ڈوفر کا محافظ دنداں ٹوتھ پیسٹ۔" بھلا بتاؤ' آج کل کے زمانے میں چیزوں کے اس طرح کے نام ہوتے ہیں؟ بعض گاہک تو اگر راستے میں یہ ٹوتھ پیسٹ لینے کے لیے رکتے ہوں گے تو نام لیتے لیتے ان کی ٹرین چھوٹ جاتی ہوگی۔"

تینوں دوستوں نے ہمدردانہ انداز میں سر ہلایا۔ ایرک بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس کا پیکٹ بھی بہت ہی دقیانوسی قسم کا ہے۔ ۱۸۹۸ء میں جب یہ ٹوتھ پیسٹ متعارف کرایا گیا تھا' اس وقت تو وہ پیکنگ ٹھیک لگتی تھی لیکن اس کے بعد سے آج تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ یہ مسابقت کا زمانہ ہے۔ اب نئے سرے سے پیکٹ اور ٹیوب کا کوئی خوب صورت سا ڈیزائن تیار کرانا چاہیے لیکن کمپنی کے پریزیڈنٹ مسٹر شروڈر میری سنتے ہی نہیں۔ وہ کمپنی کے بانی آنجہانی "ڈاکٹر ڈین ڈوفر" کی پوتی کے شوہر ہیں۔ اب تو ان کے سسر کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ یہ عہدہ انہیں ان کی بیوی کی وجہ سے ملا ہوا ہے اور کمپنی کے مال معاملات اسی بڑھیا کے ہاتھ میں ہیں جو دیکھنے میں ہی کسی بلڈاگ سے کم نہیں لگتی۔ میرے لیے تو نوکری دن بہ دن مشکل سے مشکل ہوتی جارہی ہے۔ اب تو میں سوچتا ہوں ایسی ملازمت سے بہتر تھا میں کسی بازی گر کے پاس ملازم ہو جاتا جو مجھے کسی توپ میں گولے کی جگہ ڈال کر دور پھینکا کرتا۔ یہ کام شاید میری موجودہ ملازمت سے آسان ہوتا۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر ایسا کوئی بازی گر نظر آیا تو ہم اس سے بات کریں گے۔" ہاورڈ نے نہایت خلوص سے وعدہ کیا۔

تینوں دوستوں کو ان کی منزل کے قریب اتارنے کے بعد ایرک نے کار ایک گیراج میں کھڑی کی اور پیدل اپنے دفتر کی عمارت تک پہنچا۔ کمپنی کی یہ عمارت بھی اپنی پروڈکٹ کی طرح ہی پاس پڑوس کی جدید عمارتوں کے درمیان نہایت فرسودہ نظر آتی تھی۔ ایرک نے جب بھی شروڈر سے اپنی پروڈکٹ یا عمارت کی حالت بہتر بنانے اور ان میں کوئی جدت لانے کی بات کی تھی تو اس نے یہی جواب دیا تھا کہ جو چیزیں اس کے دادا سسر کی نظر میں اچھی تھیں' وہ اس کی نظر میں اچھی ہیں۔

ایرک کی مستعد قسم کی سیکریٹری مس فلیگ کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو اس کا منہ حیرت سے کھل گیا لیکن کیونکہ وہ منجھی ہوئی اور عقل مند دفتری کارکن تھی اس لیے اس نے "گڈ مارننگ" کے سوا کچھ نہیں کہا۔ وہ ڈاک دیکھ رہی تھی۔

"کوئی اہم خط۔۔؟" ایرک نے دریافت کیا۔

"ہاں۔" مس فلیگ نے ایک خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ڈیوس اینڈ کلارک کو آئندہ کے لیے اپنا آرڈر کینسل کرا رہے ہیں۔"

ایرک کے پہلو میں گویا کسی نے بم پھوڑ دیا۔ "ڈیوس اینڈ کلارک" کے شہر میں بہت سے جنرل اسٹور اور وہ ان کے ٹوتھ پیسٹ کے بڑے خریداروں میں سے ایک تھے۔ موجودہ حالات میں ان کا آرڈر کینسل ہونا ایسا ہی تھا جیسے کسی ڈوبتے ہوئے آدمی پر ایک بڑا سا پتھر بھی رکھ دیا گیا ہو۔

باقی دن میں مزید بری خبریں سننے کو ملیں۔ دل پر مزید زخم لگے۔ دو آرڈر کینسل ہونے کی منفی خبر ملی۔ دفتر کے ایک ساتھی سے جھگڑا ہوتے ہوتے بچا جس نے ایرک کی دو رنگ کی ہینڈ بیج کو دیکھ کر ایک بے ہودہ قسم کا گانا گانا شروع کر دیا تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ اس روز دوپہر تک مسٹر شروڈر دفتر نہیں آئے تھے حالانکہ روزانہ وہ تمام ملازمین سے پہلے آجاتے تھے۔ ایرک کو کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کپتان اپنا ڈوبتا ہوا جہاز اس کے سپرد کر کے خود کہیں غائب ہو گیا تھا۔

دفتر کے ایک ساتھی سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے دوپہر کے کھانے کے دوران میں ایرک بولا "مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ مسٹر شروڈر کی بیوی نے مار مار کر آج پھر انہیں بستر پر نہ لٹا دیا ہو۔ مجھے تو وہ عورت نہیں چڑیل لگتی ہے۔" پھر وہ جھرجھری لے کر بولا "کبھی کبھی میں

مشورہ

صابن اور پرفیوم تیار کرنے والی ایک کمپنی کا اشتہار۔

"اگر آپ ہمارا صابن استعمال نہیں کرتے تو پھر آپ کو ہماری پرفیوم ضرور استعمال کرنی چاہیے۔"



سوچتا ہوں کہ اگر وہ اور میں کسی ویران جزیرے پر اکیلے رہ جائیں تو کیا ہو؟"

"اس کا اندازہ کرنا کون سا مشکل کام ہے۔" اس کا دفتری ساتھی آرتھر بولا "ظاہر ہے' وہ تمہیں کچا کھا جائے گی۔"

اس دوران میں ایرک نے محسوس کیا کہ قریب کھڑا ویٹر اس کے گال پر چپکی پیٹیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"کوئی خاص بات ہے؟" ایرک نے جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں سر!" ویٹر نے ذرا گھبرا کر کہا اور جلدی سے وہاں سے کھسک گیا۔

اس کے جانے کے بعد آرتھر بولا "اگر تم اس سوال پر میرے ساتھ مار پیٹ شروع نہ کرو تو میں پوچھنا چاہوں گا کہ تمہاری پیشانی پر یہ گومڑ کیسے ابھرا؟"

ایرک نے بڑے تحمل سے کام لیتے ہوئے اسے گومڑ کے بارے میں مطمئن کر دیا۔ اس دوران میں اس نے قریبی میز پر بیٹھے ایک مخمل کو بری طرح گھورتے ہوئے جوان کی ہینڈ بیج کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخر اس شخص نے نظر چرا لی۔ ایرک نے ٹھنڈی سانس لے کر بولا "آرتھر! ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اس کا ہر چیز پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے میری زندگی میں وہی وقت آگیا ہے۔" اس کا سر بری طرح دکھ رہا تھا اور کانوں میں گھن گھوں سی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ لنچ کر کے واپس دفتر پہنچے تو ایرک کو اپنی میز پر مس فلیگ کی چٹ رکھی ہوئی ملی۔ مس فلیگ نے اسے مطلع کیا تھا: "ہاسکم اینڈ کمپنی نے بھی آئندہ کے لیے ہمارے ٹوتھ پیسٹ کا آرڈر کینسل کر دیا ہے۔"

ایرک نے بے اختیار اپنی پیشانی پر زور سے ہاتھ مارا لیکن فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ یہ ایک غلطی تھی۔ بے اختیار اس کے منہ سے ہلکی سے چیخ نکل گئی کیونکہ ہاتھ اس نے اپنے گومڑ پر مار لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے پتا چلا کہ ان کی ایڈورٹائزنگ کمپنی نے بھی ان کی تشہیری مہم چلانے سے معذرت کر لی تھی۔ پچھلے سال ان کی برانی ایڈورٹائزنگ کمپنی بھی اس بنا پر ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھی کہ ان کی پبلسٹی کا بجٹ بہت کم اور تشہیر مہم بہت مختصر تھی۔ وہ اتنے چھوٹے چھوٹے کام نہیں کرتے تھے اور دوسری کمپنی نے بھی ایک سال بعد ہی جواب دے دیا تھا۔

ایرک نے نہایت احتیاط سے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ چند لمحے اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد وہ چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے مارنے کے ارادے سے واش روم چلا گیا۔ اسے امید تھی کہ ٹھنڈے پانی سے چہرہ بھگونے سے طبیعت کسی نہ کسی حد تک بحال ہو جائے گی۔ واش روم میں اس نے مسٹر شروڈر کو واش بیسن پر جھکے ہوئے پایا۔ غالباً وہ بھی چہرے پر ٹھنڈے پانی چھپکے مار رہے تھے۔ ایرک کو دیکھ کر وہ ذرا کھسیانے سے انداز میں سیدھے ہو گئے۔ وہ پھولے پھولے سرخ گالوں والے ایک پستہ قد' گول مٹول سے آدمی تھے اور کسی ٹوتھ پیسٹ کمپنی کے مالک کے بجائے تبت کا کوئی لاما دکھائی دیتے تھے۔

انہوں نے ایرک کو ہیلو کہا پھر کاغذی تولیے سے چہرہ خشک کرتے ہوئے اس کے رخسار کی طرف بغور دیکھ کر بولے "یہ کیا ہے؟"

ایرک کے سر میں اب بڑے زور کی دھمک ہو رہی تھی۔ جواب دینے سے پہلے ایک بار پھر اس نے دل ہی دل میں دس تک گنتی کی پھر کنڈرگارٹن کے بچوں کو سمجھانے کے انداز میں بولا "یہ ہینڈ بیج ہے۔"

"وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے لیکن ہوا کیا تھا؟ کیا تم وہسکی کی کسی ٹوٹی ہوئی بوتل پر گر پڑے تھے؟"

"اس قصے کو چھوڑیے۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" ایرک نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔

صبح سے جو پریشانیاں' ناگواریاں اور جھگڑے برداشت کرنا پڑ رہے تھے' ان سب کا زہر گویا دل میں کسی ایک مقام پر آکر جمع ہو گیا تھا۔ غم و غصے کے سیلاب کو قابو میں رکھنا گویا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ گو کہ اسے یہ بھی احساس تھا کہ جو کچھ وہ کہنے جارہا تھا' شاید اس پر بعد میں اسے پچھتانا پڑے۔ اس کے باوجود وہ وہیں واش روم میں کھڑے کھڑے سب کچھ کہہ گیا۔ ایک عرصے سے دل میں جو غبار جمع ہو رہا تھا' وہ اس نے نکال دیا۔ اس نے مسٹر شروڈر کو بتا دیا کہ کن کن حماقتوں کی وجہ سے کمپنی ڈبو رہے تھے۔ بلکہ ڈوبتی جارہی تھی۔ اس نے اپنی تلخ و تند تقریر کا اختتام اس اطلاع پر کیا کہ وہ استعفا دے رہا تھا۔

یہ سب کچھ کہہ کر وہ دروازے کی طرف مڑا تو مسٹر شروڈر اس کا بازو پکڑ کر روکتے ہوئے بولے "اتنی تیزی ٹھیک نہیں۔ میرے ساتھ میرے کلب چلو۔ وہاں آرام سے بیٹھ کر کچھ پیتے ہیں پھر بات کرتے ہیں۔ ابھی ہمیں بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

کچھ دیر بعد وہ شہر کے ایک نہایت عمدہ کلب میں بیٹھے تھے اور مارٹینی کا ایک ایک گلاس خالی کر چکے تھے۔ دوسرے گلاس سے بھی چند گھونٹ لے جا چکے تو مسٹر شروڈر نے کہا "اب بولو۔"

"میرا خیال ہے، میں پہلے ہی بہت بول چکا ہوں۔" ایرک کا لہجہ اب دھیما تھا۔

"لیکن میرا خیال ہے، تم نے جو کچھ کہا ہے، تمہارے ذہن پر ان کے علاوہ بھی کچھ باتوں کا بوجھ ہے۔" مسٹر شروڈر نے کہا۔

تب ایرک نے انہیں اپنی بیوی کی ناپسندیدہ عادتوں کے بارے میں بتایا جن کی وجہ سے اسے سخت کوفت ہوتی تھی لیکن وہ کسی طرح بھی انہیں چھوڑنے پر تیار نظر نہیں آتی تھی۔ آخر میں وہ بولا "حالانکہ مجھے اس سے بے پناہ محبت ہے لیکن کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے ایک آدھ گھونسا رسید کردوں۔"

"لیکن تم نے کبھی اپنی یہ خواہش پوری نہیں کی؟" مسٹر شروڈر نے تصدیق چاہی۔

"ہرگز نہیں۔" ایرک نے جواب دیا۔

"یہی مسئلہ میرا بھی ہے۔" مسٹر شروڈر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ چھڑی لے کر اپنی بیوی کی ٹھیک ٹھاک پٹائی کروں۔ تم نے کپتی کی جن خامیوں کی نشاندہی کی ہے، وہ سب میرے علم میں ہیں اور تم نے جتنی بھی تجویزیں پیش کی ہیں، وہ میرے ذہن میں بھی آتی رہی ہیں اور میں انہیں ڈورا کے سامنے بیان کرتا رہا ہوں لیکن وہ انہیں ہمیشہ رد کرتی رہی ہے۔ کپتی چونکہ اسے ورثے میں ملی ہے اس لیے حکم اسی کا چلتا ہے۔"

انہوں نے گلاس خالی کر کے مزید ڈرنکس کا آرڈر دیا اور چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولے "تم نے آج جس طرح مجھے گھری گھری سنائی ہیں شاید یہ کم و بیش اسی طرح کی چیز تھی جسے ڈاکٹر "جھٹکے کے ذریعے علاج" کہتے ہیں۔ تمہاری باتیں سن کر میرے اندر بھی ایک باغی سی روح ابھر آئی ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ آج جب میں گھر جاؤں گا تو میں بھی ڈورا کو کھری کھری سناؤں گا اور عین ممکن ہے میں اس کی پیشانی پر گھونسا مار کر ایسا ہی گومڑ بھی ابھار دوں جیسا تمہاری پیشانی پر ابھرا ہوا ہے۔"

"لیکن میری پیشانی پر گومڑ تو گیل کی فراک میں الجھ کر گرنے سے ابھرا ہے۔" ایرک نے جلدی سے گویا صفائی پیش کی۔

"تم بتا چکے ہو۔ اور مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔" مسٹر شروڈر نے اسے تسلی دی "میں تو اصل میں یہ مشورہ دینے لگا تھا کہ تمہیں بھی اسی طرح گیل کا علاج کرنا چاہیے جس طرح میں ڈورا کا کرنے جا رہا ہوں۔ تم اسے صاف صاف بتا دو کہ تم فرش پر بکھرے ہوئے اس کے کپڑوں میں الجھ کر گرتے گرتے، ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کو ٹھیک کرتے کرتے اور چیزیں غلط سلط جگہوں سے ڈھونڈتے ڈھونڈتے عاجز آ چکے ہو۔ اگر اب بھی اس نے اپنی خامیوں کی اصلاح نہ کی تو تم اس کا کچومر بھی نکال سکتے ہو۔ جب وہ اصلاح پر آمادہ دکھائی دے تو تم محبت کے ذریعے اپنے روپے کی تلافی کر سکتے ہو اور اسے خوش خبری سنا سکتے ہو کہ تمہاری تنخواہ میں اضافہ ہو گیا ہے۔"

"کیا؟" ایرک نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں۔ میں تمہاری تنخواہ میں اضافہ کر رہا ہوں۔ تم نے جب مجھے کھری کھری سنائیں تو پہلے میں یہی سوچتا تھا کہ تمہیں نکال باہر کروں لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ یہی نئے فیصلوں اور تبدیلیوں کا لمحہ ہے۔ اب ہم پہلے میں تبدیلی کے بارے میں بات کریں گے۔ سب سے پہلے ہمیں اپنے ٹوتھ پیسٹ کا نام بدلنا ہوگا۔"

چند لمحے بعد وہ دونوں میز پر کاغذات پھیلائے اور سر جوڑے بیٹھے تھے۔

اس روز ایرک کافی تاخیر سے پہنچا تو اسے اپنی بیوی کی گھونسے والا فارمولا آزمانے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ اس کا کھانا اوون میں رکھ کر خود چادر لپیٹ کر سو لیے لیٹی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ گھر میں ہر چیز سلیقے، قرینے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی تھی حتیٰ کہ وہ باتھ روم میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کو بھی بالکل صحیح حالت میں لانے کے لیے اس کا نچلا حصہ موڑ کر تھوڑا سا لپیٹ دیا گیا تھا۔ میٹ لسن کینٹ پر ایک کانچ چسپاں تھا جس پر گیل کی پہچان سی تحریر میں لکھا تھا:

"تم ابھی گنوار اور جنگلی ہو مگر مجھے تم سے محبت ہے۔"

گیل۔"

وہ مسکرا دیا۔

(انگریزی سے ترجمہ)

ضیاء تسنیم بلگرامی

**قومِ مدین کے نبی جو کاہن تھے جب اپنی قوم کو گمراہی سے نکالنا چاہتے تھے تو ان کی قوم بُری طرح قعرِ مذلت میں گری ہوئی تھی، ان کو عیاری اور مکاری کے گُر آتے تھے وہ قوم بد دیانت تھی، گمراہ راہ تھی بڑی انانیت پرست تھی کہ آپ کی اصطلاح میں دنوسی بان تھی اس کی اصلاح کرنے کرنے حضرت شعیبؑ عاجز آ گئے مگر قوم عاجز نہیں آئی۔ وہ آنکھیں بند کئے اپنی شرارتوں اور گمراہی پر کاربند رہی اور نتیجۃً اس کو وہ دن دیکھنا پڑا کہ الامان والحفیظ۔**

**پیغمبرزادوں کے حالاتِ زندگی، حکایتِ لذیذ واقعات کشید**

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک سو اڑتیس سال کی عمر میں قطورہ سے تیسری شادی کی۔ قطورہ سے جو اولادیں پیدا ہوئیں ان میں سے ایک کا نام یقسان تھا اور ایک کا نام مدین۔

ان دو کے علاوہ چار بیٹے اور تھے۔ یقسان کی نسل سے جو قوم پیدا ہوئی، وہ اصحاب الایکہ کہلائے۔ یقسان کے بیٹے ودیان تھے اور قوم ایکہ انہی کی نسل سے تھی۔

قطورہ کے ایک بیٹے کا نام مدین تھا اور مدین کے ایک صاحب زادے عیفاہ تھے۔

ان لوگوں نے مدین کے نام سے ایک شہر آباد کیا۔

خلیج عقبہ کے دونوں ساحلوں پر شمالی اور مغربی حجاز میں یہ قوم آباد تھی۔ جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی حصے تک ان کی آبادی تھی چونکہ یہ لوگ اپنے وقت کی بہترین شاہراہِ تجارت کے آس پاس آباد تھے اس لیے یہ بھی تجارت کرنے لگے تھے۔ تجارت کے علاوہ ان کا دوسرا پیشہ لوٹ مار تھا۔ یہ گزرنے والے قافلوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔

تجارت میں یہ چیزیں کم تولنے کے عادی تھے اور اس معاملے میں وہ کسی کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

عیفاہ کے گھر میں ایک بچے کی ولادت ہوئی اور اس بچے کا نام جو کچھ بھی رکھا گیا ہو ہمیں نہیں معلوم لیکن ہم اسے حضرت شعیب علیہ السلام کے نام سے جانتے ہیں۔ ویسے انہیں رعویل، یثرو اور حوباب بھی کہتے ہیں۔

حضرت شعیبؑ نے مدین میں آنکھ کھولی اور انہوں نے سنِ شعور میں قدم رکھتے ہی اپنی قوم کی خرابیوں کو بہ نظرِ غائر دیکھنا شروع کیا۔

اکثر و بیشتر یہ مناظر دیکھنے میں آئے کہ بازار میں کم تولنے پر جھگڑے ہو رہے ہیں۔ کسی گاہک نے دکان دار کا گریبان پکڑ رکھا ہے اور کم تولنے کی شکایت کر رہا ہے۔ دکان دار گریبان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرے دکان دار اپنے بے ایمان دکان دار کی حمایت میں وہاں پہنچ جاتے اور گاہکوں کی پٹائی کر دیتے۔ یہ جھگڑا یہاں تک بڑھتا کہ بازاروں میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے اور کچھ پتا نہ چلتا کہ کون کس کی طرف ہے۔

حضرت شعیبؑ یہ سب دیکھتے اور انہیں اپنی قوم کی گمراہی پر افسوس ہوتا۔ انہوں نے اپنی قوم کو سمجھانا شروع کیا۔

شروع شروع میں انہوں نے ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور قوم کے لوگوں کو ایسا لگتا جیسے ایک شخص بلاوجہ نصیحتیں کرتا پھر رہا ہے لیکن جب حضرت شعیبؑ کو اللہ تعالیٰ نے پیغمبری عطا کر دی تو حضرت شعیبؑ کے لیے یہ فرض ہو گیا کہ یہ خیال کیے بغیر کہ ان کی باتیں دوسروں پر اثر انداز ہوں گی یا نہیں۔ وہ اپنے کام سے لگے رہے، وہ دکان داروں کے پاس جاتے اور

انہیں دیانت داری کا درس دیتے۔

حضرت شعیبؑ کی شادی ۔نقسان کی بیٹی سے ہوئی لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت شعیبؑ کی شادی حضرت لوط کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ شادی کے بعد ان کی کئی اولادیں ہوئیں۔

عموماً دیکھا یہ گیا ہے کہ شادی کے بعد جب اولادیں پیدا ہوجاتی ہیں تو انسان میں احتیاط پسندی آجاتی ہے اور یہ احتیاط پسندی آدمی کو بزدل بنادیتی ہے لیکن حضرت شعیبؑ میں کسی قسم کی مصلحت اندیشی نہیں تھی اور ہر بات وہ دل نشین پیرائے میں کہہ جاتے تھے۔

ان کی قوم کو حضرت شعیبؑ کی کسی بات سے بھی کوئی غرض نہیں تھی اور جب انہوں نے انہی کے سامنے ان کی مذمت کی تو کچھ لوگ حضرت شعیبؑ کے حامی ہوگئے مگر اکثریت ان کے خلاف ہوگئی۔

حضرت شعیبؑ مندروں میں جاتے اور بعل دیوتا کی مذمت کرتے حالانکہ یہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ آپ نے اس دیوتا کی بھی برائی کی۔ بعل دیوتا کا تعلق زحل سے تھا۔

ایک روز انہوں نے بعل دیوتا کے مندر سے کچھ لوگوں کو نکلتے دیکھا اور باہر نکل کر یہ لوگ آپس ہی میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ معلوم نہیں کس بات پر ان میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ حضرت شعیب بھی ان کے پاس پہنچ گئے اور کھڑے کھڑے پوچھا "لوگو! تم کس بات پر جھگڑ رہے ہو؟ آخر وہ کون سا اہم مسئلہ ہے کہ بعل دیوتا نے تمہاری کوئی مدد بھی نہیں کی اور تم وہاں سے نکل کر شاید پہلے سے زیادہ شدت سے جھگڑ رہے ہو۔"

ان لوگوں نے حضرت شعیبؑ سے پوچھا "پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم یہ جو ہمارے معاملات میں مداخلت کرتے رہتے ہو تو تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے؟"

"حضرت شعیبؑ نے جواب دیا "میں نبی ہوں اور نبی کو اپنی قوم کی برائیوں پر نظر رکھنی ہوتی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اگر تم لوگوں نے اپنی اصلاح نہ کی تو تم پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔"

قوم نے ان کی باتوں کا مذاق اڑایا اور کہا "ہمارا تم کو یہ مشورہ ہے کہ یہاں اگر واقعی کوئی عذاب نازل ہونے والا ہے تو تم اپنے بیوی بچوں کو یہاں سے نکال لے جاؤ۔"

حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو بتایا "دیکھو! تمہیں میرے بیوی بچوں کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

ان کی قوم نے کہا "واہ شعیب! تم ہمارے معاملات میں دخل دیتے رہو تو کوئی بات نہیں مگر جب ہم تمہارے بیوی بچوں کے بارے میں کہیں تو تم ہمیں منع کرو کہ ہم ان کے بارے میں کچھ نہ کہیں۔"

لوگوں نے آپس میں پھر بحث و مباحثے شروع کردیے اور یہ بحث و مباحثے ہاتھا پائی تک پہنچ گئے۔ خوب ہی خون خرابہ ہوا۔

یہ تاجر اور خریدار لوگ تھے جو کم تولنے اور کم تول وزن کی قیمت ادا نہ کرنے کے مسئلے پر لڑ رہے تھے۔

حضرت شعیبؑ نے مسئلے کی نوعیت سمجھنے کے بعد دکان داروں سے کہا "تم کتنے عجیب لوگ ہو کہ اپنے بعل دیوتا کے سامنے مسئلے لے کر جاتے ہو اور باہر نکل کر بے ایمانی اور بددیانتی پر قائم رہتے ہو۔ آخر یہ کیا بات ہے؟"

دکان داروں نے کہا "ہم تو یہاں آنے کے لیے تیار نہیں تھے مگر یہ خریدار ہمیں زبردستی وہاں لے گئے تو ہم نے وہاں بھی بعل دیوتا کے سامنے بھی یہی کہہ دیا کہ تم ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔ ہم اپنی چیز کے مالک ہیں اور اس کی جتنی قیمت چاہیں وصول کریں اور کم تولیں۔ کسی دوسرے کو اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

حضرت شعیبؑ نے تاجروں سے کہا "جب تمہیں کوئی شخص تمہاری چیز کی پوری قیمت دے رہا ہے تو وہ کم چیز کیوں لے گا؟ جس طرح تم یہ کہتے ہو کہ تمہیں اپنی چیز پر پورا اختیار ہے کہ کم تولو یا زیادہ اسی طرح خریدار یہ کہہ سکتا ہے کہ رقم اپنی ہے ہم کم دیں یا زیادہ' اس طرح تو پورا کاروباری اور معاشرتی نظام برباد ہوجائے گا۔ خدا کے لیے تم لوگ من مانی نہ کرو۔"

دکان داروں نے کہا "ہم یونہی پریشان ہیں اس نے ہمیں اور پریشان کر رکھا ہے۔"

حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو بتایا "حضرت ادریسؑ نے جو تین طبقات قائم کیے تھے' اس میں کاہن کو سب سے اونچا مقام حاصل تھا۔ میں تمہاری قوم کا کاہن ہوں اس لیے تمہیں ہمارا کہنا ماننا چاہیے۔"



تاجروں نے کہا "ہم تمہارا کہنا اپنے کاروباری معاملات میں نہیں مانیں گے اور تمہیں بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ہمیں تمہاری باتوں سے نقصان نہ پہنچے۔ اگر نقصان پہنچے گا تو ہم تمہاری بات ہی نہیں مانیں گے۔"

حضرت شعیبؑ کو بڑی مایوسی ہو رہی تھی کہ یہ ناہنجار قوم کوئی معقول بات سمجھنے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ ان کی عورتیں اور لڑکیاں بھی بہت تیز تھیں۔ یہ لٹیروں کی مدد کرتی تھیں۔ جب کوئی کاروباری قافلہ ادھر سے گزرتا اور قزاقوں کو معلوم ہوجاتا کہ قافلے کے ساتھ مال بہت ہے تو یہ قافلے والوں کو گمراہ کرنے کے لیے اپنی لڑکیاں قافلوں میں بھیج دیتے اور یہ لڑکیاں ہنس ہنس کے ان کی چیزوں کے بھاؤ تاؤ کرتیں۔ ان کی اداؤں اور مسکراہٹوں کا یہ اثر ہوتا کہ قافلے کے لوگ ان کے گرویدہ ہوجاتے اور یہ لڑکیاں انہیں سامان کے ساتھ آبادی میں لے جاتیں جہاں ان کی گھات میں لگے ہوئے لٹیرے ان کا مال چھین کے فرار ہوجاتے اور تاجر روتے دھوتے رہ جاتے۔

ایسا ہی ایک قافلہ مسالے اور خوشبویات لے کر مصر جا رہا تھا کہ مدین والوں کو ان کی آمد کا علم ہوگیا۔ یہ لوگ گھات لگا کر بیٹھ گئے اور کئی لڑکیاں قافلوں میں پہنچ گئیں۔ ان لڑکیوں نے آج کے نوسربازوں جیسا کارنامہ انجام دیا۔

تاجروں نے شہر کے باہر پڑاؤ کیا تھا۔

لڑکیوں نے قافلے کے اندر آمدورفت شروع کردی۔ وہ قافلے کے سردار کے پاس پہنچ کے پوچھنے لگیں "سردار! یہ تو بتائیں' یہ مال جو آپ لوگ مصر لے جا رہے ہیں' وہاں تک کس طرح پہنچے گا؟"

تاجروں کے بڑے بیوپاری نے جواب دیا "یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ مال راستے میں لٹ بھی سکتا ہے مگر یہ ہمارا پہلا سفر نہیں ہے۔ ہم اپنے ساتھ جنگجو بھی رکھتے ہیں جو ہمارے مال کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور بوقت ضرورت لٹیروں کا مقابلہ بھی کرسکتے ہیں۔"

ایک لڑکی نے کہا "اگر یہ بات ہے تو بہت اچھی بات ہے لیکن جناب! یہ خوشبویات عبادت گاہوں میں جلائی جاتی ہیں اس لیے ان کا تقدس پامال نہیں ہونا چاہیے۔ تم لوگ یہاں تک آگئے ہو تو ہمیں بھی اپنی خدمت کا موقع دو۔"

تاجروں نے ان لڑکیوں میں دلچسپیاں لینی شروع کردیں اور پوچھا "تم ہماری کیا مدد کرسکتی ہو؟"

لڑکیوں نے کہا "ہم تمہارے ساتھ چند ایسے رہنما کرسکتے ہیں جو تمہیں محفوظ راہوں سے ایک ایسی شاہراہ تک پہنچادیں گے جو لٹیروں سے محفوظ ہوگی۔"

تاجروں نے پوچھا "تمہارے بزرگ کیا کرتے ہیں؟"

لڑکی نے جواب دیا "ہمارا خاندان بھی عبادت گاہوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وقت ضرورت مسافروں کی مدد کرتا ہے۔ لوگوں کی امانتیں رکھتا ہے۔ لوگوں کے جھگڑے نمٹاتا ہے' مسافروں کی رہائش اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتا ہے اور یہ کام ہمارے خاندان میں صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔"

یہ لڑکی نہایت تیز طرار اور گفتگو کے فن سے واقف تھی۔ ایک تاجر نے کہا "تمہارا خاندان تو بہت کچھ کرتا ہے مگر تم کیا کرتی ہو؟"

ایک لڑکی نے جواب دیا "ہمارے پاس کوئی خاص کام تو ہوتا نہیں۔ اپنے فارغ اوقات میں نکل کر مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں تم لوگ چاہو تو تمہاری بھی مدد کرسکتے ہے غالباً تم میرا مطلب سمجھ گئے ہوگے۔"

تاجر گھبرا گیا' جواب دیا "ہاں کچھ سمجھے اور کچھ نہیں۔ تم بھی تو ذرا کھل کے بات کرو۔"

لڑکی نے جواب دیا "تم لوگ مہینوں اور سالوں اپنے گھروں سے دور رہتے ہو۔ تمہارے بیوی بچے تمہارے ساتھ سفر نہیں کرسکتے۔ کیا وہ تمہیں پردیس میں یاد نہیں آتے؟"

تاجر نے جواب دیا "وہ یاد تو آتے ہیں لیکن کیا کریں' انہیں ہم اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

لڑکی نے کہا "انہیں ساتھ رکھنا بھی نہیں چاہیے لیکن ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہنی چاہیے۔ اگر تمہاری بیویاں تمہارے گھروں پر ہیں تو یہاں کی بیویوں سے کام چلاؤ۔"

تاجر نے پوچھا "لڑکی تو کمسن بیویوں کی بات کر رہی ہے۔ ہم پردیسیوں سے کون شادی کرے گا؟"



پاکستان پوائنٹ فورم

لڑکی نے پٹی پڑھائی اور یقین دلایا کہ وہ اور اس کی قبیل کی کئی لڑکیاں ان تاجروں سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی ہیں۔

تاجروں نے اشاروں کنایوں میں لڑکیوں کو جتایا۔ "لڑکیو! قافلے میں پچاس مرد ہیں اور انہیں اتنی ہی لڑکیاں درکار ہوں گی مگر مصیبت یہ ہے کہ یہ لڑکیاں بھی ہمارے ساتھ سفر نہیں کر سکتیں کیونکہ آدمیوں اور مال کا بوجھ ہی بہت زیادہ ہے۔"

لڑکی نے کہا "تب پھر تم ایسا کرو کہ ہم میں سے چند لڑکیوں کا انتخاب کر لو۔ وہ سب کے لیے کافی ہوں گی گو کہ یہ اخلاقی نقطہ نظر سے بری بات ہے لیکن ضرورت کے نقطہ نظر سے مناسب بات ہے۔"

تاجروں کو ان سے باتیں کر کے مزہ آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ ہم میں سے کچھ لوگ ان لڑکیوں سے شادیاں کر لیں اور کسی طرح یہاں سے نکل چلیں۔ ان سے ہم سب لطف اندوز ہوتے رہیں گے اور پھر کام نکل جانے کے بعد انہیں کہیں بازاروں میں فروخت کر دیں گے۔ اس طرح آم کے آم گٹھلیوں کے دام مل جائیں گے۔

سب ہی نے اس رائے سے اتفاق کیا اور اپنے فیصلے سے دوسروں کو بھی مطلع کر دیا۔

جب لڑکیوں کو خفیہ شادی کے لیے قافلے میں بلوایا گیا تو انہوں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "جو کام کرنا ہے' جلد از جلد کر لو کیونکہ گھر والوں کو سن گن مل گئی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ بات بگڑ جائے۔"

قافلے والوں کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ باتونی لڑکیاں اپنے گھروں سے مطمئن نہیں ہیں اور شاید ان پر سختیاں بھی ہوتی ہیں اور اپنے اس ماحول سے نکلنا چاہتی ہیں۔

یہ کل دس لڑکیاں تھیں جو اپنے ماحول' اپنے خاندان اور اپنی معیشت سے نالاں تھیں۔

تاجر تو اتنی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے کہ ان سب کی قیمت فروخت کا اندازہ لگا لیا گویا ان کی خوش قسمتی سے نیا مال ہاتھ آ گیا تھا۔

وہ سب لڑکیوں کی ناز برداریاں کرنے لگے اور ان لڑکیوں نے ان کی چکنی چپڑی دعوتیں بھی کر دیں۔ انہوں نے آپس میں تحفہ تحائف بھی دیے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لڑکیوں نے خاموشی سے اپنا رختِ سفر بھی باندھ لیا اور شادی کے پہنچے ہی اچانک قافلے کے ساتھ روانہ ہو گئیں۔ یہ سب خوش تھیں لیکن انہیں دو منزلوں کے بعد پکڑ لیا گیا۔ مدین کے لوگوں نے قافلے پر الزام لگایا کہ وہ ان کی دس لڑکیاں اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔

"پہلے تو قافلے والوں نے انکار کیا کہ ان کے ساتھ مدین کی کوئی لڑکی نہیں ہے۔"

مگر مدین کے ایک بزرگ نے قافلے والوں کو سمجھایا "دیکھو' تم نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ جھوٹ بولنے سے کچھ حاصل نہیں۔ لڑکیاں ہمارے حوالے کر دو اور ہم سے معافی مانگ لو۔"

لیکن تاجروں کو چونکہ یہ یقین تھا کہ لڑکیاں اپنی مرضی سے ان کے ساتھ آئی ہیں اس لیے انہیں بھی رازداری سے کام لینا چاہیے اور چالاک تاجروں نے فوراً ہی یہ منصوبہ بنا لیا کہ کچھ لوگ مدین والوں کو باتوں میں لگائے رکھیں اور کچھ ان لڑکیوں کو لے کر آگے چلے جائیں۔

چنانچہ اس منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے لڑکیوں کو پہلے پیار و محبت اور پھر زبردستی قافلے سے الگ کر کے آگے منتقل کرنا چاہا مگر لڑکیوں نے اس ہدایت پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً قافلے والوں نے انہیں باندھ دیا مگر ایک لڑکی کسی طرح انہیں دھوکا دے کر بھاگ نکلی اور شور مچانے لگی "بچاؤ! بچاؤ... ہمیں ان ظالموں سے بچاؤ۔"

مدین والے تو اس موقع کی تلاش میں تھے چنانچہ قافلے والے جھوٹے ٹھہرے اور ان سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ وہ اپنی بے گناہی کی قسمیں کھاتے رہے مگر ان کا کسی نے یقین نہ کیا اور مقدمہ جرگے کے روبرو پیش ہوا۔ وہاں ایک لڑکی نے رو رو کے بیان دیا "ہمیں ان لوگوں نے بہلا پھسلا کر قافلے میں بلایا اور پھر ہمیں قیدی بنا لیا۔ ہمارے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے۔ ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور یہاں تک لے آئے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ زیادتیاں بھی کیں جب تک زیادتیاں کرتے' ہمارے منہ سے کپڑے نکال کر ہاتھ پاؤں کھول دیتے اور زیادتیوں کے بعد یہ ہمارے منہ میں دوبارہ کپڑے ٹھونس دیتے اور ہاتھ پاؤں باندھ دیتے۔ یہ آپس میں کہہ رہے تھے کہ مصر پہنچنے تک ان لڑکیوں سے مزے لو اس کے بعد ان سب کو فروخت کر دو۔"

اس مقدمے کی کارروائی دیکھنے اور سننے کے لیے ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔



مقدمہ کی روداد پہلے ہی تاجروں کے خلاف جا چکی تھی۔

آخر جرگے نے تاجروں کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ تاجر مجرم قرار پائے جنہوں نے مدین والوں پر شرمناک ہاتھ ڈالا تھا اور ان کی عزت و آبرو خاک میں ملا دی تھی۔

جرگے نے فیصلہ دیا کہ قافلے والوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کا سامان تجارت ضبط کر لیا جائے۔

تاجر فریاد کرتے رہے کہ ان پر مدین والوں نے لڑکیوں کی مدد سے ظلم کیا ہے اور ان کے ساتھ سراسر زیادتی اور ناانصافی ہو رہی ہے۔

تاجروں کو نہایت سفاکی سے قتل کر دیا گیا اور ان کی اشیائے تجارت ضبط کر لی گئیں اور اپنی اس کامیابی کی خوشی میں بعل دیوتا کے قدموں میں قربانیاں دی گئیں۔ خوشبویات جلائی گئیں۔

جب یہ جشن منایا جا رہا تھا تو حضرت شعیبؑ نے اپنی بیٹیوں کے ذریعے اس مقدمے سے متعلق ایک لڑکی کو بلوایا اور اس سے پوچھا "بیٹی! سچ سچ بتا کہ اصل معاملہ کیا تھا؟"

لڑکی نے جھوٹ کا سہارا لیا اور جس بیان کی بنیاد پر یہ مقدمہ جیتا گیا تھا اس کو بیان کرنے کے بعد لڑکی رونے لگی اور کہا۔ "یہ بہت ظالم لوگ تھے اور انہوں نے ہم سے بڑی زیادتیاں کی ہیں۔"

حضرت شعیبؑ نے لڑکی کے بیان کو سچ نہیں مانا اور کہا "دیکھ بیٹی! تو نے جو کچھ کہا' وہ سب جھوٹ ہے کیونکہ کوئی بھی گروہ یا جماعت دس لڑکیوں پر قابو پا کے اور انہیں باندھ کے اگر لے جانا ہی چاہے تو مدین سے اتنے قریب نہ ٹھہرتے کہیں بہت دور نکل جاتے۔"

لڑکی رونے لگی۔

حضرت شعیبؑ نے کہا "اس رونے سے بھی کوئی فائدہ نہیں کیونکہ تم سب کے بیانوں پر ان سب کو قتل کر دیا گیا اور وہ لوٹ لیے گئے ہیں۔"

حضرت شعیبؑ کی بیٹیاں بہت پریشان تھیں کہ ان کے شہر میں ظلم و زیادتی ہوئی اور اس ظلم و زیادتی میں لڑکیاں بھی ظالموں کی شریکِ کار رہیں۔

حضرت شعیبؑ کی بیٹی صفورہ نے اس لڑکی سے کہا "تو سچ سچ بتا کہ یہ معاملہ کیا تھا کیونکہ تو نے جو کچھ بتایا ہے' اس پر والد صاحب نے اعتبار نہیں کیا' معاملہ کچھ اور ہے۔"

جب لڑکی نے دیکھا کہ یہاں جھوٹ اس کے کام نہیں آئے گا تو اس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور آخر میں کہا "ہوا یہ کہ جب یہ قافلہ یہاں آیا اور اس کے ساتھ لوگوں نے بے پناہ سامان دیکھا تو یہاں والوں کی نیتیں بدل گئیں اور اس قافلے کو لوٹنے کا ایک ایسا منصوبہ تیار ہوا جس میں ہمیں بھی شریک کر لیا گیا اور پھر جو کچھ ہوا' اس سے آپ واقف ہی ہیں۔"

حضرت شعیبؑ نے مدین والوں کو شرمندہ کیا اور کہا "تم لوگوں کے طریقہ واردات کتنے عجیب و غریب ہیں۔ تم سب کھلم کھلا ناجائز طریقوں سے لوٹ مار کرتے ہو۔ چیزیں فروخت کرتے ہو تو کم تولتے ہو۔ تجارتی معاہدے کرتے ہو تو فائدے اٹھانے کے لیے انہیں توڑ دیتے ہو۔ جب یہ سب کر چکتے ہو تو قافلوں کے راستوں میں بیٹھ جاتے ہو اور رہزنی شروع کر دیتے ہو۔ تم یہ سب کیوں کرتے ہو۔ کیا تمہیں اللہ کے پاس نہیں جانا ہے۔ اللہ کو منہ نہیں دکھانا ہے۔ تم نے اپنے دادا ابراہیمؑ کا طریقہ چھوڑ دیا اور بت پرستی کرنے لگے۔ تم پتھر کے بے جان مجسمے بعل کو تو ہر طرح راضی رکھنے کی کوشش کرتے ہو جو تمہارے کسی بھی فعل سے نہ تو خوش ہو سکتا ہے اور نہ ناخوش اور اس ذات کو ناراض کر دیتے ہو جس نے تمہیں پیدا کیا اور یہ کائنات بنائی۔ اب تم نے اپنی لوٹ مار میں اپنی بیٹیوں کو بھی شریک کر لیا ہے اور کچھ ایسا عجیب و غریب طریقہ اختیار کرنے لگے ہو کہ بظاہر تم بھولے بھالے اور معصوم نظر آتے ہو مگر اس معصومیت کے پیچھے تمہارا خبث باطنی کم از کم مجھے تو صاف نظر آتا ہے۔ بتاؤ تم یہ سب کب تک انجام دیتے رہو گے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم پر بھی عذاب الٰہی نازل ہو گا۔ خدا کے لیے تم اپنی ان حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ تم مٹ جاؤ گے اور تمہاری داستانیں آنے والوں کو عبرت دلانے کے لیے باقی رہ جائیں گی۔"

ایک مفسد نے ان کو مشورہ دیا "حضرت! آپ ہماری فکر نہ کریں۔ ہم تو جس طرح ہیں' اسی طرح رہیں گے۔"

حضرت شعیبؑ نے کہا "میری باتیں ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتیں لیکن جب تم پر عذاب نازل ہوگا اور تم پناہ مانگو گے تو تمہیں پناہ نہیں ملے گی۔ بولو تم کیا چاہتے ہو؟"

انہیں جواب دیا گیا "حضرت! آپ ہماری فکر نہ کریں آپ کو بس اپنی فکر ہونا چاہیے۔ ہم سب تو انتہائی خوش دل اور مزے کی زندگی گزار رہے ہیں مگر تمہیں چوپائی کرنی پڑتی ہے۔ تمہاری بیٹیوں کو مویشی سنبھالنا پڑتے ہیں اور تم سچ سچ بتاؤ کہ یہ جو تم کہتے پھرتے ہو اس سے تمہیں بھی کوئی فائدہ پہنچا؟"

حضرت شعیبؑ نے کہا "مجھے یہ فائدہ پہنچا کہ میرا بد کاروں میں نام نہیں لیا جاتا۔ مجھے تم لوگوں میں شامل نہیں کیا جاتا اور مجھے تمہارے پتھر کے بتوں کے سامنے جھکنا نہیں پڑتا۔"

حضرت شعیبؑ کی باتوں کا کچھ پر اثر ہوا وہ آپ کی پیروی کرنے لگے اور ان سب نے بعل دیوتا کی پرستش بند کردی اور حضرت شعیبؑ کے ساتھ نماز پڑھنے لگے۔

اب حضرت شعیبؑ کے ماننے والوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہوگیا تھا۔ مدین کے لوگوں کو خوف ہوا کہ یہ لوگ دوسروں پر بھی اثر انداز ہوں گے اور ان کی اپنی قوت میں کمی ہوجائے گی تو انہوں نے حضرت شعیبؑ کے خلاف باتیں شروع کردیں اور دھمکیوں پر اتر آئے۔

ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کرکے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت شعیبؑ کو صاف طور پر منع کیا جائے کہ وہ ان لوگوں کو مروجہ آبائی طریقوں سے نہ روکیں۔ یہ ناپ تول میں کمی اور بت پرستی، ڈاکا زنی یہ کوئی ان کے اپنے رائج کردہ طریقے تو نہیں ہیں۔ یہ ساری چیزیں انہیں ورثے میں ملی تھیں۔ ان کے آباؤ اجداد بھی یہی سب کرتے تھے اور ان کے بزرگوں کو کسی نے ان کاموں سے نہیں روکا تھا پھر وہ کیوں دخل دیتے ہیں۔

اسی دوران میں ان کی بیٹیاں مویشیوں کو چرا کر واپس لائیں اور کنوئیں پر انہیں پانی پلانے لگیں تو انہیں ایک اجنبی نظر آیا۔ اس اجنبی نے ان لڑکیوں سے پوچھا "تم کہاں رہتی ہو؟"

لڑکیوں نے باپ کا نام بتایا اور اپنے خاندان کی تفصیل بتائی تو معلوم ہوا کہ ان کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے ہے۔

یہ لڑکیاں اس اجنبی کو اپنے گھر لے گئیں اور حضرت شعیبؑ نے جب ان سے ان کا تعارف چاہا تو پتا چلا کہ اس نوجوان کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کے پوتے حضرت یعقوبؑ کی نسل سے ہے اور اس نوجوان کی پوری نسل مصر میں آباد تھی۔ ان کا نام حضرت موسیٰؑ تھا ان کے ہاتھ سے ایک قبطی مارا گیا تھا اور حضرت موسیٰؑ بوجہ مجبوری مصر چھوڑ کر مدین چلے آئے تھے۔

حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ میں وہ ساری خصوصیات دیکھیں جو ایمان والوں میں ہوتی ہیں تو انہوں نے اپنی بیٹی صفورہ کی شادی حضرت موسیٰؑ سے کردی اور حضرت موسیٰؑ بھی چوپائی کرنے لگے۔

حضرت موسیٰؑ بھی بت پرستی سے مجتنب اور ایک اللہ کی عبادت کرتے تھے اس لیے مدین کے لوگ حضرت موسیٰؑ کو بھی پسند نہ آئے لیکن چونکہ حضرت موسیٰؑ کا تعلق اس قوم سے نہیں تھا اور نہ حضرت موسیٰؑ اس قوم کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے تھے اس لیے قوم کی ذمے داری حضرت شعیبؑ کو سونپی گئی تھی اور حضرت شعیبؑ کو پہلے تلقین وارشاد میں مشغول دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھا تھا کہ مدین کے شریر لوگ ان سے کتنی بری طرح پیش آتے تھے۔

حضرت شعیبؑ خود بھی نماز پڑھتے تھے اور حضرت موسیٰؑ کی تعلیمات پر عمل کرنے والے بھی نمازیں پڑھتے تھے۔ ان کا یہ طریقہ عبادت مدین والوں کو پسند تو نہیں تھا مگر یہ تعداد میں کم تھے اس لیے انہیں ان ایمان والوں سے کوئی خوف بھی نہ تھا۔ ان کا یہی بے ضرر ہونا مدین والوں کی خاموشی کا سبب تھا لیکن اب حضرت شعیبؑ کے لہجے میں شدت پیدا ہوگئی تھی اور آپ بار بار کہہ رہے تھے "زمین میں فساد برپا نہ کرو۔ زمین میں اصلاح کے بعد خرابی نہ کرو۔ اگر تم صاحب ایمان ہو تو خدا کا دیا ہوا نفع ہی بہتر ہے اور میں تم پر نگہبان نہیں ہوں۔ اگر تم میں سے ایک جماعت میری رسالت پر ایمان لے آئی ہے اور ایک جماعت ایمان نہیں لائی تو میں اپنے ایمان لانے والے ساتھیوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ صبر کریں اس وقت تک کہ خدا ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کردے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

مدین کے لوگوں نے عاجز آکے حضرت شعیبؑ کو منع کیا کہ وہ ایسی باتیں نہ کریں ورنہ وہ بھی حضرت شعیبؑ اور ان کے



ساتھیوں کے خلاف سخت رویہ اختیار کریں گے۔

حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا "تم ایک اللہ کی عبادت کرو کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ ناپ اور تول میں کمی نہ کرو۔ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے دلیل آچکی ہے اس لیے تم ناپ تول پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا۔ اگر تم میری نصیحتوں پر عمل کرو تو میں تمہیں اچھی حالت میں دیکھتا ہوں اور اگر تم ایمان نہ لائے تو مجھے تمہارے بارے میں ایک ایسے دن کے عذاب کا خوف ہے جو تم کو گھیر کر رہے گا اور اے قوم! ناپ اور تول میں انصاف سے کام لو یعنی کم نہ تولا کرو۔"

مدین والے یہ باتیں سنتے سنتے تنگ آگئے۔ پہلے تو وہ ان پر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے مگر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کے ..... اپنے لوگ حضرت شعیبؑ کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور حضرت شعیبؑ کے ماننے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے تو انہیں تشویش ہوئی اور انہوں نے حضرت شعیبؑ کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا۔

ان کی ایک مختصر جماعت حضرت شعیبؑ کے پاس آئی اور انہیں منع کیا کہ تم یہ نصیحتوں اور ہدایتوں کا سلسلہ بند کرو کیونکہ اب تمہاری باتیں ناقابل برداشت ہوگئی ہیں۔

حضرت شعیبؑ نے جواب دیا "باتیں تو تم سب کی ناقابل برداشت ہیں اور میں انہیں گوارا نہ ہونے کے باوجود برداشت کرتا ہوں تو تمہیں بھی نصیحتیں برداشت کرنی چاہئیں بلکہ انہیں اختیار کرنا چاہیے تاکہ تم اللہ کے نیک بندوں میں شمار کیے جاؤ۔"

ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ حضرت شعیبؑ نماز پڑھنے چلے گئے اور ان لوگوں سے کہتے گئے ..."میں ابھی آیا نماز پڑھ لوں پھر تم سے بات کروں گا۔"

یہ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے اور آپس میں پوچھنے لگے۔ یہ نماز کیا ہوتی ہے اور شعیب کو ہمارے ذاتی مشاغل سے چڑ کیوں ہے؟"

ان میں سے کسی نے بتایا "شعیب کسی خاص معبود کو عبادت کرنے کے دوران میں سامنے نہیں رکھتے۔ وہ کسی ان دیکھی قوت کو معبود سمجھتے ہیں اور اسی کی عبادت کرتے ہیں۔"

ایک نے کہا "چلو عبادت سے ہمارا کیا سروکار۔ وہ جس کی عبادت چاہیں کریں مگر وہ تو ہمارے ذاتی مشاغل میں بھی رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔ مثلاً ہماری ناپ تول سے بھی انہیں اختلاف ہے اور انہیں اس مال سے بھی پرہیز ہے جو ہم راہوں میں بیٹھ کے لوگوں سے چھین لیتے ہیں حالانکہ شعیب کو سوچنا چاہیے کہ اس میں ہماری جان کو بھی خطرہ ہوتا ہے اور ہمارے کئی آدمی کام بھی آچکے ہیں۔"

دوسرے نے اپنے ساتھیوں کو بتایا "مسئلہ یہ نہیں کہ ہم اپنی عقل اور ہوشیاری سے اتنی دولت کما لیتے ہیں بلکہ شعیب کی نظر میں مسئلہ یہ ہے کہ وہ کیوں نہیں کماتے۔ شعیب کا اپنا کوئی کاروبار بھی نہیں ہے۔ ان کی گزر بسر چوپائی پر ہے۔ وہ اتنے بہادر بھی نہیں ہیں کہ راہوں میں لوٹ مار کریں۔ سیدھے سادے آدمی ہیں، اگر خود کچھ نہیں کرسکتے تو دوسروں کو کرتا دیکھ بھی نہیں سکتے۔"

حضرت شعیبؑ نماز پڑھ کر آئے تو ان لوگوں نے پوچھا "آپ نماز پڑھ آئے؟"

حضرت شعیبؑ نے جواب دیا "ہاں میں نماز پڑھ آیا۔"

ایک نے ازراہِ شرارت پوچھا "شعیب! اگر ہم تمہیں اپنے کاروبار میں شریک کرلیں اور تمہیں بھی دولت کمانے کے مروجہ طریقے حاصل ہوجائیں تو سچ سچ بتاؤ کہ تم کیا کرو گے؟"

حضرت شعیبؑ نے جواب دیا "اول تو میں کسی کاروبار میں شریک ہونا پسند نہیں کرتا اور اگر کسی طرح مجھے بھی کاروبار کرنے کا موقع ملے تو میں اپنے آلات دیانہ درست رکھوں گا۔ اس کے علاوہ میں لوگوں کو دھوکا بھی نہیں دوں گا۔"

کسی نے اپنے ساتھیوں سے کہا "دیکھا تم نے یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اگر یہ شخص اپنے قول کے مطابق کاروبار شروع کردے تو یہ ہمیں نقصان پہنچاوے گا کیونکہ سارے گاہک اسی سے لین دین شروع کردیں گے اور یہ مالدار ہوتا چلا جائے گا اور ہم سب

خسارے میں رہیں گے۔"

ان میں کئی ایسے بھی تھے جو قطع الطریق اور رہزنی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک نے حضرت شعیبؑ سے کہا "شعیب! تم سے امید تو نہیں ہے کہ تم ہماری ہاں میں ہاں ملاؤ مگر پھر بھی ہماری طرف سے پیش کش ہے کہ اگر تمہیں دولت کی ہوس ہے تو ہمارے ساتھ چلو۔ فی الحال تم کچھ نہ کرو اور صرف ہمارے ساتھ رہو۔ ہم تمہیں بھی اپنی لوٹ مار سے حصہ دیں گے مگر تم یہ نصیحتیں اور ہدایتیں بند کردو کیونکہ ہم تمہاری یکساں راگنی سے تنگ آگئے ہیں۔"

حضرت شعیبؑ نے لاحول پڑھی اور کہا "تم کتنے بے ہودہ لوگ ہو کہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے مجھے بھی اپنی طرف کھینچ لینا چاہتے ہو۔ مجھے دولت کی کوئی ہوس نہیں۔ میرے پاس بہت سارے مویشی ہیں۔ ان سے میری بہت اچھی گزر بسر ہو رہی ہے۔ مجھے گوشت بھی میسر ہے اور دودھ بھی۔ خبردار! جو آئندہ مجھے اس قسم کی کوئی ترغیب دی۔"

ان شریر لوگوں نے کہا "ہمیں آپ کی مجبوری کا پتا ہے۔ رہزنی کا پیشہ بہادری چاہتا ہے اور آپ میں بہادری نام کو بھی نہیں ہے۔ آپ کاروباری حضرات کے ساتھ ان کے کاروبار میں شریک ہو جائیں۔ آپ کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا صرف ناپ تول کریں نفع میں سے ہم آپ کو کچھ نہ کچھ دے دیا کریں گے۔"

حضرت شعیبؑ نے غصے میں کہا "یہ تم لوگوں کی عقلوں کو کیا ہوا کہ میں تو تمہیں نیکی کی راہ پر لانا چاہتا ہوں اور تم مجھے برائی کی ترغیب دے رہے ہو۔ اب تم لوگ جاسکتے ہو کیونکہ تم پر عذاب نازل ہو کر رہے گا۔"

ایک نے ان سے پوچھا "اے شعیب! سچ بتاؤ۔ کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں، ہم ان کو ترک کردیں یا اپنے مال میں تصرف کرنا چاہیں تو نہ کریں۔ تم تو بڑے نرم دل اور راست باز ہو۔"

حضرت شعیبؑ نے کہا "اے قوم! دیکھو تو اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے اپنے کرم سے مجھے نیک روزی دی ہے تو کیا میں اس کے خلاف کروں گا اور میں نہیں چاہتا کہ جس امر سے تمہیں منع کروں، اسے خود کرنے لگوں۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا تمہاری اصلاح چاہوں گا۔ اللہ ہی کے بھروسے پر اس کے کرم کا خواستگار ہوں اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ مجھ ڈر ہے کہ جو تم میری مخالفت میں لگے رہتے ہو تو تم کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھو جس سے اللہ ناراض ہو اور تم پر قوم نوح قوم ہود اور قوم صالح جیسی کوئی آفت نازل ہو۔"

وہ لوگ غصے میں آگئے اور حضرت شعیبؑ سے کہا "اے شعیب! تم نے حد کردی۔ اب تمہاری باتیں ناقابل برداشت ہوگئی ہیں اس لیے ہم تمہیں تمہارے ساتھیوں کے ہمراہ اپنے شہر سے نکال باہر کریں گے۔"

حضرت شعیبؑ نے انہیں نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی اور یہ نرمی اس لیے نہیں تھی کہ وہ مدین کے بااثر اور صاحب ثروت لوگوں سے خوف زدہ ہو گئے تھے بلکہ وہ چونکہ ایک رسول کے منصب پر فائز تھے اس لیے حلم و مروت سے کام لینا نبوت کا خاصّہ تھا۔ آپ نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے شہر سے نکال دینے کی دھمکی دیتے ہو میں تو اللہ کی جانب سے مامور کیا گیا ہوں۔ میں وہی کہوں گا جس کا مجھے حکم دیا جائے گا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اپنے ماننے والوں کی وجہ سے تمہارا وہ سخت رکھتا ہوں۔ میں تو اللہ کی طرف سے مامور کیا گیا ہوں۔ تم میرا کہنا نہیں مانتے تو نہ مانو اور اپنے شیطانی کام کرتے رہو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔ اللہ کے نزدیک جو درست راستے پر ہوگا، اللہ اسے نوازے گا اور جو غلط راستے پر ہوگا تو دونوں کے بارے میں اللہ کی طرف سے فیصلہ صادر ہو جائے گا۔ اللہ قادر مطلق ہے وہی منصف حقیقی ہے۔"

مدین والوں کو حضرت شعیبؑ سے زیادہ ان کے قبیلے کا ڈر تھا۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور حضرت شعیبؑ کا قبیلہ ایک باوقار اور باعزت قبیلہ تھا۔ مفسدین مدین کو یہ ڈر لاحق تھا کہ اگر انہوں نے حضرت شعیبؑ کے خلاف کوئی کارروائی کی تو ان کے قبیلے کے لوگ سامنے آجائیں گے اس لیے یہ لوگ حضرت شعیبؑ کے قبیلے والوں سے ملے اور ان سے حضرت شعیبؑ کی شکایت کی "اب شعیب ناقابل برداشت ہو چکے ہیں۔ تم لوگ شعیب کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہو تم چاہو تو شعیب باز آجائیں گے ورنہ ہم انہیں طاقت سے روک دیں گے اور اس وقت تم کوئی اعتراض بھی نہ کر سکو گے۔"

قبیلے کے بڑے لوگوں نے وعدہ کیا کہ وہ حضرت شعیبؑ کو سمجھائیں گے۔ اگر وہ پھر بھی باز نہ آئے تو تم ان کے خلاف



کارروائی کرنے میں حق بہ جانب ہوگے۔

ان لوگوں نے ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت شعیبؑ سے ملاقات کی اور اس بار ان کا لہجہ ہی بالکل مختلف تھا اور دیر تک انہیں سمجھاتے رہے اور انہیں یہ بھی بتادیا کہ وہ ان کے قبیلے کے بڑے لوگوں سے مل چکے ہیں اور ان لوگوں نے ہمیں اجازت دے دی ہے کہ تم سے جس طرح چاہیں بات کریں۔

انہوں نے کہا "شعیب! تم جو باتیں کرتے ہو، وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ تمہارے بزرگوں سے ملنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ تم طاقت ور بھی نہیں ہو۔ محض ایک کمزور انسان ہو۔ ہم ابھی تک جو خاموش تھے تو اس لیے کہ ہمیں تمہارے بھائی بندوں کا خیال تھا۔ اگر ہمیں ان کا خیال نہ ہوتا تو تمہیں سنگسار کردیتے۔ تم ہم پر کسی طرح بھی غالب نہیں آسکتے تھے کیونکہ تم ایک کمزور انسان ہو۔"

حضرت شعیبؑ نے ان پر بے حد افسوس کیا اور کہا "میں تمہاری سمجھ اور عقل پر جتنا بھی ماتم کروں کم ہے۔ تم کہتے ہو کہ ابھی تک تم اس لیے خاموش رہے کہ تمہیں میرے قبیلے کا خیال تھا جب کہ تمہیں اللہ کا خوف ہونا چاہیے۔ اللہ کی قدرت کے مقابلے میں میرے خاندان کی حیثیت ہی کیا۔ اس کی گرفت سے کوئی بھی نہیں نکل سکتا اور اس کا قہر عذاب بدکردار قوموں کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کردیتا ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ تم نے مجھ سے کہا کہ میرے بھائی بندوں کا دباؤ اللہ سے زیادہ ہے۔ گویا خدا کو تم نے پیٹھ پیچھے ڈال رکھا ہے حالانکہ میرا پروردگار تمہارے تمام اعمال پر احاطہ کیے ہوئے ہے اور اے میری ان ملت! تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ اور میں اپنی جگہ۔ کام کیے جاتا ہوں۔ تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ ذلیل اور رسوا کرنے والا عذاب کس پر آتا ہے اور جھوٹا کون ہے اور سچا کون؟ تم بھی انتظار کرو۔ میں بھی انتظار کروں گا۔"

اس تلخ جواب نے متکبرین کو بہت زیادہ مشتعل کردیا۔ انہوں نے غصے میں کہا "اے شعیب! اب تو تمہیں کوئی شہر سے نکال دینے سے نہیں روک سکتا۔ ہربات کی ایک حد ہوتی ہے۔ ہم تمہیں شہر بدر کرنے کی سوچ رہے تھے لیکن اب کچھ اور ہی سوچ رہے ہیں یعنی ہم تمہیں سنگسار کردیں گے۔ اگر تمہارے ساتھیوں نے تمہیں بچانا چاہا تو انہیں بھی سنگسار کردیں گے۔ آخر تم اپنی آبائی روش کیوں نہیں اختیار کرتے۔ تمہیں کچھ موقع دیا جاتا ہے کہ تم اپنے ساتھیوں سمیت اپنے سابقہ دین پر واپس آجاؤ۔ اسی میں تم سب کی بھلائی ہے۔"

اس بار حضرت شعیبؑ نے بھی سخت لہجہ اختیار کیا "لوگو! یہ تم کیسی فضول باتیں کرتے ہو کہ ہم تمہارے دین میں واپس آجائیں۔ خدا نے ہمیں گمراہی سے نکالا ہے اور تم ہمیں گمراہی کی طرف پھر بلا رہے ہو۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم جھوٹ اختیار کریں۔ ہمارا بھروسا تو خدا پر ہے۔ ہمارے پروردگار کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور میں کہتا ہوں کہ اے اللہ! ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کردے کیونکہ تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

حضرت شعیبؑ کے سخت لب و لہجے نے مدین والوں کو حیران کردیا۔ ان کے علم کے مطابق اب حضرت شعیبؑ کے قبیلے والے بھی ان کی حمایت نہیں کر رہے تھے۔ بس ان کے کچھ ساتھی تھے جن پر حضرت شعیبؑ بھروسا کرتے تھے۔

اب ایک بار پھر اور غالباً آخری بار مدین کے سرداروں نے حضرت شعیبؑ کو متنبہ کیا "اے شعیب! ہم نے تمہیں اپنے آبائی دین کی طرف بلایا مگر تم نے انکار کردیا۔ اگر ہم تمہاری پیروی کریں گے تو اس میں ہمیں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ اس میں صرف دین و دنیا کا خسارہ ہی خسارہ نظر آتا ہے۔ دین کا خسارہ تو اس لیے کہ تم چاہتے ہو کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کا مسلک چھوڑ دیں اور دنیا کا نقصان اس وجہ سے کہ تمہارا مطالبہ ہے کہ ہم ناپ تول درست کرلیں اور حصولِ دولت کے لیے اپنے مال میں ہر قسم کا تصرف جو مناسب سمجھیں کریں، ہم تمہاری دعوت کو رد کرتے ہیں۔"

جس وقت یہ باتیں کی جارہی تھیں حضرت شعیبؑ کے ماننے والے بھی کہیں آس پاس موجود تھے۔ ان لوگوں نے اس بار انہیں بھی مخاطب کیا اور کہا "لوگو! ہم تمہیں بھی یہی مشورہ دیتے ہیں کہ شعیب کا ساتھ چھوڑ دو ورنہ خسارے میں پڑ جاؤ گے۔"

یہاں مدین میں یہ سب ہو رہا تھا۔ حضرت موسیٰؑ مصر واپس جاچکے تھے۔ وہاں فرعون کے خلاف ایک زبردست مہم چلی ہوئی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ان کے بھائی حضرت ہارونؑ بھی تھے۔ مصر سے زبردستی نکلنے کا منصوبہ بن چکا تھا۔

یہ ساری خبریں مدین پہنچ رہی تھیں۔ ان لوگوں کو خطرات کا احساس ہی نہ ہوا۔ حضرت شعیبؑ کو شاید یہ اندازہ نہیں تھا کہ مدین میں کیا ہونے والا ہے۔

بالآخر مصری بنی اسرائیلی صحرائے سینائی میں داخل ہوگئے اور انہوں نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنا شروع کیے اور مدین پر حملہ کیا اور ایسی گھمسان کی جنگ ہوئی کہ مدین والے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ مدین کے بے شمار مرد، بچے اور عورتیں قتل کردیے گئے۔ بیس ہزار کنواری لڑکیاں لونڈیاں بنائی گئیں اور ان کا مال لٹ گیا اور ان کے مویشی بھی ان سے چھین لیے۔ چھ لاکھ پچھتر ہزار بھیڑ بکریاں ان کی قبضے میں چلی گئیں۔ بہتر ہزار گائے بیل اور اکسٹھ ہزار گدھے بنی اسرائیلیوں کے قبضے میں چلے گئے۔

لوگوں نے حضرت شعیب سے کوئی بات کی اور نہ ہی انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچایا۔ غالباً حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو حضرت شعیبؑ کے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا اور حضرت شعیبؑ ان کے سسر بھی تھے۔

مدین پر جو تباہی آئی، اسے بھی عذاب الٰہی قرار دیا گیا مگر ایک ایسا عذاب جس کا تعلق آفات ارضی وسماوی سے ہو، ابھی تک مدین پر نہیں آیا تھا۔

چنانچہ مدین کے کچھ لوگ بچ گئے تھے۔ ان کے لیے اللہ کی طرف سے اس طرح عذاب نازل ہوا کہ آسمان سے اولوں اور پتھروں کی بارش ہوئی اور زمین کے اندر سے گڑگڑاہٹ کی آوازیں سنائی دیں اور ایک چیخ نے سب ہی کو دہلا دیا۔ مدین کے وہ لوگ جو کل تک اکڑ اکڑ کر باتیں کررہے تھے، آج وہ خوار وزبوں تھے۔

حضرت شعیبؑ نے مدین کو چاروں طرف سے گھوم پھر کے دیکھا تو ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ یہ بالکل اس حصے میں نیچے جہاں کبھی وہ بکریاں چرایا کرتے تھے، وہاں بھی جیسے کوئی چراگاہ نہیں تھی سب کچھ جھلس چکا تھا۔

حضرت موسیٰؑ کو اس قوم سے کوئی ہمدردی نہیں تھی کیونکہ ان لوگوں نے حضرت شعیبؑ کے ساتھ بہت ظالمانہ سلوک کیا تھا۔ انہوں نے دور کھڑے ہوکر مدین کی تباہی وبربادی پر افسوس کیا۔

حضرت شعیبؑ نے کہا "اے میری قوم! الوداع، میں نے تم کو اپنے پروردگار کا پیغام پہنچایا۔ میں نے تمہاری خیر خواہی کی مگر تم پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ جن لوگوں کو تم پر مسلط کیا گیا ہے، وہ اسی طرح تمہاری باتیں نہیں سنیں گے جس طرح تم نے میری باتیں نہیں سنیں۔"

قوم مدین کی تباہی وبربادی کی خبر ہمیں قرآن نے دی ہے۔ توریت میں اس کا ذکر نہیں ملتا مگر اس کا ذکر توریت میں تلاش کیا جائے تو انتہائی چھان بین کے باوجود کچھ تھوڑا بہت اس طرح ملے گا جو جزوی اور معمولی طور پر ہے جس سے کوئی داستان مرتب نہیں ہوسکتی۔ بس کہیں کہیں اشارے ملتے ہیں۔ جب کہ مدین کا وجود باقی رہا اور جب اسلام نے فروغ پایا تب بھی مدین موجود تھا۔ آثار قدیمہ کے ماہرین نے بھی اور جغرافیہ نویسوں نے بھی مدین کا بہت ذکر کیا ہے۔

مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین کا آباد کیا ہوا شہر تھا اس لیے اللہ نے اسے مکمل تباہی سے بچائے رکھا۔

حضرت شعیبؑ نے یہاں سے کنارہ کشی اختیار کی تو اصحاب الایکہ میں چلے گئے۔ یہ ایک الگ قوم تھی اور حضرت شعیبؑ کو دو قوموں پر مبعوث کیا گیا تھا۔ اصحاب الایکہ کا مطلب ہے جنگل والے۔ کچھ محققین نے مدین اور اصحاب الایکہ کو ایک ہی قرار دیا ہے حالانکہ مدین میں جنگل یا باغات نہیں تھے جب کہ ایکہ نامی جگہ پر جنگلات اور باغات موجود تھے۔ ایکہ ایک الگ قوم تھی اس لیے ان کے حالات الگ لکھے جائیں گے۔

قصص القرآن کے مباحث

قصص القرآن — مولانا حفیظ الرحمٰن
انبیائے قرآن — جمیل احمد
بلاد الشام — حمید اختر
قصص القرآن — مولانا حفظ الرحمٰن
ترجمان القرآن — مولانا آزاد
عہد نامہ عتیق — توریت



مساوات کے دور میں مردوں کی حکمرانی پر یقین رکھنے والے ایک پتھر دل شوہر کی کتھا

رشتوں کی ناقدوں سے دور اپنی دنیا بسانے والے ایک خود غرض کی داستان۔ اسے اپنی محبت میں کسی کی شرکت قبول نہیں تھی اور محبت اس کے نزدیک خدمت کا دوسرا روپ تھا

# اسیر کا اقرار

محمد زیب سلیمانی

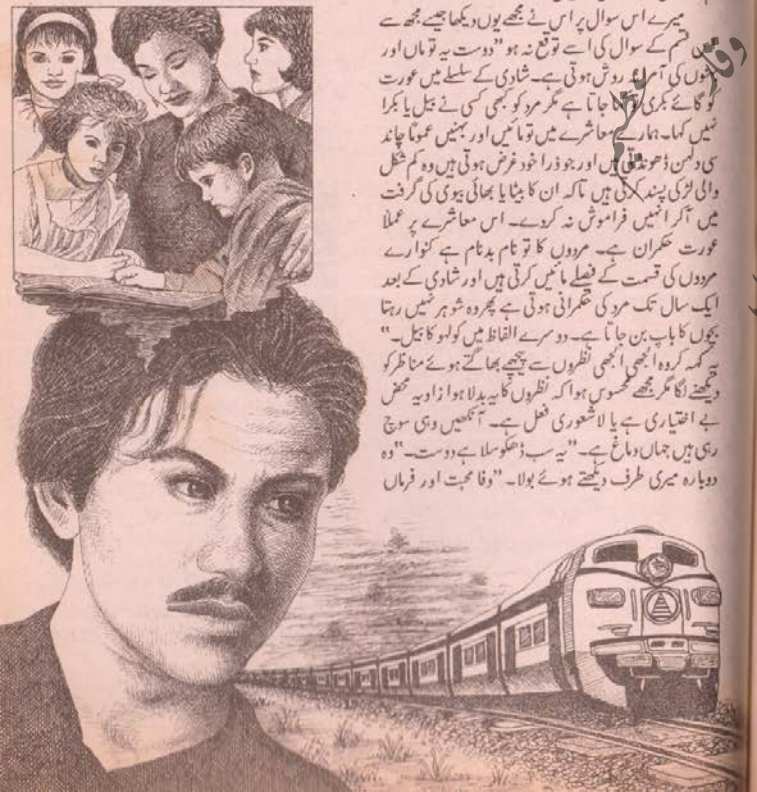

"پھر اس کے بعد تم نے کیا کیا؟"

"کیا کرنا تھا بس روٹین کی زندگی تھی۔ صبح الھنا دفتر کی تیاری پھر ناشتا اور اس کے بعد روانگی۔ دوپہر کو واپسی تھوڑا سا آرام پھر آوارہ گردی، شام کو گھر رات کو بستر۔" یہ کہہ کر وہ زیر لب مسکرا دیا۔

ریل گاڑی اب اپنی رفتار پکڑنے لگی تھی۔

"جب تمہاری اس کے ساتھ ذہن ہم آہنگی نہیں تھی تو تم نے اس سے شادی کیوں کی؟"

میرے اس سوال پر اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے مجھ سے اس قسم کے سوال کی اسے توقع نہ ہو "دوست یہ تو ماں اور بہنوں کی آرا پر منحصر ہوتی ہے۔ شادی کے سلسلے میں عورت کو گائے بکری کی طرح جانا جاتا ہے مگر مرد کو کبھی کسی نے بیل یا بکرا نہیں کہا۔ ہمارے معاشرے میں تو مائیں اور بہنیں عموماً چاند سی دلہن ڈھونڈتی ہیں اور جو ذرا خود غرض ہوتی ہیں وہ کم شکل والی لڑکی پسند کرتی ہیں تاکہ ان کا بیٹا یا بھائی بیوی کی گرفت میں آکر انہیں فراموش نہ کردے۔ اس معاشرے پر عملاً عورت حکمران ہے۔ مردوں کا تو نام بدنام ہے کنوارے مردوں کی قسمت کے فیصلے مائیں کرتی ہیں اور شادی کے بعد ایک سال تک مرد کی حکمرانی ہوتی ہے پھر وہ شوہر نہیں رہتا بچوں کا باپ بن جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کولہو کا بیل۔" یہ کہہ کر وہ ابھی الجھی نظروں سے پیچھے بھاگتے ہوئے مناظر کو دیکھنے لگا مگر مجھے محسوس ہوا کہ نظروں کا یہ بدلا ہوا زاویہ محض بے اختیاری ہے یا لاشعوری فعل ہے۔ آنکھیں وہی سوچ رہی ہیں جہاں دماغ ہے۔ "یہ سب ڈھکوسلا ہے دوست۔" وہ دوبارہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "وفا محبت اور فرماں

برداری۔۔۔ وہ عورت مرگئی ہے جو ان تینوں جذبوں کے تابع رہا کرتی تھی اس کے بدلے میں وہ دلوں پر حکمرانی کیا کرتی تھی۔ ماچس ہوگی آپ کے پاس؟" وہ سگریٹ منہ میں دباتے ہوئے بولا۔

میں نے ماچس اسے تھما دی اس نے ماچس ہاتھ میں پکڑی، سگریٹ کو منہ سے نکالا اور اسی ہاتھ کو نچاتے ہوئے بولا "مگر میں نے بھی بیوی پر جتا دیا کہ میں تم سے محبت ضرور کرتا ہوں مگر تمہارے بغیر بھی رہ سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے سگریٹ کو دوبارہ ہونٹوں میں دبایا دیا' سلائی کو ماچس کی ڈبیا پر لگے ہوئے مسالے سے رگڑا اور سگریٹ سلگا کر ماچس جیب میں رکھنے لگا مگر اسے خیال آگیا کہ ماچس کسی اور کی ہے چنانچہ اس نے ماچس کی ڈبیا میری طرف بڑھا دی۔

"سوری میں نے سگریٹ کا نہیں پوچھا۔" یہ کہہ کر اس نے سگریٹ میری طرف بڑھا دی۔

"شکریہ۔" میں نے اس کی پیش کش کو رد کرتے ہوئے جواب دیا "میں مارون پیتا ہوں اور گزشتہ کئی سالوں سے یہی سگریٹ پی رہا ہوں۔"

"سگریٹ کے برانڈ بدلتے رہا کریں کسی ایک برانڈ سے محبت ایسے ہی ہے جیسے کسی ایک عورت سے محبت' جس طرح انسان سگریٹ کے لیے نہیں بلکہ سگریٹ انسان کے لیے ہے بالکل اسی طرح مرد عورت کے لیے نہیں بلکہ عورت مرد کے لیے ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ بابا آدم کی تنہائی دور کرنے کے لیے عورت کو پیدا کیا گیا وہ بھی اس کی پسلی سے؟ ورنہ اللہ تعالیٰ نے تو ہوا' آگ' پانی اور مٹی کی آمیزش سے مرد کو پیدا کیا ہے۔ نازیہ کو اس بات سے اختلاف تھا کہ عورت' مرد کی تسکین کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ نازیہ میری بیوی کا نام ہے۔" وہ میری سوالیہ آنکھوں کو پڑھتے ہوئے وضاحت آمیز لہجے میں بولا "میں دو سال سے بیوی کے بغیر رہ رہا ہوں صرف اسے یہ احساس دلانے کے لیے کہ اگر عورت بچوں کی پیدائش کے بعد مرد سے توجہ ہٹا لیتی ہے تو مرد بھی اسے اپنی توجہ اور محبت سے محروم کر سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔

میں نے رسٹ واچ دیکھی دن کے ۱۲ بج رہے تھے۔ میرے قریب لیٹا ہوا واحد مسافر دنیا و مافیہا سے بے نیاز نیند میں مصروف تھا اور میں نے چونکہ رات کو برتھ پر مزے کی نیند لی تھی۔ اس لیے اب تازہ دم تھا مگر شیو نہ کرنے کے باعث ذہن پر تھوڑی سی مردنی چھائی ہوئی تھی۔

"آپ کو سونا ہے تو میری برتھ فارغ ہے۔" میں نے بیوی سے بیزار اس نوجوان کو آفر کرتے ہوئے کہا۔ اس نے جواباً خالی برتھ کو دیکھا پھر شکریے کے ساتھ میری پیشکش مسترد کر دی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ویسے بڑی عجیب بات ہے کہ میں نے آپ کو دل کا حال بتا دیا مگر نام نہیں بتایا۔ میری بیوی نازیہ بھی ایسی ہی ہے بہت جلد دوست بنا لیتی ہے۔ ریل گاڑی میں ہی اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ایڈریس لے کر انہیں خط لکھنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور ایک لمبا کش لگا کر جلتے ہوئے سگریٹ کو کھڑکی سے باہر اچھال دیا "مجھے ناصر کہتے ہیں۔" اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو ناصر صاحب اب آپ یقیناً کراچی جا رہے ہوں گے؟"

"جی ہاں۔"

"تو کیا گزشتہ دو سال سے آپ بیوی سے ملنے نہیں گئے؟"

"نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"آپ کی بیوی آپ کی امی کے ساتھ رہتی ہوگی؟"

"شاید میری امی کے ساتھ رہتی ہو یا شاید کسی ہوٹل میں رہتی ہو۔ کبھی میری امی کے پاس کبھی اپنی امی کے پاس۔ میں نے تو پوچھا بھی نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہوٹل میں رہتی ہو۔ کبھی نہ ماں اور بہنوں کو دیکھا اور نہ بیوی بچوں کو۔"

"تو کیا آپ کے بچے بھی تھے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔ اس عالم میں اس کی آنکھیں کسی صحرا کی مانند محسوس ہو رہی تھیں۔ لق و دق صحرا' بادلوں کی راہ تک رہا ہو۔

گاڑی کی رفتار ہلکی ہو رہی تھی یہ کسی اسٹیشن کی آمد کے آثار تھے اکّا دکّا گھر جو پیچھے کی طرف جا رہے تھے ایک عجیب سا منظر پیش کر رہے تھے۔ ناصر کی آنکھیں باہر کے مناظر کو دیکھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ملتان کا اسٹیشن آگیا۔

"چائے پئیں گے آپ؟" میں نے ناصر سے سوال کیا۔

"جی نہیں شکریہ۔ آپ اسٹیشن پر جا کر پی آئیں میں آپ کی سیٹ کا خیال رکھتا ہوں۔"

میں گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ ڈبے میں کافی ہلچل مچی ہوئی تھی اترنے والے کم تھے اور سوار ہونے والے زیادہ' چائے حلق سے انڈیلنے اور اسٹیشن پر چہل قدمی کرنے کے بعد میں



واپس اپنے ڈبے میں آگیا۔ میری برتھ پر کسی صاحب نے اپنا سامان رکھ دیا تھا۔ ناصر نائیں لمبی کی میری سیٹ کی حفاظت کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ٹانگیں سکیڑ لیں میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد انجن نے وسل دی اور گاڑی پٹری پر سرکنے لگی ملتان کا خوب صورت اسٹیشن پیچھے کو سرکنے لگا۔ دوستوں اور رشتے داروں کو الوداع کہنے والے حسرت بھری نظروں سے جاتی ہوئی ٹرین کو دیکھ رہے تھے۔

"آپ کے والدین بیوی اور بچے کس شہر میں رہتے ہیں؟"

"راولپنڈی میں۔"

"اور آپ؟"

"دو سال تک پشاور میں رہا ہوں اب کراچی جا رہا ہوں۔ میں نے اپنی پوسٹنگ وہاں کرالی ہے۔"

"کیا آپ کو گھر یاد نہیں آتا؟" میں نے سوال کیا۔

"گھر۔۔۔!" اس نے زیر لب دہرایا اور سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "دو بات گھر بھی کوئی بھولنے کی چیز ہے مگر جو گھر آپ کا ذہنی سکون چھین لے اس گھر سے تو وہ مکان ہی بہتر ہے جس کے کمرے کی ہر چیز آپ کو خود جلانا پڑتی ہو۔ جس کے فرش کی جھاڑو آپ کو دینا پڑتی ہو' جہاں کے باتھ روم میں آپ کو اپنے لیے خود ہی چائے تیار کرنی پڑتی ہو۔"

"معاف کرنا دوست اپنے بیوی بچوں اور ماں بہنوں کو یوں بے آسرا چھوڑنا اور وہ بھی کسی ٹھوس وجہ کے بغیر' یہ بہت زیادہ نامناسب فیصلہ ہے میں اس سلسلے میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔"

میری بات سن کر وہ تن کر بیٹھ گیا۔

"میری بہن نوکری کرتی ہے میری ماں کو میرے باپ کی پنشن وصول ہو جاتی ہے اور نازیہ یعنی میری بیوی سرکاری ملازم ہے۔ بیوی جب صاحب تنخواہ اور صاحب اولاد ہو تو شوہر کی حیثیت آدھی سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ وہ محض بجلی کا بل پانی اور گیس کا بل جمع کرانے کے لیے رہ جاتا ہے یا پھر سودا سلف لانے' بچوں کو سیر کرانے اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں درست کرنے کے لیے۔ میں نے کئی بار اس سے کہا کہ تم نوکری چھوڑ دو' میں تمہیں بٹھا کر کھلا سکتا ہوں مگر وہ کب کسی کی مانتی ہے۔"

"آپ کو آخر اس کی نوکری پر اعتراض کیوں تھا؟"

"میں چاہتا تھا کہ میں جب باہر سے تھکا ہارا واپس آؤں تو وہ مسکرا کر میرا استقبال کرے میں جب بستر پر بیٹھوں تو چائے کا کپ بنا کر لائے اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہے' ناصر آج کا دن کیسا گزرا اور میں جواب دوں اب سے تھوڑی دیر پہلے بہت برا گزرا تھا مگر تمہاری انگلیوں کے لمس نے دماغ پر اتنا اچھا اثر کیا ہے کہ لگتا ہے دن اتنا برا بھی نہیں گزرا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ایک ٹھنڈی سانس لی اور ڈبیا سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبالی میں نے ماچس اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور ماچس مجھے واپس کر دی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا "مگر ہوتا یہ تھا کہ جب میں دفتر سے واپس آتا تھا تو وہ مجھے سوئی ہوئی ملتی تھی چونکہ اسکول ٹیچر تھی اس لیے مجھ سے پہلے آجاتی تھی۔ میں اپنا کھانا خود ہی فریج سے نکالتا تھا اور خود ہی گرم کر کے کھاتا تھا پھر آرام کرنے کے بعد وہ بچوں کی خاطر مدارات میں مصروف ہو جاتی تھی۔ میرے کپڑے دھو کر اور فریج میں کھانا رکھ دینے کے بعد گویا وہ میرے حقوق سے دستبردار ہو جاتی تھی۔ نہیں دوست یہ میرے ارمانوں کی شکست تھی۔ میں نے ایسی زندگی کا خواب کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب اگر دل کو حقیقی خوشی نہیں ہے تو کیا ہوا ذہن تو پرسکون ہے۔"


## عیسائی ڈاکٹر کا حیرت انگیز کمال

پاکستان بننے سے پہلے دہلی میں ایک عیسائی ڈاکٹر نے میرے مطب کے چند کامیاب نسخوں کو اپنے مریضوں پر آزما کر انکا کامیاب علاج کیا۔ تو وہ میرا اور بھی گہرا دوست بن گیا پھر وہ ریٹائر ہو کر انگلستان چلا گیا۔ یہ دوستی بہ خط و کتابت کی صورت میں جاری رہی وہ میرے بہت سے نسخے تو اپنے ساتھ لے گیا لیکن اپنی دواؤں کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ آخر اتفاق سے ایک سال قبل ڈاکٹر ولیم نے اپنا ایک مشہور نسخہ مجھے تفصیل سے لکھ کر بھیج دیا۔ جو کہ کمزور نوجوانوں کو بہت کم دنوں میں قابل رشک صحت کا مالک بنا دیتی تھیں میں نے خاص بیماریوں کا نسخہ پاتے ہی فوراً دوائیں تیار کر کے اپنے مطب میں آنے والے بالکل گئے گذرے کمزور نوجوانوں کو استعمال کرائیں خدا نے میرے ہاتھوں کو مکمل شفا عطا فرمائی اور ساتھ ہی میرے مطب کو ایسی شہرت بخشی جیسی ولیم کو انگلینڈ بھر میں حاصل تھی۔ اس نسخہ کے استعمال کے فوراً بعد ہی ایسی محسوس ہونے لگتا ہے جیسے سدا نوجوانی کا راز پالیا ہو۔ مایوس مریض ایسا اشتہار نہیں ملکہ حقیقت ہے اگر خدانخواستہ آپ بھی کسی ایسی ہی شکایت میں مبتلا ہوں تو آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافہ کے ہمراہ روزانہ کر دیں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائیگا۔

حکیم اینڈ نفیز ہوٹ بکس 2159 کراچی 74600 پاکستان

"آپ نے اپنی بیوی پر اپنے خیالات آشکار نہیں کیے میرا مطلب ہے اسے یہ نہیں بتایا کہ آپ اس سے کیا چاہتے ہیں۔" میں نے سوال کیا۔

"ایک بار نہیں بار بار بتایا پیار سے بتایا دلیل دے کر سمجھایا۔ ہاتھ بھی اٹھایا احتجاجاً بول چال بھی بند کی مگر وہ نجانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے کش لینے لگا۔ اس کی آنکھیں ڈبے میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا طواف کر رہی تھیں مگر میں جانتا تھا کہ وہ ارد گرد کے ماحول سے بے نیاز ہے۔

"اب آپ خوش ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بہت خوش ہوں۔ میں نازیہ کے بغیر جی سکتا ہوں اپنے بچوں کے بغیر جی سکتا ہوں۔"

"مگر آپ کے بچوں نے کیا قصور کیا تھا۔"

"میں نے کیا قصور کیا تھا؟ کیا میری خواہشیں ناجائز تھیں؟" وہ جذباتی لہجے میں بولا "جو شخص اپنا استحصال دیکھتے ہوئے خاموش رہتا ہو، وہ دوسروں کے لیے کیا کرے گا ہم پر سب سے پہلا حق ہماری زندگی کا ہے جب ہم اپنا حق وصول نہیں کر سکیں گے تو دوسروں کو ان کے حقوق کیسے دیں گے۔"

پھر وہ خاموش ہو گیا۔

گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے بھاگ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ڈبے میں چائے والا آگیا۔ میں نے اس سے دو کپ لیے اور ایک کپ ناصر کو تھما دیا۔ ناصر نے ایک چسکی لی اور پھر خیالوں میں کھو گیا "چائے بہت اچھی بناتی تھی وہ۔" وہ بے اختیار بولا۔

"کون؟"

"میری بیوی۔" یہ کہہ کر اس نے سرد آہ بھری "اور ماش کی دال تو ایسے بناتی تھی کہ جی چاہتا تھا کھاتے جاؤ کھاتے ہی جاؤ۔" اس کی آنکھیں ایک بار پھر لق دق صحرا کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

میں نے جلدی جلدی حلق سے چائے انڈیلی اور پیالی چائے والے کو تھما دی۔ چند سیکنڈ بعد ناصر نے بھی کپ اسے لوٹا دیا۔

"ہمیں اپنے آپ کو محبتوں کا عادی نہیں بنانا چاہیے۔" وہ دوبارہ گویا ہوا "آخر ہم بچوں اور بیوی کو اپنی بیساکھی کیوں بناتے ہیں کہ چند قدم بھی ان کے بغیر نہیں چل سکتے۔"

"عورت جسمانی طور پر کمزور مگر اندر سے بہت طاقت ور ہوتی ہے مگر مرد جسمانی طور پر طاقت ور ہونے کے باوجود اندر سے کم ہمت ہوتا ہے اس لیے ہمیں بیساکھیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔" میں نے پہلی بار اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ہماری اس کمزوری سے آج کی عورت نے فائدہ اٹھا رکھا ہے تم ذرا شہر والوں کے گھروں میں جھانک کر دیکھو۔ ہر گھر میں عورت کی حکمرانی ہے۔ مرد تو بس کٹھ پتلی بن کے رہ گیا ہے۔ مرد کمائے اور عورت خرچ کرے اور پھر عورت کی ضرورت کی حد کہاں تک ہے؟ آج تک کوئی نہیں بتا سکا۔ نہ میرے دوست میں بتا دینا چاہتا ہوں بلکہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ مرد عورت کے بغیر رہ سکتا ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ میں دو سال تک ان سے دور رہا ہوں۔ اب مزید دور ہونے جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک مصنوعی سا قہقہہ لگایا پھر وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

گاڑی اپنی رفتار سے منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اسٹیشن آتے ہی ہنگامہ خیزیاں ہوتیں اور منظر تبدیل ہو جاتا۔ کچھ لوگ آتے کچھ چلے جاتے پھر نہ جانے کب دن ڈھلا اور رات ہو گئی۔ ڈبے میں روشنی تھی مگر باہر خاصا اندھیرا تھا۔ کبھی کبھار کوئی جلتا ہوا بلب پلک جھپکتے میں سامنے آتا اور پھر پیچھے بھاگ جاتا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے گاڑی کی کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے چاند کو دیکھا۔ ڈبے میں طائرانہ نظر ڈالی تقریباً تمام مسافر سو رہے تھے۔ میرے سامنے بیٹھا ہوا ناصر سیٹ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ دفعتاً اس نے آنکھیں کھولیں پھر جیب سے ایک پوسٹ کارڈ سائز رنگین تصویر نکالی اور اس تصویر کو انہماک سے دیکھنے لگا۔ اس تصویر میں دو بچیاں اور ایک بچہ مسکرا رہے تھے۔ اسی لمحے مجھے ناصر کی بیوی کی عمر پچیہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بہت معصوم سی مسکراہٹ بھی تھی پھر اس نے تصویر جیب میں ڈالی اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ ان لمحوں میں اس کی آنکھیں ایک بار پھر کسی لق و دق صحرا کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ وہ صحرا کہ جس پر عرصہ دراز سے کوئی بادل نہ برسا ہو اور پھر اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے اور اس کے رخساروں سے ہوتے ہوئے اس کی گود میں جا گرے۔ یہ آنسو بتا رہے تھے کہ وہ اپنی بیوی اپنے بچوں کی محبت سے شکست کھا چکا ہے اور خود کو فریب دے کر سرابوں کے سائے میں زندگی گزارنا چاہتا ہے۔

میں نے آنکھیں موند لیں کیونکہ اب میرے ذہن کی پشت پر زندگی کی ٹرین بہت تیزی سے بھاگ رہی تھی۔





## انعام یافتہ شعر

سید محمود عالم ایڈیکٹ ——— ایف بی ایریا کراچی

میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

آصف محمود آصف ——— گلشن حدید کراچی

آنکھوں سے بڑا کوئی مصور نہیں عابد
الفاظ سے جو جذبات کی تصویر بنا دے

محمد تنویر ناز ——— پنجن وال

میں نے ہاتھوں کو ہی چپوار بنایا ورنہ
ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میرے کس کام کی تھی

محمد حسین ——— اسلام آباد

تجھ سے کیا پوچھتے ہو زندگی کے بارے میں
اجنبی کیا بتا سکتا ہے اجنبی کے بارے میں

ایاز احمد قائم خانی ——— جھڈو میرپور خاص

احساس ——— انداز بدل جاتے ہیں ورنہ
آنچل بھی کبھی تار سے بنتے ہیں کفن بھی

عرفان رشید ملک ——— کھنڈرو ضلع سانگھڑ

ہوا میں ڈولتی خوشبو پتا خود ہی بتا دے گی
چلو رستوں پہ تھوڑی دور چل کے دیکھ تو آئیں

نصرت یاسمین ——— جھجو شاہ یتیم

ٹوٹ جاتے ہیں کبھی رشتے مگر
دل سے دل کا رابطہ اپنی جگہ

شیخ محمد جاوید فخر ——— بلیب الشیخ کویت

کبھی جو حد سے بڑھے دل میں تیری یاد کا حبس
کھلی فضا میں تجھے کھانسنے لگتے ہیں

محمد بخش صابر لنگاہ ——— خانیوال

احساس اگر ہو تو محبت کرو محسوس
ہر بات کا اظہار ضروری نہیں لب سے

سید حیدر رضا ——— راولپنڈی

نہیں عتاب زمانہ خطاب کے لائق
ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

مظہر حسین ساقی ——— ڈیرہ اسماعیل خان

کوئی اس دور میں وہ آئینے تقسیم کرے
جس میں باطن بھی نظر آتا ہو ظاہر کی طرح

عاصم سعید جھنڈیر ——— روہیلا نوالی

رات کی زلفیں بھیگی بھیگی اور عالم تنہائی کا
کتنے درد جگاتا ہے جھونکا اک پروائی کا

محمد آصف بٹ، باہر زمان بٹ، وقاص بٹ، وزیر آباد

تجھ سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں
اے محبت تیرا جواب نہیں

راشد منصور ——— صادق آباد

کیا روک بھی سکتے ہیں سفر سورج کا
وہ اندھیرے جو اجالوں سے حسد رکھتے ہیں

عباس ملی بلوچ ——— سوئی، بلوچستان

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے پاس رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

سلطان محمود میرانی ——— گرین ٹاؤن کراچی

پھولوں سے تعلق ہی ایمان نہیں اپنا
کانٹوں سے بھی رکھتے ہیں ہم رسم شناسائی

اے حفیظ تبسم ——— دھاکیری بالا آزاد کشمیر

اے صبا آ کر دکھائیں تجھے وہ گل جس نے
باتوں ہی باتوں میں گلزار کھلا رکھا ہے

عظمیٰ اعجاز، سارہ نواب جنک، حافظ آباد سٹی

ضبط غم کے مجھے آداب سکھانے والے
دل جو ٹوٹے گا تو پلکوں پر چراغاں ہوگا

مقصود احمد ——— پنڈی بھٹیاں ضلع حافظ آباد

حنوط کر کے مجھے رکھ لیا ہے دنیا نے
عذاب قبر سے محفوظ ہو گیا ہوں میں

ظفر اعجاز نوشاری ——— گڈو، سندھ

کسی کے ایک آنسو پر ہزاروں دل تڑپتے ہیں
کسی کا عمر بھر رونا یونہی بیکار جاتا ہے

محمد سلیم خان لنگاہ، محمد نعیم خان لنگاہ، محمد اصغر سندھو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

ہنس پڑتا ہے بہت زیادہ غم میں بھی انسان
بہت خوشی سے بھی تو آنکھیں ہو جاتی ہیں نم

اختر سحر ——— ہری پور

تو اپنی شیشہ گری کا نہ کر ہنر ضائع
میں آئینہ ہوں مجھے ٹوٹنے کی عادت ہے

محمد احسان اللہ ——— گوجرانوالہ

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

رحمانہ طاہر ——— کھمایاں سنی

آئینے کی آنکھ ہی کچھ کم نہ تھی میرے لیے
جانے اب کیا کیا دکھائے گا تمہارا دیکھنا

راجہ منور حسین، عمران خان راجپوت، محبت خان بھرگڑی

حسرتیں بے قیاس ہوتی ہیں، سورتیں غم شناس ہوتی ہیں
جن کے ہونٹوں پہ ہو ہنسی ان کی، اکثر آنکھیں اداس ہوتی ہیں

محمد سعید خان، نظر آباد کالونی ڈیرہ اسماعیل خان

بجھا بجھا سا چہرہ دھواں دھواں آنکھیں
خوشی کی کھوج میں کتنے غموں سے گزر گئے

سعید احمد شیخ، وقاص احمد شیخ، پشاور

دوست ملتے ہیں تو کترا کے گزر جاتے ہیں
ہم نے کیا آئینہ ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے

رانا سہیل صدیقی ——— شیخوپورہ

میں نے کاغذ پہ سجائے ہیں جو تابوت نہ کھول
لفظ جی اٹھے تو تو خوف سے مر جائے گا

واجدہ، ریحان مزار کھرکا، سرائے عالمگیر

اک موج دبے پاؤں تعاقب میں چلی آئی
ہم بت خوش تھے ریت کی دیوار بنا کر

بشریٰ افضل ——— بہاولپور

اب تو کھل جائے گا شاید تری الفت کا بھرم
اہل دل جرأت اظہار تک آپہنچے

رابعہ خان روہی ——— سوئی بلوچستان

عجیب خواب تھا آنکھیں ہی لے گیا میری
کرن کا عکس بھی اب میری دسترس میں نہیں

عبدالعزیز خان ——— نیو سینٹرل جیل ملتان

یہ ہم ہی ہیں کہ تیرا درد چھپا کر دل میں
کام دنیا کے تسلسل سے کیے جاتے ہیں

طارق سلیم ہاشمی ——— لاہور

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

امجد حسین ملک ——— تلہ گنگ، چکوال

جانتی ہوں کہ ایک مدت سے، مجھ پہ بربادیوں کے سائے ہیں
ہر قدم پر ہوئی ہے مایوسی، ہر قدم پر فریب کھائے ہیں

محمد شہزاد ——— اٹک شہر

تھا سمجھ رہا ہے میرے دل کو چارہ گر
دنیا بسی ہے اس میں کسی کے خیال کی

محمد فیض الابرار شاہ ——— ساہیوال

بس اسی بات پہ ہے ہم سے خفا گردشِ وقت
ہم نے سیکھے نہیں انداز زمانے والے

محمد اعظم اعوان ——— منگھوڑ، مانسہرہ

گرا ہوا ہوں ان گنت اداسیوں کے درمیاں
میں دیوتا ہوں اور اپنی داسیوں کے درمیاں

واجدہ اینڈ عاصمہ ——— چکوال

دل کی خوش گمانی کا جانے کیا ارادہ ہے
روبرو ہواؤں کے، پھر دیا جلایا ہے

سہیل اقبال ——— ایبٹ آباد، سعودی عرب

سب سرکشوں سے روٹھ گئے قاتلانِ شہر
ان کے حضور کٹ کے کوئی سر نہیں گیا

سعدیہ تاج ——— سرگودھا

جسم فانی ہے کیا کرے گا تو
روح کو تیرے ہاتھ دیتا ہوں

محمد لقمان ——— جھنگ شہر

ہو جو مربوط شرائط وہ رفاقت کیسی
جو ہو محتاج دلائل وہ صداقت کیسی

کاشف علی شہزاد ——— واہ کینٹ

محبتیں تو فقط انتہائیں مانگتی ہیں
محبتوں میں بھلا اعتدال کیا کرنا

ایم اے بزمی ——— رحیم یار خان

تیری زندگی اسی سے، تیری تہذیب اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی

سرفراز احمد ——— منڈی وارپرٹن، شیخوپورہ

کروں تلاش جواہر تو ریت ہاتھ آئے
سمندروں کا چلن بھی یہاں عجیب سا ہے

خالد بشیر بلوچ ——— گوجرانوالہ

اس بار پر آئیں گے تو دیکھیں گے جہاں کو
تھوڑا سا بن رہا ہے ارادہ اڑان کا

آفتاب نیازی روکھڑی ——— کلہ خیل، میانوالی

شاید کہ تیرے ہاتھ پہ لکھتا وہ میرا نام
تو کاتبِ تقدیر سے درخواست تو کرتا

عالیہ ارشاد ——— ہری پور ہزارہ

کہا ہر راستہ بخشا ہے دشوار کیوں مجھ کو
جواب تیا تجھے ہر راستہ ہموار کرنا ہے

خالدہ اشرف ——— مصطفیٰ آباد، ملتان، خلیلِ تصور

سلجھتا ہے افلاس کے عقدے وہ سخن ور
جو ہاتھ میں تھامے ہوئے، سونے کا قلم ہے

گل زیب احمد گل اینڈ مسعود ڈوڈی، کوٹ نجیب اللہ

اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

صائمہ، مصباح، زرقا قادر آباد، منڈی بہاؤالدین

شبِ انتظار کی کشمکش یہ نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی یہ چراغ جلا دیا کبھی وہ چراغ بجھا دیا

محمد شریف ——— تونسہ، دوتارا

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کی آنکھیں
مقامِ قلب سے پہلو میں ہم نے جام جم پایا



سیدہ طیبہ تصور ——— مدینہ سیداں گجرات

درد کا کہنا چیخ ہی اٹھو، دل کا کہنا وضع نبھاؤ
سب کچھ سہنا، چپ چپ رہنا، کام ہے عزت داروں کا

شان و شوکت ——— خوشاب

ہمارے بعد ہر کمرے میں اک تصویر رکھ دینا
اکیلے میں بہت گھبراؤ گے جب ہم نہیں ہوں گے

منیر احمد فیجانہ ——— دادن، ضلع ساہیوال

محل بنتے بناتا ہوں شبِ فرقت میں الفت کے
مگر ہونے نہیں پاتی کہ سارے ٹوٹ جاتے ہیں

مسز شری عدیل میر ——— اسلام آباد

تیری نفرت میری چاہت میں کمی لا نہ سکی
وہ جو پہلے تھے وہی لفظ دعاؤں میں رہے

پروین رضوی ——— عباس ٹاؤن گلشن اقبال کراچی

تمہارے چاند سے رخ کی قسم میں ہی ہوں قمر
جگر کا داغ دکھاؤں جو اعتبار نہ ہو

ایم الیس کنول ——— ملتان

موسم خشک میں خوشبو کا تصور تو رہے
طاق میں پھول کی تصویر سجائے رکھنا

فرخ ناز سیال ——— نارتھ کراچی

ذات کدے میں پہروں باتیں اور ملیں تو مہر بہ لب
مختاری سی مختاری ہے مجبوری سی مجبوری

نعیمہ اعوان ——— سرگودھا

جو گلہ کیا ہے تم سے تو سمجھ کے تم کو اپنا
مجھے غیر سے شکایت کبھی تھی، نہ ہے، نہ ہوگی

اظہر علی خان ننگ شانی ——— کھلہ خیل، کوہاٹ

بھلا چکا ہے مجھے بھی یہ کیا کیا اس نے
یہی تو ایک سبق اس کے دل کے باب میں تھا

محمد یونس چوہدری ——— سلطان پورہ، لاہور

دنیا تیری تلاش میں دل تک پہنچ گئی
آنکھوں میں تیرے نقش قدم دیکھتی ہوئی

عابدہ شکیلہ ——— شمس آباد، خان پور

امجد نہ قدم روک کہ وہ دور کی منزل
نکلے گی کسی روز اسی گرد سفر سے

محمد عدیل اکرم ——— فیصل آباد

تمنا میری کتنی مختصر ہے
محبت ہوں محبت چاہتا ہوں

نعمت اللہ پختون ——— کچلاک کوئٹہ

مزہ برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آئینو
سفیدی ہے، سیاہی ہے، شفق ہے، ابر ساراں ہے

اشوک کمار سندھو جا ——— تھرپارکر علی خان، سندھ

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتہ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

محمد اعجاز ——— ماموں کانجن

شبنم کی تراوٹ سے بھی دکھتا تھا دل زار
گھنگھور گھٹاؤں کو برسنے کی پڑی تھی

عالیہ صمر، آصفہ صمر، ڈاسی بانچ خلا، لاہور

مزاج اپنے بہت مختلف سہی لیکن
ہمارے پاس محبت کا پاس رہتا ہے

عظمیٰ لطیف، مٹھ ——— صادق آباد

بھنور میں کشتی کو چھوڑ آتے تو آپ پر بھی نہ بات آتی
ڈبویا مجھ کو قریب ساحل کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

## محفلِ شعر و سخن

کوپن بھیجنے کا آخری نمبر دسمبر 2000

نام .....

پتا .....

سرابوں کے اسیر ایک بے خانماں شخص کی بربادی کا افسانہ

ش صغیر ادیب

# یورپ کے سبز باغات

آپ کے جانے پہچانے ش صغیر ادیب گذشتہ تقریباً چار عشروں سے انگلستان میں مقیم ہیں۔ اس طویل فرقت کے باوجود اپنے وطن اور اس کی مٹی سے ان کی رفاقت روزِ اوّل کی طرح نہ صرف برقرار ہے بلکہ اُس میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ یقیناً اسی وجہ سے غریب الوطنی کا کرب، معاشرتی اقدار اور دو مختلف سماجی رویوں کا نوحہ اُن کی تحریروں کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ وہ وہاں رہتے ہوئے جو کچھ اپنے اردگرد ہوتا دیکھتے ہیں اسے بہت گہرائی میں جاکر محسوس کرتے ہیں۔ اسی لیے انسانی فطرت کی اعجوبیت اُن کی کہانیوں میں اپنی جھلک خوب خوب دکھاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس اچھوتے اور منفرد انداز سے انسانی احساسات و جذبات کو الفاظ کی صورت میں رقم کرتے ہیں وہ صرف ان کا ہی خاصہ ہے۔ نیر نظر کہانی بھی ان ہی خصوصیات کی حامل ایک شاہکار داستان ہے۔

اپنوں سے ٹھکرائے جانے کے بعد تنہائی کے بے کراں اور بے مہر ریگ زار میں کسی نخلستان کی تلاش میں اِدھر اُدھر آبلہ پائی کرنے والے بدقسمت کی داستان جس کے لیے اپنی زمین سے فرار ہی روشن اور تابناک مستقبل کی نوید تھا۔ حقائق کی چکاچوند روشنی میں جاگتی آنکھوں سے سہانے خواب دیکھ کر ان کی تعبیر تلاش کرنے کی جستجو میں ترکِ وطن کرنے والے اُس شخص کی کتھا جس کی آزادی اب غلامی میں مضمر تھی۔ تارکینِ وطن کے مسائل کا احاطہ کرتی ایک عبرت انگیز داستان جس میں بہت سوں کے لیے بہت کچھ ہے۔

شام کے گہرے افسردہ سناٹے میں رویندر سنگھ کی آواز ہولے ہولے بلند ہوئی۔ کوئی پنجابی لوک گیت تھا۔ جس میں ایک ایسی لڑکی کے دکھ اور اندوہ کی عکاسی کی گئی تھی جو اپنے محبوب سے بچھڑ گئی ہے۔ اس کا محبوب بھری بہار کے موسم میں اس سے وعدہ کرکے کہ اگلی بہار میں جب پودوں پر شگوفے چٹکنا شروع ہوں گے' وہ ضرور واپس آئے گا لیکن ایک کے بعد دوسری بہار گزرتی جاتی ہے اور پھول کھل کھل کر مرجھائے جاتے ہیں۔ مگر اس کا محبوب واپس نہیں آیا ہے اور لڑکی یہ سوچ کر خوف زدہ ہوتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جوانی کا موسم بہار بھی خزاں کی نذر ہو جائے اور اس کا محبوب نہ آئے تو کیا ہوگا؟ یہ رویندر سنگھ کی عادت تھی کہ سارے دن کی محنت اور جان توڑ مشقت کے بعد جب اس کے جسم کا جوڑ جوڑ پکے پھوڑوں کی طرح دکھ رہا ہوتا' وہ بستر پر لیٹتا تو کوئی نہ کوئی گیت ضرور گاتا۔ مدھم سروں میں' گرد و پیش سے غافل ہو کر' اپنے آپ میں ڈوب کر۔ یوں لگتا جیسے وہ اپنے جسم و ذہن اور دل و روح کے زخموں پر گیت کا مرہم رکھ رہا ہے۔ اپنے دکھوں کو بہلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید ایسا ہی تھا۔ شاید گیت کے بول واقعی اس کے ذہنی کرب اور جسمانی اضمحلال کو کم کر دیتے تھے اور وہ ایک اور مشقت بھرے دن سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔

چنانچہ وہ گاتا رہا۔ اس کی آواز کی کھرج جس میں ہلکے سے سوز کا تاثر بھی تھا' کمرے کے سکوت میں مدھم سروں میں گونجتی رہی۔ اور آفاق غیر ارادی طور پر بے حد دھیان سے گیت سنتا رہا۔ آفاق کو پنجابی سے معمولی شدبد تھی۔ مگر مجموعی طور پر گیت کا مفہوم اور اس میں پوشیدہ درد' ہجر اور انتظار کی پرسوز کیفیت کو وہ پوری طرح محسوس کر لیتا تھا۔ حتیٰ کہ خود اس کا دل بھی غم و اندوہ میں ڈوب جاتا اور اداسی اس کی رگ رگ میں پھیلتی چلی جاتی اور اسے یوں لگتا جیسے غبار کی جگہ وہ خود ہے۔ اور کرب کے صحرا میں آبلہ پا بھٹکتا پھر رہا ہے۔ اپنے محبوب کی جستجو میں' چاروں طرف پھیلی نامہرباں ریت کا سمندر ہے۔ سر بہ فلک سورج ہے اور حدِ نظر تک کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اس بے آب و گیاہ ویرانے میں اس کا محبوب اس سے بچھڑ گیا ہے۔ اور وہ دیوانہ وار اپنے محبوب کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اور نہیں جانتا ہے کہ اس کا محبوب اسے ملے گا بھی یا نہیں۔

آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ وہ جسے بھی جان سے چاہا جاتا ہے' ہمیں نہیں ملتا اور بچھڑ جاتا ہے۔

اور وعدہ کرکے چلا جاتا ہے۔

کہ جب بہار آئے گی اور کلیاں چٹکیں گی اور پھول کھلیں گے تو واپس آئے گا۔

مگر بہار آتی ہے اور چلی جاتی ہے۔

کلیاں چٹکتی ہیں۔

پھول کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔

کوئل "پی کہاں" کا پرافسوں راگ الاپتی ہے۔

اور بلبل گیت گاتی ہے۔

مگر محبوب واپس نہیں آتا۔

آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟

گیت ختم ہو گیا۔ رویندر سنگھ چپ ہو گیا۔ مگر اس کی آواز کی پُرسوز بازگشت دیر تک کمرے میں گونجتی رہی۔ اور وہ دونوں خاموشی کے سحر میں لپٹے دیر تک چپ چاپ یوں بیٹھے رہے جیسے اپنے آپ سے' اپنے آس پاس سے اور اپنے چاروں طرف سانس لیتی دنیا سے قطعی بے خبر ہوں۔ کئی منٹ کے بعد گیت کا تاثر ٹوٹا تو آفاق یوں چونکا جیسے کسی خواب سے جاگا ہو۔ اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ پھر رویندر سنگھ کو دیکھا اور ہولے سے مسکرا دیا۔

"رویندر! تم گاتے بہت اچھا ہو۔"

"نہیں بھائی' بس یونہی دل بہلا لیتا ہوں۔"

آفاق نے جیب سے پیکٹ برآمد کیا۔ پیکٹ میں تین پورے سگریٹ تھے اور ایک نصف۔ نکوٹین اس نے نصف سگریٹ نکال کر سلگائی۔ پھر بے دھیانی سے چاروں طرف دیکھا۔ ہر چند کہ شام ہو چکی تھی مگر ابھی اجالا پوری طرح ماند نہیں پڑا تھا۔ چھوٹی سی کھڑکی کی دبیز سلاخوں کے باہر ابھی بدستور موجود تھا اور آسمان کا چھوٹا سا نیلا ٹکڑا' آفاق چند لمحے آسمان کے اس نیلے ٹکڑے کو دیکھتا رہا پھر رویندر کی طرف متوجہ ہوا۔

"آج موسم تو بہت اچھا رہا؟"

"ہاں' سارا دن دھوپ رہی۔"

"ٹھنڈ یا' سردی کافی تھی یا شاید مجھی کو لگ رہی تھی؟"

"نہیں' سردی تو خیر تھی" رویندر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "حالانکہ یہ اپریل کا آخر ہے۔ اور ان دنوں اپنے یہاں کافی گرمی ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں اس مہینے میں بھی اچھی خاصی سردی ہوتی ہے۔"

آفاق نے کش لیا پھر بولا "یار' ابھی تک گھنٹی نہیں بجی؟"

"کیا بھوک لگی ہے۔"

"ہاں' سارے دن کی محنت کے بعد بھوک تو لگتی ہی ہے۔" آفاق نے مدھم آواز میں کہا۔

"فکر نہ کرو" رویندر نے سرہلایا "گھنٹی بھی بجے گی اور



دروازہ بھی کھلے گا اور یہ بھی یاد رکھو کہ آج سبزی کا دن ہے۔ ابلی ہوئی سبزی ملے گی۔ آلو' گوبھی' پالک اور مٹر۔ ساتھ میں تین چار سلاد کس۔"

"خیر مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں گوشت کو تو چھوتا ہی نہیں ہوں" یہ کہہ کر آفاق زور سے ہنسا۔ پھر یکایک چپ ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟" رویندر نے تجسس آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں یار' بس یونہی۔"

"پھر بھی' تم اچانک چپ کیوں ہو گئے؟"

"یار روی' کیا یہ حد درجہ واہیات اور مضحکہ خیز بات نہیں ہے کہ ہم لوگ ہنس رہے ہیں۔ ان حالات میں آخر ہمیں ہنسی کیسے آجاتی ہے؟"

رویندر کے چہرے پر ناچتی مسکراہٹ اور خوش دلی یکلخت یوں غائب ہو گئی جیسے جلتا ہوا بلب اچانک بجھ جاتا ہے۔ اس کا چہرہ افسردہ اور تاریک ہو گیا۔ چند ثانیے وہ ویران آنکھوں سے آفاق کو دیکھتا رہا پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر شکستہ آواز میں بولا "ہنسی کیسے آسکتی ہے۔ ان حالات میں بھلا ہنسی کیسے آسکتی ہے۔" اس نے رک کر کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ پھر اضافہ کیا "مگر وہ ہوتے ہیں نا کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے تو شاید ایسا ہی معاملہ ہنسی کا بھی ہے۔ ایسے حالات میں بھی ہنسی آسکتی ہے اور آجاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب ہمیں ہنسی آتی ہے تو دراصل اپنے آپ پر آتی ہے۔ اپنے حالات' اپنی بے کسی اور اپنے کیے پر ہنسی آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں شاید یہ ہنسی نہیں' خود فریبی ہے۔ ہم اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے ہنستے ہیں۔"

"ہاں' شاید تمہاری بات درست ہو" آفاق کی آواز مدھم تھی۔

پھر وہ اٹھا اور اپنے جسم کو گھسیٹتا ہوا کھڑکی تک لے گیا۔ کھڑکی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس میں لوہے کی دبیز سلاخیں نصب تھیں۔ آفاق نے دونوں کہنیاں کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکا دیں اور باہر نظر ڈالی۔ باہر حدِ نظر تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ گوبھی' کرم کلہ' اسٹرابری' آلو' مٹر اور پھلیوں کے کھیت۔ کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ نظر آرہے تھے اور کہیں جھاڑیوں کی لمبی قطاریں۔ جنہیں ہیج رو (HEDGE ROW) کہا جاتا ہے۔ آفاق کو بتایا گیا تھا کہ جھاڑیوں کی قطاریں' جو بظاہر دیوار کی طرح نظر آتی ہیں' انگلستان کے دیہاتی منظرنامے کا نہ صرف ایک ضروری جز ہیں بلکہ ایک تہذیبی ورثہ بھی۔ یہ جھاڑیاں کئی لحاظ سے ضروری اور مفید ہیں۔ اول یہ کہ تیز ہواؤں سے یہ سبزی کے پودوں کو برباد ہونے سے بچاتی ہیں۔ دوم بے شمار کیڑوں مکوڑوں اور پرندوں کے لیے "گھر" مہیا کرتی ہیں اور سوم یہ کہ کھیتوں کی حد بندی کرتی ہیں۔ آفاق کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ان جھاڑیوں کو قانونی تحفظ حاصل ہے۔ بغیر حکومت کی اجازت کے ان جھاڑیوں کو کاٹا نہیں جا سکتا تھا۔

آفاق خاموش کھڑا رہا اور باہر دیکھتا رہا۔ دور تک بکھرے سبز پودوں کو' درختوں کو اور آسمان کی پنہائیوں میں محو پرواز آبی پرندوں کی ڈاروں کو۔ شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی اور چاروں اور پھیل رہی تھی۔ ہر طرف ایک گہرا سکوت تھا۔ افسردہ کن سناٹا اور ایک ناقابلِ بیان سی اداسی۔ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ آفاق کے دل کی اداسی یکایک بڑھ گئی۔ ایک بے کسی اور بے یقینی اس کے ذہن و احساس میں سرایت کرتی چلی گئی۔ پتا نہیں یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ جانے یہ عمارت' جس میں اس وقت وہ کھڑا ہے' کہاں ہے؟ یہ خیال اتنا عجیب تھا کہ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ اور لایعنی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کس قدر احمقانہ' مہمل اور مضحکہ خیز بات ہے کہ اسے یہ نہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟

اچانک اس نے گردن موڑ کر رویندر کو دیکھا "یار رویندر! تمہیں معلوم ہے کہ ہم لوگ کہاں ہیں؟"

"نہیں۔"

"اور یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ عمارت کس جگہ واقع ہے؟"

"نہیں۔" رویندر نے اسے غور سے دیکھا۔

"مگر بھائی تم تو یہاں چھ سات مہینوں سے ہو۔"

"بے شک ہوں" رویندر نے جواب دیا "مگر گذشتہ چند دنوں میں تم نے خود ہی دیکھ لیا ہے کہ یہاں کا طور طریق کیا ہے۔ کس طرح وہ لوگ نگرانی کرتے ہیں۔ پرندہ تک تو پر مار نہیں سکتا۔ جب یہاں لائے گئے تھے تو ٹرک میں بند تھے۔ باہر کا کوئی منظر نہیں دیکھا تھا' نہ کوئی گاؤں یا شہر۔ لہٰذا یہ کیسے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ کہاں ہیں۔ بس ایک بات یقین سے کہہ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ لندن سے کافی دور ہیں۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو" آفاق نے اتفاق کیا "کوئی آٹھ دس گھنٹے تو میں نے بھی ٹرک میں سفر کیا تھا۔"

رویندر نے مزید کہا "تم اکثر اس کھڑکی میں کھڑے ہو جاتے ہو اور باہر دیکھتے رہتے ہو۔ بائیں جانب کافی فاصلے پر کچھ بلند پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ جبکہ دائیں طرف گھنے درختوں کا سلسلہ ہے۔ جب ہم فیلڈ میں کام کرتے ہیں تو تم

نے محسوس کیا ہوگا کہ دائیں سمت سے آنے والی ہوا میں اکثر نمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید دائیں جانب کچھ فاصلے پر سمندر ہے۔ یہاں جو سردی ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً ہم لوگ شمالی انگلستان کے کسی حصے میں ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے بارڈر پر ہوں۔"

"شمالی انگلستان؟"

"ہاں" رویندر نے جواب دیا "مجھے انگلستان کے جغرافیہ کے بارے میں تھوڑا سا علم ہے۔ لندن ساؤتھ میں ہے۔ اس سے آگے بڑھیں تو مڈلینڈ ہے۔ پھر لنکا شائر اور کمبریا وغیرہ، جو شمالی انگلستان میں ہیں۔ اور میرا ایک اندازہ ہے کہ ہم لوگ شاید کارلائل یا نیو کاسل کے آس پاس کہیں ہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"میں نے ایک بار ڈیوڈ اور رچی کو گفتگو کرتے سنا تھا۔ گو میری انگریزی زیادہ اچھی نہیں لیکن تھوڑی بہت سمجھ لیتا ہوں۔ میں نے رچی کو کہتے سنا تھا کہ وہ دو تین گھنٹے تک کارلائل پہنچ جائے گا۔ اور شام ہونے سے پہلے واپس آجائے گا۔ ڈیوڈ نے اس سے کہا تھا کہ آتے ہوئے وہ بیئر کے دو کریٹ بھی لیتا آئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کارلائل یہاں سے ساٹھ ستر میل سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔"

آفاق نے سر ہلایا "غالباً تمہارا اندازہ درست ہے۔ مگر یار آس پاس کوئی گاؤں وغیرہ بھی تو ہونا چاہیے۔"

"ضرور ہوگا۔" رویندر نے گردن کو جنبش دی "مگر بارہ پندرہ میل سے کم فاصلے پر نہیں ہوگا۔"

آفاق کچھ کہنا چاہتا تھا کہ چپ ہوگیا۔ سبب یہ تھا کہ اچانک آہنی دروازہ کھلنے کی پُرشور آواز سنائی دی تھی۔ پھر گھنٹی بجی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ کھانا لگ چکا ہے۔ رویندر نے آفاق کی طرف دیکھا۔ پھر پھیکے انداز میں مسکرایا۔ "چلو یار، پیٹ پوجا کرلیں۔"

وہ کمرے سے نکل کر راہداری میں آئے۔ دوسرے دونوں کمروں کے دروازے بھی کھل گئے تھے۔ اور ماریا، ارما، امیر اور مارکو سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔ رویندر تو آگے چلا گیا لیکن آفاق رک گیا۔ اس کی نظریں ارما پر جمی ہوئی تھیں۔ مارکو، امیر اور ماریا آگے نکل گئے۔ ارما آفاق کے پاس رک گئی۔ آفاق نے ارما کا ہاتھ تھام لیا اور مسکرا کر مگر استفہامیہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اب تو کافی ٹھیک ہے" ارما نرم لہجے میں بولی۔ اس کی آواز سے اپنائیت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"بخار تو لگتا ہے کم ہوگیا ہے۔"

"ہاں۔"

دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔ آہنی دروازے سے گزر کر گرد آلود سیڑھیاں اترکر نیچے آئے۔ کھانے کا کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں دو میزیں لگی تھیں۔ مسزولیم کھانا لگانے میں مصروف تھی۔ ڈیوڈ دروازے پر کھڑا تھا۔ اور حسب معمول کرخت نظروں سے ہر ایک گھور رہا تھا۔ ڈیوڈ ایک جسیم اور دراز قامت آدمی تھا۔ قد چھ فٹ تین انچ، سینہ چوالیس انچ، گردن کسی گینڈے کی طرح موٹی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور زرد دانت پیلے اور بدنما۔ اس کے دائیں کان کی لو کٹی ہوئی تھی اور کان سے ذرا اوپر کنپٹی پر ایک گہرے زخم کا نشان تھا۔ اپنے حلیے اور جسامت سے وہ ایک بے حس، مکار اور سنگدل آدمی نظر آتا تھا۔ اس کے دائیں کندھے پر ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ جس میں ایک پستول موجود تھا اور آفاق کو یقین تھا کہ پستول بھرا ہوا ہوگا۔

جب وہ دروازے سے گزرنے لگے تو ڈیوڈ نے عامیانہ اور حریص نظروں سے ارما کو دیکھا اور بازاری انداز میں مسکرا کر بولا "ہیلو سوئیٹی!"

"ہیلو۔"

"کیسی ہو تم؟"

"ٹھیک ہوں" ارما نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

"شکریہ۔"

مارکو، امیر اور ماریا پہلے ہی ایک ٹیبل پر بیٹھ چکے تھے۔ رویندر سنگھ دوسری ٹیبل پر براجمان تھا۔ آفاق اور ارما بھی دوسری ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ مسزولیم پانی کا جگ رکھ رہی تھی۔ اس نے ارما کو ذرا غور سے دیکھا اور قدرے دوستانہ لہجے میں پوچھا کہ اس کی طبیعت کیسی ہے۔ اس نے پیراسیٹامول لی تھی یا نہیں۔ ارما نے بتایا کہ اس کی طبیعت قابل بہتر ہے۔ معمولی سی حرارت رہ گئی ہے۔ البتہ کھانسی اور نزلہ بدستور پریشان کررہا ہے۔

مسزولیم نے کہا "فکر نہ کرو۔ میں ایک دوا لائی ہوں۔ بہت اچھی دوا ہے۔ سوتے وقت لے لینا۔ صبح تک بالکل ٹھیک ہوجاؤں گی۔"

"بہتر ہے۔"

مسزولیم ایک فربہ عورت تھی۔ عمر پچپن سے اوپر تھی۔ بال سنہرے تھے جو ہمیشہ بے ترتیبی سے بکھرے رہتے تھے۔ چہرہ گول تھا، ناک قدرے بیٹھی ہوئی اور لب دبیز۔ بظاہر اس کے نین نقش ایسے نہیں تھے کہ اسے حسین کہا جائے۔ مگر عمر رسیدگی اور فربہی کے باوجود اس کے سراپے میں خاصی



کشش محسوس ہوتی تھی اور صاف پتا چلتا تھا کہ جوانی میں بہت جاذب نظر رہی ہوگی۔ آفاق کو حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق اس نے اکیس سال کی عمر میں شادی کی تھی۔ اس کا شوہر ایک سیاہ فام ویسٹ انڈین تھا۔ شادی کے چار سال بعد اس کے شوہر کو کسی نے چھری مار کر قتل کردیا۔ اس وقت وہ لیورپول میں رہتی تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد اس نے لیورپول چھوڑ دیا اور پھر کبھی شادی نہیں کی۔ وہ ایک خوش مزاج، ملنسار عورت تھی۔ غیر ضروری یا ضرورت سے زیادہ گفتگو نہیں کرتی تھی۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اس عمارت کے حصے وائسن فارم ہاؤس کہا جاتا تھا، کچھ اصول اور ضابطے ہیں۔ جن پر عمل کرنا لازمی ہے۔ مسز چیک وائسن جو وائسن فارمس کے مالک تھے، خلاف ورزی اور کوتاہی بالکل نہیں پسند کرتے، ذرا سی کوتاہی خواہ وہ بے ضرر ہی کیوں نہ ہو، کسی بڑی سزا اور نقصان کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ یہ بات مسزولیم کے علم میں تھی۔ چنانچہ وہ اپنی زبان سے کبھی فضول یا بے فائدہ الفاظ نکلنے نہیں دیتی تھی۔ رویندر نے چند ایک بار اس سے کریدنے کی کوشش کی تھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ لوگ کہاں ہیں اور کیا یہ وائسن فارم ہاؤس کس جگہ واقع ہے۔ مگر اسے ناکامی ہوئی تھی۔ مسزولیم نے یہ بتانے میں پس وپیش نہیں کیا تھا کہ شوہر کے قتل کے بعد اس نے لیورپول چھوڑ دیا تھا۔ کچھ عرصہ پریسٹن میں رہی تھی۔ اس کے بعد مسٹر وائسن کی ملازمت اختیار کرلی تھی اور یہ کہ گذشتہ کچھ عرصے سے وہ وائسن فارم ہاؤس میں ہے۔ جہاں وہ "ورکروں" کے لیے کھانا پکاتی ہے۔ لیکن یہ بتانے سے احتراز کیا تھا کہ وائسن فارم ہاؤس کس جگہ واقع ہے۔

"مگر کیوں؟" رویندر سنگھ نے دوستانہ انداز میں جرح کی تھی "آخر اس میں کیا حرج ہے؟"

"لیکن تم جاننا کیوں چاہتے ہو؟"

"بس یونہی" رویندر سنگھ نے کہا تھا "اگر یہ معلوم ہوجائے کہ ہم لوگ کہاں ہیں تو اس میں کیا برائی ہے؟"

"برائی نہیں، خطرہ ہے۔ مسٹر وائسن کو یہ بات اچھی نہیں لگے گی۔"

"کیوں؟"

"وہ اصولوں کی خلاف ورزی بالکل پسند نہیں کریں گے۔"

"مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔"

مسزولیم نے چند لمحے قدرے مشفقانہ نظروں سے رویندر سنگھ کو دیکھا تھا پھر تنبیہی لہجے میں کہا تھا "سنگھ، تم اگر کوئی ایسی ویسی بات سوچ رہے ہو تو اسے بھول جاؤ۔"

"تمہارا مطلب فرار سے ہے؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم کہیں بھی نہیں جاسکتے۔ اس علاقے کے بارے میں تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ تم اِدھر اُدھر بھٹکو گے اور یہ لوگ بہرحال تمہیں تلاش کرلیں گے۔ پھر تم خوا مخواہ مصیبت میں پڑجاؤ گے۔"

"تمہارا مطلب ہے، یہ لوگ مجھے اذیت دیں گے۔"

"جان سے بھی مار سکتے ہیں۔"

رویندر سنگھ کے حلق میں تھوک خشک ہوگیا "واقعی؟"

"ہاں، اپنے آپ کو خوا مخواہ خطرے میں مت ڈالو۔"

"مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" رویندر سنگھ نے مسکرا کر کہا تھا "میں تو صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ انگلستان کے کس حصے میں ہیں۔"

"تمہارے لیے بس اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ تم انگلستان میں ہو۔ اس سے زیادہ جاننے کی فی الحال کوشش مت کرو۔"

کھانا حسب معمول بے مزہ تھا۔ میش پٹیٹو، ابلی ہوئی گاجر، مٹر اور بند گوبھی پر مشتمل کھانا لذیذ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر کھانے کا انتخاب ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ جو کچھ انہیں دیا جاتا وہ انہیں کھانا پڑتا۔ ہفتے میں ایک بار ابلی ہوئی یا تلی ہوئی مچھلی دی جاتی۔ دوبار گوشت اور باقی چار دن سبزی۔ آفاق گوشت یا مرغی نہیں کھاتا تھا۔ لہٰذا اسے چھ دن سبزی پر گزارہ کرنا پڑتا۔ مچھلی بھی وہ صرف اس صورت میں کھاتا "اگر ابلی ہوئی ہوتی۔ تلی ہوئی مچھلی اس کے بس کی بات نہیں تھی کہ مسزولیم مچھلی تلنے کے لیے جو تیل استعمال کرتیں، اس میں جانوروں کی چربی بھی شامل ہوتی تھی۔ یہ پریشانی صرف آفاق کو تھی۔ باقی سب ہی افراد گوشت بھی کھاتے اور مرغی بھی اور بیئر بھی پیتے، جو انہیں ہفتے میں دو تین بار مہیا کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ارما اور امیر بھی گوشت کھانے اور شراب پینے میں کوئی پس وپیش نہ کرتے حالانکہ وہ دونوں مسلمان تھے۔

کھانا ختم ہوگیا۔ ماریا اور ارما نے برتن سمیٹنے میں مسزولیم کی مدد کی۔ پھر کافی آئی۔ سیاہ اور تلخ مگر اس کے ایک ہی گھونٹ نے گویا آبِ حیات کا کام کیا۔ گرم کافی حلق سے اتری اور سینے تک پہنچی تو یوں لگا جیسے تازگی اور توانائی جسم میں دوڑتی چلی گئی ہو۔ تھکن کا احساس کم ہوگیا۔ آفاق نے دوسرا گھونٹ لینے کے بعد رویندر سنگھ کی طرف دیکھا۔

"یار، یہ مسزولیم کافی بہت اچھی بناتی ہے۔"

"ہاں، مسزولیم کے ہاتھ میں جادو ہے۔"

آفاق نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ برآمد کیا۔ اسے قیمتاً ہر روز دس سگریٹ دی جاتی تھیں۔ جنہیں وہ سارا دن بہت سوچ سمجھ کر اور احتیاط سے پیتا تھا۔ اس نے پیکٹ کا جائزہ لیا۔ ابھی تین سگریٹ موجود تھے۔ ایک، دو، تین اس نے گنتی کی اور ہولے سے مسکرایا۔ ایک ایسی ہنسی جس کا مفہوم اسے خود نہیں معلوم تھا۔ نہ ہی یہ علم تھا کہ وہ کیوں مسکرایا ہے۔ پھر اس نے سگریٹ نکالی۔ سلگائی اور ایک طویل کش لیا۔

پھر اس نے ذرا غور سے ارما کو دیکھا۔

ارما نے اس کی نگاہوں کو محسوس کرتے ہی مسکرا کر کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"کیا؟"

"یہ کہ تمہیں اب سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ مگر یاد نہیں آتا کہ کہاں؟"

ارما نے سگریٹ کا کش لیا۔ پھر کافی کی ایک چسکی، پھر خوش دلی سے بولی "یہ جوک تو تم پہلے بھی دو ایک مرتبہ کر چکے ہو۔"

"مگر یہ جوک نہیں ہے" آفاق نے کچھ مصنوعی سنجیدگی سے کہا "ہم تم یقیناً پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔ کسی دوسرے جہان میں، کسی پچھلے جنم میں اور یا پھر خوابوں میں۔ تم ذرا ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرو۔ مجھے کچھ ایسا دھیان پڑتا ہے کہ ہم کسی باغ میں ملے تھے۔ بہت وسیع اور حد درجہ خوبصورت باغ تھا۔ چاروں طرف پھول ہی پھول کھلے ہوئے تھے۔ گلاب اور گیندے اور آرکڈ اور۔۔۔"

"اور گوبھی۔۔۔؟" رویندر نے لقمہ دیا۔

"نہیں گوبھی نہیں۔ حالانکہ مجھے گوبھی کا پھول بھی پسند ہے۔ دیکھنے میں بھی اچھا لگتا ہے اور کھانے کے کام بھی آتا ہے۔" آفاق نے بدستور سنجیدگی سے کہا "مگر گوبھی کا پھول وہاں ہرگز نہیں تھا۔ باقی سب ہی تھے مگر ان پھولوں کی شگفتگی، شادابی، رنگت اور خوبصورتی ماند پڑ گئی تھی۔ کیونکہ ارما تم وہاں موجود تھیں۔ تم نے سفید ریشمی لباس پہن رکھا تھا اور تمہارے سر پر ایک خوبصورت تاج بھی تھا۔ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے روشوں پر چہل قدمی کر رہے تھے اور۔۔۔"

"اور پھر یکایک تمہاری آنکھ کھل گئی" رویندر نے بات کاٹی۔

"ہاں، یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ پھر میری آنکھ کھل گئی لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ہم خوابوں میں ہی سہی، پہلے بہرحال مل چکے ہیں۔ تاہم یہ یاد نہیں آتا کہ وہ باغ جس میں ہم ملے تھے، کہاں ہے۔ ارما، تم یاد کرو۔ شاید تم نے بھی وہ خواب ٹھیک اس وقت دیکھا ہو، جس وقت میں نے دیکھا تھا اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں یاد آجائے کہ وہ باغ کہاں ہے؟"

"میں ایسے بے تکے خواب نہیں دیکھتی" ارما۔۔۔ نے شوخی سے مسکرا کر کہا۔

"یہ اور بھی غلط بات ہے۔ آفاق نے بڑی اہمیت کے ساتھ کہا "تمہیں خواب ضرور دیکھنے چاہئیں۔ خواب صحت کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ آنکھوں کی روشنی بڑھاتے ہیں اور کبھی کبھی اس محبوب سے ملاقات بھی کرا دیتے ہیں جو مستقبل میں ملنے والا ہو۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ خوابوں پر کوئی ٹیکس نہیں ہوتا۔ یہ بالکل مفت ہوتے ہیں۔ چاہے سیاہ و سفید ہوں یا رنگین۔ میں تو اکثر سینما اسکوپ خواب بھی دیکھتا ہوں۔ تم بھی خواب ضرور دیکھا کرو۔"

"اچھی بات ہے۔ اب میں بھی خواب دیکھا کروں گی۔"

"اور خواب میں اس باغ کو ضرور تلاش کرنا جہاں ہم دونوں ملے تھے۔"

"اچھی بات ہے۔"

پھر ارما خوش دلی سے ہنسنے لگی۔ رویندر سنگھ نے اس کا ساتھ دیا۔ امیتابھ مارکو اور ماریا دوسری میز پر تھے۔ انہوں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ مگر سمجھ نہ سکے کہ ہنسی کا سبب کیا ہے کیونکہ انہوں نے آفاق کی خوابوں کے بارے میں دی گئی چھوٹی سی تقریر نہیں سنی تھی۔ مارکو نے حیرت سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" ارما بمشکل ہنسی روک کر بولی۔

اسی وقت گھنٹی بجنے کی آواز بلند ہوئی۔

یہ اس بات کا اعلان تھا کہ کھانے کے کمرے میں بیٹھنے اور گپیں ہانکنے کا وقفہ ختم ہوا۔ اب انہیں اوپر جانا ہوگا۔ اپنے اپنے کمروں میں رات گزارنے کے لیے۔ جہاں وہ صبح سات بجے تک بند رہیں گے۔ اگرچہ اوپر کی منزل میں انہیں پوری آزادی ہوگی کہ اپنے کمرے تک محدود رہیں یا ٹیلی وژن روم میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھیں۔ لیکن وہ نیچے نہیں آسکیں گے کیونکہ زینے کا آہنی دروازہ بند کر کے اس میں بھاری قفل ڈال دیے جائیں گے۔ جو صبح سات بجے سے پہلے نہیں کھلیں گے۔ گھنٹی بج کر خاموش ہوگئی لیکن اس کی اعصاب شکن بازگشت کئی منٹ تک کمرے کی دیواروں سے سر ٹکراتی رہی اور ان کے اعصاب میں گونجتی رہی۔ پھر آخر کار رویندر نے پہل کی۔ وہ زور سے سانس لے کر اٹھا اور پژمردہ آواز میں بولا۔

"چلو یار!"

سب سے پہلے رویندر کمرے سے باہر آیا۔ پھر ہارکو، ماریا اور امیر۔ ارمان کے پیچھے تھی اور آفاق ارما کے پیچھے۔ ڈیوڈ بدستور دروازے میں کھڑا تھا۔ اور بہت غور سے ارما کو دیکھ رہا تھا۔ آفاق نے اس کی نظروں کو دیکھا اور ایک خلش اور بے چینی سی محسوس کی۔ کیونکہ ڈیوڈ کی آنکھوں میں ہوس اور بھوک تھی۔ وہی سفاکی اور بھوک جو گدھ کی آنکھوں میں اس وقت نظر آتی ہے جب وہ لاش کی طرف جھپٹتا ہے۔ جب ارما دروازے سے گزرنے لگی تو معاً ڈیوڈ نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

"ہیلو سوئیٹی!"

"ہیلو۔" ارما نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اور عجلت سے آگے بڑھ گئی۔

آفاق معاندانہ نظروں سے ڈیوڈ کو گھورتا ہوا دروازے سے گزرا۔

راہداری میں ایک قطار کی صورت چلتے ہوئے وہ سیڑھیوں تک آئے اور اوپر پہنچے۔ ڈیوڈ ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ جب وہ بالائی منزل کی راہداری میں پہنچ گئے تو ڈیوڈ نے آہنی دروازہ پر شور آواز سے بند کیا تالے بند کرنے کی آواز سنائی دی۔ پھر ڈیوڈ نے اپنی کرخت آواز میں گڈنائٹ کہا۔ اس کے بعد اس کے بھاری بوٹوں کی چاپ ابھری۔ جب تک ڈیوڈ کے نیچے اترتے قدموں کی آواز آتی رہی، وہ سب یوں چپ چاپ کھڑے رہے جیسے بے جان پتلے ہوں۔ چند لمحوں بعد انجام کار آواز معدوم ہوگئی۔ اور گرد و پیش میں گہری خاموشی مسلط ہوگئی۔ وہ کئی منٹ تک خاموشی اور سناٹے کے حصار میں قید چپ چاپ کھڑے رہے اور اپنے ہی دلوں کی دھڑکن سنتے رہے۔ پھر یکایک رویندر سنگھ نے زور سے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اور کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔

"اب کیا کریں؟"

"کیا وقت ہوا ہے؟" ارما نے پوچھا۔

"آٹھ بج کر چالیس منٹ ہوئے ہیں۔"

"نیند تو اتنی جلدی نہیں آئے گی۔" آفاق نے کہا "کیوں نہ کچھ دیر تاش کھیلیں یا ٹی وی دیکھیں۔"

"چلو ٹی وی دیکھتے ہیں۔ ابھی بی بی سی پر خبریں آئیں گی۔"

لیکن امیر اور ماریا ان کے ساتھ نہیں آئے۔ امیر کی طبیعت کچھ سست تھی، وہ سونا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رہ گئی ماریا تو وہ ویسے ہی کافی خاموش طبع تھی اور الگ تھلگ رہنا پسند کرتی تھی۔ شاید اس نے ذہنی طور پر اس نئی صورت کو ابھی تک قبول نہیں کیا تھا۔ وہ رومانیہ کے ایک چھوٹے سے شہر سے بھاگ کر آئی تھی۔ اسے اپنے شہر سے بڑی محبت تھی اور اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ اپنا شہر چھوڑ دے گی۔ مگر اس کے شہر میں غربت تھی اور محرومی اور لاقانونیت۔ زیست کرنا وہاں اتنا ہی مشکل تھا، جتنا ننگے پاؤں جلتی ریت پر چلنا۔ پھر بھی شاید وہ ریت پر چلتی رہتی۔ مگر ہوا یہ کہ ایک دن مارکو نے اسے ملک چھوڑنے کے لیے کہا۔ ماریا کا باپ مر چکا تھا۔ ایک بوڑھی ماں تھی۔ مارکو اس کا بوائے فرینڈ تھا اور ان دونوں کا ارادہ جلد ہی شادی کرنے کا تھا۔ ماریا کے استفسار پر کہ وہ کہاں جائیں گے، اور کیوں اپنا ملک چھوڑیں، مارکو نے کہا تھا کہ وہ فرانس، جرمنی یا انگلستان جائیں گے۔ اور اس محرومی اور غربت سے نجات حاصل کرلیں گے جس میں وہ اب تک زندگی گزارتے رہے ہیں۔ ماریا شاید پھر بھی راضی نہ ہوتی مگر مارکو کی ضد کے آگے مجبور ہوگئی۔ رومانیہ سے اٹلی اور وہاں سے فرانس ہوتے ہوئے وہ انگلستان پہنچے تھے۔ ماریا کو یقینی طور پر یہ توقع رہی ہوگی کہ انگلینڈ پہنچتے ہی مارکو کو کوئی اچھی سی ملازمت مل جائے گی پھر وہ اپنا گھر لے لیں گے اور سکون و آرام کی زندگی گزاریں گے۔

یہ ایک سپنا تھا، ایک خوبصورت خواب جو ہر افروز سپنا جو اس دنیا کے کروڑوں انسان سوتے جاگتے دیکھا کرتے ہیں۔ ایک خوبصورت، پر آسائش گھر، آرام، سکون، مسرت اور تحفظ کے انمول احساس۔ تحفظ کہ وہ بے انصافی، ستم اور محرومی کا شکار نہیں ہوں گے۔ تحفظ کہ وہ روٹی کے لیے نہیں ترسیں گے۔ تحفظ کہ ان کا کل تاریک نہیں ہوگا۔ اور وہ کیڑوں مکوڑوں کی طرح نہیں، بلکہ انسانوں کی طرح زندگی گزار سکیں گے۔ یہ سپنا لاکھوں کروڑوں سال سے لاکھوں کروڑوں انسان، لاچار، بے بس، ستم رسیدہ اور بدنصیب انسان دیکھتے چلے آرہے ہیں اور دیکھتے رہیں گے۔

ماریا بھی اس سپنے کو آنکھوں میں سجا کر مارکو کے ساتھ نکلی تھی۔ مگر سپنا پورا نہیں ہوا تھا۔ تعبیر اس کی توقع کے برعکس نکلی تھی۔ ایک خوبصورت، پر آسائش گھر کے بجائے وہ ولسن فارم ہاؤس پہنچ گئی تھی۔ جہاں اسے قیدیوں کی طرح روز و شب گزارنے پڑ رہے تھے اور شاید اس کے دل و دماغ نے اس سچائی کو ابھی تک قبول نہیں کیا تھا۔ وہ ابھی تک شکستہ خوابوں کی نوکیلی کرچیاں آنکھوں میں سجائے ہوئے تھی۔ اور شاید یہی سبب ہے کہ وہ اداس رہتی تھی۔ فولی ہوئی، بکھری ہوئی۔ ریزہ ریزہ۔ بہت کم بات کرتی۔ فارم ہاؤس میں ہوتی تو بیشتر وقت اپنے کمرے میں گھسی رہتی۔ آفاق نے



دو ایک بار اسے چپکے چپکے روتے بھی دیکھا تھا۔

جب وہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی تو وہ چاروں ٹیلی وژن روم میں پہنچے۔ لیکن وہ کمرا کیا تھا، اچھا خاصا کباڑ خانہ تھا۔ دیواریں ننگی اور بدنما تھیں کہ ان پر عرصے سے رنگ و روغن نہیں کیا گیا تھا۔ فرش پر ایک پرانا، بدرنگ نمدا بچھا ہوا تھا۔ ایک سالخوردہ صوفہ تھا جو اتنا میلا ہو چکا تھا کہ اس کے اصل رنگ کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ تین خاصی بھدی اور کہنہ کرسیاں تھیں۔ مغربی دیوار کے ساتھ ایک پرانی میز پڑی تھی جس پر ٹیلی وژن رکھا تھا جو ہر چند کہ خاصا پرانا تھا مگر اتفاق سے تصویر بالکل صاف دیتا تھا۔ دائیں جانب والی دیوار میں ایک کھڑکی تھی۔ بالائی منزل کی دوسری کھڑکیوں کی طرح وہ بھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اور اس میں بھی موٹی آہنی سلاخیں پیوست تھیں۔ ٹیلی وژن آن کرنے کے بعد وہ ادھر ادھر بیٹھ گئے اور ٹی وی کے اسکرین پر نظریں جمادیں۔

کوئی مزاحیہ پروگرام چل رہا تھا جو اختتام کے قریب تھا۔ پروگرام ختم ہوا تو خبریں شروع ہوئیں۔ ایتھوپیا کے علاقے ارٹری میرا کے ایک ضلع کے بارے میں ایک تازہ تفصیلی رپورٹ تھی۔ رپورٹر کے مطابق اری میرا کا بڑا علاقہ شدید خشک سالی اور قحط کی زد میں تھا۔ لوگ خوراک اور پانی کی تلاش میں اپنے گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن پانی کا ایک قطرہ بھی کہیں نہیں تھا کہ کئی برس سے بارش ہی نہیں ہوئی تھی۔ لوگ جڑیں اور جنگلی درختوں کی پتیاں کھا کر پیٹ کا دوزخ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کے نتیجے کے طور پر بیمار ہو کر مر رہے تھے۔

امدادی تنظیمیں علاقے میں موجود تھیں اور دن رات کام کر رہی تھیں مگر ان کی جدوجہد کافی نہیں تھی کہ ان کے پاس وسائل کی شدید کمی تھی۔ خوراک، دوائیں اور پانی۔ رپورٹر کے مطابق ان گنت لوگ، بچے، عورتیں اور بوڑھے ہر روز کیڑے مکوڑوں کی طرح مر رہے تھے۔ خبریں یہ بھی بتایا گیا کہ اقوام متحدہ نے وارننگ دی ہے کہ اگر فوری طور پر خوراک اور دوائیں مہیا نہ کی گئیں تو دس لاکھ سے زیادہ انسانی زندگیاں ضائع ہو سکتی ہیں۔

اقوام متحدہ نے دولت مند ممالک پر یہ الزام بھی لگایا تھا کہ وہ امداد کی پیشکش میں فراخ دلی اور دریا دلی کا مظاہرہ نہیں کر رہے ہیں۔ رپورٹ میں قحط زدہ علاقے کی تصاویر بھی دکھائی گئی تھیں۔ ہڈیوں کے ڈھانچے جن پر کھال منڈھی ہوئی تھیں۔ بھوک کے مارے ستے ہوئے چہرے اور گرسنہ آنکھیں، زرد، فاقہ زدہ، ایک شدید، کربناک، جاں سوز انتظار ان چہروں پر اور ان آنکھوں میں منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ سوکھے ہوئے مریل بچے ہوں یا عورتیں یا مرد، ہر ایک کے چہرے پر وہ انتظار موجود تھا۔ روٹی کہاں ہے، پانی کہاں ہے اور دوا کہاں ہے؟ انتظار۔ انتظار۔ جسم و جان سے حیات کا رس نچوڑ لینے والا انتظار۔ یہ انتظار کبھی ختم ہو گا یا نہیں۔ مگر انتظار کے آسیبی سائے صرف چہروں پر اور آنکھوں ہی میں تو نہیں تھے۔ بلکہ وہ انتظار زمین پر بھی ہر جگہ موجود تھا کہ زمین پیاسی تھی اور ترسی ہوئی تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی، زمین خشک ہو کر چٹخی تھی۔ دھوردنگر جگہ جگہ مرے پڑے تھے۔ اور ان کا گوشت گل گل، سڑ سڑ کر معدوم ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ ان کا گوشت کھانے کے لیے جنگلی جانور تک نہیں تھے اور زمین... ترسی ہوئی زمین، پیاسی منتظر آنکھوں سے آسمان کو تک رہی تھی جو خالی تھا، ایک سرے سے دوسرے سرے تک خالی تھا۔ بالکل ویران اور سنسان۔ بادل کا کہیں ایک ٹکڑا تک نہیں تھا۔ آخر کب تک زمین انتظار کرے گی، کب بادل آئیں گے اور جھوم کر برسیں گے اور زمین کی پیاس بجھے گی۔

آفاق ایک دہشت کے عالم میں ساکت بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیں پلک جھپکائے بغیر اسکرین پر یوں جمی ہوئی تھیں جیسے چپک کر رہ گئی ہوں۔ وہ مدقوق اور آفت زدہ چہرے اور زرد گرسنہ نظریں اسے ڈرا رہی تھیں۔ ایک سرد لہر کی طرح اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت سے دلآزار مناظر دیکھے تھے۔ بھوک کے، ظلم کے، تباہی و بربادی کے، مگر یہ مناظر حد درجہ ہولناک تھے۔ اتنے لرزہ خیز اور دہشت ناک کہ بجائے خود قیامت تھے۔ آفاق کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ موت کو مجسم اپنے روبرو دیکھ رہا ہو۔ آخر کار اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ یکلخت اٹھا اور ٹی وی آف کردیا۔

"بند کرو یار! مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ دم بخود بیٹھے رہے اور بے معنی انداز میں خلا میں گھورتے رہے۔ کئی منٹ کے جان لیوا سکوت کے پھر آخر کار رویندر نے لب کھولے اور پست آواز میں کہا "اتنی بھوک ہے اس دنیا میں؟"

"ہاں، اتنی بھوک ہے۔" مارکو دھیرے سے بولا۔

چند لمحے اور گزرے پھر ارمانے شکستہ آواز میں کہا "میں نے یہ بھوک دیکھی ہے۔"

یہ محض ایک جملہ تھا۔ عام سے الفاظ پر مشتمل ایک

سادہ سا جملہ لیکن اس جملے کا ردِعمل اتنا شدید تھا کہ مارکو ایک نادیدہ خوف سے لرز گیا۔ رویندر کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ آفاق نے دہشت زدہ ہو کر ارما کی جانب دیکھا۔ ارما ساکت بیٹھی تھی۔ اس کی ٹھہری ہوئی نظریں ٹی وی کے تاریک اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ چہرہ بوں سفید اور بے روح ہو گیا تھا جیسے اس نے کسی آسیب کو دیکھ لیا ہو۔

چند لمحے بعد اس نے ایک بار پھر اسی سرسراتی ہوئی زندگی سے عاری آواز میں کہا "میں نے یہ بھوک دیکھی ہے۔"

"ارما!" آفاق نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"ہاں' میں نے یہ بھوک دیکھی اور لاچاری اور ذلت اور موت۔" ارما کہتی رہی "وہاں کو سود میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بس موت تھی اور تباہی اور بے کسی۔ میرا گاؤں ایک بڑا قبرستان بن گیا تھا۔ جہاں موت دندناتی پھرتی تھی اور گلی کوچوں میں انسانوں کو ڈھونڈتی تھی اور وہ لوگ جو ہمارے پڑوسی تھے اور ہم وطن تھے' انہوں نے اچانک ہتھیار اٹھالیے تھے اور ہمیں چن چن کر مار رہے تھے۔ انہوں نے بوڑھوں کو مارا' جوانوں کو مارا اور عورتوں اور بچوں کو مارا۔ اور نوجوان لڑکیوں کو زیادتی کا نشانہ بنایا۔ کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی۔ اس دکھ اور عذاب میں ہم بھی مبتلا تھے۔ اور جب اور کوئی چارہ نہ رہا تو میں اور میرے گھر والے گاؤں چھوڑ کر پہاڑیوں پر چلے گئے۔ کئے جنگلوں میں کہ اپنی جان بچانے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ وہاں ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ نہ سردی اور برف سے بچنے کے لیے مناسب کپڑے' نہ بیماری سے لڑنے کے لیے دوا اور نہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کھانا۔ وہاں میں نے اپنی آنکھوں سے انسانوں کو کتے بلیوں کی طرح مرتے دیکھا تھا۔ سسک سسک کر' ایڑیاں رگڑ رگڑ کر۔ ضعیف مردوں کو' بوڑھی عورتوں کو اور معصوم بچوں کو۔ ہمارے پاس تو کفن تک نہیں تھا۔ ہم گڑھا کھود کر مرنے والوں کو چیتھڑوں میں لپیٹ کر دفن کر دیتے تھے۔ وہاں' ان جنگلوں میں بھوک تھی۔ اتنی بھوک تھی کہ ہر طرف چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ اور ہمارے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہاں ہم نے جڑیں اور درختوں کے پتے تک ابال کر کھائے تھے۔" وہ یکایک رکی پھر زور سے سانس لے کر بولی "ہاں' میں نے یہ بھوک دیکھی ہے۔"

پھر وہ چپ ہو گئی۔ یوں جیسے کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ اور نہ ہو۔ آفاق' رویندر اور مارکو بھی چپ رہے۔ ایک لرزہ خیز خوف اور سناٹے کے کفن میں لپٹے ہوئے۔ اور گہرے سکوت میں ارما کی آواز کی دلآزار بازگشت سنتے رہے۔

"بھوک۔"

"بھوک۔"

"بھوک!"

○☆○

اس رات آفاق کو دیر تک نیند نہ آئی۔ رویندر تو کسی نہ کسی طرح سو گیا تھا۔ مگر آفاق کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا اور گرد آلود چھت کے بدنما دھبوں کو گھورتا رہا۔ اس نے بتی بھی بند نہیں کی تھی کہ اندھیرا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دل و دماغ پر ایک ناقابلِ بیان سی بے کسی اور الجھن طاری تھی۔ ذہن ایک آوارہ پرندے کی طرح اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا اور یادیں جو خوشگوار نہیں تھیں' ماضی کے اندھیروں سے نکل کر اس کے آس پاس آموجود ہوئی تھیں۔ وہ ان یادوں سے آنکھیں نہیں ملانا چاہتا تھا مگر مجبور تھا۔ یادیں خوبصورت اور خوشگوار ہوں تو باعثِ مسرت ہوتی ہیں۔ دل و روح کو تقویت پہنچاتی ہیں اور سنہرے حیات میں زادِ راہ بنتی ہیں لیکن اگر یادیں ناکامی' حسرت اور محرومی سے عبارت ہوں تو دکھ پہنچاتی ہیں۔ آدمی کو پچھتاوے اور کم مائیگی کے احساس میں مبتلا کرتی ہیں۔ آفاق کی یادیں بھی روشن نہیں سیاہ پوش تھیں اور وہ ان کا بوجھ بڑھاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گئے دنوں کی یادوں سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ دل پہلے ہی مایوسیوں کے بوجھ سے چور رہتا تھا مزید بوجھ بڑھانا مناسب نہ تھا چنانچہ اس نے ذہن کو اِدھر اُدھر بہلانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ جب الجھن اور بے چینی اور زیادہ بڑھی تو یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک نظر رویندر سنگھ کو دیکھا۔ وہ سو رہا تھا مگر چہرے سے پتا چلتا تھا کہ نیند پرسکون نہیں ہے۔ اس نے بتی بند کر دی اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر دور تک اندھیرا بکھرے ہوئے تھے اور ایک آسیبی سناٹا اور گہرا سکوت' یہاں لگتا تھا جیسے پوری دنیا یکایک خالی ہو گئی ہے اور کہیں کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ وہ آسمان کے گہرے بادلوں اور نگاہ کے اختتام پر نظر آنے والے دھندلے سیاہ ہیولوں کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک طویل سانس لی اور گھوم کر دروازے کی طرف بڑھا۔ کوئی خاص سبب نہیں تھا۔ بس یونہی خیال آیا تھا کہ راہداری میں ٹہلنا چاہیے۔ شاید اس طرح کچھ سکون ملے۔ چنانچہ دروازہ کھول کر وہ راہداری میں آیا۔ سیڑھیوں کے قریب ایک دھندلا سا بلب جل رہا تھا جس کی پیلی' بیمار سی روشنی راہداری کے اختتام تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ غیر



ارادی طور پر ٹہلتا ہوا سیڑھیوں تک گیا اور آہنی دروازے کو چھو کر دیکھا۔ جو باہر سے بند تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ناچ گئی۔ تمسخر آمیز اور طنزیہ' جیسے خود اپنے آپ پر ہنسا ہو۔ پھر کھڑکی کے پاس آیا اور چوکھٹ پر کہنیاں ٹکا کر بے دھیانی سے باہر دیکھنے لگا۔

بالائی منزل پر کل چھ کمرے تھے۔ جن میں سے ایک ٹی وی روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ٹی وی روم سے متصل ایک اسٹور روم تھا جس میں دنیا بھر کا پرانا اور فالتو کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ سیڑھیوں کے قریب باتھ روم اور اس سے ملحق باورچی خانہ تھا۔ چار کمرے بطور خواب گاہ استعمال ہوتے تھے۔ ایک کمرے میں ماریا اور ارما سوتی تھیں۔ دوسرا مارکو اور امیر کے استعمال میں تھا۔ جبکہ رویندر اور آفاق اسٹور روم سے ملحقہ کمرے میں سوتے تھے۔ اوپر کی منزل میں' دروازہ بند ہونے کے بعد انہیں پوری آزادی ہوتی تھی کہ ٹی وی دیکھیں' تاش کھیلیں یا باتیں کریں۔ ایک دوسرے سے ملنے جلنے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اگر پابندی تھی تو صرف اتنی کہ جب تک کوئی نگراں موجود نہ ہو' باہر نہیں جا سکتے تھے۔

آفاق اپنے خیالوں میں گم خاموش کھڑا تھا کہ معاً اس کے کانوں سے دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ ٹکرائی۔

اس نے گھوم کر دیکھا تو ارما پر نظر پڑی۔ اس نے حیرت سے کہا "ارے' ارما! تم کیا بات ہے' کیا نیند نہیں آرہی؟"

ارما نے اسے دیکھا' ایک لمحے کے لیے جھجکی پھر مسکرا کر اس کی طرف بڑھی "نہیں۔ بہت کوشش کی پر نیند نہیں آئی۔ کیا وقت ہوا ہے؟"

"ایک بج کر پندرہ منٹ" آفاق نے گھڑی دیکھی۔

"مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

آفاق نے ٹھنڈی سانس لی "جی بہت اداس ہو گیا تھا ارما' کوشش کے باوجود نیند نہیں آئی تو یہاں آگیا۔"

"جی اداس ہو گیا تھا' کیا میری باتیں سن کر؟"

"ہاں' کچھ تمہاری باتیں سن کر' کچھ اپنے حالات کی بنا پر" اس نے افسردہ آواز میں کہا۔

ارما کچھ نہیں بولی۔ اس کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اور باہر دور تک پھیلی تاریکی اور ویرانی کو دیکھنے لگی۔ پھر یکایک سرہلا کر کہا "کتنا سناٹا ہے؟"

"ہاں' بہت سناٹا ہے۔"

"تمہیں سناٹا اچھا لگتا ہے؟"

آفاق نے ایک لمحہ غور کیا پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ دل پر بوجھ ہوتا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ خود اپنے ساتھ رہوں۔ تب سناٹا اور تنہائی اچھی لگتی ہے۔ کسی کی مداخلت کا احتمال نہیں رہتا ناں۔"

ارما کی ہنسی کی مدھم سی جلترنگ ابھری "تم بھی میری طرح ہو۔ جیسا میں محسوس کرتی ہوں' ویسا ہی تم بھی محسوس کرتے ہو۔ جو مجھے اچھا لگتا ہے' وہی تمہیں بھی پسند ہے۔ میرا بھی یہی حال کہ کبھی کبھی اپنی سنگت کے سوا اور کچھ اچھا نہیں لگتا۔ گاؤں میں بھی تب بھی میں اکثر یہی کیا کرتی تھی کہ پہاڑیوں یا کھیتوں کی طرف نکل جاتی تھی۔ اور ڈھیر سارا وقت خود اپنی معیت میں گزارتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کبھی کبھی آدمی کا سب سے اچھا رفیق خود اس کی ذات ہوتی ہے دوسرا کوئی نہیں۔"

آفاق مسکرایا۔ گردن گھما کر ارما کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے بالکل قریب کھڑی تھی اور اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ آفاق کے دل کی دھڑکن یکایک تیز ہو گئی۔ ارما کا زرد چہرہ اس سے فانوس کی طرح روشن ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں ستارے جگمگا اٹھے تھے۔ آفاق نے اس کے دلنواز چہرے کو دیکھا' اس کی مخمور آنکھوں کو دیکھا' شانوں پر بکھرے ریشمی بالوں کو دیکھا اور یکلخت اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا۔ اس کا تصور اسے چشمِ زدن میں بہت دور آفاق سے پرے' رنگ و نور سے معمور' انجانی' ان دیکھی وادیوں میں لے گیا۔ جہاں ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے تھے اور فضا میں عطر گھلا ہوا تھا اور شفاف پانیوں کے چشمے رل تل کا گیت گا رہے تھے اور ایک بہت ہی مدھر' روح کو مدہوش اور مخمور کر دینے والی موسیقی کی مدھم لے چاروں اور گونج رہی تھی اور وہ دونوں پھولوں کے تختوں کے نیچے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ خوش اور بے فکر' نہ آنے والے کل کا خوف' نہ گزرے ہوئے کل کا رنج۔ وہ لمحہ موجود میں زندہ تھے اور بہت خوش تھے کہ وہ لمحہ ان کا اپنا تھا۔ بلا شرکت غیرے وہ اس لمحے کے مالک تھے اور جس طرح ان کا من چاہے' اس لمحے میں جی سکتے تھے۔

کئی منٹ گزر گئے۔ آفاق وادی سے واپس نہیں لوٹا نہ اس کی پلک جھپکی۔ نہ محویت ٹوٹی۔ وہ اسی طرح ڈوب کر' فنا ہو کر ارما کو دیکھتا رہا۔ تب ارما نے ہولے سے آفاق کا ہاتھ دبایا اور کچھ مسکرا کر' کچھ شرما کر حیرت سے کہا۔

"احمد!"

"ہاں۔"

"ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟"

"آں" آفاق معاً چونک پڑا پھر خجل ہو کر مسکرانے لگا "کچھ نہیں۔"

ارما مسکرائی۔ چند لمحے معنی خیز نظروں سے آفاق کو

دیکھتی رہی جیسے کہہ رہی ہو "میں تمہارے دل کا حال خوب سمجھتی ہوں۔" پھر قدرے وقفہ دے کر بولی "چائے پیو گے؟"

"چائے!" آفاق نے حیرت سے کہا "بھلا اس وقت چائے کہاں ملے گی؟"

"میرے پاس چائے کی پتی بھی ہے، شکر بھی اور خشک دودھ بھی۔"

آفاق مزید حیران ہوا "مگر تمہارے پاس یہ سب چیزیں کہاں سے آئیں؟"

"آج شام کھانے کے بعد میں نے مسز ولیم سے مانگ لی تھیں۔"

"ارے، تو انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا؟"

"لو اس میں اعتراض کی بات ہے بھلا۔ ہم کوئی چوری تھوڑا ہی کر رہے ہیں۔"

"اور اگر مسٹر واٹسن یا ڈیوڈ کو پتا چل جائے تو؟" آفاق نے خدشہ ظاہر کیا۔

"تو کیا؟" ارما نے قدرے ناگواری سے کہا "ہم ان کے احکامات کے پابند ضرور ہیں تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم چائے تک نہیں پی سکتے۔ مسز ولیم نے تو یہ بھی کہا ہے کہ ہم چائے کی پتی، شکر اور بسکٹ وغیرہ قیمتاً خرید سکتے ہیں۔"

"اچھا!"

"ہاں۔"

آفاق مسکرایا "بھئی ارما، اس وقت چائے کا ایک کپ آبِ حیات سے کم نہیں ہوگا۔"

"میں ٹی بیگ اور شکر لے کر آتی ہوں۔"

وہ اپنے کمرے میں گئی اور چند منٹ میں واپس آگئی۔ پھر وہ کچن میں گئے۔ جو خاصی ابتر حالت میں تھا۔ مگر خوش قسمتی سے ضرورت کی تمام اشیا وہاں موجود تھیں۔ دو شکستہ سی بغیر ہتھوں کی کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ آفاق ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنائیت بھری نظروں سے ارما کو دیکھتا رہا۔ ارما نے ایلومینیم کا پان اچھی طرح دھو کر پرانے اور بدرنگ لگر پر چڑھایا۔ پھر کیبنٹ کھولی۔ جو پرانے برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ قرائی پان، گلاس، کپ اور چند پلیٹیں اور پتیلیاں۔ ارما نے دو کپ نکالے۔ اور انہیں اچھی دھونا شروع کیا۔ آفاق خاموش مگر مسرور نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس لمحے ارما اسے بہت اچھی لگی۔ بہت زیادہ اس کے دل کو بھائی۔ خوبصورت، پاکیزہ اور پروقار بالکل کسی مشرقی عورت کی طرح ذمے دار اور گھر گرہست۔ اور ارما بھی اتنی ہی محویت سے چائے بنانے میں مصروف تھی جیسے اپنے ہی گھر میں، اپنے ہی باورچی خانے میں ہو اور اپنے گھر کا کام کر رہی ہو۔ اس نے نہایت سلیقے سے دو کپ چائے تیار کی۔ ایک کپ آفاق کو دیا دوسرا خود لے کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ جو آفاق کی کرسی کے قریب ہی رکھی تھی۔

آفاق نے چائے کا گھونٹ لیا۔ مہکتی ہوئی گرم اور خوش ذائقہ چائے حلق سے اترتی تو جسم و جان میں ایک تازگی اور راحت کا احساس ہوا۔ اس نے ارما کی طرف دیکھا۔

"تم چائے بہت اچھی بناتی ہو۔"

"میں کھانا بھی بہت اچھا بناتی ہوں" ارما نے چائے کی چسکی لی۔

"کبھی موقع ملا تو تمہارے ہاتھ کا کھانا بھی کھاؤں گا" آفاق نے سر ہلا کر کہا "میں نے البانیہ، رومانیہ اور کوسووو کے کھانے کبھی نہیں کھائے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کسی دن مسز ولیم سے پوچھوں گی۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو میں تمہارے لیے کھانا بناؤں گی" ارما نے خوش دلی سے جواب دیا۔

وہ دونوں چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، جو بظاہر بے مقصد ہوتی ہیں۔ مگر زندگی میں رنگ بھرتی ہیں۔ ایک چاشنی، مسرت اور معنی پیدا کرتی ہیں۔ وہ دونوں بھی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ننھی ننھی خوشیاں کشید کرتے رہے۔ آفاق نے اپنی خواہشوں اور پسند ناپسند کا ذکر کیا۔ ارما نے اپنی پسندیدہ چیزوں کے بارے میں بتایا۔ دونوں ہی دونوں حیران ہوئے۔ اس انکشاف سے کہ ان کی پسند ناپسند میں کئی باتیں مشترک تھیں۔ بچپن اور گھر کا ذکر ہوا تو بات کسی نہ کسی نیت یا ارادے کے کوسووو کے موجودہ حالات تک پہنچی۔ آفاق نے ارما کو بتایا کہ جب جنگ چل رہی تھی تو وہ وطن میں تھا۔ اور اخبارات میں جنگ کی تفصیلات پڑھتا رہتا تھا۔ لیکن اسے اندرونی حالات کا زیادہ علم نہیں ہے۔ حالات کیوں کر بگڑے تھے۔ سربوں اور مقامی افراد میں اختلافات کیوں کر پیدا ہوئے تھے۔ اور یہ کہ اس وقت کوسووو میں کیا حالات ہیں؟

ارما کے چہرے کی قندیل دھندلا گئی۔ اس نے غور سے آفاق کو دیکھا اور چند لمحے دیکھتی رہی پھر طویل سانس لے کر بولی "غالباً تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں یہاں اس عمارت میں کیوں کر پہنچی، ہے نا؟"

آفاق نے ہولے سے سر کو جنبش دی "میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا لیکن۔"

"میں نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔ اتنے کہ اب عادت ہو گئی ہے" ارما نے مدھم آواز میں کہا "اب اگر میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں جو دراصل کوسووو کے لاکھوں انسانوں کی کہانی



ہے تو مجھے کچھ زیادہ اذیت کا احساس نہیں ہوگا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ یہ کہانی تمہیں سناؤں گی۔ جانے کیا بات ہے کہ تمہارے پاس بیٹھنا اور تم سے باتیں کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ دل کو ایک ڈھارس سی ملتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں کسی اپنے سے باتیں کر رہی ہوں۔" وہ یکایک رکی۔ فراک کی لمبی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا برآمد کی۔ ایک سگریٹ آفاق کو دی۔ ایک خود جلائی، پھر اس کا ہاتھ تھام کر بولی "تم نے کے ایل اے کا نام سنا ہوگا۔ کاسووو لبریشن آرمی۔ اس آرمی کو قائم کرنے والے نہ تو غدار تھے، نہ دہشت گرد اور نہ ہی علیحدگی پسند۔ جب تک یوگوسلاویہ ٹوٹا نہیں تھا تب تک باہر کی دنیا کو کچھ زیادہ علم نہیں تھا کہ یوگوسلاویہ میں خاص طور پر بوسنیا اور کوسووو وغیرہ میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ تو ہم لوگ جانتے ہیں۔ کیونکہ ہم وہاں موجود تھے اور ہر طرح کی ذلت، تحقیر اور ناانصافی اور تفریق کا سامنا کر رہے تھے۔ سربیا اور وہاں کے حاکم بنیادی طور پر ہر شے پر ہمارے وسائل کو قابض تھے اور ہماری حیثیت دوسرے درجے کے شہریوں سے زیادہ نہیں تھی۔ سرب آقا تھے اور ہم غلام۔

زبان سے یہ بات کوئی بھی نہیں کہے گا لیکن عملی صورت یہی تھی۔ سوچ نے طرح طرح کی دلآزار اور توہین آمیز پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جو بنیادی طور پر صرف غیر سربوں کے لیے تھیں۔ محکومی، مجبوری اور زبان بندی کا یہ دور عرصے سے چل رہا تھا اور شاید چلتا ہی رہتا لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو پھر ایک لہر اٹھی۔ وقت نے فیصلے صادر کیے۔ سوویت یونین کی شکست و ریخت ہوئی۔ ایک ایک کر کے وہ تمام ملک جو روس کے زیرِ تسلط تھے، آزاد اور خودمختار ہوئے۔ یہ امر روس سے چل کر چیکوسلواکیہ اور یوگوسلاویہ تک آئی۔ کروشیا اور بوسنیا کے لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بوسنیا اور کروشیا میں جو کچھ ہوا، تم بخوبی جانتے ہو۔ بستِ بربادی ہوئی، بہت خون بہا، انسانی جان کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ بے قیمت اور بے وقعت ہو چکی تھی۔

سربوں نے شقاوت، بربریت اور درندگی کی ہر انتہا کو چھو لیا تھا۔ انہوں نے بلا کسی تمیز تفریق کے بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کو مارا تھا اور اجتماعی قبریں بنائی تھیں۔ ایک ایک قبر میں تیس تیس چالیس سے لے کر سو، دو سو تک لاشیں دفن کی تھیں۔ بعد میں یہ قبریں دریافت ہوئی تھیں، تمہیں تو پتا ہوگا۔"

"ہاں، بوسنیا کے بارے میں کافی کچھ جانتا ہوں۔"

ارما نے زور سے سانس لی "بہرحال پھر جنگ ہوئی اور انجام کار سربوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ کروشیا اور بوسنیا آزاد ہوئے۔ اس وقت ہمارے کوسووو میں علیحدگی اور خودمختاری کا رجحان کچھ زیادہ نہیں تھا۔ بس ایک چھوٹا سا گروہ تھا جو بنیادی طور پر نیم خودمختاری کا خواب دیکھتا تھا، نیم خودمختاری سے مراد یہ تھی کہ کوسووو ایک علیحدہ خطہ ہے اور کوسووو میں آباد افراد چونکہ نسلاً سرب نہیں ہیں اور مذہبی ان کا ایک الگ تشخص ہے لہٰذا یہ ان کا حق ہے کہ صوبے کا انتظام ان کے ہاتھ میں ہو۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ کوسووو کی پوری سرکاری انتظامیہ سربوں پر مشتمل تھی اور ان کا سلوک مقامیوں کے ساتھ منصفانہ نہیں تھا لیکن وہ چھوٹا سا گروہ جو کوسووو کے حقوق کے خواب دیکھتا تھا۔ غیر اہم تھا۔ اکثریت صرف یہ سوچتی تھی کہ کوسووو کے حالات بہتر کیے جائیں۔ اور بلغراد کی حکومت دہرے معیار کا رویہ ترک کرے۔ اس سے زیادہ کوئی کچھ نہیں چاہتا تھا۔

کوسووو میں غربت بہت تھی۔ بیکاری بہت تھی، تعلیم اور صحت کی سہولتوں کا فقدان تھا۔ لیکن حکومت قصداً ان کے مسائل کی جانب سے پہلوتہی اور چشم پوشی کرتی تھی۔ پھر بھی عوام اتنا ہی شکوہ کرتے تھے، جتنا کسی بھی ملک کے عوام جائز طور پر اپنی حکومت سے کر سکتے ہیں۔ لیکن پھر یہ ہوا کہ بوسنیا اور کروشیا اور سلووینیا آزاد ہوئے کہ سربوں کے لیے خاص طور پر بوسنیا کا ہاتھ سے نکل جانا ایک ناقابلِ برداشت ذلت اور ہزیمت کے مترادف تھا۔ ان کی حالت اس کتے کی سی ہو رہی تھی جو پاگلوں کی طرح اپنے ہی زخم چاٹتا رہتا ہے۔ ایک طرف تو ساری دنیا میں وہ رسوا اور بے عزت ہو رہے تھے۔ دوسری طرف ایک نیا مسئلہ ان کے لیے پیدا ہو رہا تھا۔ ان سربوں کے لیے جگہ کا مسئلہ جو بوسنیا اور کروشیا کی آزادی کے نتیجے میں وہاں سے بھاگ کر سربیا آ رہے تھے۔ ان دو وجوہ سے ان کی تمام تر توجہ یکایک کوسووو پر مرکوز ہو گئی۔ تمہیں یقیناً علم ہوگا کہ کوسووو میں آباد مسلمانوں کی بڑی اکثریت البانیہ سے ترکِ وطن کرنے والے افراد پر مشتمل ہے۔ کسی زمانے میں البانیہ سے یہ لوگ ترکِ وطن کر کے کوسووو میں آئے تھے اور مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے۔ وہ نسل تو عرصہ ہوا ختم ہو گئی۔ اب جو مسلمان وہاں آباد ہیں، وہ نسلاً بے شک البانی ہوں لیکن اب ان کا کوئی تعلق البانیہ یا رومانیہ سے نہیں ہے۔ وہ کوسووی ہیں۔ اور یہی ان کی شناخت ہے۔ لیکن سربوں کی سوچ کچھ اور تھی۔ وہ گو زبان سے کہتے نہیں تھے مگر کوسووو کے مسلمانوں کو غیر ملکی گردانتے تھے۔ بوسنیا میں جوتے پڑنے کے بعد انہوں نے ایک منصوبہ بنایا۔ یہ کہ اگر کوسووو سے غیر سرب مسلمانوں کو دھکے دے کر نکال دیا

جائے تو ایک طرف تو بوسنیا میں اٹھائی ہوئی ذلت کا تسکین کا کچھ سامان ہو سکے گا۔ دوسرے ایک بڑا خطۂ زمین ہاتھ آجائے گا۔ جہاں سربوں کو آباد کیا جا سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک طے شدہ پروگرام کے تحت ظلم و ستم اور بے انصافی کا سلسلہ شروع کیا۔ جو دن بدن بڑھتا ہی چلا گیا۔ ان حالات میں، تم خود ہی سوچو کہ سووو کے لوگ کیا کرتے؟"

"اور غالباً ان ہی وجوہ سے کے ایل اے وجود میں آئی" آفاق نے پوچھا۔

"ہاں۔" ارما نے جواب دیا "مگو' کے ایل اے کچھ عرصہ پہلے ہی بن چکی تھی مگر اس میں بہت کم لوگ شامل تھے اور عملی طور پر ان کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان کے پاس اسلحہ بھی برائے نام تھا۔ مگر جب کوسووو کی سرب پولیس نے بے گناہ لوگوں کو ستانا اور ہراساں کرنا شروع کیا تو کے ایل اے نے ہتھیار اٹھا لیے کہ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ پھر سرب حکومت نے فوج بھیج دی۔ اب ایک طرف کوسووو میں سرب پولیس اور فوج تھی اور دوسری طرف کمزور نہتے عوام۔ اور ایک سلسلہ تھا لامتناہی سلسلہ جو ذلت سے، تحقیر سے، بے حسی اور کمینگی سے اور موت سے عبارت تھا۔ ان دنوں موت کوسووو کے گلی کوچوں میں چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔"

ارما ایک طویل سانس لے کر چپ ہو گئی۔

آفاق نے اپنے جسم میں ایک سرد لہر کو سرسراتے ہوئے محسوس کیا۔

چند لمحے بعد ارما نے پھر کہا "میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ کیونکہ تم بہت کچھ جانتے ہی ہو۔ بس یوں سمجھو کہ ایک قیامت تھی جو کوسووو کے گلی کوچوں پر مسلط تھی اور جائے پناہ کوئی نہیں تھی۔ وہ لوگ بلا تکلف گولیاں چلاتے تھے۔ کتے بلیوں کی طرح انسانوں کو مارتے تھے۔ نوجوان اور معصوم لڑکیوں کی انفرادی اور اجتماعی آبروریزی کرتے تھے اور پولیس اور فوج کے اکثر جوان صاف صاف کہتے تھے کہ کوسووو سے نکل جاؤ۔ جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔ ورنہ ہم تمہاری زندگیاں جہنم بنا دیں گے اور انہوں نے واقعی کوسووو کو دوزخ بنا دیا تھا۔ ان حالات میں لوگ کیا کرتے، کے ایل اے بے شک لڑ رہی تھی۔ لیکن ایک بے سروسامان جماعت کے لیے سربیا کی حکومت سے جیتنا آسان نہیں تھا۔ تو پھر عام آدمی کیا کرتا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا، خوف زدہ، آفت کے مارے، بے آسرا لوگوں کے ہجوم البانیہ کا رخ کر رہے تھے۔ جہاں جگہ جگہ کیمپ لگائے گئے تھے۔ دوسری طرف بے شمار لوگ پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لے رہے تھے۔ تاکہ جان بچا سکیں۔ عزت بچا سکیں۔ اور اس دن کا انتظار کر سکیں جب دورِ ستم ختم ہو گا اور وہ اپنے گھروں کو لوٹ سکیں گے۔ اور ان لوگوں میں، میں بھی شامل تھی اور میری ماں بھی۔"

"تم!"

"ہاں۔"

ارما کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور ڈھلک کر گالوں پر چمک رہے تھے۔ آفاق ہمدردی سے اسے دیکھتا رہا۔ قدرے توقف کے بعد ارما نے ہاتھ اٹھا کر آنسو پونچھے، پھر کہنے لگی "وہاں جنگل میں ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ خوراک ختم ہو چکی تھی۔ کئی بار ہم نے لیشل کے پتے یا جڑیں ابال کر کھائیں۔ سردی کے دن تھے۔ برف باری شروع ہو چکی تھی۔ رگوں میں خون منجمد کر دینے والی، اس بے پناہ سردی سے بچنے کے لیے ہمارے پاس مناسب کپڑے بھی نہیں تھے۔ بھوک سے، بیماری سے یا سردی سے لوگ مرتے تھے تو ہم انہیں ان ہی کے کپڑوں میں لپیٹ کر دفن کر دیتے تھے۔ میرے باپ کو تو وہ لوگ پہلے ہی قتل کر چکے تھے۔ ہاں، یہ ذکر میں نے نہیں کیا۔ لیکن میرے باپ کو ان لوگوں نے اس وقت مار ڈالا تھا جب ہم گاؤں میں ہی تھے۔ وہ گھر سے ماں کی دوا لینے نکلا تھا کہ پولیس نے اسے پکڑ لیا۔ دہشت گردی کے الزام میں۔ پھر وہ لوگ اسے پولیس اسٹیشن لے گئے۔ انہوں نے زدوکوب کیا کہ وہ مر گیا لیکن انہوں نے رجسٹر میں رپورٹ لکھی کہ ایک دہشت گرد مقابلے میں مارا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کی لاش ہمارے حوالے کی اور دھمکی دی کہ اگر ہم نے زبان کھولی تو ہمارا بھی وہی حشر ہو گا جو میرے باپ کا ہوا تھا۔ اس کے بعد ہم لوگ بھاگ کر جنگل میں آگئے تھے۔ وہاں ایک دن میری ماں [illegible] وہ بیمار، بوڑھی، کمزور اور بے حد خوف زدہ تھی۔ سردی اور بھوک برداشت نہ کر سکی اور چپکے سے مر گئی لیکن اصل میں وہ مری نہیں تھی، فرار تھا۔ اس دنیا سے اور زندگی کی اذیتوں سے نجات حاصل کرنے کی ایک کوشش۔ بے شمار لوگ یہی کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ سارے دروازے بند ہیں اور صرف ایک دروازہ کھلا ہے۔ موت کا دروازہ تو وہ اس دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔

میرے پاس کفن نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی ماں کو انہی کپڑوں میں دفنا دیا جو وہ پہنے ہوئے تھی۔

پھر مغربی ممالک حرکت میں آئے۔ انہوں نے ملک کے طول و عرض میں بمباری شروع کی۔ ان کی نیت کیا تھی، مقصد کیا تھا۔ میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گی کیونکہ میں تو



تمہیں اپنی کہانی سنا رہی ہوں۔ لہٰذا اس ذکر کو اپنی ذات تک محدود رکھوں گی۔" وہ رکی، چند لمحے ٹھہر کر اپنے خیالات کو مجتمع کیا پھر بولی "تو جب بمباری شروع ہوئی تو سرب فوجیوں نے بھی اپنی کارروائی تیز کر دی۔ اب انہوں نے جنگلوں اور پہاڑیوں پر، جہاں تک ان کی دسترس تھی، فائرنگ اور بمباری شروع کی۔ اس میں چالاکی یہ تھی کہ ان کی بمباری سے لوگ مریں گے تو وہ بڑی آسانی سے الزام مغربی ممالک پر دھر دیں گے کہ نیٹو کی بمباری سے لوگ ہلاک ہوئے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم لوگ جس جنگل میں تھے، وہ آبادی سے زیادہ دور نہیں اور ان کی گنوں کی زد میں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں وہ پناہ گاہ چھوڑنا پڑی۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم لوگ بھی البانیہ کا رخ کریں۔ چنانچہ ہم چل پڑے۔ افتاں وخیزاں، بے سروسامان، جنگلوں میں چھپتے چھپاتے، تمہیں شاید یقین نہیں آئے گا کہ جب میں کیمپ میں پہنچی ہوں تو میں نے ایک سو پچاس میل سے زیادہ پیدل سفر کیا تھا۔ میں شدید طور پر ناتواں اور بیمار ہو چکی تھی۔ تیز بخار میں مبتلا تھی اور تین دن کی بھوکی تھی۔"

"تم نے اتنی اذیت اٹھائی ہے" آفاق نے معاً کہا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"ہاں" ارما نے اس کے ہاتھ پر ہولے سے تھپکی دی۔

"ان کیمپوں کی تصویریں میں نے ٹی وی پر دیکھی تھیں۔" آفاق نے سہلایا "زندگی تو وہاں بھی آسان نہیں تھی۔"

"ہاں، وہاں بھی ان گنت مشکلات تھیں" ارما نے اتفاق کیا "لیکن کم از کم وہاں کھانا تھا۔ سر چھپانے کے لیے ٹینٹ اور سردی سے بچنے کے لیے کمبل تھے اور بیماروں کے لیے دوائیاں بھی تھیں۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہاں سرب نہیں تھے۔"

"تو کیمپ میں تمہارا علاج ہوا تھا؟"

"ہاں۔ وہاں انہوں نے میرا علاج کیا۔ مجھے کھانا دیا اور پھر وہیں بعد ازاں میری ملاقات امیر سے ہوئی۔"

"تو امیر تمہیں کیمپ میں ملا تھا؟"

"ہاں، وہ میرے ایک رشتے کے چچا کا بیٹا ہے۔"

"ہاں، تم نے ایک بار ذکر کیا تھا کہ وہ تمہارا چچا زاد بھائی ہے۔"

"وہ بہت دکھی آدمی ہے۔" ارما کہنے لگی "تم نے دیکھا ہو گا کہ وہ بہت خاموش رہتا ہے اور ہر چند کہ عمر میں مجھ سے بڑا ہے لیکن مجھے بڑی بہن یا ماں کی طرح اس کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ کیمپ میں وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کی بیوی اور بچی بمباری کے دوران میں مر گئی تھیں۔ باپ کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ جب حالات بہت زیادہ مخدوش ہو گئے تو اسے شہر چھوڑنا پڑا۔ کسی نے اسے بتایا تھا کہ اس کی ماں جو گاؤں میں تھی، ایک قافلے کے ساتھ البانیہ چلی گئی ہے اور کسی کیمپ میں پناہ گزین ہے۔ وہ اپنی ماں کی تلاش میں وہاں پہنچا تھا۔ مگر ماں وہاں نہیں تھی۔ امیر نے جی جان سے اپنی ماں کو تلاش کیا۔ کئی کیمپوں میں مارا مارا پھرا۔ ریڈ کراس اور یو این او والوں کو ماں کی تصویر اور دیگر کوائف مہیا کیے۔ لیکن ماں کا کوئی پتا نہیں چلا۔ ابھی بھی وہ قطعی لاعلم ہے کہ اس کی ماں کہاں ہے؟"

"یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔"

"ہاں ہے۔ مائیں بڑی انمول ہوتی ہیں۔ تم دنیا کی ہر شے کی قیمت لگا سکتے ہو مگر ماں کی قدر مقرر کرنا ناممکن ہے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو" آفاق نے اپنی اماں کو تصور میں دیکھا جو اب اس دنیا میں نہیں تھیں۔

چند لمحے سکوت رہا۔ پھر آفاق نے پوچھا "تو پھر تم یہاں کیسے پہنچیں؟"

"بتاتی ہوں" ارما نے مزید دو سگریٹ سلگائے۔ ایک آفاق کو دیا پھر بولی "یہاں آنے کا فیصلہ یا ارادہ میرا نہیں تھا۔ بلکہ ہوا یہ کہ وہاں کیمپ میں امیر کے دو دوست تھے۔ انہوں نے کیمپ سے بھاگنے اور مغربی یورپ کے کسی ملک میں جانے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے امیر سے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ اس وقت جنگ ختم ہو چکی تھی۔ سرب پولیس، انتظامیہ اور فوج کوسووو چھوڑ کر جا چکی تھی اور کیمپوں سے بے شمار لوگ واپس کوسووو کا رخ کر رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ ابھی کوسووو محفوظ نہیں تھا۔ وہاں خوراک کی کمی تھی۔ گھر کوئی سلامت نہیں تھا کہ ہر شہر، ہر گاؤں کھنڈر بن چکا تھا۔ پورے ملک میں بارودی سرنگیں بچھی تھیں۔ کیمپوں کے منتظمین کا کہنا تھا کہ لوگوں کو اس وقت تک کیمپ میں ٹھہرنا چاہیے جب تک بارودی سرنگیں صاف نہ ہو جائیں۔ لیکن لوگ پھر بھی واپس جا رہے تھے کہ لوگوں کو اپنا گھر زیادہ اچھا لگتا ہے۔ ہم دونوں بھی واپس جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ تبھی امیر کے دوستوں نے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ شاید امیر انکار کر دیتا تاہم ہوا یہ کہ انہی دنوں اسے اڑتی ہوئی خبر ملی کہ اس کی ماں مغربی یورپ کے کسی ملک میں ہے۔ تمہیں شاید علم ہو گا کہ کیمپوں سے ہزاروں بوڑھوں، لاوارث بچوں اور بیماروں کو جہازوں میں بھر بھر کر یورپ کے ملکوں میں لایا گیا تھا۔ چند ہزار امریکا اور کینیڈا بھی لے جائے گئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ جب حالات سازگار ہوں گے تو ان

پناہ گزینوں کو واپس کوسووو پہنچادیا جائے گا۔ امیر کو بتایا گیا کہ اس کی ماں بھی شاید اٹلی یا فرانس میں ہے۔ چنانچہ وہ فوراً اٹلی جانے کے لیے تیار ہوگیا۔"

"تو کیا صرف یہی ایک سبب تھا یہاں آنے کا" آفاق نے سوال کیا۔

"نہیں' ایک اور وجہ بھی تھی۔ میں نے جیسا کہ ذکر کیا کہ کوسووو میں غربت بہت تھی۔ اور یہ تقریباً طے تھا کہ واپس جانے کی صورت میں برسوں ہمیں مشکلات' محرومی اور افلاس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ امیر اور اس کے دوستوں کا خیال یہ تھا کہ اگر موقع مل گیا تو یورپ کے کسی ملک میں مستقل طور پر آباد ہوجائیں گے۔ اس خواہش کے پس پردہ جیسا کہ تم قیاس کرسکتے ہو' اپنی برسوں کی محرومی اور غربت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' میرا خیال ہے میں یہاں آنے کے خیال سے کچھ زیادہ متفق اور مطمئن نہیں تھی لیکن اول یہ کہ میرا اب کوئی نہیں تھا' دوم میں امیر کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ شاید میری اس خواہش کے پیچھے یہ احساس کارفرما ہو کہ میں امیر کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہوں اور غالباً اسی بنا پر بادل نخواستہ میں بھی ان کے ساتھ نکل پڑی۔ پہلے ہم اٹلی پہنچے۔ کچھ دن اِدھر اُدھر بھٹکتے اور چھپنے چھپانے کے بعد فرانس کا رخ کیا۔ وہاں سے امیر کے دونوں دوست جرمنی چلے گئے۔ لیکن انہوں نے انگلینڈ آنے کا فیصلہ کیا۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گی کیونکہ تم خود بھی ان مراحل سے گزر چکے ہو۔ بس یوں سمجھو کہ ہمیں ایک آدمی مل گیا تھا۔ اس نے اطمینان دلایا کہ وہ چوری چھپے ہمیں انگلینڈ پہنچادے گا۔" وہ سانس لینے کے لیے رکی۔

"لاری سے آئی تھیں؟" آفاق نے پوچھا۔

"نہیں' موٹر بوٹ سے" ارما نے پست آواز میں کہا۔ "ہماری بوٹ ڈوور سے کافی دور ایک ویران ساحلی علاقے میں رکی تھی۔ وہاں دو آدمی پہلے سے موجود تھے۔ ایک چھوٹا ٹرک بھی تھا۔ بوٹ کے مالک نے ہم سے تین تین ہزار پونڈ طلب کیے جو ہمارے پاس نہیں تھے۔ ہم نے بوٹ کے مالک سے کہا کہ تمہیں تو پہلے ہی علم تھا کہ ہمارے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔ ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ انگلینڈ پہنچ کر جونہی آمدنی کی صورت نکلے گی' ہم تمہاری رقم رفتہ رفتہ ادا کردیں گے۔ اور اب بھی ہمارا یہ وعدہ ہے کہ ہم تمہیں دھوکا نہیں دیں گے۔ تم ہماری مدد کرو۔ ہم کچھ عرصہ میں تمہاری رقم یقیناً ادا کردیں گے لیکن بوٹ کے مالک نے ہماری بات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اس نے ہمیں ان دو آدمیوں کے حوالے کردیا جو ٹرک لے کر آئے تھے۔ اب ایک طویل اور تکلیف دہ سفر شروع ہوا جو بے یقینی اور تذبذب سے عبارت تھا۔ کب تک سفر کرنا ہوگا۔ وہ لوگ ہمیں کہاں لے جارہے ہیں۔ کیوں لے جارہے ہیں۔ ایک خوف مسلسل مجھے گھیرے ہوئے تھا۔ اس وقت پہلی بار پچھتاوے کا احساس میرے دل ودماغ میں ابھرنا شروع ہوا۔ شاید ہم نے غلطی کی ہے۔ شاید ہمیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ بہتر یہی ہوتا کہ ہم اپنے گاؤں واپس چلے جاتے۔ لیکن یہ سوچ اور پچھتاوا بعد از وقت تھا کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ ہم انگلینڈ میں موجود تھے اور ایک بند لاری میں بیٹھے کسی نامعلوم مقام کی طرف جارہے تھے۔"

وہ رکی' چند لمحے غور کیا' پھر کہا "وہ دونوں آدمی برے نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیں بھوکا نہیں رکھا۔ بلکہ کھانا اور چائے دی اور سگریٹ بھی مہیا کیے۔ لیکن ٹرک سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ مجھے بالکل علم نہیں ہے کہ ہم ملک کے کس علاقے میں تھے۔ کن راستوں سے گزرے اور کس علاقے میں سفر کا اختتام ہوا۔ فقط اتنا علم ہے کہ جب ٹرک روانہ ہوا تھا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ جب سفر ختم ہوا تو سہ پہر کے پانچ بجے کا عمل تھا۔ گویا ہمیں تیرہ گھنٹے سفر کرنا پڑا تھا۔ جس مکان میں ہمیں لے جایا گیا۔ وہ ایک خوبصورت سمر کاٹیج تھا۔ چاروں طرف سبزہ بہت تھا۔ درختوں کے جھنڈ' جھاڑیاں اور فارم۔ لیکن مکانات نظر نہیں آتے تھے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کاٹیج کہیں مضافات میں تھا۔ وہاں ہم نے مسٹر واٹسن اور ڈیوڈ کو پہلی بار دیکھا۔ ایک عمر رسیدہ عورت بھی تھی۔ ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھایا گیا۔ عمر رسیدہ عورت نے ہمیں چائے اور سینڈوچ دیے۔ وہ دونوں آدمی مسٹر واٹسن اور ڈیوڈ کے ساتھ ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔ وہاں انہوں نے کیا گفتگو کی اور کیا لین دین ہوا' اس سے ہم قطعی بے خبر ہیں۔ البتہ اتنا واضح ہوگیا تھا کہ مسٹر واٹسن نے کچھ رقم ہم دونوں کے عوض ان دونوں ٹرک ڈرائیوروں کو دی تھی۔"

"گویا انہوں نے تمہیں اور امیر کو مسٹر واٹسن کے ہاتھ بیچ ڈالا؟"

"ہاں' میرا خیال ہے اس بات کو اسی طرح کہیں گے۔"

"جیسے مجھے بیچا تھا ان لوگوں نے جو مجھے لائے تھے" آفاق نے سر ہلایا "مجھے بھی یہ علم نہیں کہ میرے لیے مسٹر واٹسن نے کتنی قیمت ادا کی تھی تاہم میرا اندازہ ہے کہ ڈیڑھ دو ہزار پونڈ سے زیادہ قیمت نہیں لگی ہوگی۔"

"ہوسکتا ہے کہ ہم دونوں کی قیمت بھی اسی تناسب سے

لے ہوئی ہو" ارما نے مسکرا کر کہا۔

"مگر بھئی، یہ کچھ اچھی بات تو نہیں" آفاق نے بچن کی چھوٹی سی کھڑکی سے باہر دور تک پھیلے اندھیرے کو دیکھا "ہم جیتے جاگتے انسان ہیں۔ جوان اور صحت مند ہیں۔ اور قیمت صرف ڈیڑھ یا دو ہزار پونڈ۔ یہ تو صریحاً توہین ہے۔ کم از کم ایک ڈیڑھ لاکھ پونڈ تو لگنی ہی چاہیے تھی۔ کیوں، تمہارا کیا خیال ہے؟"

ارما خوش دلی سے اونچی آواز میں ہنسی "بہت بدمعاش ہو تم۔ اس میں بھی مزاح کا پہلو تلاش کر رہے ہو۔"

"بھئی تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تھوڑا بہت ہنس لینا، خواہ وہ کسی بھی بہانے سے ہو، برا تو نہیں" آفاق نے فلسفیانہ انداز میں سر کو ایک بار پھر جنبش دی "ویسے ارما، یہاں آنے کا کم از کم ایک فائدہ تو ہوا۔"

"کیا؟"

"ہمیں اپنی قیمت معلوم ہو گئی۔ ورنہ میں تو خوا مخواہ خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ بہت بیش قیمت ہوں۔"

ارما پھر ہنسی۔

چند لمحے بعد آفاق نے کہا "ارما، تم انگریزی بہت اچھی بول لیتی ہو، کہاں سے سیکھی تھی؟"

"اسکول میں، اختیاری مضمون کے طور پر۔ خیال تھا کہ شاید مستقبل میں کام آئے" ارما بتانے لگی "اس کے علاوہ میں نے چند سال ایک چھوٹے سے اسپتال میں بھی کام کیا تھا۔ جسے یورپین مشنری والے چلاتے تھے۔ وہاں انگریزوں اور امریکنوں سے مستقل طور پر رابطہ رہتا تھا۔ اس سے بھی بڑی مدد ملی تھی۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ارما اپنے خیالوں میں گم تھی۔ آفاق کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ رات دبے قدموں گزر رہی تھی اور سارے میں اتنا سکوت تھا، مانو کہیں کچھ نہیں ہے۔ پوری کائنات بالکل خالی ہے۔ اور اس بے کنار کائنات میں صرف وہ دونوں زندہ ہیں۔ دو انسان، دو روحیں، ایک دوسرے کے ہم دم، دمساز اور رفیق۔ ایک انتہائے دوسری انتہا تک پھیلی ہوئی بے ثباتی میں صرف ان کا وجود اثبات ہے اور زندگی کے وجود کا پتا دے رہا ہے۔ آفاق نے معاً ارد گرد دیکھا۔ کچن کی نیم تاریک دیواروں کو، شکستہ سازو سامان کو اور کھڑکی سے باہر حدِ نگاہ تک پھیلے اندھیرے کو اور اسے عجیب سا لگا۔ ناقابلِ یقین، ایک غیر حقیقی خواب کی طرح۔ کیسی انوکھی بات ہے۔ وہ بہت دور مشرق سے آیا ہے۔ ارما کو سودو سے آئی ہے۔ اور وہ دونوں اس عمارت میں اس وقت موجود ہیں۔ جو انگلستان میں کسی جگہ واقع ہے۔ لیکن کہاں ہے، یہ انہیں نہیں معلوم۔ کیا واقعی یہ سچ ہے؟ کیا واقعی وہ وہاں موجود ہیں؟

یکایک آفاق نے ارما کا خوبصورت ہاتھ ہولے سے دبایا۔ ارما اپنے خیالوں سے چونکی اور اس کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔

"کیا بات ہے؟"

"تمہیں یہاں آئے ہوئے دو ماہ ہو گئے ہیں؟"

"تقریباً سات ہفتے۔"

"ارما!" آفاق نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ آہستہ سے دبایا "تم اب کیا سوچتی ہو۔ آئندہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے، میں تمہارا مطلب سمجھ رہی ہوں" ارما نے نرم اور دوستانہ لہجے میں جواب دیا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں قنوطیت پسند اور زود رنج نہیں ہوں۔ بے شک میں نے ماں باپ کھو دیے ہیں اور اب صرف چند رشتے دار ہیں جن کے بارے میں مجھے علم بھی نہیں کہ کہاں ہیں۔ اور بہت تنہا ہوں اور میں نے بہت عذاب برداشت بھی کیے ہیں اور دیکھے بھی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے، میں ٹوٹ کر بکھروں گی نہیں۔ زندگی کو بہت خوبصورت نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ رہنا ایک اچھی بات ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے اپنے آپ کو سمیٹ لوں گی اور ایک بار پھر زندگی سے رشتہ جوڑ لوں گی۔ کیونکہ میں نے خزاں میں بھی کو اپنا حسن لٹاتے اور بہار میں پھر سنگھار کرتے دیکھا ہے۔"

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے" آفاق نے کہا "زندگی کبھی بھی اتنی فضول اور بے قیمت نہیں ہوتی کہ اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔"

ارما نے سر کو جنبش دی "مسٹر آفاق نے بے شک مجھے خریدا ہے لیکن یقیناً اس لیے نہیں کہ وہ ہمیں ہمیشہ یہاں رکھیں گے۔ ایک دن وہ ضرور ہمیں جانے دیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے اور تب میرا خیال ہے کہ میں یہاں رہوں گی نہیں۔ اگرچہ میرے ذہن میں واضح نہیں ہے کہ کیا کروں گی۔ بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ یہاں ہماری آمد غیر قانونی ہے لیکن مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ شاید میں واپس جانا پسند کروں گی۔ مگر ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔ کم از کم بھر کے لیے رکی، پھر پوچھا "اور تم کیا کرو گے؟"

"مجھے نہیں معلوم" آفاق نے زور سے سانس لی "میں اپنا ملک چھوڑا تھا تو میرے احساسات کچھ اور تھے۔ اب کچھ اور ہیں۔ میں تمہاری اس بات سے متفق ہوں کہ مسلمان ہمیشہ ہمیں غلام بنا کر نہیں رکھیں گے۔ چنانچہ جب یہاں



چھٹکارا ملے گا تب آئندہ کے بارے میں غور کروں گا۔ ویسے ایک بات ہے، یہاں آ کر دل پر جو بوجھ پڑا تھا، وہ اب اتنا شدید نہیں ہے۔ شاید یہاں آنا ایک طرح سے ایک اچھے پہلو کا حامل بھی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی یہاں نہ آتا تو تم سے ملاقات کیسے ہوتی؟"

ارما ہنسنے لگی اور چند لمحے ہنستی رہی پھر آفاق کا ہاتھ دبا کر بولی "تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں؟"

"کہو۔"

"میں تھوڑی سی تمہاری ہم وطن بھی ہوں۔"

"میری ہم وطن؟ میں سمجھا نہیں!"

"میری رگوں میں کوئی دس پندرہ فیصد مشرقی خون بھی ہے۔"

"اب یہ تم صریحاً مذاق کر رہی ہو" آفاق ہنس کر بولا۔

"نہیں، میں سچ کہہ رہی ہوں" ارما کچھ اور اس کے قریب سرک آئی "یہ کئی سو سال پہلے کی بات ہے۔ تمہارے ملک پر کسی اضلاع میں غالباً قحط پڑا تھا اور خوراک کی شدید کمی ہو گئی تھی۔ الجزائر نامی میں وہاں بنجاروں کی آبادی خاصی تھی۔ جب خوراک کا مسئلہ زیادہ گمبھیر ہوا اور غالباً وہاں کے حاکموں نے بھی بنجاروں کو ستانا شروع کر دیا تو بڑی تعداد میں بنجاروں نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ لوگ ایران اور روسی ترکستان ہوتے ہوئے رومانیہ اور البانیہ آئے۔ کچھ آس پاس کے دوسرے ملکوں میں بکھر گئے۔ اور کچھ غالباً ایران اور ترکی ہی میں رک گئے تھے۔ جو چند ایک خاندان البانیہ آئے، انہی میں سے ایک خاندان سے میری پردادی کا تعلق تھا۔"

"تمہاری پردادی! واقعی؟" آفاق حیرت سے بولا۔

"ہاں، میرے والد بتایا کرتے تھے کہ ان کا نام مرجانہ تھا۔ انہوں نے میرے پردادا سے شادی کر لی تھی اور نہ صرف اپنا خاندان ہی چھوڑ دیا تھا بلکہ اپنا طرزِ زندگی بھی مکمل طور پر بدل ڈالا تھا۔ اس وقت میرا خاندان البانیہ ہی سکونت پذیر تھا۔ لیکن جب میرے دادا بڑے ہوئے تو انہوں نے البانیہ چھوڑ دیا اور کوسووو میں سکونت اختیار کر لی۔ یوں میرا تھوڑا بہت نسلی تعلق تمہارے ملک سے بھی ہے۔"

آفاق کچھ دیر حیرت اور مسرت سے ارما کو دیکھتا رہا پھر اچنبھے سے بولا "کیا واقعی، یہ سچ ہے؟"

"ہاں، یہ حقیقت ہے۔ مشرقی یورپ کے اکثر بنجاروں کا تعلق تمہارے ہی ملک سے ہے۔ خاص طور پر رومانیہ میں ان کی کافی بڑی تعداد ہے۔ اگر تم وہاں جاؤ اور ان بنجاروں کو دیکھو تو حیرت کرو گے۔ ان کے لباس، زیورات، طور طریق میں اب بھی مشرقیت کی واضح جھلک موجود ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ تمہارے ملک کی زبان کے گیت بھی سنتے ہیں۔ البتہ مجھے یہ علم نہیں کہ وہ لوگ ان گیتوں کے کیسٹ کہاں سے حاصل کرتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے، اردو گیت اور گانے؟" آفاق نے بے یقینی سے پوچھا۔

"اب جو بھی تمہاری زبان کا نام ہو، مجھے علم نہیں۔"

"بھئی ارما، اس وقت تو تم نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ کیا واقعی یہ سب سچ ہے؟"

"ہاں۔"

آفاق نے مسکراتی نظروں سے ارما کے چہرے کو دیکھا جو مسرت کے انوکھے، اندرونی احساس سے منور ہو گیا تھا۔ پھر اس نے ذرا شوخ لہجے میں کہا "تو یہ بات ہے۔ میں اکثر حیران ہوتا تھا کہ تمہارے چہرے پر یہ مشرقیت کی جھلک کیوں ہے۔ رنگ و روپ، ناک نقشہ اور مزاج۔ اب بات واضح ہوئی۔"

"ان تفصیلات کا کچھ حصہ تو تاریخ کی کتابوں سے میرے علم میں آیا تھا اور کچھ خاندان کے روزنامچوں میں محفوظ تھا۔ مگر۔"

آفاق نے سوالیہ نظروں سے ارما کو دیکھا۔

ارما نے پژمردہ لہجے میں کہا "مگر سب ضائع ہو گیا۔ وہ تمام روزنامچے، مخطوطے، کتابیں اور دوسری قیمتی یادگاریں جو برسوں سے ہمارے خاندان میں محفوظ چلی آ رہی تھیں۔ اس تباہی، جلاوطنی اور جنگ میں برباد ہو گئیں۔ اب کچھ بھی باقی نہیں بچا ہے۔" ارما یکایک چپ ہو گئی اور چند لمحے زخمی نظروں سے خلا میں گھورتی رہی۔ پھر چونکی۔ زور سے سانس لی اور گھوم کر آفاق کی طرف دیکھا۔ ہولے سے مسکرا کر بولی "خیر احمد چھوڑو، ان باتوں کو۔ یہ نفع و نقصان کو چلتا ہی رہتا ہے۔ وقت کے رمز کو کون آج تک سمجھا ہے کہ ہم سمجھ سکیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ کبھی کبھی ان باتوں کو کچھ دیر کے لیے بھول بھی جایا کریں، تم مجھے ایک بات بتاؤ۔"

"پوچھو۔"

لیکن ارما نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔ چند لمحے بہت غور سے، بہت اپنائیت سے آفاق کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں یکایک ستارے جگمگا اٹھے تھے۔ چہرہ کسی اندرونی جذبے سے فروزاں ہو رہا تھا اور وہ آفاق کے اتنی نزدیک تھی کہ اس کی گرم، معطر سانسیں آفاق اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحے گہرے سحر انگیز سکوت میں گزرے۔ پھر ارما نے آہستہ سے کہا "اس وقت، ہم جب

کھڑکی میں کھڑے تھے' تم نے مجھے بہت دھیان سے دیکھا تھا۔ کیا دیکھ رہے تھے تم اس وقت؟"

"کچھ نہیں" آفاق شرما کر مسکرایا۔

"لیکن مجھے معلوم ہے۔ تم کیا دیکھ رہے تھے اور کیوں دیکھ رہے تھے؟" ارما نے کہا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ پھر اس نے معاً آفاق کی پیشانی چوم لی اور اپنا ایک ہاتھ اس کی گردن کے گرد حمائل کردیا۔

آفاق نے اس کی آنکھوں میں جھانکا "میری زندگی میں کبھی کوئی نہیں آیا ہے ارما!"

"زندگی کے راستے پر میں بھی اب تک اکیلی ہی چلی ہوں احمد!" ارما نے کہا اور آفاق کے رخسار کو ہولے سے چوما۔

"میں بہت اکیلا ہوں" آفاق کی آواز کانپ رہی تھی۔

"نہیں' تم اکیلے نہیں ہو" ارما نے کہا "میں ہوں نا' میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔"

وہ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے میں گم کھڑے رہے۔

○☆○

رات ختم ہوئی تو بہت خوبصورت دن طلوع ہوا۔ آسمان پر یہاں وہاں بادل کے چند ٹکڑے تھے۔ موسم خاصا گرم تھا اور دھوپ' سنہری' تیکھی کاتی دھوپ حدِ نظر تک پھیلی ہوئی تھی۔ آفاق نے کھڑکی سے دور تک برستی دھوپ اور دھوپ میں جگ مگ کرتے سبز کھیتوں کو دیکھا اور خوشی سے مسکرایا۔ گو وہ بہت کم سویا تھا پھر بھی پوری طرح چاق و چوبند تھا۔ جسم و جان میں ایک فرحت اور تازگی اور توانائی کا احساس موجود تھا۔ جب وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلا تو ارما سے سامنا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ارما بھی بہت خوش ہے۔ اس کا چہرہ معمول کے برخلاف روشن اور تر و تازہ نظر آرہا ہے۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ رقصاں ہے۔

"تیار ہو گئیں؟" اس نے سرسری طور پر پوچھا۔

"ہاں۔"

"امیر کی طبیعت کیسی ہے؟"

"اب بہت بہتر ہے۔ بخار اتر گیا ہے" ارما نے بتایا۔

"کام پر چلے گا؟"

"ہاں' تیار ہو رہا ہے۔"

انہوں نے مقررہ وقت پر ناشتا کیا۔ پھر مسز ولیم نے انہیں لنچ پیک دیے۔ جو سینڈوچز پر مشتمل تھے۔ ساتھ میں چائے کے تھرماس۔ پھر ڈیوڈ اور ایلن کی نگرانی میں وہ باہر آئے۔ لیکن رچی نظر نہیں آیا حالانکہ ڈیوڈ اور رچی کی مستقل ڈیوٹی فارم ہاؤس پر رہتی تھی۔ جبکہ ایلن اور جیمی کبھی کبھار نظر آتے تھے۔ ڈیوڈ نے ایک بھاری ایپرا ک پہن رکھا تھا۔ اور انہیں معلوم تھا کہ ایپرا ک کے اندر ہولسٹر ہوگا جس میں پستول بھی موجود ہوگا۔ وہ وین کے قریب کھڑا انہیں سرد اور برگشتہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حسب عادت اور حسب معمول کرختگی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے وین میں سوار ہوئے۔ امیر' مارکو' رویندر سنگھ' ماریا۔ اس کے بعد ارما تھی اور پھر آفاق۔ جب ارما آگے بڑھی تو ڈیوڈ نے اسے بھوکی نظروں سے گھورا۔ اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ہیلو ہنی!"

"ہیلو۔"

"یو لک بیوٹی فل دس مارننگ!"

"تھینک یو" ارما نے خشک لہجے میں کہا اور عجلت سے آگے بڑھی۔

ڈیوڈ بانچھیں پھیلا کر مسکرایا۔ اور بدستور ارما کو بازاری نظروں سے گھورتا رہا۔ آفاق پیچھے تھا۔ اس کی نظریں کبھی ڈیوڈ اور کبھی ارما کے چہروں کا طواف کر رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ڈیوڈ کے چہرے پر ایک وحشیانہ چمک ناچ رہی ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ ارما کا چہرہ جو تازہ پھلے کلی کی طرح شاداب اور منور نظر آرہا تھا' معاً بجھ گیا ہے اور اس پر خوف کی پرچھائیں پھیل گئی ہے۔ یہ نظارہ بہت کریہہ اور دل شکن تھا۔ آفاق کے رگ و پے میں گرم چنگاریاں دوڑتی چلی گئیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ جھپٹ پڑے۔ اور ڈیوڈ کو گردن سے پکڑ لے۔ اور اس کی ان آنکھوں کو پھوڑ ڈالے جن سے اس نے ارما کو گھورا ہے اور شاید ہوش میں' ایک لمحاتی غضب کے رو میں جھپٹ بھی پڑتا لیکن دماغ نے دل کی لگام تھام لی۔ نہیں تم ایسا کچھ نہیں کرو گے' تم جانتے ہو اس کے پاس پستول ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس ملک میں تم اسمگل ہو کر آئے ہو۔ یہاں تمہارا کوئی دوست نہیں۔ نہ قانون نہ عدالتیں۔ اگر تم نے جوش میں اندھے ہو کر کوئی غلط قدم اٹھایا تو ضرر صرف تمہاری ذات کو پہنچے گا۔ ڈیوڈ کا بال بھی بانکا نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب ارما وین میں سوار ہو گئی تو وہ آگے بڑھا' بھاری قدموں سے اور ڈیوڈ کو کینہ توز نظروں سے گھورتا ہوا وین میں سوار ہو گیا۔

ان کی ڈیوٹیاں مختلف دنوں میں مختلف کاموں پر لگائی جاتی تھیں۔ رہائشی عمارت کے عقب میں ایک بڑا شیڈ تھا جسے عام طور پر اسٹور کہا جاتا تھا۔ کبھی ان سب کو وہاں پیکنگ کے کام پر لگا دیا جاتا۔ کبھی کھیتوں کی صفائی' گوڑائی کروائی جاتی۔ اور کبھی کھیتوں سے مختلف قسم کی سبزیاں نکالنے کا کام لیا جاتا۔ انہیں حاصل شدہ اطلاعات کے مطابق مسٹر واٹسن ایک بڑے بزنس مین بھی تھے اور فارمر بھی۔ چند ایک فیکٹریاں بھی تھیں اور درآمد برآمد بھی کرتے تھے لیکن یہ اطلاعات مصدقہ نہیں تھیں۔ ہاں' یہ بات طے شدہ تھی کہ ملک کے کئی حصوں میں ان کے کئی بڑے بڑے فارم تھے۔ جہاں وہ مختلف اقسام کی سبزیاں اور فروٹ کی کاشت کرتے تھے۔

اس دن بھی ان کی ڈیوٹی کرم کلے اور گاجر کے فارم میں تھی۔ جو عمارت سے قدرے فاصلے پر واقع تھا۔ فارم کے ایک طرف پستہ قد درختوں کی ایک گھنی قطار تھی جو تیز ہوا کو روکتی تھی جبکہ دوسری طرف انواع و اقسام کی سبزیوں کے فارم تھے۔ اور جھاڑیوں کے قطاریں جو فارموں کی حد بندی کرتی تھیں جہاں تک نظر جاتی تھی' سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ درختوں کے جھنڈ' جھاڑیاں اور کھیت۔ اور سارے میں دھوپ بکھری ہوئی تھی۔ سنہری' روشن دھوپ' آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے آوارہ ٹکڑے اور ان کے پیش منظر میں یہاں وہاں اڑتے ہوئے پرندے۔ فطرت اتنی عظیم اور حسین ہو سکتی ہے' اس کا ادراک پہلے کبھی آفاق کو نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ فطرت کا بے پناہ حسن اور کشش ہی ہے جو آدمی کے اندر زندہ رہنے کی لامحدود خواہش پیدا کرتی ہے۔ جو زندگی کو دلکش بناتی ہے۔ اس دنیا میں بے شمار دکھ ہیں' محرومیاں اور مایوسیاں ہیں۔ آدمی یا تا بہت کم ہے' کھوتا بہت زیادہ ہے لیکن اگر ایک بار' ہاں صرف ایک بار وہ جی بھر کر فطرت کے اس بے کنار حسن کا نظارہ کر لیتا ہے تو حیاتِ رائیگاں کا احساس مٹ جاتا ہے۔ اور وہ محسوس کرتا ہے کہ ایک لمحے کے لیے ہی سہی' وہ جی بھر کر جی لیا ہے۔

آفاق کچھ دیر بشاش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ قرب و جوار کے چند فارموں میں کچھ اور افراد بھی کام میں مصروف تھے۔ عورتیں' مرد۔ تاہم اسے یہ علم نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا کہ ان میں سے کتنے اس کی طرح غیر قانونی تھے اور کتنے ایسے تھے جو غیر قانونی تو نہیں تھے لیکن کام غیر قانونی طور پر کر رہے تھے۔ آفاق کی نظریں ان لوگوں کو دیکھتی اور گردوپیش میں بھٹکتی ہوئی آخر کار پہلے ایلن اور پھر ڈیوڈ پر رکیں۔ ڈیوڈ فارم کے مغربی کونے پر' ایک قدرے اونچی جگہ پر کھڑا تھا۔ اس طرح وہ چاروں طرف نظر رکھ سکتا تھا۔ کون آرہا ہے' کون جا رہا ہے' یہ احتیاط بہت ضروری تھی۔ گو اس وقت تک آفاق کو ایسے کسی تجربے سے دوچار نہیں ہونا پڑا تھا۔ لیکن اسے بتایا گیا تھا کہ کبھی کبھی سوشل سیکیورٹی یا امیگریشن والے اچانک آجاتے ہیں اور پوچھ گچھ شروع کر دیتے ہیں۔ جو لوگ فارموں میں کام کر رہے ہیں۔ وہ کون ہیں؟ ان کے کیا نام ہیں؟ کہاں رہتے ہیں۔ ان کے پاس ضروری کاغذات اور ایمپلائمنٹ انشورنس نمبر ہے یا نہیں۔ اگر ایسے دو چار افراد ہاتھ آجاتے جن کا وہاں موجود ہونا یا کام کرنا غیر قانونی ہوتا تو پکڑے جاتے۔

آفاق چند لمحے ڈیوڈ کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے باسکٹ اٹھائی اور کھیت میں قدم رکھا۔ "آؤ ارما' آج تم میرے ساتھ ہی رہو۔"

ارما نے اسے دیکھا اور مسکرائی "اچھا!"

○☆○

آفاق نے ارما سے کہا تھا کہ ملک چھوڑتے وقت اس کے احساسات کچھ اور تھے' اب کچھ اور ہیں اور یہ سچ بھی تھا۔ اس عرصے میں یعنی جب وہ ملک سے چلا تھا اور انگلینڈ پہنچا تھا' اس کا ذہن کئی مختلف مراحل سے گزرا تھا۔ کبھی اس نے خود کو بہت خوش اور پُرجوش محسوس کیا تھا۔ کبھی احساسات پر مایوسی اور کسی حد تک خوف کا غلبہ ہوا تھا اور کبھی یوں لگا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے' نری حماقت ہے۔ اور اب وہ واقعی محسوس کرتا تھا کہ اس کا اس طرح غیر قانونی طور پر برطانیہ میں داخل ہونا اور "فروخت" ہونا انتہائی پاگل پن کی بات ہے۔ وہ ایک پڑھا لکھا آدمی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی آزادی اور حق خود ارادی کا حامی ہے۔ اس کی جیب میں کاغذ کا وہ ٹکڑا بھی موجود ہے' جسے بی اے کی ڈگری کہتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ زمانہ لد چکا' جب انسانوں کی خرید و فروخت کی رسم قبیح اس دنیا میں موجود تھی۔ آج کا آدمی آزاد بھی ہے اور اپنے فطری حقوق سے باخبر بھی۔ اس کے باوجود کیا یہ انتہائی مضحکہ خیز بات نہیں ہے کہ وہ خود فروخت ہوا ہے۔ باقاعدہ اور باضابطہ طور پر نہ سہی' چوری چھپے اور غیر قانونی طور پر ہی سہی۔ مسٹر واٹسن نے ایک رقم اس کے لیے ادا کی ہے۔ گویا انہوں نے اسے خریدا۔ عام بولٹ نے رقم وصول کی گویا اس نے بیچا۔ اور ان دونوں کے درمیان خرید و فروخت کی شے وہ خود تھا۔ اور یہ "کاروبار" برطانیہ میں ہوا جس نے دنیا میں سب سے پہلے غلاموں' دوسرے الفاظ میں انسانوں کی تجارت پر پابندی لگائی تھی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس حماقت کا ارتکاب اس سے ہوا کیوں کر!

اب وہ سوچتا ہے تو ہنسی آتی ہے لیکن حماقت تو حماقت

ہی ہوتی ہے اور ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک کام ابتدا میں درست نظر آتا ہے لیکن آگے چل کر پتا چلتا ہے کہ قطعی غلط تھا۔ ہماری ذہانت کبھی کبھی بے وقوفی کا مظاہرہ یوں بھی کرتی ہے۔ اور آفاق کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ جب اس نے اپنے دوست جبار کی تجویز پر کہ برطانیہ چلنا چاہیے' ہاں کہی تھی تو اپنی دانست میں اس نے ایک عاقلانہ فیصلہ کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ برطانیہ پہنچ جائے گا تو ایک بہتر زندگی گزارنے کے تمام مواقع میسر آجائیں گے اور اب تک جن محرومیوں میں مبتلا رہا ہے' ان کی تلافی ہو جائے گی۔ لیکن برطانیہ پہنچا تو منکشف ہوا' اس کا فیصلہ حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا اور اب وہ اس مضحکہ خیز صورت حال سے دوچار تھا کہ برطانیہ پہنچ گیا تھا پھر بھی نہیں پہنچا تھا۔

شومئی قسمت کہ ماں لڑکپن میں ہی جنت کو سدھار گئی تھی۔ والد صاحب قبلہ نے غالباً دنیا کو دکھانے کے لیے کچھ دن سوگ وغیرہ منایا۔ دنیا سے بے زاری کا اظہار کیا اور اکثر یہ بھی کہا کہ بیوی کے مرنے کے بعد زندگی بے کیف و بے رنگ اور بے معنی ہو گئی ہے لیکن کچھ دن گزرے' دھیرے دھیرے ان کی بیزاری کم ہوئی اور پھر بے معنی زندگی میں معنی پیدا کرنے کے لیے انہوں نے شادی رچالی۔ آفاق کی نئی ماں اس سے صرف نو سال بڑی تھی۔ خاصی پڑھی لکھی تھی۔ گھر گرہستی کا سلیقہ بھی تھا۔ اور بہ لحاظ صورت شکل تو حسین نہیں تو قدرے خوبصورت بھی یقیناً تھی اور قیاس اغلب ہے کہ آفاق کے باپ سے کافی محبت بھی کرتی تھی۔ بس ایک اڑچن تھی وہ یہ کہ آفاق اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ ایک روایتی سوتیلی ماں تھی۔ اور آفاق تھا ایک روایتی سوتیلے بیٹے کے روپ میں دیکھتی تھی۔ دونوں کے درمیان قطبین کا فاصلہ تھا۔ یہ فاصلہ بڑھ کر زمین اور مریخ کے فاصلے کے برابر اس وقت ہوا جب اس کی سوتیلی ماں نے ایک ننھی سی سوتیلی بہن کو جنم دیا۔

والد صاحب قبلہ اپنی نئی نویلی بیوی کی زلف شب تار کے اندھیروں میں کہیں گم ہو گئے تھے۔ انہیں اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے' دائیں بائیں آگے پیچھے' اوپر نیچے اپنی بیوی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اور آفاق تو بالکل ہی نظر نہیں آتا تھا کہ وہ تو مریخ کے فاصلے پر تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے اس طرح پالا جیسے کوئی بیگار ٹالتا ہے۔ آفاق بھی شاید خاصا بے شرم تھا کہ پھر بھی پل گیا۔ اس نے ٹیوشن کیے۔ جزوقتی ملازمتیں کیں اور کسی نہ کسی طرح کاغذ کا وہ ٹکڑا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جسے بی اے کی ڈگری کہتے ہیں۔ پھر اس نے جوتیاں چٹخانی شروع کیں۔ ہمارے ملک میں جوتیاں چٹخانا ایک باقاعدہ فن ہے اور بڑی لگن' صبر و استقلال' جاں سوزی اور مشقت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس فن کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کی جیب میں کاغذ کا وہ ٹکڑا ہو جسے سرٹیفکیٹ یا ڈگری کہتے ہیں۔ لیکن نہ تو رشوت دینے کے جیب میں نقد نارائن ہو اور نہ ہی کوئی سفارش۔ تب آپ سڑکوں پر جوتیاں چٹخانے اور اس فن یگانہ میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ ایک بات اور بھی یاد رکھیے' جب آپ جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہوں گے تب آپ کو کئی طرح کے انوکھے' عجوبہ روزگار تجربات حاصل ہوں گے۔ جو آئندہ زندگی میں آپ کے کسی کام نہیں آئیں گے مثلاً دو ایک تجربات جو آفاق کو حاصل ہوئے۔

وہ ایک صاحب کے دفتر میں پہنچا جن سے اس کے ماموں کی خاصی واقفیت تھی۔ اس نے اس واقفیت کے بھروسے پر اس دفتر میں قدم رکھنے کی جرأت کی تھی۔ انہوں نے آفاق کی درخواست پر نظر ڈالی' ڈگری ملاحظہ فرمائی۔ اس کی التجائیہ باتیں صبر و تحمل سے سنیں پھر ان کی مونچھوں کے نیچے ایک دودھاری مسکراہٹ نظر آئی۔

"اسامی تو خیر خالی ہے لیکن..."

"لیکن کیا؟" آفاق نے پوچھا۔

"بھئی' وہ جگہ تو میں اپنے بہنوئی کے بیٹے کو دے رہا ہوں۔"

اتفاق سے آفاق بہنوئی کے بیٹے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے حیرت سے کہا "مگر جناب' وہ تو صرف میٹرک پاس ہے۔ وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں۔"

"تو کیا ہوا' وہ میرا بھائی ہے" انہوں نے مسکرا کر کہا "کیا یہ کوالی فی کیشن کافی نہیں۔"

آفاق نے سر ہلایا "نہیں' ضرورت سے زیادہ ہے۔"

ایک اور کمپنی کے دفتر میں اس کا سامنا ایک مدقوق سے آدمی سے ہوا جو آفس منیجر تھا اور سر سے بالکل گنجا تھا۔ اس نے بھی حسب دستور بڑے انہماک سے آفاق کی ڈگری ملاحظہ فرمائی۔ اس کی التجائیہ باتیں خصوصی توجہ اور ہمدردی سے سنیں' پھر گنجے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"مسٹر آفاق! میں آپ کو دھوکا دینا پسند نہیں کروں گا۔ بلکہ جو کچھ کہوں گا' خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ سچ کہوں گا۔"

"فرمائیے۔"

"اگر میرے اختیار کی بات ہوتی تو یہ ملازمت فوراً آپ کو دے دیتا۔"

"تو کیا یہ آپ کے اختیار میں نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

آفس منیجر نے اپنے گنجے سر پر ایک بار پھر ہاتھ پھیرا "وجہ یہ ہے کہ جی ایم صاحب پہلے ہی کسی کو یہ جگہ دے چکے ہیں۔ کیونکہ وہ آپ سے زیادہ قابل تھا۔"

"کیا وہ ایم اے تھا؟" آفاق نے تجسس سے پوچھا۔

"نہیں' اس کے پاس ہرے اور سرخ کاغذ کے ٹکڑے تھے۔ جنہیں عرف عام میں نوٹ کہا جاتا ہے اور جو غالباً آپ کے پاس نہیں ہیں۔"

"نہیں ہیں۔" آفاق نے مسکین لہجے میں کہا۔

آفس منیجر نے اس سے بھی زیادہ مسکین آواز میں کہا۔ "آپ تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے اور سمجھ دار ہیں اور زمانے کو بخوبی سمجھتے ہیں۔"

"پہلے نہیں سمجھتا تھا۔ اب سمجھنے لگا ہوں' کچھ کچھ" آفاق نے جواب دیا اور ٹھنڈی سانس لی۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب آفاق جوتیاں چٹخانے میں مہارت حاصل کر رہا تھا۔ اور شہر کی تمام اہم شاہراہوں کی لمبائی چوڑائی سے تقریباً واقف ہو چکا تھا کہ ایک دن اس کے والد صاحب قبلہ نے اسے طلب کیا۔ حالات کی کشاکش' مستقبل کی بے یقینی' دنیا کی بے ثباتی اور ذمے داری اور فرض شناسی کے موضوع پر ایک پرمغز تقریر کی۔ جس کا حاصل کچھ بھی نہیں تھا پھر سہلا کر اسے تنظر آمیز نظروں سے گھورا۔

"کیا خیال ہے تمہارا' کیوں نہ تمہاری شادی کرادی جائے؟"

"ابھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"ابھی میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"تو کیا تم اپنے پیروں پر نہیں کھڑے ہو؟"

"کھڑا تو خیر اپنے پیروں پر ہوں" اس نے جواب دیا "مگر پیروں کے نیچے زمین نہیں دلدل ہے۔ میں ٹھوس زمین کی جستجو میں ہوں۔"

والد صاحب قبلہ چند لمحے اسے بہت غور سے دیکھتے رہے جیسے اس کے الفاظ کو تول رہے ہوں پھر سہلا کر بولے "ٹھیک ہے۔ لیکن ایسا کرو کہ ٹھوس زمین ذرا جلدی تلاش کرلو۔ اپنے پیروں پر جو آدمی کھڑا ہو' وہ واقعی باعزت نظر آتا ہے۔"

والد صاحب قبلہ نے زبان سے نہیں کہا تھا لیکن ان کی گفتگو میں جو اشارہ پوشیدہ تھا وہ آفاق کی نظروں سے' بہرحال اوجھل نہ رہ سکا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا اب ان کے گھر میں رہنا اور مفت کی توڑنا انہیں زیادہ بہتر الفاظ میں ان کی بیوی کو پسند نہیں تھا۔ چنانچہ آفاق نے پختہ اور ٹھوس زمین کی تلاش کی مہم تیز کردی۔

انہی دنوں جبار نے برطانیہ یا کسی مغربی ملک چلنے کی تجویز پیش کی۔ آفاق کو اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں معلوم تھا۔ نہ ہی اسے کبھی باہر جانے کا خیال آیا تھا۔ ہاں' وہ یہ مشاہدہ ضرور کرتا تھا کہ یورپ یا امریکا جانے کا رجحان گزشتہ کچھ عرصے میں بہت بڑھ گیا ہے۔ اکثر لوگ سفارت خانوں کے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ تاکہ مڈل ایسٹ یا مغرب کے کسی ملک کا ویزا حاصل کرسکیں۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اس خواہش کے تحت اکثر افراد ناپسندیدہ اور غیر قانونی ذرائع بھی اختیار کرتے ہیں۔ اور سبب اس کا محض یہ ہے کہ مغربی ممالک میں جو سہولتیں اور آسائشیں میسر ہیں' ان کا اپنے ملک میں فقدان ہے۔ اور لوگ ایک بہتر زندگی کی تلاش و جستجو میں مغرب اور امریکا کا رخ کرتے ہیں۔ حقائق کا اسے علم نہیں تھا۔ لیکن اس نے بہرحال یہ بھی دیکھا تھا کہ جو لوگ برطانیہ' جرمنی' امریکا یا کینیڈا میں سکونت پذیر ہیں' اور کبھی کبھار چھٹیاں گزارنے یا عزیزوں سے ملنے وطن آتے ہیں' ان کا رنگ ڈھنگ بالکل جدا ہوتا ہے۔ جسم پر خوبصورت لباس' ہاتھ میں چمکتی دمکتی گھڑی اور پرس میں مالدہ کرنسی نوٹوں کے پلاسٹک کارڈز۔ وہ بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور روپیا یوں خرچ کرتے ہیں گویا ان کی نظر میں پیسے کی کوئی قدر ہی نہ ہو۔ آفاق کو اس بات کا گمان تک نہیں تھا کہ باہر سے چند دن کے لیے آنے والے ان لوگوں میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جو اس ملک میں' جہاں بھی وہ سکونت پذیر ہیں' کسی بہتر حیثیت کے مالک نہیں ہیں۔ فیکٹری ورکرز' بس کنڈیکٹرز' مارکیٹ میں اسٹال لگاتے ہیں اور پھر دوسری چھوٹی موٹی ملازمتیں کرتے ہیں۔ لیکن دو دو چار چار پونڈ جمع کرکے جب وطن آتے ہیں تو روپیا پانی کی طرح خرچ کرتے ہیں۔ اور یوں اپنے بچھورے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ وہ چند دن کے بعد واپس چلے جائیں گے۔

آفاق کو اس پس پردہ حقیقت کا علم نہیں تھا۔ جو کچھ وہ بظاہر دیکھتا تھا' اس کی بنا پر اس کا تاثر تھا کہ مغربی ممالک میں پیسے کی فراوانی ہے۔ اور یہ کہ وہاں جا کر ہر شخص خوش حال ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جبار نے باہر جانے کی بات کی تو اسے ایک ناقابل بیان جوش اور مسرت کا احساس ہوا۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا وہ جرمنی' برطانیہ یا کسی دوسرے مغربی ملک میں جا سکتا ہے؟ اگر ایسا ہو جائے تو جوتیاں چٹخانے سے ہی نہ



صرف نجات مل جائے گی بلکہ پاؤں جما کر کھڑے ہونے کے لیے ٹھوس زمین بھی میسر آجائے گی۔ لیکن کیا وہاں جانا ممکن ہے؟

"مگر یار' ہم لوگ وہاں کیسے جا سکتے ہیں؟" اس نے جبار سے پوچھا۔

"کیوں نہیں جا سکتے' دنیا جا رہی ہے" جبار نے اطمینان سے کہا۔

"دنیا تو خیر جا رہی ہے مگر ہم لوگ کیسے جائیں گے' ویزا کیوں کر ملے گا؟"

"ارے بھئی' کوشش کرنا پڑے گی کوشش۔"

چنانچہ پھر کوشش شروع ہوئی۔ سفارت خانوں کے چکر کاٹے گئے۔ درخواست کے چند ایک فارم بھرے گئے۔ مگر بات کچھ بنی نہیں۔ معلوم ہوا کہ مغرب کے اکثر ممالک نے اب طرح طرح کی پابندیاں عائد کردی ہیں حتیٰ کہ بعض ملکوں نے تفریحی ویزا کے لیے بھی کڑی شرائط نافذ کر رکھی ہیں۔ آفاق کا دل مایوسی سے گھر کرنا شروع کیا۔ شاید وہ باہر نہیں جا سکے گا۔ شاید وہ بھی شہر کی بے حس و بے مروت سڑکوں پر جوتے چٹخاتے ہوئے اسی کی زندگی بیت جائے گی۔ لیکن ابھی وہ امید و بیم کی اسی کیفیت میں تھا کہ ایک دن جبار نے اس سے ایک فارم پر دستخط کروائے۔ پاسپورٹ سائز تصویریں اور پاسپورٹ لیا اور چلا گیا۔ وہ تین بعد واپس آیا تو پاسپورٹ پر جرمنی کا ویزا لگا ہوا تھا۔

آفاق کو حد درجہ خوشی کا احساس ہوا۔ وفور مسرت میں اس نے ایک فلک شگاف نعرہ بھی لگایا "ہرے!" مگر جب ویزے کا جائزہ لیا تو سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"ابے چغد' یہ تو تفریحی ویزا ہے۔"

"ہاں۔"

آفاق نے آنکھیں نکالیں "تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم سمجھتے ہو میں جرمنی تفریح کرنے جاؤں گا اور وہ بھی قرض لے کر۔"

"نہیں' ہم وہاں تفریح کرنے نہیں جائیں گے۔"

"تو پھر اس بے ہودگی کا مطلب؟" اس نے ویزے کی طرف اشارہ کیا۔

"بے ہودگی نہیں ویزا ہے۔ اور بڑی مشکل سے ملا ہے" جبار بُرا مان گیا "ایک آدمی مل گیا تھا۔ اس کا جرمنی میں کئی اہم لوگوں سے رابطہ ہے۔ اسی کی کوشش سے یہ ویزا ملا ہے۔ اور تم اطمینان رکھو' یہ تفریحی ویزا ہمیں پہلے جرمنی اور پھر انگلستان لے جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"وہاں فرینکفرٹ میں بھی ایک آدمی ہے۔ اپنے ہی ملک کا ہے" جبار بتانے لگا۔ "اس کا بہت اثر و رسوخ ہے۔ وہ لوگوں کے برطانیہ' ڈنمارک' ناروے وغیرہ جانے کا بندوبست بڑی آسانی سے کردیتا ہے۔ وہ ہمیں بھی برطانیہ بھجوا دے گا۔"

"یہ بات اس آدمی نے کہی ہے جس نے ویزا دلایا ہے۔"

"ہاں۔"

"اور تم نے اس کا اعتبار کرلیا؟" آفاق نے خشمگیں نظروں سے جبار کو گھورا۔

"اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے" جبار نے اطمینان سے کہا "معتبر آدمی ہے۔ پہلے بھی کئی افراد کو باہر کے ملکوں میں بھجوا چکا ہے۔ میری اچھی خاصی واقفیت ہے اس سے۔ لہٰذا یہ سوچنا کہ مجھے دھوکا دے گا' قطعی مناسب نہیں۔"

"تمہیں واقعی پورا اطمینان ہے؟" آفاق نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں یار!" جبار نے جواب دیا۔ پھر اضافہ کیا "دیکھو یار آفاق' پریشانی تو ہوتی ہے۔ کچھ خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے۔ اگر اندیشوں اور خدشات سے ڈر کر آدمی گھر میں بیٹھا رہے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ بس اللہ کا نام لے کر چل پڑو۔ جو کچھ ہوگا' اچھا ہی ہوگا۔ میرا دل کہتا ہے کہ جرمنی سے برطانیہ پہنچنے کا سامان ہو ہی جائے گا۔"

"مگر کیسے؟"

"دیکھو پابندیاں یہاں سے ہیں۔ لیکن جرمنی اور برطانیہ یورپین یونین میں شامل ہیں۔ لہٰذا جرمنی سے برطانیہ کا ویزا ملنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ ایسا مجھے بتایا گیا ہے۔"

جبار کو واقعی اطمینان تھا یا نہیں' یہ تو آفاق کو علم نہیں تھا۔ لیکن خود اسے پورا اطمینان نہیں تھا۔ دل میں وسوسے اور اندیشے دو بدو تھے۔ بات کچھ بن نہیں آرہی تھی۔ پھر بھی وہ تیار ہو گیا۔ ایک دھچکے کے بار بار دھوکا کھانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ شاید اس لیے کہ لاشعوری طور پر وہ خود بھی دھوکا کھانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر ایک بار اور جبار ٹھیک کہتا ہے۔ گھل تو ہم اٹھا ہی رہے ہیں۔ ایک بار اور سہی۔ شاید اس بار کچھ بن جائے۔ قسمت ہی یاوری کرے۔ کامیابی یا ناکامی' چنانچہ پھر اس نے تیاری شروع کردی۔ کچھ روپیا تو اس کے پاس تھا۔ کچھ ادھر اُدھر سے قرض لیا کیونکہ والد صاحب قبلہ نے باہر جانے کے لیے ان کی بیوی کو زیور دینے سے بھی انکار کردیا تھا۔ پھر ٹکٹ خریدا تھا اور وہ دونوں جہاز میں بیٹھ کر

جرمنی پہنچے۔

جبار نے ایک آدمی کو جو اس کے کسی دوست کا واقف تھا' اطلاع دے دی تھی۔ وہ آدمی انہیں لینے ائیرپورٹ تو آگیا تھا۔ مگر اس کے بشرے سے پتا چلتا تھا کہ کچھ خوش نہیں ہے۔ اس کا نام عابد تھا۔ اس نے انہیں خوش آمدید کہا۔ مگر اس طرح گویا مجبور ہو۔ پھر وہ انہیں لے گیا اور ٹھہرنے کے لیے ایک معمولی سے کمرے کا بندوبست بھی کردیا۔ اگلے چند ایک دن شہر میں گھومنے پھرنے اور عابد کے دو ایک دوستوں سے ملنے میں گزرے۔ آفاق نے شہر دیکھا۔ عمارتیں' سڑکیں' باغات' پارک اور شہری نظام کا مشاہدہ کیا۔ تب اسے خوشی بھی ہوئی اور ملال بھی۔ خوشی اس لیے کہ شہر اسے بہت اچھا لگا۔ صفائی ستھرائی بہت تھی۔ سلیقہ اور ترتیب۔ پولیس کا طرز عمل بھی مہذب اور دوستانہ' صاف محسوس ہوتا کہ سارے کام ایک نظام کے تحت چل رہے ہیں۔ اور کوئی اس نظام کی خلاف ورزی کرنا پسند نہیں کرتا۔ آفاق کو یہ سب کچھ اچھا لگا۔ اور اسے خوشی ہوئی۔ تاہم ساتھ ہی ملال بھی ہوا۔ یہ سوچ کر کہ مغربی ممالک میں جو بھی اچھی باتیں ہیں' وہ ایسی تو نہیں کہ ہم انہیں اپنا نہ سکیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ ہمارا ملک غریب ہے اور ہمارے پاس وسائل کی کمی ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ نہیں بات اس طرح نہیں ہے۔ بے شک ہمارا ملک بہت دولت مند نہیں' تاہم اتنا مفلس بھی نہیں ہے کہ ہم کاسۂ گدائی لیے ہوئے ہر وقت مغربی ممالک کے دروازے پر کھڑے رہیں۔ ہمارے پاس اتنا پیسا بہرحال ہے کہ ہم ملک میں بہت سے ترقیاتی کام بغیر کسی دشواری کے کرسکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم چوری نہ کریں۔ رہ گیا وسائل کا مسئلہ' تو اور بھی زیادہ مضحکہ خیز اور قابل قبول بات ہے۔ بھلا سڑکوں اور گلیوں کی صفائی سے وسائل کا تعلق ہے۔ ایک کلرک رشوت لیے بغیر دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دے' اس سے وسائل کا کیا تعلق ہے۔ ایک پولیس والا شرافت سے گفتگو کرے اور آڑھتی اجناس میں ملاوٹ نہ کرے۔ ان معاملات سے وسائل کی کمی کا کیا تعلق ہے۔ جوں جوں آفاق نے شہری نظام اور سرکاری اہل کاروں کے طریقہ کار کا جائزہ لیا۔ اس کا رنج اور مایوسی مزید بڑھی۔ اور اس کے دل میں یہ احساس جاگزیں ہوتا چلا گیا کہ اپنے ملک میں جو بھی افراتفری' انتشار' پریشانی' بدعنوانی اور پسماندگی ہے۔ اس کے ذمے دار اگر کلی طور پر نہ سہی تو بہت حد تک ہم خود ہی ہیں۔

ہماری حالت اس پھوہڑ عورت جیسی ہے جسے ایک خوبصورت گھر ہر طرح کی آرائش وزیبائش اور آسائشی ضروریات سے آراستہ کرکے دے دیا جائے اور وہ عورت اپنی غلط روی اور پھوہڑپن سے چھ ماہ میں ہی گھر کا ستیاناس مار کر رکھ دے۔ کچھ ایسا ہی ہم نے کیا ہے۔ گھر بھی موجود تھا۔ سجانے سنوارنے اور بنانے کے تمام لوازمات بھی میسر تھے۔ لیکن ہم نے سنوارنے کے بجائے گھر کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اگر ایک سگھڑ عورت ہمیں مل جائے' ہاں صرف ایک سگھڑ عورت تو گھر سنور سکتا ہے۔ اور اتنا بے مثال بن سکتا ہے کہ ہم اس پر فخر کریں۔

لیکن کیا ایسی کوئی سگھڑ عورت ہمیں ملے گی؟

کچھ دن گزرے' پھر جانی سے ملاقات ہوئی۔

جانی اس آدمی کا نام تھا۔ جس کے بارے میں ویزا دلانے والے شخص نے بتایا تھا۔ جانی تھا تو ایشین ہی مگر اس کی کسی ادا' کسی انداز سے مشرقیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ رنگ گہرا تھا۔ سر پر بالوں کی تعداد اتنی ہی تھی کہ ضرورت پڑنے پر انہیں گنا بھی جاسکتا تھا۔ دائیں کان کے نیچے زخم کا نشان تھا۔ ملاقات کے ابتدائی چند منٹ میں ہی واضح ہوگیا کہ اسے باتیں کرنے کا بہت شوق ہے۔ اور یہ کہ وہ دنیا کے ہر موضوع پر بے تکان بول سکتا ہے۔ اس نے آفاق اور جبار کے پیسوں سے لوگر... کی چار بوتلیں کیں۔ سگریٹ پھونکیں کچھ دیر اپنی حرماں نصیبی اور زمانے کی ناقدری کا رونا رویا۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر سرہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ لوگوں کو برطانیہ بھجوادوں گا۔ آپ لوگ میرے دیس کے ہیں۔ میرے بھائی ہیں۔ اگر آپ کے کام نہ آؤں تو لعنت ہے میری زندگی پر۔ جانی تو بھائیوں کے لیے جان دے سکتا ہے۔ میں نے پہلے بھی اپنے کئی بھائیوں کی مدد کی ہے مگر۔"

"مگر کیا؟"

"آپ لوگوں کو انتظار کرنا پڑے گا۔ جو آدمی آپ کو لے جائے گا' اس کا نام ٹام بولٹ ہے۔ اس وقت لندن میں ہی ہے۔ میری اطلاع کے مطابق اگلے ہفتے کے آخر میں یہاں آئے گا۔ تب ہی آپ لوگ جاسکیں گے۔"

"کوئی بات نہیں' ہم انتظار کرلیں گے۔" جبار نے کہا۔

کوئی دس دن انتظار کرنا پڑا۔ لیکن یہ انتظار کم از کم آفاق کے لیے فکر و تذبذب کا باعث بنا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک الجھن تھی۔ اور ایک شک وشبہ۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت جو سرخوشی اور جوش اس کے دل میں موجزن تھا' اب دھیرے دھیرے بیٹھ رہا تھا اور اندیشوں کے ساتھ ساتھ ایک خوف سر ابھار رہا تھا۔ گو وہ سمجھ نہیں سکتا تھا تاہم محسوس کررہا تھا کہ شاید ہر بات خوبصورت اور خوش گوار نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بات ہے جو غلط بھی ہے اور ناخوش گوار بھی۔ لیکن وہ کیا بات ہے؟ اتنے دن میں پہلی بار یہ خیال بھی اس کے ذہن میں پیدا ہونا شروع ہوا کہ گھر چھوڑ کر شاید اس نے غلطی کی ہے۔ بلکہ شاید اس سے حماقت سرزد ہوئی ہے۔ یوں حالات سے بددل ہوکر بھاگ کھڑے ہونا مناسب نہیں تھا۔ اپنے ہی شہر میں رہتا تو بہتر تھا۔ بے شک حالات ناسازگار اور وقت نامہربان تھا لیکن ایسا تو نہیں ہے کہ وہ بالکل ہی تہی دامن تھا۔ کم از کم اس کے پاس امید اور کوشش کا جذبہ تو تھا۔ ایک دن حالات ضرور سدھرتے اور اسے پاؤں جمانے کے لیے ٹھوس زمین بھی ضرور ملتی۔ مگر یہ سوچ بعد از وقت تھی۔ جو کچھ ہونا تھا' ہوچکا تھا۔ اور وہ اپنے گھر سے ہزاروں میل دور جرمنی میں موجود تھا۔ اب پچھتانا بے سود تھا۔ مناسب یہی تھا کہ وہ مستقبل کی طرف دیکھے۔ ممکن ہے کہ اس کے لیے اسی میں بہتری کا کوئی پہلو موجود ہو۔

چودہویں دن ان کی ملاقات ٹام بولٹ سے ہوئی۔ ٹام بولٹ ایک جسیم اور بھاری بھرکم آدمی تھا۔ سر پر استرا پھرا ہوا تھا۔ گردن گھٹنے کی طرح موٹی' پیٹ بٹیوں کی روایتی توند کا مانند گول اور بڑھا ہوا۔ اس کی دونوں کلائیوں پر گہرے نیلے اور سرخ ٹیٹو تھے اور سب ہی انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں۔ اس نے سیاہ پتلون اور نیلی پہن رکھی تھی جتنی دیر جانی اسے آفاق اور جبار کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ شراب اور سگار سے شغل کرتا رہا۔ جب جانی خاموش ہوا تو ٹام بولٹ نے غور سے ان دونوں کو دیکھا۔

"میں لمبے فاصلے کا لاری ڈرائیور ہوں" آخر اس نے بھاری آواز میں کہا "انگلینڈ سے فرانس' اٹلی' جرمنی اور اسپین تک لاری لے جاتا ہوں۔ میں پہلے بھی چند افراد کو برطانیہ لے جاچکا ہوں۔ تمہیں بھی لے چلوں گا۔ تمہارے پاس کتنا روپیا ہے؟"

جبار نے بتایا کہ ان دونوں کے پاس مشترکہ طور پر کتنا روپیا ہے۔

ٹام بولٹ کے چہرے پر حیرت اور برگشتگی کے آثار نظر آئے "صرف اتنی رقم ہے تمہارے پاس اور تم چاہتے ہو کہ اتنی قلیل رقم کے عوض میں خطرہ مول لوں اور تمہیں برطانیہ پہنچادوں' یقیناً تم مجھے بے وقوف نہیں سمجھتے' ہے نا۔"

جبار نے مایوسی سے جانی کی طرف دیکھا۔ پھر ٹام بولٹ سے کہا "لیکن ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کی پوری رقم ادا کردیں گے' آپ ہمارا اعتبار کیجیے۔"

"کہاں سے ادا کرو گے۔ تمہارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔" ٹام بولٹ نے خشک لہجے میں اعتراض کیا۔

"وہاں انگلینڈ میں میرا ایک واقف ہے۔ میں نے اسے اطلاع دے دی ہے۔ جب ہم وہاں پہنچیں گے تو وہ پوری رقم آپ کو ادا کردے گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

"اور اگر اس نے نہ دی تو۔" دفعتاً ٹام بولٹ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز اور پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"وہ ضرور دے گا۔ ہمیں یقین ہے۔" جبار نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

ٹام بولٹ چند لمحے چپ رہا اور ان دونوں کو معنی خیز نظروں سے گھورتا رہا۔ اس کے ہونٹوں کی پراسرار مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔ پھر اس نے جانی کی طرف دیکھا۔ جانی کے ہونٹوں پر بھی ایک ناقابل فہم مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ دونوں نے شاید ایک دوسرے سے کچھ اشارے کیے۔ پھر ٹام بولٹ نے گلاس اٹھا کر ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا اور چٹکی بجا کر سگار کی راکھ جھاڑی۔

"تو تم دونوں انگلینڈ ضرور جانا چاہتے ہو؟" آخر کار اس نے کہا۔ اس کا لہجہ خاصا پراسرار تھا۔

"ہاں۔"

ٹام بولٹ نے ایک بار پھر جانی کی طرف دیکھا۔ پھر سر کو جنبش دی "ٹھیک ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا "میں تمہیں انگلینڈ لے چلوں گا۔ کل صبح دس بجے تم دونوں تیار رہنا۔"

"دس بجے صبح!" اس بار آفاق نے چونک کر کہا "یہ تو بہت جلدی ہے۔ میرا مطلب ہے ویزا وغیرہ۔"

"ویزا!" ٹام بولٹ پہلے حیران ہوا پھر زور سے ہنسا "مسٹر' تمہیں برطانیہ جانا ہے۔ سو پہنچ جاؤ گے۔ باقی سب بھج پر چھوڑ دو' سمجھے۔"

جب وہ اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو آفاق کا ذہن شش وپنج میں گھرا ہوا تھا۔ ایک بے یقینی اور خوف کی کیفیت طاری تھی۔ جانی اور ٹام بولٹ سے جو گفتگو ہوئی تھی' وہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور کئی طرح کے شکوک پیدا کررہی تھی۔ ٹام نے کہا تھا "تمہیں برطانیہ پہنچنا ہے' پہنچ جاؤ گے۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔" پھر اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ لمبے فاصلے کے لاری ڈرائیور ہے۔ دھیرے دھیرے آفاق کے ذہن کی دھند صاف ہونا شروع ہوئی۔ اسے وہ خبریں یاد آئیں جو انسانوں کی اسمگلنگ سے متعلق تھیں۔

ان خبروں کے مطابق یورپ کے اکثر ملکوں میں انسانی اسمگلنگ کا کاروبار اچھے خاصے پیمانے پر چل رہا تھا۔ ایسے لوگ یا گروہ موجود ہیں جو غیر قانونی طور پر لوگوں کو جرمنی' فرانس' اٹلی اور انگلینڈ پہنچاتے ہیں۔ کبھی موٹر بوٹ کے ذریعے اور کبھی لاریوں' ٹرکوں اور کاروں میں چھپا کر۔ اور

ایسا نہیں ہے کہ سب ہی طالع آزما بخیریت منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہوں۔ کچھ گرفتار ہوتے ہیں اور کچھ کبھی کبھی جان بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ اسے ایک واقعہ بطور خاص یاد آیا۔

اٹلی کے کسی ساحلی علاقے سے ایک بھری ہوئی بوٹ انگلستان کے لیے روانہ ہوئی۔ بوٹ میں سوار سارے افراد غیر قانونی طور پر غالباً کیلے یا ڈوور کے ساحل پر اترنا چاہتے تھے لیکن ایک تو سمندر پرسکون نہیں تھا' دوم بوٹ میں ضرورت سے زیادہ افراد سوار تھے چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ بوٹ الٹ گئی اور تقریباً چالیس افراد سمندر کی نذر ہوگئے۔ جن میں سے آٹھ کا تعلق اس کے اپنے ملک سے تھا۔ اس کے ذہن میں وسوسہ سرابھار رہا تھا۔ اور خوف اور نشتر کی مانند چبھتا ہوا ایک سوال۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کوئی بدشگونی ان کا راستہ نہیں روکے گی؟ بے شک وہ بوٹ میں سفر نہیں کریں گے لہٰذا ڈوبنے کا خطرہ خارج از امکان ہے لیکن لاریاں کسٹم پر روکی بھی تو جاتی ہیں اور ان کی تلاشی بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کی گرفتاری بالکل ممکن ہے اور اگر گرفتار کرلیے گئے تو پھر کیا ہوگا؟

جوں جوں وہ سوچتا گیا' اسے یقین ہوتا گیا کہ ٹام بولٹ انہیں غیر قانونی طور پر برطانیہ لے جائے گا۔ یعنی اسمگل کرکے اور یہ تصور ایسا تھا کہ اس کے بدن میں دوڑتا ہوا خون منجمد ہونے لگا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" آخر کار اس نے فیصلہ سنادیا۔

"کہاں نہیں جاؤ گے؟" جبار نے پوچھا۔

"برطانیہ!"

"اب یار بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" جبار نے ترشی سے کہا "برطانیہ کیوں نہیں جاؤ گے؟ سبب کیا ہے؟"

"مجھے جیل جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"اب یہ جیل کہاں سے بیچ میں ٹپک پڑا" جبار نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"سنو جبار! میرا خیال ہے تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم قانونی طور پر برطانیہ میں داخل نہیں ہوں گے بلکہ وہ گنجا اور موٹا آدمی' کیا نام ہے اس کا ٹام بولٹ' وہ ہمیں اسمگل کرکے لے جائے گا یعنی غیر قانونی طور پر۔ اب ذرا غور کرو۔ اگر کسٹم پر لاری کی تلاشی ہوئی اور ہم لوگ پکڑ لیے گئے جو خارج از امکان نہیں ہے تو کیا ہوگا؟ حوالات میں رکھیں گے وہ لوگ ہمیں' پھر مقدمہ چلے گا۔ اس کے بعد یا تو جیل بھیج دیے جائیں گے اور یا پھر ڈی پورٹ کیے جائیں گے۔ دونوں ہی صورتوں میں انجام برا ہوگا۔ نہیں یار! مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ میں اس طرح غیر قانونی طور پر انگلینڈ نہیں جاؤں گا۔"

"تو پھر کیا کرو گے؟" جبار نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں واپس چلا جاؤں گا۔"

جبار چائے بنا رہا تھا۔ اس نے ایک کپ آفاق کے سامنے رکھا۔ پھر ایک سگریٹ جلائی۔ کش لے کر تفکر آمیز سنجیدگی سے بولا "آفاق میں تمہارے احساسات کو بخوبی سمجھ رہا ہوں۔ اور سچ پوچھو تو میں بھی کچھ خوش نہیں ہوں۔ لیکن کیا کیا جائے' مجبوری ہے۔ جب ہم گھر سے چلے تھے تو میرا خیال بھی یہی تھا کہ یہاں جرمنی میں برطانیہ کا ویزا مل جائے گا۔ کیونکہ مجھے یہی بتایا گیا تھا۔ یہ غیر قانونی داخلے والی بات کا گمان تک نہیں تھا۔ لیکن اب صورتِ حال واضح ہوچکی ہے۔ ہمیں ویزا نہیں مل سکتا اور ہمارے پاس ٹام بولٹ کی مدد لینے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ مگر تم اطمینان رکھو۔ جانی نے مجھے بتایا ہے کہ ٹام بولٹ تجربہ کار ہے۔ وہ پہلے بھی کئی افراد کو برطانیہ لے جاچکا ہے اور مجھے امید ہے کہ ہمیں کسی ناخوش گوار صورت حال سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔"

"مگر یار' غیر قانونی طور پر برطانیہ جانا...." آفاق نے الجھ کر بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

"تو کیا ہوا۔ بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ ہم لوگ کوئی نئی بات تو نہیں کررہے ہیں" جبار نے جواز پیش کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میرا مطلب یہ تھا کہ وہاں کریں گے کیا۔ ہم تو وہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میں نے سنا ہے کہ وہاں کچھ قانونی نوعیت کے کاغذات ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر وہاں کوئی ملازمت نہیں کرسکتا۔ وہ کاغذات ہم کہاں سے حاصل کریں گے۔ کیونکہ ہماری حیثیت تو غیر قانونی ہوگی۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر کسٹم پر نہ پکڑے گئے تو بعد میں کسی بھی وقت کسی بھی جگہ پکڑے جاسکتے ہیں۔ تب کیا کریں گے؟ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے پاس روپیا تو ہے نہیں' ہم ٹام بولٹ کو رقم کی ادائیگی کہاں سے کریں گے؟"

جبار نے کپ اٹھا کر چائے سپ کی "آفاق' میرے یار! اگر تم ایک "اگر" کا سرا پکڑو گے تو ان گنت اگر نکلتے چلے آئیں گے۔ اگر ایسا ہوگیا' اگر ویسا ہوگیا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اگر اور مگر کے چکر میں نہ پڑو۔ تمہارے خدشات بجا ہیں مگر اتنا یاد رکھو' خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ تب ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔ بے شک وہاں کاغذات کے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتا لیکن مجھے مصدقہ طور پر معلوم ہے کہ بے شمار لوگ چوری چھپے بھی کام کرتے ہیں۔ ہم بھی وہی کریں گے۔"

دن۔"

"کچھ دن؟" آفاق نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھو' کاغذات بنوانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ کار ضرور ہوتا ہے۔ میں نے تم سے اپنے ایک واقف کار کا ذکر کیا تھا۔ عبداللہ نام ہے اس کا اور وہ برمنگھم میں رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کاغذات بنوانے میں ہماری مدد ضرور کرے گا۔ اسی طرح مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ وہ ہمیں اتنا روپیا ضرور دے دے گا کہ ہم ٹام بولٹ کو مطلوبہ رقم ادا کر سکیں۔ بعد ازاں ہم جب کام کریں گے تو رفتہ رفتہ اس کا قرض اتار دیں گے۔"

"اور گرفتاری کے بارے میں کیا خیال ہے؟" آفاق نے تند نظروں سے جبار کو گھورا۔

"ہاں' یہ ممکن ہے۔" جبار نے سر کو جنبش دی۔ "اگر ہارڈر پر نہ سہی تو بعد میں کسی بھی وقت گرفتاری خارج از امکان نہیں ہے لیکن اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم اسائلم کی درخواست دے دیں گے۔"

"اسائلم؟"

"ہاں' سیاسی پناہ۔" جبار نے سگریٹ سلگائی۔ "ہم کہیں گے کہ ہم ایک سیاسی پارٹی کے کارکن ہیں۔ اور زیر عتاب ہیں۔ حکومت ہمیں ناجائز طور پر تنگ کر رہی ہے۔ نیز یہ کہ ہمیں اپنی جان کا خطرہ بھی ہے۔ اس طرح ہمیں سیاسی پناہ مل جائے گی۔" جبار ایک پل کے لیے رکا پھر اس نے اضافہ کیا۔ "میں ایسے کئی افراد کے بارے میں جانتا ہوں جنہوں نے یورپ کے کسی نہ کسی ملک میں سیاسی پناہ حاصل کرلی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو بھی لے گئے ہیں۔ حالانکہ ان کا سیاست سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے مغربی ممالک کے اس قانون سے فائدہ اٹھایا۔"

"تو کیا سیاسی پناہ مل جاتی ہے؟" آفاق نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھو یار آفاق! بات یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں حالات خراب ہیں۔ سیاسی انتشار' انتقامانہ کارروائی' جبر اور ناانصافی کا ماحول ہے اور کچھ لوگ واقعی مشکل میں ہیں اور جان کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ تو یہ جائز طور پر ان کا حق ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے کسی ملک میں سیاسی پناہ حاصل کریں۔ یہ ایک بین الاقوامی قانون ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کچھ لوگ اس قانون کو اپنی مطلب براری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور سیاسی پناہ حاصل کرتے ہیں۔ ہرچند کہ یہ اخلاقی طور پر درست نہیں۔ لیکن کیا کیا جائے' مجبوری ہے۔ اگر میں اپنے ملک میں ہوتا تو اسائلم کے حصول کے بارے میں کبھی نہ سوچتا۔ مگر جس صورت حال سے اس وقت ہم دوچار ہیں' اس میں ہمارے لیے صرف یہی ایک راستہ ہے۔"

آفاق تھوڑی دیر چپ رہا۔ اور غور سے جبار کو دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں الجھن پنپتی مچی ہوئی تھی۔ جبار کی بات گو اس کی سمجھ میں آرہی تھی پھر بھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ باتیں واضح نہیں ہیں۔ کچھ دیر تک اندر ہی اندر اپنے آپ سے الجھنے کے بعد آخر کار اس نے کہا "اچھا فرض کرو' ہم وہاں پہنچ گئے اور اسائلم کی درخواست بھی دے دی' پھر کیا ہوگا؟"

جبار نے گھن لے کر گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ "جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ اسائلم کی درخواستوں کا فیصلہ ہونے میں اکثر دو سے تین سال لگ جاتے ہیں۔ پھر کچھ لوگوں کو طویل قیام کی اجازت مل جاتی ہے۔ کچھ افراد کو واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ دراصل اس کا انحصار اس پر ہے کہ درخواست گزار کے حالات کی نوعیت کیا ہے اور وہ اپنا مقدمہ کس طرح پیش کرتا ہے۔ فرض کرو' ہم مقدمہ ہار بھی گئے تو بھی دو تین سال تو رہ ہی لیں گے اور اتنا پیسا بنالیں گے کہ آئندہ زندگی میں کہیں نہ کہیں ٹھکانہ کرنا پڑے۔"

"ہمم۔"

"پھر وہی اگر مگر" جبار چڑ گیا "دیکھو یار آفاق! اب یہ سال تک آنے کے بعد میں تو واپس نہیں جاسکتا۔ تاش کے پتوں کی طرح اگر یہ ایک اندھی چال ہے تو میں یہ چال ضرور چلوں گا اور نتیجہ قسمت پر چھوڑوں گا' تمہیں نہیں جانا ہے تو مت جاؤ۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے' کل صبح تک سوچ لو۔"

وہ سوچتا رہا۔ صبح تک سوچتا رہا۔ اپنے آپ سے لڑتا رہا۔ کیا کرے' کیا نہ کرے۔ لیکن جب دن کے دو بجے تو وہ لاری میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور لاری کیفے کی جانب بھاگ رہی تھی۔

مجبوری تھی۔ گھر وہ واپس جانا چاہتا تھا لیکن کیا منہ لے کر واپس جاتا۔ دوست احباب' والد صاحب قبلہ اور ان کی بیوی' ان کے طنز و تضحیک کا سامنا کیسے کرتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ قرض کہاں سے ادا کرتا۔ پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں تھی اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ واپس جاتے ہی اسے کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔ چنانچہ بادل ناخواستہ اس نے بھی جبار کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ بے شک اندھی چال



خطرناک ہوتی ہے کہ بیشتر ہار پر منتج ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی جیت کا مژدہ بھی تو سناتی ہے۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی اس نے اپنا مختصر سا سامان پیک کیا اور جبار سے کہا۔

"میں بھی چل رہا ہوں۔"

ٹام بولٹ دراصل ایک برٹش ہائی کمپنی میں بطور ڈرائیور ملازم تھا۔ اس ہائی کمپنی کے ٹرک اور لاریاں برطانیہ' اٹلی اور جرمنی کے مختلف کارخانے اور کمپنیاں اپنی مصنوعات ایک ملک سے دوسرے ملک بھیجنے کے لیے کرائے پر حاصل کرتی تھیں۔ ٹام بولٹ اپنے ٹرک یا لاری میں اگر "انسانوں" یا دوسری اشیا کی اسمگلنگ کبھی کبھار کرتا تھا تو یہ قطعی طور پر اس کا ذاتی فعل تھا۔ کمپنی کی انتظامیہ اس کی ان غیر قانونی سرگرمیوں سے بالکل بے خبر تھی۔ اس وقت تو نہیں لیکن بعد ازاں آفاق کو علم ہوا تھا کہ ٹام بولٹ اسمگلنگ کا کام اکثر و بیشتر کرتا تھا۔ عموماً وہ سگریٹ اور شراب اسمگل کرتا تھا۔ کیونکہ ان اشیا کی قیمت برطانیہ میں دیگر ملکوں کی بہ نسبت زیادہ تھی اور کبھی کبھی اگر رقم معقول ملتی تو انسانوں کو بھی اپنی لاری میں چھپا کر انگلینڈ لے جاتا تھا۔

جب وہ دونوں لاری میں سوار ہوئے تب منکشف ہوا کہ دو افراد اور بھی ہیں۔ جو ان کے ساتھ انگلینڈ جا رہے ہیں۔ مارکو اور ماریا۔ وہ دونوں رومانیہ سے آئے تھے۔ اور غالباً چوری چھپے جرمنی میں داخل ہوئے تھے۔ مارکو اچھی خاصی انگریزی بول لیتا تھا جبکہ ماریا کی انگریزی سے واقفیت واجبی سی تھی۔ ٹام بولٹ نے انہیں لاری کے بالکل اندرونی حصے میں بٹھایا تھا۔ یہ حصہ ڈرائیور کی سیٹ کی عقبی دیوار کے ساتھ تھا۔ اور اتنا محدود تھا کہ انہیں ہاتھ پاؤں ہلانے میں دشواری محسوس ہوتی تھی۔ دیوار میں ایک چھوٹی سی جالی تھی جو نہ صرف ہوا کی آمدورفت کی اہم ضرورت پوری کرتی تھی بلکہ ٹام بولٹ اسے بوقت ضرورت مختلف ہدایات دینے کے لیے بھی استعمال کرسکتا تھا۔ لاری میں اوپر سے نیچے تک بڑے اور وزنی ڈبے بھرے ہوئے تھے۔ اور یہ ڈبے اس طرح رکھے گئے تھے کہ ان کے بیٹھنے کی جگہ سے ایک تنگ سرنگ کی شکل اختیار کرلی تھی۔ جو اتنی محدود تھی کہ نہ ہاتھ پاؤں پھیلا سکتے تھے اور نہ ہی گہرے اندھیرے کے سبب ایک دوسرے کی شکل دیکھ سکتے تھے۔

تیاری مکمل ہو چکی تو انجن اسٹارٹ ہوا اور لاری نے اپنا سفر شروع کیا۔

وہ ایک طویل' تکلیف دہ اور اندیشوں سے بھرا ہوا سفر تھا۔ اس کشتی کی طرح جو سمندر کی پرغضب اور شوریدہ سر لہروں کے رحم و کرم پر ہو اور کسی کو علم نہ ہو کہ غرقاب ہوگی یا منزل مقصود پر پہنچے گی۔ آفاق ایک کونے میں ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے چاروں طرف دبیز تاریکی کا گہرا غلاف تھا اور سانسوں کی مدھم آوازیں۔ اور کانوں میں انجن کا شور۔ لیکن اس کا دھیان انجن کے ناگوار شور کی طرف نہیں تھا۔ وہ تو اپنی سوچوں میں گم تھا۔ جہاں ان گنت اندیشے اور وسوسے تھے اور ان گنت خیالات' کچھ خوش گوار اور دل کو ایک انوکھی سی مسرت عطا کرنے والے۔ اور کچھ ناخوشگوار' ذہن میں اذیت اور خوف کا احساس پیدا کرنے والے۔ اس وقت شدید تنہائی کے اس لمحے میں' اور اس گہری تاریکی میں' اس کی بجتی زندگی کی ان گنت یادیں ننھے ننھے جگنوؤں کے مانند جل بجھ رہی تھیں۔ بچپن سے جوانی تک اس کی زندگی کچھ عجیب ہی ڈھنگ سے گزری تھی۔ گو بچپن کی یادیں اس کے ذہن میں بہت دھندلی تھیں تاہم اسے یقین تھا کہ بچپن خوبصورت ہی رہا ہوگا کہ اس کی اماں اس وقت موجود تھیں۔ اور ماؤں کی گود جنت سے کم نہیں ہوتی اور جنت میں جو وقت گزرے' شادمانی سے عبارت ہوتا ہے لیکن پھر اس کی اماں چلی گئیں۔ والد صاحب قبلہ کا مزاج مصلحت کوش تھا۔ ہر کام وہ اس وقت تک کرتے تھے' جب تک ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ آفاق کی اماں سے بھی اس وقت تک محبت کرتے رہے' جب تک وہ زندہ رہیں۔ ایک بار رفاقت ختم ہوئی تو محبت بھی انجام کو پہنچی۔ یہی صورت حال آفاق کے ساتھ رہی۔ جب تک دوسری شادی نہیں کی' آفاق کا خیال کرتے رہے۔ لیکن دوسری شادی رچائی' پوری محترمہ گھر میں تشریف لائیں تو آفاق کی اہمیت بحساب بن کر اڑ گئی۔ وہ یوں پلتا بڑھتا رہا' جیسے کوئی جنگلی پودا خود بخود اگتا اور نشوونما پاتا ہے۔ آفاق کی زندگی میں صبح سے شام کا ہونا ایک میکانکی عمل تھا۔ خود بخود صبح ہوئی' دن گزرا' شام ہوئی اور دن تمام ہوگیا۔ آفاق کو قطعی علم نہیں تھا کہ اس کی زندگی کا کوئی مدعا ہے یا نہیں۔ نہ ہی اس نے کبھی یہ سوچا کہ زندگی میں کیا کرنے کا ہے؟ بس ایک مبہم سا تصور اس کے ذہن میں تھا کہ تعلیم ختم ہوگی۔ کوئی معقول ملازمت مل جائے گی۔ پھر شادی ہوجائے گی اور وہ اپنا ایک گھر بنالے گا اور پھر دنیا کے لاکھوں کروڑوں عام' بے قیمت' بے وقعت انسانوں کی طرح شب و روز زیست کرنے میں جت جائے گا۔ روزکنواں کھودے گا اور پیاس بجھائے گا حتیٰ کہ زندگی' دنیا کے لاکھوں کروڑوں معمولی' غیر اہم اور گمنام انسانوں کی زندگیوں کی طرح' اپنے انجام کو پہنچ جائے گی اور وقت کے ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن بھی نہیں پڑے گی۔

تو یہ تھا اس کی زندگی کا منظرنامہ' بے کیف و بے رنگ۔

انگلینڈ کے بارے میں تو اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا مگر یہ نیرنگی حالات کی ایک شوخ اور متلون ادا ہے کہ وہ اس وقت ایک لاری میں بیٹھا ہوا تھا اور لاری کینٹے کی بندرگاہ کی طرف بھاگی چلی جارہی تھی۔

وقت کیوں کر گزرا' انہوں نے کتنا سفر طے کیا' کب ان کی لاری سی فیری پر چڑھائی گئی؟ اور کتنا وقت کیلے سے ڈوور پہنچنے میں لگا؟ اس بات کا کوئی اندازہ آفاق کو نہیں تھا۔ نہ ہی اس کے علم میں یہ بات تھی کہ ٹام بولٹ نے کسٹم کے مراحل کیوں کر طے کیے۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ایک تنگ سے کونے میں پاؤں سکیڑ کر بیٹھے بیٹھے اس کے اعصاب اینٹھنے لگے تھے۔ جوڑوں میں شدید درد ہو رہا تھا' پسلیاں دکھ رہی تھیں اور گردن اکڑ گئی تھی۔ اور اس کے دل میں شدید خواہش ابھر رہی تھی کہ ایک لمحے کے لیے ہی سہی' اسے پاؤں پھیلانے اور کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع مل جائے لیکن وہ ایک لمحہ' بیش قیمت اور حیات افروز لمحہ کم از کم اس وقت اسے نہیں مل سکتا تھا۔ دوسرا احساس خوف کا تھا۔

جب لاری کسٹم پر کھڑی تھی اور وہ باہر سے آنے والی آوازیں سن رہا تھا تو اس کا خوف سہ چند ہو گیا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور شاید گردن اور پنڈلیوں پر پسینے کی بوندیں بھی ابھر آئی تھیں۔ عجیب حالت تھی اس کی' سانسیں چل رہی تھیں لیکن جسم کے اندر ٹھنڈی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ باہر سے آنے والی آوازیں گو اس کے لیے اجنبی تھیں تاہم وہ قیاس کر سکتا تھا کہ کسٹم آفیسران کی لاری کا جائزہ لے رہے ہیں۔ دو ایک بار ٹام کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ غالباً کسٹم آفیسر کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ اس نے لاری کا دروازہ کھلنے کی آواز بھی سنی اور پھر روشنی کی باریک سی لکیروں کو اندر آتے دیکھا۔ مگر روشنی کی وہ مدھم لکیریں مزید خوف لے کر آئیں۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یوں لگا کہ شاید ساعت بد آپہنچی ہے۔ بس کوئی لمحہ جاتا ہے کہ ڈبے ہٹائے جائیں گے اور کسٹم آفیسران کے سر پر آ کھڑے ہو جائیں گے۔ اور تمسخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہیں گے۔

"کم آن بوائز' یور جرنی از اوور۔"

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ بری گھڑی ٹل گئی۔ دروازہ پھر بند ہو گیا اور کچھ دیر بعد لاری کا انجن اسٹارٹ ہوا۔

بالآخر سفر تمام ہوا۔ ایک طویل اور پر اذیت انتظار کے بعد!

پھر لاری کا دروازہ کھلا۔ کچھ ڈبے ہٹائے گئے اور انہیں باہر نکلنے میں مدد دی گئی۔ مدد کی انہیں شدید ضرورت بھی تھی کہ سفر کی طوالت اور شدید بے آرامی کے سبب ان کے جسم کا ایک ایک عضو اکڑ گیا تھا۔ ٹام بولٹ نے ہر چند کہ سفر کے دوران میں انہیں دو بار کھانا اور چائے دی تھی پھر بھی جسمانی اضمحلال اتنا بڑھ گیا تھا کہ لگتا تھا' وہ لوگ برسوں کے بیمار ہوں۔ جب آفاق سہارا لے کر لاری سے نیچے اترا تو اپنے پیروں پر فوری طور پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ اگر لاری کا دروازہ نہ پکڑ لیتا تو یقیناً گر پڑتا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ پورے بدن میں تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی اور آنکھوں کے سامنے سیاہ دائرے ناچ رہے تھے۔

وہ چپ چاپ دروازہ تھامے' چند منٹ کھڑا رہا اور زور زور سے سانس لیتا رہا۔ یوں جیسے حواس اور قوت بحال کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے کانوں میں کئی آوازیں آرہی تھیں۔ لیکن اس کا ذہن ان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ دماغ پر ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ کئی منٹ لگے جب اس کے حواس قدرے واپس آئے اور ذہن اور آنکھوں نے کام کرنا شروع کیا۔ تب اس نے حیرت سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

لاری ایک چھوٹے سے میدان میں کھڑی تھی۔ جو ایک خوبصورت کاٹیج کے سامنے واقع تھا۔ کاٹیج کے باہری باغیچے کی چوبی گیٹ کے قریب ایک عمر رسیدہ عورت کھڑی تھی۔ غالباً وہ خانساماں کے لیے فراک میں ملبوس کھڑی ان سب کو دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ گیٹ کے دائیں جانب استادہ ایک چھوٹے سے گھنے درخت کے قریب تین افراد کھڑے زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر گفتگو کرنے میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک تو خیر ٹام بولٹ تھا جبکہ دوسرے دو آدمی اجنبی تھے۔ آفاق چند ثانیے دھندلی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گردن گھمائی اور اطراف کا جائزہ لیا۔ کاٹیج کے علاوہ آس پاس میں کوئی اور عمارت نظر نہیں آئی۔ البتہ جہاں تک نگاہ جاتی تھی' سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ بلند و پست درختوں کے جھنڈ' نارم' بہت دور نگاہ کے اختتام پر پہاڑیوں کے نیم دائرے جو سہ پہر کی نیم روشن دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ ان پہاڑیوں کے پیش منظر میں کچھ آبی پرندے بھی اڑتے نظر آئے۔ دائیں جانب کسی قدر فاصلے پر دو مکانوں کے خاکے بھی دکھائی دیے۔ جن میں سے ایک مکان کی چمنی سے دھواں نکل کر فضا میں ایک سرمئی لکیر کی طرح پھیل رہا تھا۔ ڈوبتی سہ پہر کی نرم اور نیم روشن دھوپ میں گرد و پیش کا وہ پورا منظر ایک وسیع لینڈ اسکیپ کی طرح نظر آتا تھا۔ اور اتنا دلکش تھا کہ آفاق چند منٹ تک آس پاس سے غافل ہو کر اس منظر میں ڈوبا رہا۔ اسے یہ قیاس کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ کسی مضافاتی علاقے میں ہیں۔ مگر کیوں؟ مضافات میں کیوں؟



انہیں تو کسی شہر میں جانا تھا۔ شاید برمنگھم نام بتایا تھا جبار نے۔ مگر یہ برمنگھم تو نہیں لگتا۔

ٹام بولٹ چند منٹ ان دونوں آدمیوں سے بات کرتا رہا پھر ان کے پاس آیا "تم لوگ ٹھیک ہو؟"

"ہاں" آفاق نے آہستہ سے کہا۔

"آؤ ہمارے ساتھ" وہ کاٹیج کی طرف گھوما۔

"مسٹر بولٹ!" یکایک جبار نے تجسس آمیز لہجے میں کہا "یہ تم ہمیں کہاں لے آئے ہو' ہمیں تو برمنگھم جانا تھا۔"

ٹام بولٹ مسکرایا' وہی تیکھی' پراسرار اور معنی خیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نظر آئی جو وہ پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ پھر اس نے غور سے جبار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "برمنگھم بھی پہنچ جاؤ گے' فکر نہ کرو۔ آؤ ہمارے ساتھ۔"

"مگر۔"

"کھانا' فکر نہ کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ٹام بولٹ کے لہجے میں درشتی اور تحکم کا تاثر تھا۔ آفاق محسوس ہوا کہ وہ فیصلے اور انتخاب کے اختیار سے شاید محروم ہو چکے ہیں۔ بس بے بسی سے جبار کی طرف دیکھا۔

"آوئیار' لگتا ہے لوگ کسی چکر میں پھنس گئے ہیں۔"

انہیں کاٹیج کے جس کمرے میں بٹھایا گیا۔ وہ درمیانے سائز کا ایک خوبصورت کمرا تھا۔ کھڑکی پر شیشنگ کا بھاری پردہ پڑا تھا۔ صوفہ سیٹ چمڑے کا تھا اور بہت آرام دہ تھا۔ ایک وسیع الماری دیوار کے ساتھ استادہ تھی۔ جس میں کچھ ظروف اور کچھ کتابیں قرینے سے سجی تھیں۔ دیواروں پر تین آئل پینٹنگ بھی نظر آئیں۔ ایک ٹیلی وژن بھی تھا اور اس کے قریب ہی ایک گول ٹیبل پر مصنوعی پھولوں کا ایک گلدستہ بھی۔ آفاق پسندیدگی سے مگر نظر آنے انداز میں کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کا دل معمول سے زیادہ تیز دھڑک رہا تھا۔ اور اندیشوں اور وسوسوں کی سوئیاں اس کے ذہن میں چبھ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی غلط اور ناخوشگوار بات ہے ضرور' مگر وہ کیا بات ہے؟

کچھ دیر بعد عمر رسیدہ عورت کمرے میں آئی۔ اس نے اپنا تعارف جینی اسکاٹ کے نام سے کرایا۔ اور میز پر ان کے لیے انڈے کے سینڈوچ اور چائے کے مگ رکھے۔ آفاق نے سینڈوچ چنگیر پر نظر ڈالی۔ چائے کے مگ سے گرم گرم بھاپ کو اٹھتے دیکھا۔ اور ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس وقت اسے چائے کی اشد ضرورت تھی کہ اس کا جسم درماندہ اور ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ مگر اس نے پس و پیش کیا۔ ایک نظر سینڈوچز اور چائے کو دیکھا۔ پھر جینی اسکاٹ کی طرف نظر اٹھائی۔

"کیا بات ہے؟" جینی اسکاٹ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" آفاق نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

جینی اسکاٹ خوش اخلاق اور نرم دل عورت تھی۔ اور جہاندیدہ' ان کے پس و پیش اور تردد کو وہ بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ مسکرا کر نرم لہجے میں بولی "تکلف نہ کرو' کچھ کھا لو' تمہیں اس کی ضرورت بھی ہے۔ نہیں کھاؤ گے تو اپنے ساتھ زیادتی کرو گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے" اتنی دیر میں پہلی بار مارکو نے زبان کھولی "مگر وہ مسٹر ٹام بولٹ کہاں ہیں؟ اور ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

جینی اسکاٹ چند لمحے چپ رہی اور غور سے باری باری انہیں دیکھتی رہی۔ پھر دوستانہ لہجے میں کہنے لگی "تم لوگ بہت پریشان ہو۔ ہے ناں' مگر پریشان ہونے یا ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ لوگ دوسرے کمرے میں ہیں اور ابھی یہاں آجائیں گے۔"

"لیکن ہم یہاں کیوں لائے گئے ہیں؟" اس بار جبار نے جرح کی۔

"ابھی چند منٹ میں تمہیں ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی" جینی اسکاٹ نے جواب دیا "پریشان مت ہو۔ سینڈوچ کھاؤ اور چائے پیو۔ اور اطمینان رکھو' مسٹر وانسن برے آدمی نہیں ہیں۔"

"مسٹر وانسن؟"

"ہاں' وہ جو سنہری فریم کی عینک پہنے ہوئے تھے۔ ان کا نام مسٹر وانسن ہے۔ اور وہ یہاں کے مالک ہیں۔"

پھر جینی اسکاٹ چلی گئی۔ ان چاروں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر چائے کے مگوں پر نظر ڈالی۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے صاف ہویدا تھا کہ وہ سینڈوچ کھانا چاہتے ہیں اور چائے پینا چاہتے ہیں۔ مگر احساس بے کسی مانع ہے۔ ہاتھ بڑھائیں یا نہ بڑھائیں۔ نہ جانے وہ کہاں ہیں؟ اور کیوں ہیں؟ انہیں اس عمارت میں کیوں لایا گیا ہے؟ اور یہ ایک سرا سیمہ کرنے والی پراسراریت کیوں پورے گھر پر طاری ہے؟ ایسا لگتا ہے جیسے گھر کی دیواریں زبان خاموشی سے کچھ کہہ رہی ہیں۔ انہیں کچھ بتا رہی ہیں جسے سمجھنے سے وہ قاصر ہیں۔ اور وہ ٹام بولٹ اور مسٹر وانسن کہاں ہیں؟ شاید دوسرے کمرے میں۔ مگر وہ لوگ دوسرے کمرے میں کیا کر رہے ہیں؟ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ کیا وہ لوگ ان چاروں کے خلاف کوئی سازش تیار کر رہے ہیں؟ ہاں شاید' وہ کوئی سازش ہی کر رہے ہیں۔ آخر کو وہ انگریز ہیں اور اجنبی ہیں۔ کیا بھروسا ہے ان کا۔ مگر کیا سازش ہو سکتی ہے؟

کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ پولیس کو بلالیں۔ مگر نہیں، وہ پولیس کے حوالے انہیں نہیں کرسکتے۔ کیونکہ اگر ایسا ان کا کوئی ارادہ ہوتا تو نام بولٹ پولیس اور انٹیلی جنس کا خطرہ مول لے کر انہیں جرمنی سے برطانیہ لاتا ہی کیوں؟

تو پھر کیا سازش ہوسکتی ہے؟

کچھ دیر گزری۔ وہ دم سادھے، خوف اور تذبذب کے حصار میں گھرے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اور گرم چائے سے دھواں اٹھتا رہا پھر آخرکار، ماریا سے ضبط نہ ہوسکا۔ اس کے چہرے سے نقاہت اور آنکھوں سے بھوک جھانک رہی تھی۔ درحقیقت اس کی حالت خاصی خستہ تھی۔ چنانچہ اس نے یکایک زور سے سانس لی۔ معذرتی نظروں سے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر ایک سینڈوچ اٹھالیا۔

ماریا کی جرأت رندانہ نے انہیں بھی ترغیب دی۔ پس وپیش بے سود ہے۔ بھوکے رہنے سے بری گھڑی ٹل تو نہیں جائے گی۔ جو کچھ ہونا ہے، وہ تو بہرحال ہو کر رہے گا اور جب ہوگا، تب دیکھا جائے گا۔ چنانچہ پھر مارکو نے تقلید کی، پھر جبار نے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے بعد آفاق نے بھی ماریا اور جبار کی جانب دیکھا۔ پژمردگی سے مسکرایا اور ایک ٹکڑا اٹھالیا۔

بالآخر انتظار تمام ہوا۔ جاں سوز اور اعصاب شکن انتظار تمام ہوا۔ انہوں نے ٹام بولٹ کو دیکھا۔ وہ گھر سے نکل کر لاری کی طرف جارہا تھا۔ پھر انہوں نے انجن اسٹارٹ ہونے کا مدھم سا ارتعاش سنا۔ پھر لاری متحرک ہوئی اور چند منٹ میں درختوں کے عقب میں غائب ہوگئی۔ وہ خاموش بیٹھے رہے۔ اور ان کے کان دروازے پر قدموں کی چاپ سننے کا انتظار کرتے رہے۔ خود بخود انہیں احساس ہوگیا تھا کہ چونکہ ٹام بولٹ چلا گیا ہے۔ لہٰذا مسٹر وائٹسن ان کے پاس ضرور آئیں گے اور اس سازش سے غالباً آگاہ کریں گے۔ جو انہوں نے ان کے خلاف تیار کی ہے۔

زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ قدموں کی مدھم آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا اور مسٹر وائٹسن اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ دوسرا آدمی بھی تھا۔ مسٹر وائٹسن ایک گول مٹول آدمی تھے۔ جسم کی طرح چہرہ بھی گول تھا۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بھورے بال تھے۔ ہونٹوں پر گھنی بھوری مونچھیں اور تھوڑی پر ایک چھوٹی سی گول داڑھی۔ وہ چارخانے دار پتلون اور سفید کوٹ پہنے تھے اور اپنے حلیے سے اچھے خاصے فلمی کامیڈین نظر آتے تھے۔ مسٹر وائٹسن کے برعکس دوسرا آدمی، جس کا نام ڈیوڈ بتایا گیا، ایک جسیم آدمی تھا۔ قد چھ فٹ سے بھی اوپر، گردن گینڈے کی طرح موٹی اور سخت اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی، جو اس سے میل نہیں کھارہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک دونالی بندوق تھی اور شانے سے لٹکے ہولسٹر میں ایک پستول بھی موجود تھا۔ اندر داخل ہو کر وہ دروازے کے قریب ہی کھڑا ہوگیا اور انہیں یوں دیکھنے لگا جیسے شکرا اپنے شکار کو دیکھتا ہے۔

مسٹر وائٹسن مسکرائے "کیسے ہو تم لوگ؟" آخرکار انہوں نے کہا۔

ان کی آواز نسوانی آوازوں کی طرح باریک اور کسی حد تک سریلی تھی۔ جیسے سیٹی بج رہی ہو۔ وہ کھڑکی سے پشت ٹکا کر کھڑے ہوگئے اور مسکراتی ہوئی قدرے شوخ نظروں سے انہیں کچھ دیر دیکھتے رہے پھر انہوں نے سیٹی بجائی "نام بولٹ چلا گیا ہے۔ اب تم لوگ میرے پاس رہو گے۔"

"کیا مطلب؟" جبار نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ اب تمہیں نام سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں نے رقم ادا کردی ہے۔ اب تم چاروں میری تحویل میں ہو۔"

"رقم ادا کردی ہے" یہ محض چار الفاظ تھے اور بظاہر سادہ اور بے ضرر۔ مگر انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے ذہن میں بارود پھٹا ہو۔ انہوں نے پہلے شدید حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر مسٹر وائٹسن کی طرف نظریں گھمائیں۔ وہ ہونٹوں پر ایک قدرے شریر اور پرمعنی مسکراہٹ سجائے انہیں دیکھ رہے تھے۔ کئی بوجھل اور اعصاب شکن لمحے گزرے۔ پھر مارکو نے اپنی سیٹ پر اضطراری انداز میں پہلو بدلا اور کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"مسٹر وائٹسن!" آخرکار اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا "آپ نے رقم ادا کردی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ نام بولٹ نے ہمیں آپ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

مسٹر وائٹسن مسکراتے رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر مستقل طور پر چسپاں رہتی ہے۔ قدرے سکوت کے بعد انہوں نے کہا "دیکھو، تمہارے اور نام بولٹ کے درمیان ایک رقم طے ہوئی تھی۔ جس کے عوض اسے تم سب کو اسمگل کرکے برطانیہ لانا تھا۔ تم نے ایک چھوٹی سی رقم بطور ایڈوانس دی تھی۔ باقی رقم کی ادائیگی کے لیے تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے تمہارے عوض ایک معقول رقم اسے دے دی ہے۔"

"مگر ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اس کی رقم ہم جلد ہی ادا کردیں گے" جبار نے ترش آواز میں جرح کی۔

"کیسے ادا کرتے، رقم کہاں سے آتی تمہارے پاس۔ یہ



مت بھولو کہ تم لوگوں کا داخلہ اس ملک میں ناجائز اور غیر قانونی ہے۔ تم لوگ تو کوئی ملازمت بھی نہیں کرسکتے۔"

"تو گویا آپ نے ہمیں خرید لیا ہے؟" آفاق نے تلخی سے کہا۔

مسٹر وائٹسن مسکراتے رہے "تم اگر پسند کرتے ہو تو اس بات کو اس طرح کہہ سکتے ہو، میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

"پھر آپ کیا سمجھتے ہیں؟" آفاق کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔

مسٹر وائٹسن نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے اپنے سفید کوٹ کی جیب سے ایک پتلا سا سگار برآمد کیا۔ سلگایا، ایک طویل کش لیا۔ اس دوران میں وہ پرخیال نظروں سے انہیں دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے۔ پھر آخرکار گویا ہوئے "میں اس بات کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کررہے ہیں۔ تم لوگ ایک بہتر زندگی کی جستجو میں برطانیہ آنا چاہتے تھے۔ مگر نہیں آسکتے تھے کیونکہ قانوناً تمہیں اس کا حق نہیں تھا۔ پھر بھی تم آگئے، غیر قانونی طریقے سے۔ اسمگل ہو کر اب اگر میں تمہیں پولیس کے حوالے کردوں تو کیا ہوگا؟ تم گرفتار کرلیے جاؤ گے۔ پولیس پہلے تم سب کو حوالات میں رکھے گی، پھر جہاز پر بٹھا کر واپس بھیج دے گی جہاں سے تم آئے ہو۔ پھر تمہاری حکومت تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ اس کا اندازہ تم کرسکتے ہو۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ بلکہ یہاں رکنے میں تمہاری مدد کروں گا۔ اسی بنا پر میں نے ٹام بولٹ کو وہ رقم ادا کی ہے جو دراصل تمہیں دینی چاہیے تھی، یہ تو ہوئی میری مدد۔"

"اور ہم لوگ کس طرح آپ کی مدد کریں؟" جبار نے پوچھا۔ اس کی آواز میں طنز کی جھلک تھی۔

"میں ایک فارمر اور بزنس مین ہوں" مسٹر وائٹسن نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا "میرے کئی فارم اور ویئر ہاؤس ہیں۔ اور بھی کئی کاروبار ہیں۔ تم لوگ میرے لیے کام کرو گے۔"

"کیا آپ کچھ اور وضاحت کریں گے؟" مارکو نے سوال کیا۔

"ابھی نہیں، کل میں وضاحت سے سب کچھ بتاؤں گا" مسٹر وائٹسن کی سریلی آواز میں پہلی بار سنجیدگی کی جھلک نظر آئی "بس اتنا یاد رکھو کہ میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔ میرا کام تم لوگوں کے بغیر بھی چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ لیکن تم لوگوں کا ایک لمحہ بھی میرے بغیر نہیں گزر سکتا۔ یہاں ٹھہرنے کے لیے تمہیں بہرحال میری شرائط کا پابند ہونا پڑے گا۔ کیونکہ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں تم لوگوں کو میری ضرورت ہے اور بہت زیادہ۔" مسٹر وائٹسن رکے پھر اضافہ کیا "میں جانتا ہوں، تم لوگ خوف زدہ ہو اور تمہارے ذہن میں کئی اندیشے اور سوال ہیں۔ لیکن اطمینان رکھو، میں صرف اس وقت تک تمہیں اپنے پاس رکھوں گا جب تک مناسب سمجھوں گا۔ اس کے بعد جانے کی اجازت دے دوں گا۔ لیکن اس کا انحصار تمہارے اوپر ہے۔ اگر تعاون کرو گے اور احکامات کی پابندی بھی تو اس ملک میں رہو گے، ورنہ نتائج کی ذمے داری تم پر ہوگی۔"

مسٹر وائٹسن چپ ہوگئے۔ اور متوقع نظروں سے ان کی طرف دیکھتے رہے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ وہ لوگ کچھ کہیں گے۔ کوئی سوال پوچھیں گے لیکن وہ سب چپ بیٹھے رہے اور سراسیمہ نظروں سے مسٹر وائٹسن کو دیکھتے رہے۔ مسٹر وائٹسن کی باتیں بالکل واضح اور دوٹوک تھیں۔ اور وہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ وہ ایک نادیدہ جال میں پھنس چکے ہیں۔ جس سے نکلنا سردست ان کے اختیار میں نہیں۔ غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہو کر وہ اپنے جہاز جلا چکے ہیں۔ واپسی کا کوئی امکان نہیں تو پھر سوال پوچھنا بے سود ہی ہوگا۔

جب وہ مہر بلب بیٹھے رہے تو مسٹر وائٹسن نے خود ہی لب کھولے "اب شام گہری ہورہی ہے۔ آج رات تم لوگ یہیں رکو گے۔ جینی اسکاٹ تمہارے کھانے اور سونے کا بندوبست کرے گی۔ کل میں تمہیں فارم پر لے چلوں گا۔"

پھر وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ لیکن باہر نکلنے سے پہلے رک گئے۔ گھوم کر ان کی طرف دیکھا "ایک بات اور۔" انہوں نے کہا اور اس بار ان کی آواز میں سفاکی اور سرد مہری تھی "جب تک تم لوگ میرے پاس رہو گے، کوئی ایسی بات نہیں کرو گے جو میری پسند کے خلاف ہو۔ اگر کوئی ایسا فتور خیال تمہارے ذہن میں آئے بھی تو اسے نکال پھینکنا۔ کیونکہ میں اپنے معاملات اور مفادات کی دیکھ بھال کرنا خوب جانتا ہوں۔ اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے ہر قدم اٹھا سکتا ہوں حتیٰ کہ..." وہ رکے، لمحہ بھر انہیں سرد نظروں سے گھورا۔ پھر ڈیوڈ کی گن کی طرف اشارہ کرکے اضافہ کیا "میں جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو کہ موت کوئی انوکھی شے نہیں۔ یہ کسی کو بھی آسکتی ہے اور کسی بھی وقت آسکتی ہے۔"

پھر مسٹر وائٹسن نے دروازہ کھولا مسکرائے اور حسب عادت سریلی آواز میں کہا "گڈ نائٹ۔"

○☆○

اس رات آفاق کو دیر تک نیند نہیں آئی۔

بالائی منزل میں تین بیڈ روم تھے۔ ایک میں جینی اسکاٹ سو رہی تھی۔ دوسرے میں ماریا اور مارکو تھے جبکہ تیسرا کمرا

انہیں شب بسری کے لیے دیا گیا تھا۔ آفاق اپنے سنگل بیڈ پر چپ چاپ لیٹا تھا۔ اور اندھیرے میں چھت کو گھورے چلا جارہا تھا۔ جبار دوسرے بیڈ پر سر تک کمبل لپیٹے چپ چاپ پڑا تھا۔ آفاق کو علم نہیں تھا کہ وہ سو گیا ہے یا جاگ رہا ہے۔ انہوں نے دیر تک باتیں کی تھیں اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ ماسوا اس کے کہ وہ لوگ بری طرح پھنس چکے ہیں اور فی الحال ان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ مناسب یہی ہے کہ خود کو سردست حالات کے سپرد کردیں اور دیکھیں کہ آنے والے دن کیا رنگ دکھاتے ہیں۔ پھر جبار نے کمبل تان لیا تھا۔ مگر آفاق کی آنکھوں میں نیند کی کوئی رمق نہیں تھی۔ حالانکہ وہ بہت جاگا ہوا بھی تھا۔ اور طویل سفر اور بے آرامی کے سبب تھکاوٹ بھی بہت زیادہ تھی۔ جسم کا جوڑ جوڑ خستہ اور شکستہ ہو رہا تھا اور آنکھیں درماندہ اور بوجھل تھیں۔ وہ سونا چاہتا تھا۔ ذہن سے سارا خوف، بے یقینی اور تفکرات کو جھاڑ کر سو جانا چاہتا تھا لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ ذہن میں کنکھجورے رینگ رہے تھے۔ خیالات کے زہریلے کنکھجورے۔ اسے بار بار مسٹر واٹسن کی گفتگو یاد آرہی تھی۔ مسٹر واٹسن، اپنے حلیے سے جو کر نظر آئے تھے، لیکن یہ قیاس کرنا دشوار نہیں تھا کہ ان کی شخصیت کے دو رخ ہیں۔ ظاہری طور پر وہ ایک بے ضرر اور کسی حد تک مضحکہ خیز آدمی نظر آتے ہیں لیکن اندرونی طور پر وہ ایک شقی، بے حس اور مطلب پرست انسان ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، وہی ان کا مطلب ہوتا ہے۔ اگر انہوں نے کہا تھا کہ موت کسی بھی وقت آسکتی ہے تو یہ طے ہے کہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے وہ ان کی موت کا سامان کرسکتے ہیں۔ اگر ضرورت پڑے تو۔

آفاق سوچتا رہا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سوچتا رہا۔ منظر ایک کے بعد ایک اس کی آنکھوں کے سامنے آتے رہے۔ اپنا شہر، جہاز کا سفر، ٹام بولٹ اور جانی، اور پھر لاری کا سفر۔ اور اب یہ کمرا۔ جو نہ جانے ملک کے کس حصے میں، کس علاقے میں واقع ہے۔ زندگی میں کتنی انہونیاں ہوتی ہیں۔ پچھلے کچھ دنوں جن حالات سے وہ گزرا، جو کچھ اس کے ساتھ پیش آیا، یہ سب کچھ تو کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود وہ یہاں، اس کمرے میں موجود ہے۔ ہونی کی نادیدہ انگلی تھام کر بے خبری میں وہ یہاں آپہنچا ہے۔ اور اب قیدی ہے۔۔۔ قیدی۔۔۔ اس کے چاروں طرف نادیدہ دیواروں سے بنا ایک زندان ہے۔ جس سے وہ نکل نہیں سکتا۔ اسے اس زندان میں ہی قید رہنا ہوگا۔ جب تک مسٹر واٹسن چاہیں گے کیونکہ انہوں نے اسے خریدا ہے۔

"خریدا ہے؟" یہ عجیب سے الفاظ تھے۔ آفاق نے یہ لفظ اپنی زبان سے دہرائے اور اپنے رگ وپے میں ایک انجانی سرد لہر کو دوڑتے محسوس کیا۔ جو خوف اور تشکیک سے معمور تھی۔ مسٹر واٹسن نے کہا تھا کہ وہ اس بات کو اس طرح کہنا پسند نہیں کریں گے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ الفاظ کے ردوبدل سے حقیقت کا مفہوم نہیں بدلتا۔ سچ یہی ہے کہ اسے بیچا اور خریدا گیا ہے۔ فروخت کرنے والا ٹام بولٹ تھا جس نے قیمت وصول کی اور خریدنے والے مسٹر واٹسن ہیں جنہوں نے قیمت چکائی۔۔۔ قیمت۔۔۔ شاید ڈیڑھ یا دو ہزار پونڈ۔ یکایک اس کا دل چاہا کہ ہنسے، خوب زور سے، بلند آواز سے ہنسے۔ پھر جی چاہا کہ روئے، جی بھر کر روئے۔ لیکن طے نہ کرسکا کہ کیا کرے۔ روئے یا ہنسے؟ معاً اس کے ہونٹ کھنچ گئے، ایک تلخ، روتی ہوئی، استہزائیہ ہنسی اس کے ہونٹوں پر بکھری۔ یوں جیسے خود اپنے آپ پر ہنسا ہو۔ پھر آنکھوں میں آنسو آگئے اور ڈھلک کر کنپٹیوں پر بہ گئے۔۔۔ صرف ڈیڑھ یا دو ہزار پونڈ۔۔۔ کیا یہ توہین نہیں ہے۔ اس زمانے میں جبکہ کتے بلیوں کی بھی اچھی خاصی قیمت لگتی ہے، ایک جوان، تندرست، تعلیم یافتہ انسان کی قیمت صرف ڈیڑھ یا دو ہزار پونڈ۔۔۔ لعنت ہے۔ اسے یاد آیا، کسی زمانے میں انسانوں کو غلام بنانے کا دستور تھا۔ انسان فروخت کیے جاتے تھے۔ خریدے جاتے تھے۔ نیلام ہوتے تھے۔ اور اس زمانے میں ایک جوان، صحت مند انسان دو سے لے کر ہزار بارہ سو پونڈ تک میں فروخت ہوتا تھا۔ ہزار بارہ سو پونڈ۔ اور یہ تقریباً دو سو سال پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں اشیا کی قیمتیں کیا تھیں۔ تنخواہ کا تناسب کیا تھا۔ ہفتے میں چھ دن سخت مشقت کرنے کے بعد دو چار شلنگ تنخواہ ملا کرتی تھی۔ اشیا کی قیمتیں بہت کم تھیں۔ ایک شلنگ میں پورے گھر کے لیے اشیائے خورونوش کا سامان مل جاتا تھا کیونکہ اس زمانے میں زر کی قدر بہت زیادہ تھی۔ اس وقت کے ایک ہزار پونڈ آج کے دو تین لاکھ پونڈ کے برابر ہوئے۔ اب اگر اس زمانے میں ایک انسان ایک ہزار پونڈ میں بکتا تھا تو گویا آج کے دور میں اس کی قیمت دو تین لاکھ پونڈ بنی۔ جبکہ اس کی اپنی قیمت صرف ڈیڑھ دو ہزار پونڈ ٹھہری ہے۔ وہ ایک جیتا جاگتا، صحت مند اور تعلیم یافتہ آدمی ہے، پھر بھی اتنی کم قیمت، لعنت ہے۔

ایک بار پھر اسے ہنسی آئی۔ ایک بار پھر اس کی آنکھ نم ہوئی۔ کتنی مہمل اور تمسخر آمیز بات ہے۔ ایک بے تکے، بے ہودہ اور فضول لطیفے کی طرح۔ وہ زمانہ کبھی کا لد چکا جب گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسانوں کو بیچا اور خریدا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ زمانہ تاریکی کا تھا جبکہ آج کا دور روشنی

سے عبارت ہے کہ آج کے آدمی نے بہت کچھ سیکھا ہے، سنے علوم دریافت کیے ہیں۔ انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی حق خود ارادیت اور فرد کی آزادی کا نظریہ دریافت کیا ہے۔ سماجی تفریق کو مٹانے کی کوشش کی ہے اور صرف برے رسم ورواج سے ہی نہیں بلکہ انسانی تجارت کے فعل قبیح سے بھی نجات حاصل کی ہے۔ لیکن کیا یہ ایک مضحکہ خیز ستم نہیں ہے کہ سماجی اور معاشرتی علوم میں اتنی پیش رفت کے باوصف آج بھی ان گنت برائیاں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ انسانوں کی خرید وفروخت بھی۔ خواہ چوری چھپے ہو اور بہت محدود پیمانے پر ہو۔ مگر موجود ہے۔ دنیا میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں۔ الفاظ کے ہیر پھیر سے حقیقت نہیں بدلتی۔ اگر ایک غریب آدمی اپنی بیٹی کو بیاہنے کے لیے ڈھیر سارا جہیز اور نقد رقم دیتا ہے تو یہ تجارت ہے۔ ایک دیانت جان توڑ محنت کے عوض بہت معمولی معاوضہ پاتا ہے تو گویا وہ اپنی اہلیت اور محنت کو بہت کم قیمت پر بیچ رہا ہے۔ ایک زمیندار معمولی سے قرض کے بدلے میں ایک مزدور سے ساری زندگی بیگار لیتا ہے تو اگر یہ غلامی نہیں تو اور کیا ہے؟ انسانوں کی تجارت باقاعدہ طور پر پہلے ہی بند ہو چکی ہو لیکن آفاق نے سنا تھا اور دو ایک بار اخبار میں بھی پڑھا تھا کہ دنیا کے بعض خطوں میں ابھی بھی انسانی تجارت کا رواج بد موجود ہے۔ جبکہ یورپ میں صورت حال مختلف ہے۔ یہاں یہ کام ذرا مختلف ڈھنگ سے ہوتا ہے۔ کچھ لوگ غیر قانونی طور پر انسانوں کو اسمگل کر کے بڑے کارخانے داروں اور زمینداروں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ آفاق نے جب بھی ایسی خبریں سنی تھیں، اسے یقین کرنے میں تامل ہوا تھا۔ مگر اب کہ وہ خود اس ذلت آمیز مرحلے سے گزر رہا تھا، اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا تھا اور یہ خرید وفروخت اس ملک میں ہوئی تھی جو غلامی کے خاتمے میں نہ صرف پیش پیش رہا تھا، بلکہ جو حقوق انسانی کا (بزعم خود) سب سے بڑا داعی بھی ہے۔ یہ کیسی ستم انگیزیات ہے، لعنت ہے۔

اس نے سگریٹ جلائی، کش لے کر دھواں خارج کیا۔ دھوئیں کے مرغولے فضا میں بلند ہوئے تو اسے ایک عجیب سا خیال آیا۔ غلاموں کی تجارت، اس نے چشم تصور سے زمانہ قدیم کو دیکھا۔ تصور بھی ایک بڑی نعمت ہے۔ آدمی تخیل کی مدد سے ان مقامات کو بھی دیکھ سکتا ہے، جہاں وہ کبھی نہ گیا ہو۔ اور ان زمانوں میں جا سکتا ہے جو بہت پہلے گزر چکے ہوں۔ اس نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ ایک نیم کشادہ میدان ہے۔ ایک طرف زمین سے تین فٹ بلند ایک چبوترا بنا ہے۔ میدان میں لوگوں کا ہجوم ہے۔ عورتیں، مرد اور بچے، اور ان سب کی نظریں چبوترے پر مرکوز ہیں۔ جہاں ایک سیاہ فام حبشی کھڑا ہے۔ دراز قامت، قوی الجثہ، اس کے سیاہ بازو فولاد کی طرح ٹھوس اور مضبوط نظر آتے ہیں۔ اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ نما کپڑا ہے۔ اور گردن میں ایک فولادی حلقہ جو ایک زنجیر سے پیوست ہے۔ اس کے چہرے پر ہزیمت، ذلت اور لاچاری ہے۔ اور وہ بے حد بے چارگی اور مظلومیت سے ہجوم کو دیکھ رہا ہے۔

نیلامی کے فرائض انجام دینے والا آدمی سفید فام ہے۔ گول مٹول، سرخ سنجاب۔ اس کے تابنے کے مانند سرخ گول چہرے پر ایک ناقابل بے جوش و خروش اور ہیجان آمیز مسرت ہے جیسے وہ سیاہ فام غلام کو نیلام کر کے بے پناہ خوشی اور لذت حاصل کر رہا ہو۔ اس کے ہاتھ میں ایک چابک ہے۔ جسے وہ بار بار فضا میں لہراتا ہے۔ اور اپنے مخصوص پیشہ ورانہ انداز میں زور زور سے کہتا ہے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین، ذرا غور سے دیکھیے۔ ایسا "غلام" روز روز نہیں آتا۔ کبھی کبھی اور اتفاق سے ہاتھ لگتا ہے۔ ابھی ابھی تاریک براعظم سے برآمد ہوا ہے۔ ذرا اس کا قد دیکھیے۔ اس کے بازو اور گردن اور ٹانگیں دیکھیے۔ سر سے پاؤں تک فولاد ہے فولاد۔ دس گھوڑوں کے برابر کام کرے گا اور ساری زندگی آپ کی خدمت کرے گا۔ پینتالیس کا ہے۔ آپ، بولی لگائیے۔ یاد رکھیے ایسا "مال" پھر نہیں ملے گا۔"

"پچاس پونڈ!" ایک عمر رسیدہ عورت زور سے بولی ہے۔

"پچاس، محترمہ! آپ ضرور مذاق کر رہی ہیں۔ ایسی "چیز" پچاس پونڈ میں کہاں ملتی ہے۔"

"ستر پونڈ!" ایک بوڑھا آدمی ہاتھ ہلا کر اونچی آواز میں چلاتا ہے۔

"اسّی!"

"سو۔"

"ایک سو پچاس" سیاہ اونی سوٹ میں ملبوس آدمی بولی بڑھاتا ہے۔

"ایک سو پچاس ایک، ایک سو پچاس دو۔" نیلام کرنے والا زور سے چابک بجاتا ہے "حضرات" سوچ کیا رہے ہیں۔ بولی بڑھائیے، ایسا "مال" پھر نہیں ملے گا۔ یاد رکھیے، یہ لائف ٹائم "انویسٹمنٹ" ہے۔"

بولی مزید بڑھتی ہے۔ خریداروں میں جوش و خروش ہے۔ ایک جوان، تندرست اور قوی غلام، جو دس گھوڑوں کے برابر کام کرے۔ اور زندگی بھر اپنے "مالک" کی خدمت کر سکے۔ روز روز نہیں ملتا اور آسانی سے نہیں ملتا۔ چنانچہ بولی میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے۔ دو سو پونڈ، ڈھائی سو پونڈ، حتیٰ کہ بولی ساڑھے چار سو پونڈ تک پہنچتی ہے۔ پھر ایک بھاری



بھرکم توند والا دولت مند کاشتکار جسے اپنے فارموں پر کام کرنے کے لیے تندرست غلاموں کی اشد ضرورت رہتی ہے، بولی ایک دم پانچ سو پچاس پونڈ کر دیتا ہے۔ یہ بڑی رقم ہے، بہت بڑی رقم ہے۔ دوسرے کسی خریدار میں اتنا دم خم نہیں کہ بولی سے تجاوز کر سکے۔ لہٰذا ہجوم پر خاموشی چھا جاتی ہے اور بولی موٹی توند والے زمیندار کے نام پر ختم ہو جاتی ہے۔

آفاق نے ایک گہرا کش لیا۔ پھر معاً اسے ہنسی آئی۔ پتا نہیں کیسی ہنسی تھی اور کیوں آئی تھی۔ اس ہنسی میں تحقیر بھی تھی۔ طنز بھی اور بے چارگی بھی۔ شاید وہ اپنے آپ پر ہنسا تھا، اپنے حالات پر ہنسا تھا اور یا پھر ان مناظر پر ہنسا تھا جو اس نے پردہ تصور میں دیکھے تھے اور گو وہ چاہتا نہیں تھا کہ خیال پھر اس طرف جائے بلکہ وہ کچھ دیر سونا چاہتا تھا تاکہ جسم و ذہن کی تھکاوٹ، پژمردگی اور اداسی دور ہو جائے اور دل کا بھاری بوجھ کچھ کم ہو جائے۔ لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ جب بھی آنکھیں بند کرتا، نیلام کا منظر آنکھوں کے سامنے متحرک تصویروں کی طرح چلنے لگتا۔ ایک بار ذرا سی غنودگی طاری ہوئی تو پھر وہ منظر لوٹ آیا۔ وہی ہجوم، عورتیں اور مرد۔ وہی چبوترا اور چبوترے پر نیلام ہونے کے لیے کھڑا ایک غلام۔ غلام پر نظر پڑی تو درد سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سانس بھاری ہو گئی اور دل یوں ڈوبنے لگا جیسے کسی بھاری پتھر سے بندھا ہو۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور بہت غور سے دیکھا۔ پھر کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی۔ چبوترے پر جو غلام کھڑا تھا، وہ دراصل وہ خود تھا۔ اس کے جسم پر ایک میلی، بوسیدہ نیکر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گردن میں ایک آہنی حلقہ تھا جو ایک زنجیر سے منسلک تھا اور زنجیر اس آدمی کے ہاتھ میں تھی۔ جو نیلام کرنے والا تھا اور وہ آدمی کوئی اور نہیں ٹام بولٹ تھا۔

نیلام شروع ہونے سے قبل چند ایک افراد چبوترے پر چڑھ آئے۔ اور اس کا جسم ٹٹولنے لگے۔ وہ لوگ بہرحال خریدار تھے اور یہ ان کا حق تھا کہ خریدنے سے پہلے "مال" کا اچھی طرح جائزہ لے لیں۔ چنانچہ کسی نے اس کی رانوں، گھٹنوں اور پنڈلیوں کا جائزہ لیا کسی نے گردن اور ریڑھ کی ہڈی کو جانچا اور کسی نے کمر کا معائنہ کیا۔ ایک بوڑھے آدمی نے اس کا منہ کھول کر دانتوں کو چیک کیا۔ ایک بوڑھی فربہ عورت بھی چبوترے پر موجود تھی اور اس کے جسم کو پرکھ رہی تھی۔ اس نے اس کے جسم کے دو ایک نجی مقامات کو بھی چھو کر دیکھا۔ آفاق نے بوڑھی عورت کے چہرے کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ بوڑھی عورت کیوں اسے خریدنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ غلام کا کام ہے، مالک کی خدمت کرنا اور "خدمت" کسی بھی نوعیت کی ہو سکتی ہے۔ اگر بوڑھی عورت اسے خرید لے تو کیا وہ "خدمت" کرنے سے انکار کر سکے گا؟ نہیں، ایک اچھا غلام کبھی انکار نہیں کرتا۔"

جائزہ لینے والے آپس میں تبصرہ بھی کر رہے تھے۔

"جوان ہے۔"

"تندرست بھی ہے۔"

"مگر اتنا توانا نہیں، جتنا پہلے والا غلام تھا۔"

"پھر بھی کام تو کرے گا۔"

"ہاں، کام تو ضرور کرے گا۔ اگر دس گھوڑوں کے برابر نہیں تو پانچ کے برابر ضرور کام کرے گا۔"

"افریقی تو نہیں لگتا۔"

"ایشین ہے بھئی، ایشین۔"

معائنہ ختم ہوا، خریدار چبوترے سے اتر گئے۔ ٹام بولٹ نے چابک سے زور سے لہرایا۔ باچھیں پھیلا کر مسکرایا۔ پھر اپنی بھاری، کھردری آواز میں بولا "خواتین و حضرات، آپ جانتے ہیں۔ یہاں ہر ماہ نیلام ہوتا ہے۔ اور غلام نیلام کیے جاتے ہیں۔ سیاہ فام افریقی غلام۔ لیکن یہ افریقی نہیں، ایشیائی ہے۔ آپ ضرور جاننا چاہیں گے تو حضرات، میں عرض کرتا ہوں۔ یہ ایشیا کے ایک شہر میں پلا بڑھا، تعلیم حاصل کی اور بی اے کیا۔ جی ہاں حضرات، بی اے تک تعلیم حاصل کی اس نے۔ کئی مضامین میں اول پوزیشن حاصل کی لیکن اول پوزیشن حاصل کرنے والے کو اپنے شہر میں، اپنے ملک میں


ڈاک بذریعہ خواتین وحضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

| | | | |
|---|---|---|---|
| انگلش لینگویج کورس | ایئر ہوسٹس فلائیٹ اسٹیوارڈ | بیوٹی پارلر کورس | |
| بوتیک فیشن | آٹو سروسنگ | ڈرافٹسمین | ایئر جرنگ |
| ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ | الیکٹریشن | الیکٹرانک ٹیکنیک | اسکول ٹیچنگ میتھڈ |
| انٹیریئر ڈیکوریشن | فوٹوگرافی | صحافت | انگلش شارٹ ہینڈ ٹوائپنگ |
| بیوٹی کلچر | کمپیوٹر | حکمت کورس | کوکنگ بیکنگ |
| آئل پینٹنگ | میڈیکل ایڈ | ڈینٹل ٹیکنیشن | لیڈیز ٹیلرنگ |
| ایڈورٹائزنگ آرٹ ڈیزائننگ | پبلک ریلیشن آفیسر | نیوز رپورٹر | فہرسازی |

چبوترے کو سرخ اور سبز جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو یہاں غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اس روز دور دور سے خریدار آتے تھے۔ کچھ تو محض تماشا دیکھنے کے لیے آتے تھے اور کچھ واقعی غلام خریدنے کے لیے آتے تھے۔ ٹام بولٹ کا کام ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو غلاموں کی خرید و فروخت کا انتظام کرنا تھا۔ اس کام کے عوض اسے معقول معاوضہ ملتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہر غلام کی خرید پر کمیشن بھی وصول کرتا تھا۔ اس کا کام بہت آسان تھا۔ غلاموں کو چبوترے پر لانا، ان کی بولی لگوانا اور پھر انہیں خریداروں کے حوالے کرنا۔ اس کام کے لیے اسے ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو یہاں آنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس کام کے عوض اسے معقول معاوضہ ملتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہر غلام کی خرید پر کمیشن بھی وصول کرتا تھا۔ اس کا کام بہت آسان تھا۔ غلاموں کو چبوترے پر لانا، ان کی بولی لگوانا اور پھر انہیں خریداروں کے حوالے کرنا۔ اس کام کے لیے اسے ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو یہاں آنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس کام کے عوض اسے معقول معاوضہ ملتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہر غلام کی خرید پر کمیشن بھی وصول کرتا تھا۔ اس کا کام بہت آسان تھا۔ غلاموں کو چبوترے پر لانا، ان کی بولی لگوانا اور پھر انہیں خریداروں کے حوالے کرنا۔ اس کام کے لیے اسے ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو یہاں آنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس کام کے عوض اسے معقول معاوضہ ملتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہر غلام کی خرید پر کمیشن بھی وصول کرتا تھا۔

پوسٹ بکس 1237 اسلام آباد اکیڈمی جی پی او، اسلام آباد

تیسرے درجے کی نوکری بھی نہیں ملی۔ مجبور ہو کر یہ "غلام" اپنی عسرت اور تنگ دستی سے نجات پانے کے لیے یورپ آیا اور غیر قانونی طور پر ہمارے ملک میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ جی ہاں، غیر قانونی طور پر۔ اور اس طرح یہ ہمارے ہاتھ لگا۔ آپ اسے ذرا غور سے دیکھیے۔ یہ جاہل اور اجڈ اور بیک ورڈ افریقی غلاموں سے بہت مختلف ہے۔ ہی از اے گڈ کلکنگ سلیو۔ ذرا توجہ دیجیے حضرات، یہ جوان ہے، تندرست ہے۔ کسی قسم کی کوئی بیماری اسے کبھی نہیں ہوئی۔ ہینڈسم ہے اور تعلیم یافتہ بھی۔ یہ آپ کے بہت کام آئے گا۔ آپ کے کھیتوں میں کام کرے گا۔ آپ کے گھر کے باغیچے میں کام کرے گا۔ آپ کے مالی معاملات کی دیکھ بھال کرے گا۔ اور آپ کے بچوں کو تاریخ، جغرافیہ اور حساب بھی پڑھائے گا۔ یہ ایک ٹرولا ئف انویسٹ منٹ ہے۔ اتنی خوبیاں رکھنے والا غلام آپ کو روز روز نہیں ملے گا۔ بولی لگائیے حضرات! یہ موقع ہاتھ سے مت جانے دیجیے۔ ورنہ ہمیشہ کفِ افسوس ملیں گے۔"

"سو پونڈ!" بوڑھی فربہ عورت نے اونچی آواز میں بولی کا آغاز کیا۔ جس نے اسے بھوکی نظروں سے دیکھا تھا۔

"دو سو پونڈ!" ایک کونے سے آواز آئی۔

"ڈھائی سو۔"

ٹام بولٹ نے چابک کو زور سے حرکت دی "کم آن حضرات! ڈھائی سو پونڈ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ دل کھولیے اور اپنا بٹوہ بھی اور بولی بڑھائیے۔ اگر آپ پڑھا لکھا، ذہین اور مہذب غلام چاہتے ہیں تو رقم خرچ کیجیے۔ ایسا ہمہ صفت غلام آپ کو پھر نہیں ملے گا۔"

"تین سو پونڈ!" بوڑھی فربہ عورت چلائی۔

"سوا تین سو۔"

"ساڑھے تین۔"

ٹام بولٹ نے ہاتھ کو زور سے پرجوش انداز میں جنبش دی "ساڑھے تین ایک... ساڑھے تین دو... جاتا ہے یہ غلام حضرات صرف ساڑھے تین سو میں۔ ہے کوئی اور جو بولی بڑھائے۔ اس خوب صورت غلام کے لیے۔ ساڑھے تین ایک..."

"چار سو..." بوڑھی عورت نے چیخ کر کہا۔

"ساڑھے چار سو" ہجوم کے درمیان سے آواز آئی۔

"پانچ سو..."

یہ آواز مجمع کے عقب سے آئی تھی اور جانی پہچانی سی تھی۔ آفاق نے ذرا گردن اچکا کر دیکھا اور اس کی سانس تقریباً رک سی گئی۔ کیونکہ بولی دینے والا کوئی اور نہیں مسٹر واٹسن تھے اور ان کی آواز ایسی تھی کہ ہجوم پر ایک خاموشی طاری ہو گئی۔ کچھ تو غالباً اس بنا پر کہ شاید شاید ان کی شخصیت کا رعب زیادہ تھا اور کچھ اس بنا پر کہ پانچ سو پونڈ سے آگے جانا کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہر چند کہ وہ ایک جوان، وجیہہ اور تعلیم یافتہ غلام تھا مگر حبشیوں کی طرح قوی اور جسیم نہیں تھا۔ اور پانچ سو پونڈ سے زیادہ قیمت میں یقیناً مہنگا تھا۔ لہٰذا مجمع چپ رہا۔ ٹام بولٹ کئی منٹ تک پانچ سو ایک، پانچ سو دو کی گردان کرتا رہا۔ پھر اس "تین" کہہ کر بولی ختم کر دی۔

یکلخت غنودگی کا سحر ٹوٹا اور اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

پانچ سو ایک... پانچ سو دو... پانچ سو تین... اس نے زیر لب دہرایا۔ اور زور زور سے کئی سانسیں لیں۔ اس پر ایک بے نام سی وحشت سوار تھی۔ سینہ تیز سانسوں کے مدوجزر کے باعث زور زور سے ابھر رہا تھا اور ڈوب رہا تھا۔ وہ ایک دہشت کے عالم میں خاموش لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹ غیر ارادی طور پر پانچ سو ایک، پانچ سو دو کی گردان کر رہے تھے۔ پھر یکایک وہ ہنسا، لیکن عجیب سی ہنسی تھی وہ۔ تحیر اور استہزا سے بھری ہوئی۔ جیسے خود اپنے آپ پر ہنسا ہو۔ مسٹر آفاق، تم بک گئے۔ نیلام ہو گئے۔ کیونکہ تم کچھ بھی نہیں ہو۔ ایک بے قیمت، بے وقعت غلام ہو۔ حالات کے مارے ہوئے، وقت کے ٹھکرائے ہوئے۔ صرف ایک غلام اور کچھ بھی نہیں۔ اور تمہاری قیمت صرف پانچ سو پونڈ ٹھہری ہے۔ اور وہ بھی مسٹر واٹسن نے یہ قیمت ٹھہرائی ہے۔ یہ بے ایمانی نہیں تو اور کیا ہے۔ انہوں نے اتنی بولی بھی نہیں لگائی، جتنی رقم درحقیقت انہوں نے ٹام بولٹ کو ادا کی ہے۔ وہ ایک بار پھر ہنسا۔ یہ سوچ کر کہ نیلام کے وقت اس کے تصور میں صرف پانچ سو پونڈ کیوں آئے۔ پانچ لاکھ پونڈ کیوں نہیں آئے۔ اگر اپنی قدر کا تصور خود اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تھا تو وہ کوئی بھی قیمت مقرر کر سکتا تھا۔ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ خود اس کی اپنی نظر میں اس کی قدر بہت کم ہے، صرف پانچ سو پونڈ، لعنت ہے۔

یکایک اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر آنسو پونچھے۔

بے گانوں کے درمیان ایک پردیسی کی پُرمصائب داستان کا دوسرا حصہ آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں